سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

جولائی 2012

نگران اعلیٰ
معراج رسول

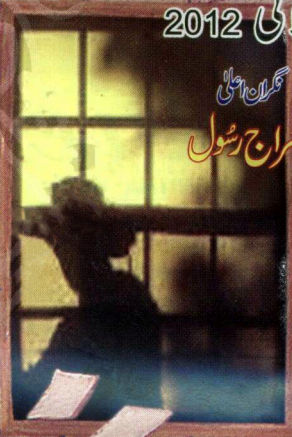

PDFBOOKSFREE.PK

محسنِ غالب: کلیاتِ غالب ہند کی الہامی کتاب قرار دینے والے کا سوانح

جال: اس باحوصلہ لڑکی کے حالاتِ زندگی جس کے گرد جال ہی جال تھے مگر وہ مایوس نہ تھی

شاطر مصلح: پاکستان میں امن قائم کرنے کے نام پر لاکھوں ڈالر غبن کرنے والے امریکی کی کتھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

15 — سرگزشت — **سپاہی** — ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادرروزگار کا تعارف خاص

16 — گفت وشنید — **شہرِ خیال** — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

24 — شخصیت — **محسنِ غالب** — ڈاکٹر ساجد امجد
اس ادیب کا سوانح جس نے کلامِ غالب کو الہامی قرار دیا

49 — زندگی نامہ — **شاطرِ مصلح** — ابن کبیر
پاکستان میں امن قائم کرنے کے نام پر اس نے لاکھوں ڈالر ہضم کرلیے

67 — طرزِ زندگی — **شرپا** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
اس معاشرے میں ایک عورت دو شوہر رکھتی ہے

75 — واقعاتِ عالم — **ایف بی آئی کا جنم** — صائمہ اقبال
امریکا کا تحقیقاتی ادارہ اتنا قوی کیسے بنا

86 — فلم وصحافت — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی اَن کہی کہانیاں، فلم نگری کی باتیں، یادیں

107 — جنگل کہانی — **سینگ چور** — مختار آزاد
جنگل میں ہونے والے جرائم میں سرِفہرست جرم

123 — سفرنامہ — **شہر یوں کا شہر** — ایس جی یزدانی
اس ملک کا تذکرہ جہاں قانون کا احترام باقی ہے جہاں بجلی چلی جائے تو حکومت ہرجانہ ادا کرتی ہے

135 — خراجِ تحسین — **رسوا** — ایاز راہی
اردو ادب کے ایک قابلِ قدر ادیب کا تذکرہ

139 — حادثات — **اُڑان** — شکیل صدیقی
اسے جہاز اُڑانے کی تمنا تھی یہ تمنا پوری ہوئی مگر کیسے خطرناک حالات میں

143 — معلومات — **نگینے** — زین مہدی
کان سے نکلنے والے پُراسرار خاصیت کے حامل پتھروں کا تذکرہ

152 — معاشرت — **سراب** — کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

191 — شعر وادب — **بیت بازی** — قارئین
شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

194 — انعامی مقابلہ — **علمی آزمائش** — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوقِ جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

196 — پہلی سچ بیانی — **جال** — نجمہ
اس کے گرد ایک جال پھیلا تھا کہ سہیلی نے حوصلے سے کام لے کر سب کچھ الٹ دیا

213 — دوسری سچ بیانی — **غیب** — ڈاکٹر منیرہ عرفان
بیٹا اس کا تھا مگر کہلاتا کسی اور کا تھا اور یہی بات اسے پسند نہیں آئی تھی

227 — تیسری سچ بیانی — **بساطِ زیست** — نائلہ
بہنیں خوبصورت تھیں پھوپھی اس نے انہیں تدبیر سے مات دے دی تھی

235 — چوتھی سچ بیانی — **ذراسی بات** — انور کمال
راہ چلتے اس کا موبائل چھنا اور اسے تھانے میں چھتر ول بھی سہنی پڑی

239 — پانچویں سچ بیانی — **کاش** — صندل
ایک نہایت ہی غیر متوقع انجام کی انتہائی دلچسپ سچ بیانی

249 — چھٹی سچ بیانی — **ڈیڈی پاپا اور میں** — عنبرین
پاپا گھر میں تھے اور ممی کسی اور کے ساتھ بے تکلفی سے ملتی وجہ کیا تھی

255 — ساتویں سچ بیانی — **ابن الوقت** — عظیم الدین
وہ وقت کی رفتار کا اندازہ بخوبی لگالیتا تھا یہی اس کی کامیابی تھی

268 — آٹھویں سچ بیانی — **تیسرا عشق** — نسیم
وہ عشق کے سمندر میں ڈوبنا چاہتی تھی لیکن حالات......

287 — نویں سچ بیانی — **گرگٹ** — نفیس خیال
وہ مفاد پرستی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد 22 ❖ شمارہ 09 ❖ جولائی 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی ناز ش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

کرپشن، کرپشن، کرپشن...... ایسا لگتا ہے کہ ہم بدعنوانی کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہیں۔ قائداعظم کے فرمان کام، کام اور کام پر ملمع چڑھا دیا گیا ہے۔ کام کو بھلا کر کرپشن کی دوڑ لگوادی ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہاں خاندانی سیاست کو رواج دیا گیا ہے۔ باپ کی کرسی بیٹے، بیٹیوں کی جاگیر بنادی گئی ہے۔ اب یہی رویہ کرپشن میں بھی نظر آنے لگا ہے۔ بچے شہ پاکر والدین سے بھی آگے جانے کی سعی میں لگے ہیں۔ ایسی ایسی وارداتوں کے تذکرے سامنے آرہے ہیں کہ ریاست پر سے یقین متزلزل ہوتا نظر آنے لگا ہے، جیسے قانون کی دیوی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی نہیں باندھی گئی، آنکھیں ہی نوچ لی گئی ہیں اور ہاتھ کے میزان کو ''بے پاسنگ'' کردیا گیا ہے۔ کیونکہ تقدس مآب ناموں والے فرزندان کے کام ایسے کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارا قانون دھاردار ہے، عدلیہ مضبوط ہے، نظام جما جمایا ہے پھر بھی وہ سب کچھ جاری وساری ہے جو قوم کے لیے باعثِ شرم ہے، باعثِ رسوائی ہے لیکن سب خود میں مست الست ہیں۔ یہاں تک کہ جمہوریت کے اصل نگراں، صحافی حضرات بھی الزامات کی بوچھاڑ میں کھڑے شرم یا بے شرمی سے مسکرا رہے ہیں۔ بریف کیس، پلاٹ اور گاڑیاں ملنے کی خبروں کو چھپا رہے ہیں۔

گر یہی صورتِ حال رہی تو ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ بقول محسن نقوی

اِک لمحہ تو دم لینے دے آغوش سکوں میں
اے گردشِ حالات کسی موڑ پہ تھم جا

معراج رسول

سپاہی

سرگزشت

قصبہ چُنار کے نائب تحصیل دار شیخ محمد زمان کے گھر 25 دسمبر 1889ء میں اس نے جنم لیا۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا اس لیے تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرتا تھا، اسے بھی پڑھانے کے لیے خاص انتظام کیا گیا، لکھنو سے مولوی کو بلایا گیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اسے جوبلی ہائی اسکول لکھنو میں داخلہ دلوایا گیا جہاں سے انہوں نے 1907ء میں میٹرک پاس کیا۔ میٹرک کے بعد اسے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ علی گڑھ پہنچتے ہی اس نے فٹ بال ٹیم میں شمولیت حاصل کرلی۔ غیرنصابی سرگرمیوں میں زیادہ وقت صرف کرنے کی وجہ سے تعلیمی کارکردگی بہت زیادہ بہتر نہ تھی پھر دوستوں کا حلقہ بھی ایسا تھا جو غیرنصابی سرگرمیوں کا دلدادہ تھا ان میں سرِفہرست شہزادہ حمیداللہ خاں جنہوں نے بعد میں نواب آف بھوپال کا تاج پہنا، شامل تھے۔ سیاست سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا مگر مسلمانوں کے حالات زار پر وہ کڑھتے ضرور تھے۔ جن دنوں جوبلی ہائی اسکول لکھنو میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے، کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ نے کالج یونین کے نائب صدر راجا غلام حسین کو مسلم آزار سیاسی رجحان کی وجہ سے کالج سے برطرف کردیا تھا جس کی وجہ سے راجا غلام حسین کو دل کا دورہ پڑا اور وہ موت کی گود میں چلا گیا۔ اس واقعے کا اثر ذہن پر بہت زیادہ تھا کہ مولانا حسرت موہانی کی گرفتاری کا صدمہ سہنا پڑا۔ ان دو واقعات نے خاصا اثر چھوڑا تھا کہ 1909ء میں مولانا محمد علی و شوکت علی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس ملاقات نے ذہن و دل میں سلگتی چنگاری کو ہوا دی اور وہ بھی سر آغا خان و مولانا شوکت علی کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فنڈ ریزنگ مہم میں شامل ہوگئے۔ اس مہم میں راجا صاحب محمود آباد نے ایک بار پھر ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم فنڈ میں دے دی۔ ان اکابرین کی رہنمائی نے ذہن کی تشکیل شروع کردی۔ راجا صاحب محمود آباد کا خصوصی دستِ شفقت تھا اس لیے آگے کی راہ ہموار ہوتی جارہی تھی۔ 1910ء میں خالہ زاد سے شادی ہوئی۔ زندگی میں نمایاں تبدیلی آئی مگر سیاسی رجحان میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ مسلمانوں کے حالاتِ زار کو بدلنے کے لیے مکمل طور پر سیاست میں آنے پر غور کرنے لگے۔ اسی دوران لیبیا پر حملہ ہوا تو انگریزوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں لگ گئے۔ ان کی اس کوشش میں کلکتہ کے ''الہلال'' اور ''لاہور کے ''زمیندار'' نے بھرپور ساتھ دیا۔ بلغاریہ نے جنگ چھیڑی تھی۔ مقابل مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی مدد ضروری تھی اس لیے وہ سلطنتِ عثمانیہ کی افواج کو طبی امداد فراہم کرنے کے لیے جو وفد تیار ہوا یہ اس میں بھی شامل ہوگئے۔ جب تک جنگ جاری رہی یہ ترک محاذ پر رہے۔ جنگ ختم ہوئی تو یہ لوٹ کر ہند آئے اور علی گڑھ کالج دوبارہ جوائن کرلیا۔ 1914ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی تو یہ پھر میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ انہوں نے ترک حکومت کی امداد کے لیے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا دورہ کیا تاکہ وہاں سے بندوقیں خرید کر ترک حکومت کو دے سکیں تاکہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑسکیں۔ انہوں نے افغانستان کا دورہ بھی کیا کہ اگر جرمنی ہند پر حملہ کرے تو اسے افغانستان اپنی سرزمین سے گزرنے کی راہ دے دے مگر جرمنی کے قدم اکھڑنے لگے تو یہ منصوبہ ناکام رہ گیا۔ اپریل 1916ء میں ایل ایل بی پاس کیا تو راجا صاحب محمود آباد نے یہ پیشکش کی کہ وکالت کی بجائے ان کے سیکریٹری بن جائیں۔ پیشکش بُری نہ تھی، وہ ان کے ساتھ ہوگئے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات بڑھنے لگے تھے بالآخر انہوں نے 1918ء کے مسلم لیگ کنونشن میں جو حکیم اجمل خاں کے گھر پر ہوا تھا اس میں مسلمانوں کی آزادی پر زور دیا۔ اس وقت مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکریٹری بھی تھے۔ 1921ء میں سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ سیاسی بازار پوری طرح گرم ہوچکا تھا۔ آپسی رسہ کشی بھی جاری تھی۔ 1933ء میں سر آغا خان نے مسلم سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ قائداعظم بھی لندن چلے گئے، ہند کے مسلمانوں کا بوجھ انہی کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیت علمائے ہند کے حسین احمد مدنی نے کوششیں شروع کردیں کہ مسلمان کانگریس کے سائے میں رہیں، ان کے ساتھ بھی ملاقاتیں، مراسلے ہوتے رہے۔ 1938ء تک سیاسی گرم بازاری عروج پر پہنچ گئی تھی کہ مصر سے فلسطین کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اور یہ کانفرنس میں ہند کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے چلے گئے۔ واپسی میں لندن رکے۔ وہیں چوہدری رحمت علی سے ملاقات ہوئی جو پاکستان نامی الگ مملکت کے بارے میں رائے عامہ ہموار کررہے تھے۔ چوہدری صاحب کے بعد وہ انڈر سیکریٹری برائے ہندوستان سے ملے اور مسلم اکثریتی علاقے کا نقشہ دکھا کر مطالبہ کیا کہ تقسیم ملک کردیا جائے۔ 1940ء تک تقسیم ہند کی جدوجہد واضح ہوگئی۔ پھر پاکستان بھی بن گیا۔ 6 جنوری 1948ء کو سردار پٹیل نے لکھنو کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''پاکستان بنانے والا اسی شہر کا باشندہ تھا۔ بھگوان کی دیا سے وہ چلا گیا ہے۔ ہم بہت خوش ہیں۔'' اس ایک جملے سے ہندوؤں کی ان سے نفرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں ان کی کتاب Pathway of Pakistan کو پسند نہیں کیا گیا۔ آزادی کے اس سپاہی کا نام چوہدری خلیق الزماں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہر خیال

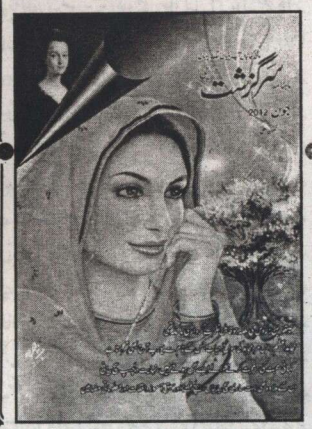

رانا محمد سجاد کا خط نواں شہر، مظفر گڑھ سے ''اصول پرست چودھری نصیر احمد عرف لارڈ ملہی سے پہلی بار تعارف ہوا۔ سوچ رہا ہوں کہ کیسے لوگ تھے جو اپنے دل میں خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتے تھے اور آج کل کے اسکینڈلز پڑھ کر شرم محسوس ہوتی ہے۔ شہر خیال کا دروازہ کھٹکھٹایا تو بھٹی صاحب نے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ خالد کبیر صاحب، پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، انشاء اللہ مایوسیوں کی یہ سیاہ رات جلد ہی ختم ہوجائے گی (آمین) اعجاز حسین ستھار صاحب شاید جلدی میں تھے کہ شہر خیال میں نہیں رکے۔ بہرحال تبصرہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا۔ افتخار احمد سمن کا تبصرہ اچھا لیکن مختصر تھا۔ سعید احمد چانڈیو بھی بھرپور تبصرہ کیا کریں نا۔ جویریہ قاضی صاحبہ، میرا خیال ہے کہ ادارہ عشق نا کام نمبر کے بعد، عشق کامیاب نمبر بھی نکالے۔ آخر روشن پہلو بھی تو دیکھنا چاہیے (عشق کامیاب کا نتیجہ شادی اور بچے، اس لیے خیال مسترد) راجا ثاقب نواز، آپ نے خوب کہی، دیپک راگ پاپ سنگر کے حوالے سے۔ حکیم سید محمد رضا، آپ پہلی مرتبہ حاضری دے رہے ہیں۔ آپ کا تبصرہ کافی پسند آیا۔ آپ کی سچ بیانی دیکھتے ہیں کب تک سامنے آتی ہے۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ملک جاوید محمد خان، شرمین عبید کے حوالے سے آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا معذرت کے ساتھ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ منظر علی خان بھی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ آئے۔ صحابہ کے جسد خاکی کے حوالے سے آپ نے ذکر کیا، کیا اس کی ویڈیو موجود ہے کہیں؟ (یوٹیوب پر ہے) احمد خان توحیدی ان قمری پیس سوٹ پہننے والوں نے اس ملک کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ لیا ہے۔ پرانے شماروں کے حوالے سے ہمیں بھی یہ خواہش ہے، شاید مل جائیں۔ خالد یوسفی، ارے یہ کیا ابھی ہم نے پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ آپ نے تبصرہ ختم کردیا۔ معراج الدین صاحب، اللہ تعالیٰ آپ کو حصولِ علم میں کامیاب کرے۔ ناصر حسین رند کا دلچسپ تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ ابرام مصر کی دیواروں پر بنی تصویری پیش گوئیاں اس پر کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی؟ باقی رہا 2012ء تو انشاء اللہ یہ سال اسرائیل جیسی ناپاک ریاست کے خاتمے کا سال ہوگا۔ مہوش رفیق روشنیوں کے شہر سے تشریف لائیں، نیوز کے بارے میں کہا تو ہمارا بھی یہی حال ہے کہ جب بھی بریکنگ نیوز ٹیلی وژن پر ظاہر ہوتی ہے تو دل نامعلوم اندیشوں میں گھر جاتا ہے، نہ جانے خوشی کی نیوز کب دیکھنے کو ملے گی۔ محترم اعجاز حسین ستھار اور ہمارا ذکر تو اس بارے میں ادارہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے اور آپ نے گزارش نوٹ کرلی تو امید ہے اسے پورا بھی کریں گے اور حاضری دیتی رہیں گی۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ مختصر لیکن اچھا لگا۔ طاہر الدین بیگ، انشاء اللہ آپ دعا کیجیے اللہ ہمیں نیک حکمران عطا فرمائے، محمد اشفاق کی رائے پر عمل ضرور کیجیے، اگر الیکشن نمبر ہے تو واقعی الیکشن لگنا چاہیے۔ مجاہد اعظم نورالدین زنگی اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب، کوئی خاص نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی صلاح الدین ایوبی کی سوانح حیات میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ درجات عطا فرمائے، آمین۔ مریم کے خان لرزیدہ یورپ خوبصورت تحریر تھی، بہت پسند آئی۔ پیرس کے بارے میں کسی تحریر کا انتظار رہے گا (پیرس پر مضمون آچکا ہے) قاتل ہیرو از مختار

آزاد، برطانیہ کی عدالتی تاریخ پر ایک دھبا ہے۔ نہ جانے جج اور جیوری کو ان سے کیا دشمنی تھی کہ بے گناہ انسان کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ عقل مند، پولیس کی کارکردگی پر مبنی تحریر تھی۔ ڈان نے اس ناکارہ پولیس کو کتنا چوکس اور باصلاحیت بنا دیا، وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ایماندار سربراہ تھا۔ کاش ہماری پولیس کو بھی ایسے سربراہ مل جائیں۔ شارے کی دلچسپ کہانی جواں ہمت اسٹیون نے کس طرح ڈھائی ماہ سمندر کی ہولناکیوں کا سامنا کیا، وجہ صرف ہمت تھی، اگر وہ نہ ہوتی تو شاید پہلے یا دوسرے ہفتے ہی وہ سمندر کا حصہ بن چکا ہوتا۔ کیتھرین روسی ملکہ کی زندگی کے چند گوشوں کا تذکرہ۔ وجہ صرف احساس محرومی تھا جس نے طاقت حاصل کرنے پر اُکسایا اور اس طاقت کے حصول کے لیے کتنی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ فلمی الف لیلہ، باری تعالیٰ آفاقی صاحب کو صحت کلی عطا کرے۔''

منظر علی خاں کا نامہ خلوص، لاہور سے ''جون کا سرگزشت پیش نظر ہے۔ مجاہد اعظم کے عنوان سے سلطان نورالدین زنگی کے حالات پر مبنی تاریخی تحریر عمدہ ہے۔ لرزیدہ یورپ مریم کے خان کی تحقیقی اور دلچسپ کاوش ہے۔ آرین نسل، زرد قوم، سامی النسل اقوام کے بارے میں تیسری اور چوتھی صدی عیسوی کی ہسٹری پر مبنی تحریر اچھی ہے مگر تشنگی پھر بھی برقرار رہی ہے۔ ارضی بساط پر تمام اقوام اور نسلی جائزے کی بنیادوں پر ایک جامع تحریر اس بات کی متقاضی ہے کہ نسل انسانی کے بارے میں جامع جائزہ لیا جائے کہ آج سے تیس پینتیس ہزار سال پہلے یورپ میں موجود ایڈ رتھال انسان کیسے ختم ہوئے۔ بہرحال یہ واضح بات ہے کہ ارتقا کے قانون کے مطابق طاقتور اقوام کمزور اقوام کو دبوچ لیتی ہیں اور تدریجاً ان کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے پھر کوئی اور بالادست قوم آکر اس غلبہ پانے والی قوم کو بھی تباہ و برباد کردیتی ہے۔ مجتار آزاد کے قاتل ہیرو پر جرم تھوپنے کے بعد بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اسے پھانسی پر لٹکا دینے کا واقعہ پڑھا، بہت افسوس ہوا۔ عقل مند کے عنوان سے سید احتشام کی تحریر خوب تھی۔ جواں ہمت، اکیلا سمندر میں زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کی کہانی یقین اور عزم کی کہانی ہے۔ سچ ہے کہ موت کا وقت معین ہے، پہلے نہیں آسکتی۔ زندگی حیلے سے اور موت بہانے سے اپنا راستہ بنا ہی لیتی ہیں۔ جرمن یا رشین شہزادی کیتھرین کے حالات ہماری مروجہ تہذیب کے مطابق نہیں۔ یورپین طرزِ معاشرت میں ایسے معاشقوں پر مبنی داستان پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ کا اپنا رنگ ہے۔ پُراسرار بندے غیر یقینی اور غیر حتمی ناپختہ اندھیروں پر مبنی اندھیروں کی دنیا ہے۔ شہریوں کا شہر ملبورن آسٹریلیا کے متعلق معلومات افزا اسفرنامہ ہے۔ مگر زیادہ تفصیلی مواد نہیں ہے۔ جاذب احتشام کی تحریر ڈنک افریقی معاشرے پر مبنی کہانی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اپنے معاشرے سے کٹ جانے اور دوسری اقوام کی غلط پیروی سے نتائج بے راہ روی کی صورت میں نکلتے ہیں بھنور چال غیرت مند عورت کی کہانی ہے۔ پختون معاشرے میں عزت پر جان قربان کردینے کی بہترین مثال ہے۔ کاشف زبیر کا تحریر کردہ سراب متواتر چکر دینے میں معروف ہے۔ سچ بیانیوں میں کہانی ایک محبت کی، بے حد پسند آئی۔ جاگیردارانہ نظام معاشرت میں بھی کچھ انسان دوست لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایثار و قربانی کی بہترین مثال ہوتے ہیں اور جن کا کردار اعلیٰ ترین انسانی اقدار سے ہوتا ہے۔''

شوکت رحمٰن خٹک کا اظہاریہ، پشاور سے ''بیماری، بڑھاپا اور بھنگدستی، تینوں یکجا ہو کر انسان کو ختم کردیتی ہیں۔ اللہ سب کی حالت پر رحم فرمائیں (آمین) اداکار گل حمید جیسے بڑے اداکار کو جو آزادی سے قبل کا سپر اسٹار تھا، اسے خراجِ تحسین پہنچا سکیں)

بشیر نام وپتے کا خط جس میں چچا کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے ''سرورق اچھا تھا، خطوط بھی کے پسند آئے۔ اس دفعہ خطوط کی محفل کافی مزیدار رہی۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی صاحب نے اپنے خط میں اتنے زیادہ توالوں کے نام لکھے، بہت اچھا لگا اور بہت حیرت بھی ہوئی۔ اس دفعہ سدرہ بانو کا خلوص نامہ سخت دکھی کرگیا۔ پیارے کراچی کے لیے بہت سی دعائیں۔ اب ذرا بات کروں گی، ممی کے کہانی نامے پر۔ سب سے پہلے راگ کی آگ پڑھی، بہت مزہ آیا۔ کافی الگ سی کہانی تھی۔ شہید مرتے نہیں، بھی پڑھی، کافی محنت اور جذبے کے ساتھ اس سچائی کو لکھا گیا ہے، بہت اچھا لگا۔ ایول آج کل معاشرے میں جو کچھ ہے اور ہو رہا ہے اس کی عکاسی کررہی تھی۔ مقدر کی بات بھی پسند آئی۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ ایک بات آپ سے کہنی تھی کہ جنوری کا سرگزشت نہیں مل سکا تھا۔ بہت تلاش کیا پر نہ مل سکا۔ کیا میں آپ کے دفتر سے منگوا سکتی ہوں؟ ضرور بتایئے گا۔'' (ہمارے سرکولیشن سیکشن سے رابطہ کرو، فون نمبر پرچے میں موجود ہے)

سدرہ بانو ناگوری کی کراچی سے پُرخلوص آمد ''سرگزشت کا شمارہ 26 تاریخ کو مل گیا تھا لیکن مصروفیات کی بنا پر 4 جون کو خط لکھ رہی ہوں، آغاز ہمیشہ کی طرح انکل کے اداریے سے کیا، مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کا عذاب بڑھتا ہی جارہا ہے، جب روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کرنے والوں کو روٹی کی بجائے فاقے، کپڑے کی بجائے کفن اور مکان کی بجائے قبر ملنے لگے تو پھر گھٹ گھٹ کر مرنے کی بجائے کیا باقی رہ جاتا ہے۔ پچھلے دنوں مزارِ قائد جانے کا موقع ملا، روشنیوں سے جگمگ کرتی طویل راہداری کو عبور کرکے مزار کے اندر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مزار اندر سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے، جب اس عظیم رہنما کے مزار کو بجلی سے محروم رکھا جاسکتا ہے تو پھر ہم عوام آواز بلند کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ شہر خیال کے ان تمام ساتھیوں کا شکریہ کہ جنہوں نے میرے پچھلے خط کو پذیرائی بخشی، دل کے پھپھولے پھوٹ جائیں تو آرام سا آجاتا ہے اس طرح شہر خیال کے باسیوں سے کراچی کا رکھ شیئر کرکے ایک سکون سا ہوا، سنا تھا کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور غم بانٹنے سے کم ہوتے ہیں، سو دکھ ذرا کم ہوئے (خوش رہیے، اللہ ہم سب کو ہمیشہ اسی طرح ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھے، آمین) اس دفعہ سراب اچھی رہی مگر انکل ذرا کہانی کا ٹمپو تیز کیجئے اور ایمن کو زیادہ سے زیادہ فوکس کیجئے کہ بارودی جیکٹ میں اس کا کیا حال ہے؟ انکل آفاقی کی قلمی الف لیلہ بھی دھیان سے پڑھی، پُرانی تصویریں دیکھ کر حیران ہوگئی کہ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے، مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے۔ بھاٹی دروازے سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کا تذکرہ خوب تھا۔ انکل کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ قلمی دنیا کا چلتا پھرا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ آپ اپنے دماغ سے کیا کیا کام لے سکتے ہیں۔ جوان ہمت انسانی صبر و برداشت اور خواہش زندگی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ہر سطر پر دل دھڑ کتا رہا کہ کب کیا ہوگا؟ ثابت ہوا کہ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ عائشہ جو یجو پُراسرار بندے لے کر آئیں اور حیران کرگئیں۔ واقعی اس کائنات میں ایسا کچھ ہے جو کبھی کبھار ظہور پذیر ہو کر انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے اور انسان کہہ اُٹھتا ہے، ہیں یہ کیا؟ قاتل ہیرو کا نام سن کر ذرا سا چونکے تھے مگر جوں جوں پڑھتے گئے، یہ راز کھلتا گیا کہ ایک ذہین، مخلص اور ماہر علوم فلسفہ کو قاتل بنا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور اس کی لاش کو جنگل میں گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ کیتھرین ابن کبیر نے روسی ملکہ کے شب و روز کا ذکرِ خاص بیان کیا، ملکہ کیتھرین نے عقل سے کام لے کر روس کے تخت کو فتح کرلیا مگر اس کے مزاج کی طرح پل پل بدلتے عاشقوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ کہانی ایک محبت کی، محبت کی یہ انوکھی کہانی آج کی محبتوں سے بالکل مختلف تھی۔ بے غرض، بے لوث اور ایسی سچی محبت کی مثال ملنا بے حد مشکل ہے مگر نواز شاہ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی محبتوں کو زندہ رکھنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ دعائے بد میں ڈاکٹر فرحان اگر مسیحا جیسے مقدس پیشے کی آڑ میں کسی کا دل دکھایا جائے تو بددعا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ایک بددعا نے آپ کا سب کچھ چھین لیا، کاش کہ آپ ایسا نہ کرتے۔ آس کے جگنو، فراز علی نے دولت کو ٹھکرا کر ہر نعمت حاصل کرلی مگر شائلہ کی ہوس اسے لے ڈوبی اور ایک عبرت ناک انجام نے اس کا قصہ تمام کیا، باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ انکل، ایک بات تو بتائیں کہ میری رائٹنگ کیسی ہے؟'' (بہت خوبصورت)

☒ **اعجاز حسین سٹھار** کا مراسلہ، نور پور تھل سے ''پر چاوقت پر مل گیا ہے اس لیے ہم نے بھی اس کا پوسٹ مارٹم شروع کردیا ہے۔ عشق ناکام نمبر تاخیر کا شکار ہو رہا ہے۔ اشتہار پڑھ کر تجسس عروج پر پہنچ جاتا ہے اور ایک ماہ کا انتظار بڑھ جاتا ہے۔ اب پٹاری کا منہ کھول دیں ورنہ جتنی دیر ہوگی، ہماری توقعات اتنی ہی بڑھ جائیں گی پھر ہزاروں پڑھنے والوں کو مطمئن کرنا کہاں آسان ہوگا (درست فرمایا، یہی مشکل آڑے آرہی تھی۔ انشاء اللہ یہ نمبر اگلے ماہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا) اصول پرست کے چودھری نصیر احمد ہماری سرزمین اور وطن کے رہنے والے تھے۔ اتنی ایمانداری، حب الوطنی اور دردمندی رکھنے والا ہمارے قریب رہا، دماغ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ مجاہد اعظم میں نورالدین زنگی سے متعلق تفصیل سے پڑھا، علما سے بھی یہ سنتے آئے ہیں۔ مجھے عین جوانی میں پہلی بار حج کی سعادت نصیب ہوئی (ماشاء اللہ) تو مدینہ المنورہ میں طویل مدت سے مقیم ایک پاکستانی نے مسجد نبوی سے جنوب کی طرف درمیان میں گلی چھوڑ کر ایک قدیم طرز تعمیر رکھنے والا مکان دکھایا تھا جس میں غیر معمولی سائز کا بڑا گڑھا بھی تھا، یہ وہی گڑھا تھا جس میں سیسہ پگھلوا کر حجرہ اطہر کے چاروں طرف بھروا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا مکان تھا اسی میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا بچپن گزرا تھا، چند سال بعد دوبارہ جانا ہوا تو دونوں مکان گرا دیے گئے تھے اور سنگ مرمر سے صحن برابر کردیا گیا۔ کتنی دہائیاں گزر چکی ہیں لیکن مجھے مکانوں کا اندرونی نقشہ مکمل یاد ہے اور اس سعادت پر فخر بھی ہے۔ دوسری کئی زیارات ہیں جو مسجد کی توسیع کے وقت ختم کردی گئیں، اب کوئی بتانے والا نہیں ہے۔ قلمی الف لیلہ بڑے جوش و جذبے سے پڑھنا شروع کی لیکن محفل جم نہ سکی اس بار ٹوٹکوں سے کام لیا گیا ہے۔ لگتا ہے آفاقی بھائی مکمل صحت یاب نہیں ہوئے۔ اللہ انہیں صحت کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے تاکہ یہ رونقیں محفلیں اور دلچسپیاں قائم رہیں، آمین۔ پُراسرار بندے میں ماورائے عقل واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اپنے ملک میں کتنے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں، یہاں لوگوں میں یہ بُری عادت ہے کہ مرچ مسالا شامل کردیتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقت بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھی اور سنی جاتی ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ بھنور جال کی رانی نے دل خوش کردیا ہے۔ اگر پریشانی اور مصیبت میں ہوشمندی سے کام لیا جائے تو حسبِ خواہش نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ سراب حسبِ روایت تجسس، ہیجان اور روانی لیے ہوئے ہے۔ یہ سلسلہ اتنا دراز ہونے کے باوجود کاشف زبیر کی گرفت حیران کن حد تک ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سچ بیانیوں میں کہانی ایک محبت کی میں نواز شاہ کا کردار خلافِ فطرت ہے، اسے صاحبہ کے صاف انکار کے بعد زخمی درندہ بن جانا چاہیے تھا، وہ تمام اختیارات بھی رکھتا تھا لیکن اس کے سینے میں واقعی محبت بھرا دل تھا، پھول کو ٹہنی سے توڑنا گوارا نہ کیا اور ہضم نہ ہونے والی فطرت کا مظاہرہ کیا۔ تجربہ کے کرداروں کا رویہ کم از کم مجھے پسند نہیں آیا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھیے اور سوچیے کہ یہ کہاں مناسب ہے، خلافِ توقع نتائج بھی بھگتنے پڑ سکتے ہیں۔ آخری شرط دلچسپ ہونے کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ لانے والی کہانی ہے۔ دعائے بد میں ڈاکٹروں کی ایک بے حسی کا پہلو اُجاگر کیا گیا ہے جو مریض ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، وہ زندگی ہارنے سے بچ جائے تو مقروض ضرور ہو جاتا ہے اور ٹیسٹوں کے نام پر یوں کھال کھینچتے ہیں کہ بے بسی میں زندگی ہار دینے کو دل چاہتا ہے۔ دیہاتوں میں سرکاری اسپتالوں کا اس سے بھی بُرا حال ہے۔ ہم یہ دعا کبھی نہیں مانگیں گے کہ ڈاکٹر فرحان جیسا انجام ہو۔ البتہ دل میں انسانیت کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونے کی دعا ضرور مانگیں گے۔ جھانسا کی خیراں کیسے، سادہ اور گھریلو عورت کا بہروپ بھر کر مداری کا تماشا دکھا گئی اسے اپنے انجام کی خبر نہیں ہے۔ وہ ایک کھلونا ہے کبھی اسے توڑ کر کوڑے دان میں پھینک دیا جائے گا۔ جنس میں باپ کے دعوے دار نے کس آسانی سے ہتھیار پھینک دیے۔ عقل تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ ماں کتنی محبت اور قربانی کا دعویٰ کرے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ ثابت قدم رہے گی۔ عورت ذات زمانے کی مشکلات کا سامنا نہیں کرسکتی۔ حامد علی بھی جان چھڑانے کے چکر میں ہوگا۔ مجھے بچے کے مستقبل کا سوچ کر فکر مندی ہو رہی ہے۔ روزی تو اللہ

دیتا ہے لیکن معاشرے میں حیثیت کا تعین لوگوں نے کرنا ہوتا ہے، اسی بات سے دل میں ہول اُٹھ رہے ہیں۔ منزل جذبات نگاری اور منظر کشی کی اضافی خوبی کے ساتھ لکھی گئی ہے لیکن واقعات کی تلخی اپنی جگہ موجود ہے۔ عبدالرحیم کا اتنے سال پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا، کتنے صدموں اور محرومیوں کو جنم دینے کا موجب بنا ورنہ حالات کو سنبھالا جاسکتا تھا۔ دیر آید سہی لیکن اس کا آنا اب بھی خوشگوار جھونکا ہے۔ اب تمام زیادتیوں کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ آس کے جگنو کی شمائلہ ثابت قدم تھی، خود برباد ہوگئی لیکن بے قصور فراز کی زندگی کی رنگینیاں بھی چھین لے گئی۔ اس کا دنیا سے یوں دل اچاٹ ہوا کہ شادی نہ کی۔ جہاں تک ثمین کا تعلق ہے وہ حق بجانب تھی۔ ظاہری حالات نے دل میں نفرت بھر دی، اسے ہم محبت کی آخری اسٹیج بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی صدمہ دوری کا سبب بنا۔ ایم اے خالق بھٹی مسند صدارت پر موجود ہیں۔ مبارک باد قبول کریں۔ خالد کبیر، جویریہ قاضی، راجا ثاقب نواز، حکیم سید محمد رضا شاہ، ملک جاوید محمد خان سرکانی، ناصر حسین رند، طاہرالدین بیگ اور رانا محمد سجاد کے تبصرے پڑھنے کے قابل ہیں۔''

☒ **طاہرالدین بیگ** کا میرپور خاص سے تبصرہ ''بہت شاندار اور جاندار اداریہ، کمال کردیا آپ نے، کیا خوب نقشہ بنایا ہے گویا سمندر کو کوزے میں بند کردیا۔ بہت خوب بھئی، بہت اچھے۔ آپ بیتیوں سے شروع کرتے ہیں، ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ بیتیاں کمال کی ہیں۔ کہانی محبت کی سطر سطر رنگ بدلتی تحریر جس طرح آگے بڑھی اور جس طرح ختم کی گئی، دل نے چاہا کہ سرگزشت کی ٹیم سے لپٹ جائیں مگر...... (مگر کیا جناب، ہم آپ کے گلے لگ جاتے ہیں۔ ویسے بھی رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے گلے لگایا جیسے ہم سب کو گلے لگایا) اس لیے ڈھیر ساری دعائیں تمام ٹیم کو۔ آخری شرط بھی کیا خوب شرط ہے۔ نہلے پہ دہلا، جناب مونچھ لینے گئے تھے اور لٹ گئے۔ ایک انتہائی خوب صورت تحریر تھی۔ دعائے بد اور جھانسا دو ڈاکٹر صاحبان کی تحریریں معاشرتی اور سبق آموز تھیں۔ خاص طور پر زبیدہ کی بددعا۔ مجاہد اعظم ڈاکٹر ساجد صاحب کی ایک عمدہ تحریر، نورالدین زنگی کی کہانی اصل میں ایسے ہی لوگوں کے کردار مسلمان حکمرانوں کی عزت اور توقیر بلند ہوتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے کردار و گفتار اور اخلاق سے دوسری قوموں کے سامنے مسلمانوں کا کردار بلند ہوتا ہے ورنہ تو حکمران آج کے بھی مسلمان ہیں...... لرزیدہ یورپ، قاتل ہیرو اور کیتھرین، یہ سب تعریفی کہانیاں ہیں اور سب الگ الگ اور جدا جدا۔ ان تحریروں کو پڑھ کر آپ کو بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کو ملے گا۔ اس مرتبہ سرگزشت نے کمال کی کہانیاں تلاش کرکے اپنے پڑھنے والوں کے لیے پیش کی ہیں۔ ہماری طرف سے ادارہ سرگزشت مبارک باد کا مستحق ہے (شکریہ، اللہ آپ کو خوش رکھے) اب ذکر کاشف زبیر صاحب کی سنسنی خیز اور سحر انگیز تحریر سراب کا۔ یہ کہانی شروع دن ہی سے اپنے پڑھنے والوں کو حصار میں لیے ہوئے ہے۔ آپ یقین جانیے یہ کہانی ماہنامہ سرگزشت کی خاصے کی چیز ہے۔''

☒ **احمد خان توحیدی**، کراچی سے رقم طراز ہیں ''شمارہ جون 18 مئی کو ملا۔ معراج رسول صاحب کی اکتاہٹ، کراچی میں قتل و غارت، مسافر کوچ جان نہ پہچان، دوستی نہ دشمنی، 11 زندگیاں چھین کر منتظر عورتوں کو بیوہ، بچوں کو یتیم کردیا۔ اصول پرست بدو ملہی دوستوں کا جانا پہچانا گاؤں لارڈ ملہی باعزت خاندان سب لارڈ ملہی کہتے ہیں۔ چوہدری غلام حیدر، چوہدری نصیر احمد، نام کسی نے نہ بتایا۔ عشق ناکام نمبر، ساتھیوں نے صبر کی تلقین کی۔ گھر والوں نے تین شادیاں خود کرادیں۔ 12 بچوں سمیت ماشاء اللہ 16 افراد کی بابرکت فیملی۔ شرعی حد پوری کرنے کے لیے چوتھی شادی کی حسرت زندگی بھر کا کامیاب عشق، ناکام عشق سامنے تو آئے (ماشاء اللہ توحید صاحب ماشاء اللہ۔ ویسے ہمیں ان تینوں خواتین کو بھی داد دینی پڑے گی جو خیر و خوبی کے ساتھ رہ رہی ہیں) محفل خطوط، ایم اے خالق بھٹی تبصرہ گڈ، کرسی صدارت مبارک۔ خالد کبیر اچھا تبصرہ باہر سے کیا لائے ہمارے لیے؟ سعید احمد چاند، جائز کام ہونے پر کنڈا، پھندا کی نوبت نہ آئے۔ نیک نیت انسپکٹرز کو کون برداشت کرتا ہے؟ جاوید محمد خان، پچھ اللہ آپ کے بھائی کو صحت کاملہ عطا فرمائیں۔ اپنا نام مختصر کریں۔ رنگ بھی کالا دل بھی کالے۔ ساری دال کالی کالی۔ رانا سجاد، بورے والا۔ مختصر تبصرہ رہ جانے والوں کا بھی حق ہے۔ سراب واقعی کتابی شکل ہونی چاہیے۔ اعجاز سٹھار، راجا ثاقب، سدرہ ناگوری، طاہر بیگ، ناصر رند، منظر لاہور، رضا شاہ، جویریہ قاضی، اچھے تبصرے۔ قلمی الف لیلہ اللہ آفاقی صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائیں (آمین) غالباً صحت کی وجہ سے صفحات کم ہیں۔ بھاٹی گیٹ کی گلیاں طویل عرصہ کوفت۔ واقعی بہت خوبصورت، اسپیشلی دیکھنے جاتا ہوں۔ دوسری قلمی کہانیاں آپ کی تحریر کے متبادل نہیں ہوسکتیں۔ سچ بیانیوں میں کہانی محبت کی، کاش سب وڈیرے نواز شاہ جیسا پُرخلوص دل رکھتے۔ تجربہ، رمیز اور نائمہ غلط روش، افروز سے فیصل کی شادی، اچھی بات۔ آخری شرط، کلن نے اچھی اداکاری شرط میں لگی 30 ہزار رقم کی ساتھ شادی بھی کرلی ہوگی۔ دعائے بد، اللہ فراخ حلال روزی دے کر انسان کو شکر کا موقع دیتے ہیں، مقدس پیشے کی آڑ میں گناہوں پر پردہ ناشکری کا انجام یہی ہوتا ہے۔ آئینہ، کھا گئے چوٹ منظر امام۔ ذہن میں ابتدا ہی سے لڑکی کی خوبصورتی کا خاکہ تھا، انجام دوستی اچھی بات۔ جھانسا جدید سائنسی دور میں فراڈ کے بھی جدید طریقے رائج ہوگئے۔ جنس، خواجہ سرا بھی اللہ کی مخلوق عورت کے بطن سے ہی جنم لیتے ہیں۔ تیسری جنس کو اب قانون بھی تسلیم کرتا ہے۔ آس کے جگنو، جمال چاچا کو شادی شریف خاندان میں ہم عمر سے کرنی چاہیے تھی۔ ثمین کے والدین کو بغیر تفتیش ایسا نہ کرنا تھا۔ فراز کو نیک نیتی کا اچھا صلہ ملا۔ شریف نیک لڑکی سے شادی ضرور کرنی چاہیے۔ شائلہ جیسے فراڈی کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔''

☒ **سعید احمد چاند**، کراچی سے لکھتے ہیں ''معراج رسول صاحب کا اداریہ حالاتِ حاضرہ کے مطابق اہل اقتدار کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ آج تک جتنے بھی قتل ہوئے، موبائل فون چھینے گئے، ان کے مجرم آج تک نہیں پکڑے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر یہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس بھی آجائے تو وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی ناکام ہوجائے گی۔ میرے خیال میں جتنے بھی جرائم ہورہے ہیں ان کی وجہ بے روزگاری ہے، لوڈشیڈنگ بھی بے روزگاری کی ایک وجہ ہے۔ جب کاروبار ہی نہ ہوں گے تو نوکریاں کہاں سے ملیں گی؟ خیر اس پر کہاں تک شور مچائیں کہ حکمرانوں کے تو کانوں پر جوں رینگنے سے رہی۔ حکمرانوں کو اپنے پورے پانچ سال پورے کرنے کی فکر ہے۔ یہاں یہ حالت ہے کہ گھر والوں کو یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ جو آدمی کام سے جارہا ہے، وہ واپس بھی آئے گا یا نہیں۔ آئے دن مذہبی جماعتیں بھی ایک دوسری جماعت کے بندوں کو مارتی رہتی ہیں۔ مگر قاتل کوئی نہیں پکڑا جاتا۔ مشرف صاحب کے خلاف لال مسجد کے واقعے کو لوگوں نے کتنا ایشیو بنالیا تھا۔ مگر جب لیاری میں پولیس آپریشن ہوا تو اربابِ اختیار کچھ دھواں دھار تقریریں کرکے خاموش ہوگئے۔ یہاں تو خمینی جیسا کوئی آئے جو بولے کہ ہمارے پاس جیل نہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کو فوراً شوٹ کردے۔ دس بیس ہزار آج مریں گے تو سب ٹھیک ہوجائیں گے۔ آخر سنگاپور اور ہانگ کانگ کے لوگ اپنے ملک کے قوانین کا احترام کررہے ہیں یا نہیں۔ میں ایک جہازی آدمی ہوں، میرا قریباً ہر ملک میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ وہاں کے طور طریقوں کا بھی مجھے علم ہے، یک صفحی سرگزشت میں چودھری نصیر احمد عرف لارڈ ملہی کی داستان پڑھی۔ کاش ہمارے سیاست داں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ ہم اے خالق بھٹی صاحب، دہلی کے بازار سیتارام کے ایک محلے بلبلی خانے کے ایک مختصر سا قبرستان ہے اس میں شہزادی چاند بی بی کا مزار ہے جس پر پرندے بیٹھے رہتے ہیں۔ خالد کبیر صاحب، جاوید اختر کے والد جاں نثار اختر نے بھی اپنے زمانے میں اچھا نام کمایا ہے۔ ان کی والدہ صفیہ بھی اچھی رائٹر تھیں۔ تان سین کے بارے میں اتنا تو معلوم ہے کہ ان کی قبر جھانسی کے قریب گوالیار میں ہے۔ باقی کچھ روشنی ماضی کی بھارتی فلم بیجو باورا میں بھی ملتی ہیں۔ جس میں تان سین کا کردار سریندر نے کیا تھا۔ ایم اے خالق بھٹی، خالد کبیر، اعجاز حسین سٹھار، افتخار احمد گھمن، جویریہ قاضی، حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ، احمد خان توحیدی، مہوش رفیق، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، منظر علی خاں، ناصر حسین رند، طاہر الدین بیگ، رانا محمد سجاد، محمد اشفاق سرائے عالمگیر کے تبصرے پسند آئے۔ جو کہانیاں پسند آئیں، ڈاکٹر ساجد امجد کا مجاہد اعظم، آفاقی صاحب فلمی الف لیلہ۔ آفاقی صاحب نے ماضی کا لاہور لکھ کر ہمیں ماضی میں پہنچادیا۔ اشعر علی سید کی کہانی ایک محبت کی، ڈاکٹر فرحان کی دعائے بد، فیصل اختر کا تجربہ، عمران قریشی کی جنس، عبدالرحیم کی منزل، فراز علی، نیو یارک کے آس کے جگنو، کاشف زبیر کا سراب اچھا جارہا ہے۔ بیت بازی میں حکیم سید محمد رضا شاہ، زاہد بنگش، نواز بٹ، مرزا ہادی بیگ، انعم رفیق، سلطان فتح علی خاں، گلگت، خالد یوسفی، تنویر رفیق، تحسین فاروقی احمد پور سیال کے اچھے لگے۔ دل تو چاہتا تھا پورے ڈائجسٹ کو پڑھ لوں مگر نیند کی دیوی اجازت نہیں دے رہی۔ شہر خیال کی بیوٹی کوئن ڈاکٹر روبی اس دفعہ شہر خیال سے غیر حاضر ہیں۔ ڈاکٹر روبی اب لوٹ بھی آؤ، کیا قارئین کی کوئی بات ناگوار گزری ہے؟''

☒ **فاروق انجم ساحلی**، لاہور سے لکھتے ہیں ''مئی کا سرگزشت خاصا بھرپور تھا۔ اس وقت تک کی ارسال کردہ تحریروں میں عراق کی سیاحت، اٹلی کا ڈکٹیٹر، جدید تخلیق، بھگوتی ڈکیت، گریٹ کا شیطان، خودفریبی، ترجمہ سی بی گلفورڈ۔ ان میں سے کچھ دیکھ کر نکال لیں۔'' (آپ سرگزشت کے مزاج سے ہم آہنگ تحریریں ہی ارسال کیا کریں)

☒ **راجا ثاقب نواز ثاقب** کی رتی ممی ساہیوال سے آمد'' انشائیہ میں معراج رسول جی بھینسوں کے وسیع باڑے میں تن تنہا بین بجا رہے ہیں۔ چودھری نصیر عرف لارڈ ملہی جیسے خاندانی سیاست داں نہ جانے کہاں کھو گئے؟ محفل آدھی ملاقات میں ایم اے خالق بھٹی ہمارے جمہوری صدر اور خالد کبیر وزیر اعظم ٹھہرے۔ سرگزشت فین کلب کے دیگر ساتھیوں میں افتخار احمد گھمن، سعید احمد چاند، سید محمد رضا، احمد خان توحیدی، معراج الدین، رانا محمد سجاد اور مہوش رفیق نمایاں رہے۔ سلطان نورالدین زنگی، مجاہد اعظم نے دل کے تاروں کو چھولیا۔ مختار آزاد نے قاتل ہیرو میں برطانوی عدالتی انصاف کے بخیے اُدھیڑ دیے۔ جواں ہمت میں نئے دور کے سند باد اسٹیون کیلاہن کی ہمت جواں مردی کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ کیتھرین نے معاشقے لڑانے میں سب کو مات دے دی مگر دل کا دورہ اسے مات دے گیا۔ فلمی الف لیلہ اب کی بار قدرے مختصر رہی، وجہ شاید آفاقی صاحب کا بستر علالت پر ہونا ہے۔ آفاقی صاحب اگر ہوسکے تو فلم اور ٹی وی کے مشہور اداکار ابراہیم نفیس مرحوم جیسے نفیس انسان کے بارے میں ضرور لکھیے گا۔ پُراسرار بندے نے سرگزشت پُراسرار نمبر کی یاد تازہ کردی۔ شہریوں کا شہر میں میٹھے آموں سے ہاتھ دھو لینے کے بعد کینگروز کے دیس کی خوب سیر کی۔ اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ ڈنک میں ٹیٹو کا ماضی تاحیات اس کا پیچھا کرتا رہے گا۔ صوبۂ سرحد کی آزادی کی گمنام رانی نے بھنور جال توڑ دیا۔ سراب کے اختتام پر سویرا کی گمشدگی کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ٹائٹل سچ بیتی، کہانی ایک محبت کی میں صاحبہ کو اس کا حقیقی ریمبو کمال شاہ، نواز شاہ کی قربانی کی بدولت مل گیا۔ تجربہ میں محترم رقیب فیصل کو شاندار کردار ادا کرنے پر نائمہ کی فوٹو کاپی افروز انعام میں دی گئی۔ آخری شرط میں ''مونچھیں ہوں تو کلن بھائی جیسی، ورنہ نہ ہوں'' دعائے بد کو بلاشبہ اسٹوری آف دی سرگزشت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مصنف ڈاکٹر فرحان نے کس قدر خوبصورتی سے اپنا پیغام معاشرے تک پہنچایا ہے۔ آئینہ کے انجام کا بلاشبہ پہلے سے ہی اندازہ تھا۔ جھانسا میں خیراں اور اس کا فریبی ٹولہ تو بنارسی ٹھگوں کو بھی مات دے گیا۔ جنس میں میرے نزدیک طاہرہ کے دوسرے شوہر نے صریحاً گھاٹے کا سودا کیا۔ عبدالرحیم نے دیر ہی سے سہی مگر اپنی منزل ...... خوش گوار طریقے سے پالی۔ آس کے جگنو میں بلاشبہ شائلہ اپنے صحیح انجام کو پہنچی۔ مگر ایک زیادتی فراز کے ساتھ ثمین اور اس کے گھر والوں نے بھی کی۔''

☒ **مہوش رفیق** نے کراچی سے لکھا ہے'' شہر خیال میں جون میں سب سے پہلے اپنے آپ کو تلاش کیا اور آخر میں ہم نظر آ ہی گئے، خوشی ہوئی

کہ ہمارا لیٹر آپ کو ٹائم پر مل گیا۔ سب سے پہلے معراج انکل کو پڑھا، واقعی مہنگائی اور بے روزگاری نے تو انسان کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے اربابِ اختیار خاموش ہیں، کیوں؟ سیاسی پارٹیوں کو آپس میں الزام تراشیوں سے فرصت نہیں ہے تو عوام کے مسائل ان کو کیسے نظر آئیں گے؟ اب آتے ہیں شہر خیال کی طرف۔ کرسی صدارت پر اس دفعہ ایم اے خالق بھٹی کو براجمان پایا۔ ان کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ کی طرح انہیں تبصرہ لکھنے میں کافی مہارت حاصل ہے۔ جناب ہماری غیر حاضری کا تو کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ خیر...... خالد کبیر صاحب، آپ کے خیالات سے متفق ہوں، بہت زیادہ۔ آج کل میڈیا پر نوجوان نسل کو کیا سکھایا جارہا ہے، صرف اور صرف جرائم۔ اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ محمد طیب، افتخار احمد گھمن، سعید احمد چاند، جویریہ قاضی، مدیحہ خان اینڈ ماریہ خان کو خوش آمدید۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، حکیم سید محمد رضا شاہ، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، منظر علی خان، دلدار احمد چٹھہ، احمد خان توحیدی، خالد یوسفی، معراج الدین، ناصر حسین رند، طاہر الدین بیگ، سدرہ بانو ناگوری، محمد اشفاق رائے عالمگیر، رانا محمد سجاد پر تو خصوصی توجہ ہیں، بھئی تھوڑا تبصرہ کرنے کا فن ہمیں بھی سکھا دیجیے۔ سب کے تبصرے جاندار تھے، سب کو سلام اور مبارک باد۔ عذرا رسول صاحبہ، 13 مئی کو میں صادق آباد گئی تھی، گھومنے کی غرض سے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ صادق آباد تحصیل رحیم یار خان کا ایک قصبہ ہے، وہاں پر بھونگ مسجد دیکھی، یقین مانیں اتنی حسین مسجد ہے، اندر سونے سے بہترین اور نفیس کام کیا گیا ہے۔ آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ سرگزشت میں تاریخی مسجد بھونگ کے بارے میں تفصیلی مضمون شائع کریں (اس علاقے کے رائٹر توجہ دیں) کہانی ایک محبت کی بہت زبردست لگی۔ محبت کرنے والوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ میرے خیال سے نمبرون یعنی سرگزشت میں سرورق کی کہانی دعائے بد ہونی چاہیے تھی۔ کاش ڈاکٹر فرحان احمد نے زبیدہ کے بیٹے کو چیک کرلیا ہوتا۔ زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ اس کے گھر میں ہر کسی کے لیے انصاف ہے۔ تجربہ، فیصل اختر کی بیکار کہانی تھی۔ آخری شرط میں کلن بھائی کی مونچھیں دیکھنے کا اشتیاق ہوگیا۔ آخری شرط ایک سبق آموز کہانی تھی۔ جھانسا میں خیراں کے گروہ نے کیا بہترین دماغ پایا تھا مگر ڈاکٹر نور احمد نے بہت جلدی اعتبار کرلیا، حیرت ہے۔''

☒ **احتشام احسان**، صفدر آباد سے رقم طراز ہیں'' اپریل کے شمارے میں اپنا خط دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی وہاں میں ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ آپ کی بات بالکل سچ ہے کہ میں بے ربط لکھتا ہوں مگر ایک تو وہ خط جلدی جلدی میں لکھا تو کچھ زیادہ ہی بے ربط ہوگیا۔ خیر، آپ سے اتنا پوچھنا تھا کہ میری کہانی آپ کو ملی ہے یا نہیں؟ کیونکہ میں نے وہ کہانی پوسٹ بکس والے ایڈریس پر بھیج دی تھی، بعد میں مارچ کے شمارے میں عبدالعزیز کا خط پڑھا تو سر پیٹ لیا مگر وہ کہانی مجھے ابھی تک نہیں ملی، کیا آپ کو ملی؟ (جی نہیں) جویریہ قاضی کی بات سے میں متفق ہوں کہ پروین شاکر کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا جانا چاہیے۔ امتحان ہورہے تھے سو چند ماہ کے شماروں کا مطالعہ نہیں کیا۔''

☒ **ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی**، برہ زئی، چھچھ سے لکھتے ہیں'' اس ماہ کی سب سے پہلی بات یہ کہ قبلہ بانڈی جیسے دور افتادہ پہاڑی گاؤں جو کہ وادیٔ چھچھ کی انتہائی مشرقی بستی ہے، وہاں حجرہ عارب خان میں گاؤں کے اوّلین مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں نوآموز احباب سخن کے ساتھ ساتھ لالا اقبال خان راہی کوکٹے اور خالد صدیقی حضرو جیسے معروف اور مستند شعرا نے بھی شرکت کی۔ ایسی علمی، ادبی محفلوں کی وجہ سے جہاں قومی زبان کی ترویج کے امکانات ہیں، ساتھ ہی عوام کو مثبت تفریح میسر آنے کے علاوہ زبان کی شائستگی اور تعمیری سوچ بھی پروان چڑھے گی۔ یہ بھی واضح ہو کہ قبلہ بانڈی چھچھ گندھارا تہذیب کا حصہ ہونے کے ساتھ ہزاروں سال پہلے بدھ مذہب کا ایک علمی مرکز بھی رہا ہے جس کے آثار اب بھی موجود ہیں لیکن سرکاری بے حسی اور عوامی کم علمی اور خودغرضی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہے ہیں۔ مجاہد اعظم حضرت نورالدین زنگی بے شک ولی اللہ تھے جنہوں نے میدانِ جہاد میں تلواروں کی چھاؤں تلے رسم شبیری ادا کی۔ یورپی رانی کیتھرین کی داستان آوارگی کے ساتھ مشرقی رانی کی غیرت، حمیت کا کارنامہ پڑھنے کو ملا۔ رانی جیسی ہستیاں قوموں کا سرمایہ ہوتی ہیں اور ضرورت بھی ہے کہ ایسے مصلحت پسند دور میں ایسے غیرت مند لوگوں کے کارناموں کی اشاعت کی جائے۔ دیگر قلم کار بھی حسبِ روایت پورے کروفر کے ساتھ موجود تھے۔ عبدالخالق بھٹی، خالد کبیر، سعید چاند، حکیم محمد رضا شاہ، مہوش رفیق اور رانا سجاد یاد رکھنے کا شکریہ۔ بیت بازی اور علمی آزمائش کے صفحات پر اپنا نام نہ پاکر مایوسی ہوئی۔''

☒ **ڈاکٹر محمود فیضانی**، ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں'' مدت سے ماہنامہ سرگزشت میں فلمی الف لیلہ پڑھ رہا ہوں۔ جون 2012ء کے پرچے میں موجودہ دور کے ڈاکٹروں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ ان خیالات سے پوری طرح متفق ہیں۔ علی سفیان صاحب نے مرض کی نشاندہی تو کی ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں بتایا۔ پہلے میں اپنا مختصر تعارف بھی کرادوں۔ میں 11 دسمبر 1931ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ میرے والد جو ادیب اور شاعر بھی تھے، محکمۂ صحت پنجاب کے دفتر میں ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔ میں چھٹی جماعت میں تھا کہ میری والدہ انتقال کرگئیں۔ ساتویں میں تھا کہ 1945ء میں والد بھی وفات پاگئے۔ 1949ء میں میٹرک کیا اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور، پرنسپل کے دفتر میں کلرک متعین ہوا۔ 1966ء میں اسی کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ چند برس پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطور ڈاکٹر کام کیا۔ 1968ء کے آخر میں وزارتِ صحت سعودی عرب کے تحت ملازم ہوا۔ بیس برس مکہ مکرمہ میں ملازمت کی اور وہاں سے بطور سینئر میڈیکل آفیسر ریٹائر ہوا۔ اکیس سال سے ایبٹ آباد میں پریکٹس کررہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔غریبوں کے ڈاکٹر کے طور پر کام کرتا ہوں اور لائبریری قائم کر رکھی ہے جو اس شہر کی سب سے ثروت مند لائبریری ہے۔تین اشخاص یہاں تحقیق کر کے ایم فل کر چکے ہیں۔آمدن برسر مطلب، جب میں ڈاکٹر بنا تو اس وقت ڈاکٹری پیشے نے کاروبار کی حیثیت اختیار نہ کی تھی،اب یہ بھی کاروباری خطوط پر چلایا جا رہا ہے۔جس پر شرم آتی ہے۔"

☒ **طاہرہ گلزار** کی آمد، پشاور سے "آداب انکل اور شہر خیال کے دوستو، کیسے ہیں آپ سب لوگ۔آفاقی صاحب کی اچھی صحت کا سن کر دل بہت خوش ہوا۔ملک کے حالات کا کیا رونا، لوڈ شیڈنگ تو کہیں پہ دھماکے، پاکستان کا کون سا شہر یا کوچہ ہے جو پر سکون ہو؟ پاکستان اس 14 اگست کو 65 سال کا ہو جائے گا۔کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سوائے 1962ء سے لے کر 1969ء تک کے دور میں پاکستان گوڈو گوڈو چلنے کے بجائے ڈگمگاتے قدموں سے چلنے لگا تھا مگر لوگوں کو یہ بھی منظور نہ تھا۔اب آتی ہوں شہر خیال کی طرف جہاں ایم اے خالق بھٹی صاحب صدارت کی کرسی پہ بیٹھے بڑے پُر جوش انداز میں تبصرہ کر رہے تھے۔بھائی، آپ نے صحیح کہا ہے کہ ہم میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ہر بندہ یہی چاہتا ہے کہ بس میں رہوں، دوسروں کے ساتھ جو ہو چاہے ہوتا رہے۔کاش کہ ہم میں، میں چھوڑ کے تو ہی تو شروع کریں۔تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔شکریہ خالد کبیر صاحب، میرا تبصرہ پسند کرنے کا۔خالد بھائی، ہمارے ملک کے جوان چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، بہت باصلاحیت ہے۔لیکن کوئی ان کو آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ہمارے ملک میں آپ اتنی بے روزگاری ہوگئی ہے کہ کلاس فور کے ملازمین بھی جاب حاصل کرنے کے لیے پچاس ہزار سے دو لاکھ تک رشوت دینے پر مجبور ہیں اور تعلیم دیکھ لو تو بی اے اور ایم اے پاس ہوتے ہیں۔سعید احمد چاند، آپ نے میرا تبصرہ پسند کیا ہے، شکریہ۔حکیم سید محمد رضا شاہ، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔میرا نام طاہرہ گل نواز نہیں، طاہرہ گلزار ہے اور میرے نام کا یہ دوسرا حصہ میری والدہ کا نام ہے۔مجھے فخر ہے اپنے والد صاحب پہ کہ ہم پر کبھی بھائیوں کو فوقیت نہیں دی۔محمد جاوید خان سرکانی درانی صاحب، میں نے آپ سے پہلے بھی پوچھا تھا کہ سرکانی درانی کے بارے میں کچھ بتائیں۔شکریہ مہوش بہن تبصرہ پسند کرنے کا۔بھائی معراج الدین، آپ پشاور میں کہاں رہتے ہیں؟ میری رہائش تو F.C.W میں ہے۔کیا آپ فضل حق اسکول اینڈ کالج میں پڑھے ہو یا باچا خان یونیورسٹی میں؟ ایم اے خالق بھٹی، خالد کبیر، اعجاز حسین سٹھار، سعید احمد چاند، جویریہ قاضی، راجا ثاقب نواز ثاقب، حکیم سید محمد رضا شاہ، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، منظر علی، احمد خان توحیدی، ناصر حسین رند اور رانا محمد سجاد، ان کے تبصرے بہت زبردست اور معیاری تھے۔اشعاروں میں حکیم سید محمد رضا شاہ، مرزا ہادی بیگ، رانا حبیب الرحمٰن، راجا ثاقب نواز ثاقب، حسین ارشاد، سعید احمد چاند اور نصرت جاوید کے اشعار بہت اچھے اور معیاری تھے۔پہلی کہانی پڑھی، کہانی ایک محبت کی، بہت اچھی تھی۔محبت وقت کی اور زمانے کی محتاج نہیں۔سچی محبت تو ہوتی ہے قربانی کا نام اور میں سلام کرتی ہوں نواز شاہ جیسے بندے کو، واقعی محبت کو سر بلند رکھا ہے۔"

☒ **خالد یوسف**، لیہ سے لکھتے ہیں "اداریے میں معراج رسول صاحب کا قلم سوچ کے نئے در وا کرتا نظر آیا، صاحب بات کہنے کی ہے کہ ہماری قوم کو جو بھی درد لاحق ہیں وہ کچھ ایسے بھی لا دوا نہیں ہیں، بس خلوصِ نیت، ہمت، محنت اور دیانت سے کچھ کر گزرنے کا جذبہ قیادت میں پیدا ہونا ضروری ہے۔سو صورتِ حال یہی بنتی ہے کہ قافلے بے شک دلدلوں میں جا ٹھہرے، رہنما پھر بھی رہنما ٹھہرے۔غلطی پھر ہماری کہ غلط لوگوں کو اقتدار سونپا جو چھرا بغیر دھار کے تھے۔محض بیانات، بیانات، بیانات! عوام بے شک اندھیروں میں رہیں یا دہشت گردی کا شکار ہوں جو ہر وقت چکا چوند روشنی میں رہیں انہیں بھلا اس سے کیا واسطہ؟ قلمی الف لیلہ اس بار بھی لاہور کے تذکرے پر ختم ہوئی۔اس شہر بے مثال کی ہر ادا نرالی ہے۔اور پُرانے لاہور کے قصے اور یادیں ہمیں بہت متاثر کرتی ہیں سو اس بار ظاہر لاہوری صاحب کی یادداشتیں آفاقی صاحب کی معرفت پڑھ کر لطف آیا۔آفاقی صاحب علالت کے سبب اس بار غالب کا شعر غلط درج کر گئے۔پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار۔اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔آگے مضمون میں بھی ایک غلطی کر گئے کہ اس شعر کو غالب سے منسوب کر دیا حالانکہ یہ غزل استاد ذوق کی ہے۔لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے۔اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے۔دیوانِ ذوق میں درج اس غزل کا ایک اور شعر قابلِ غور ہے۔دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ۔تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔خیر یہاں مقصود حوالہ جات کی اصلاح ہے ورنہ آفاقی صاحب کی علمی حیثیت، مرتبہ اور شعر دانی ہم سے کوسوں میل آگے ہے کیونکہ ان ایسے نادرِ روزگار خال خال تو کیا بالکل نظر نہیں آتے۔اللہ انہیں صحت و تندرستی دے کہ ہم سرگزشت کا یہ گوشہ سدا آباد دیکھیں، آمین۔شہر خیال تیری رونقیں دائم آباد، تیرے کوچوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو۔سبھی دوستوں کے نامے غور سے پڑھے اور مستفید ہوئے۔سب کی خدمت میں عاجزانہ سلام۔سچ بیانیاں اس بار ساری قابلِ توجہ تھیں۔لگتا تھا کہ انتخاب میں محنت کی گئی ہے۔یہی حال بیت بازی کا نظر آیا کہ کہنا پڑا، ایں آفتاب ہمہ خانہ است۔سمندری شکار اور سفر کی داستانیں مجھے بے حد مرغوب ہیں اسی لیے طارق عزیز خان کی جواں ہمت نے توجہ کھینچ لی اور یقین مانیے، بے حد مزہ آیا۔باقی مضامین بھی خوب تھے۔عشق ناکام نمبر، ہائے ہائے ہائے، اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے، جب بھی اشتہار پڑھا نہ جانے کیوں اپنا ناکام عشق یاد آ جاتا ہے۔بس اب اور نہ تڑپایئے، اعلان کیجیے کہ یہ قاتل نمبر کب آ رہا ہے تاکہ ہم بھی اپنے لختِ لختِ جگر کو بروقت سنبھال سکیں۔"

☒ **رانا حبیب الرحمٰن** کی گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے تشریف آوری "امید ہے کہ قارئین، مصنفین اور ادارہ سب بخیریت ہوں گے۔سب سے پہلے پچھلے ماہ تبصرہ نہ لکھنے کے لیے معذرت خواہ ہوں جس کی وجہ عنا دجیل میں ٹارچ سیلوں میں بند اور وہاں کاغذ اور پنسل نہ ملنے کی صورت میں سرگزشت پڑھ کر تبصرہ نہ لکھ سکے، رسالہ سرگزشت خرید کر سب سے پہلے اصول پرست پڑھی اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا، اس کے بعد شہر خیال میں پہنچ کر ایم اے خالق بھٹی کو کرسی پر موجود پایا۔خالق صاحب مبارک ہو اور تبصرہ پسند کرنے پر شکریہ۔امید ہے آئندہ بھی یاد رکھیں گے۔خالد کبیر لاہور والے، لوڈ شیڈنگ اور مہنگائی نے پاکستانیوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اور نوجوانوں کے کارنامے عوام کو دکھانے والی بات پر ہم پوری طرح متفق ہیں۔کچھ ہنرمندوں اور طالب علموں نے مل کر دنیا میں ہاتھ سے بنا ہوا سب سے بڑا قرآن پاک کا نسخہ بنایا ہے۔افغانستان کے دارالحکومت کابل میں حکیم ناصر خسر ثقافتی مرکز میں اسی قرآنی نسخے کو سرِ عام نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔52 سالہ صابر یعقوب حسینی جو فنِ خطاطی میں 27 سال کا تجربہ رکھتے ہیں، اپنے 10 شاگردوں کی ٹیم کے ساتھ مل کر پانچ سال کی مدت میں یہ نسخہ تیار کیا ہے۔اس قرآنی نسخے کی لمبائی تقریباً 8 فٹ اور چوڑائی تقریباً 5 فٹ ہے جبکہ اس کا وزن 130 کلوگرام ہے۔اعجاز حسین سٹھار صاحب شہیدوں کو مردہ کہنا بھی گناہ ہے۔قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ شہیدوں کو مردہ مت سمجھو، شہید کبھی نہیں مرتے۔مدیحہ خان، ماریہ خان، مدیحہ خان کو ہماری طرف سے مبارک باد اور خوش آمدید۔سعید احمد چاند صاحب، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔بھئی آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا ہے لہٰذا ہر بار شرکت کا کہہ رہے ہیں۔احمد خان توحیدی صاحب، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، ویسے اتنے اچھے تبصرے تو میرے نہیں ہوتے اور باقی رہی بات پسند کرنے کی تو یہ آپ سب دوستوں کی کرم نوازی ہے۔معراج الدین، ناصر حسین رند، محمد اشفاق، وحیدر کے تبصرے بھی اچھے ہیں۔مہوش رفیق صاحبہ، اس دفعہ پھر چھا گئی ہیں، ویل ڈن۔رانا محمد سجاد صاحب، آپ کی شکایت تو ایک حد تک ٹھیک ہے مگر بات یہ ہے کہ اس وقت سیدھے کہانیوں کی طرف بڑھ جاتے تھے، شہر خیال کا بالکل دھیان نہ تھا۔پھر دوسرے نمبر پر حالات واقعات نے ساتھ نہ دیا پھر سونے پہ سہاگا عرصہ پانچ سال کی جیل میں پابندی، اس کے بعد اب میں کون سا 60 سال کا ہوں، میری عمر اس وقت صرف 25 سال ہے۔اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔سب سے پہلے لرزیدہ یورپ پڑھی۔اٹیلا ہیرو محسوس ہوا اور اٹیلا کی پیش قدمی نے ملکہ میریا اور شاہ روم کے وزیر آکٹس کے ہوش اڑا دیے تھے۔اور اولڈو کو بیوی بنانے کی خواہش پوری کرتے ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔کہتے ہیں ہر کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر ناکامی کے پیچھے بھی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔آخرکار اولڈو بھی اپنے انجام کو پہنچی۔اس کے بعد اپنی پسندیدہ کہانی سراب پڑھی۔جواں ہمت پڑھ کر عقل فہم، عزم و حوصلہ ملتا ہے جس سے ہم اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ملکہ کیتھرین ابن کبیر کی پڑھ کر مغربی کہانی محسوس ہوئی۔شہریوں کا شہر، یہاں بجلی بھی چلی جائے تو حکومت ہرجانہ ادا کرتی ہے، کاش ہمارا ملک پاکستان بھی اسی طرح کا ہو جائے، آمین۔دعائے بد میں یہی کہا گیا ہے کہ کسی کی بھی بددعا نہ لیں اور انسان کو دوسرے انسان کا نقصان نہ ہو۔کہانی محبت کی، تجربہ، آئینہ، ڈنک مزے دار تھیں۔قلمی الف لیلہ کوئی خاص نہ تھی۔بیت بازی میں ہر دفعہ حصہ ضرور لیتا ہوں ہر دفعہ ہر ماہ شعر کا جواب شعر میں دیتا ہوں۔اس کے بعد علمی آزمائش بھی ایک دلچسپ سلسلہ ہے۔سب سے زیادہ شہریوں کا شہر پسند آئی۔آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قیدی کو نجات عطا فرمائے، آمین۔"

تاخیر سے موصول ہونے خطوط: وقار احمد، احسن رضی، کراچی۔محمد جلیل، لاہور۔زبیر احمد، ملتان۔رفعت حسن، چنیوٹ۔عباس علی، جہلم۔سجاد وقار احمد، پشاور۔زریں عباسی، ڈیرا مراد جمالی۔

اِنا للہ وانا الیہ راجعون

کئی سال تک بسترِ علالت پر گزارنے کا دکھ سہتے سہتے بالآخر شہنشاہ غزل نے آخری ہچکی لے لی۔سُر کی دنیا اُجڑ گئی۔پاکستان کا نام اونچا کرنے والے، دنیا کے کونے کونے سے داد وصول کرنے والے، غزل گائیکی جیسی مشکل صنف کو آواز کے جادو سے نیا رنگ دینے والے مہدی حسن کا انتقال معمولی سانحہ نہیں ہے۔ایک عہد کی موت ہے۔انہوں نے کس طرح یہ مقام حاصل کیا، ان کی جہدِ مسلسل کی مکمل داستان سرگزشت اپریل 2011ء میں شائع ہو چکی ہے۔اس سے اندازہ لگائیں کہ انہوں نے یہ مقام کیسے حاصل کیا کہ لتا اور کشور کمار تک ان کے کمرے میں ننگے پیر داخل ہو کر قدموں میں بیٹھتے تھے۔اس سانحہ پر ادارہ شہنشاہ غزل کے پرستاروں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسنِ غالب

ڈاکٹر ساجد امجد

کچھ دیے تیز ہواؤں سے بھی لڑجاتے ہیں، اس کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے۔ فکروفن کی حسین دنیا میں اپنی پہچان ثابت کرنے کے لیے وہ سعی مسلسل میں جتا رہا۔ بالآخر تنقید کے تیروں سے بھرے ترکش والے بھی اقرار کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ بازی اس کی بازی تھی، وہ شکست سے کوسوں دور تھا، بجاطورپر اپنے دور کا غالب تھا۔ اس نے ادب کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور الفاظ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ وہ اقلیم سخن تھا۔

اردو ادب کی ایک عظیم شخصیت کا تذکرۂ خاص

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب۔'' دادا جان نے اپنے پوتے فراز کو غالب کے ایک شعر کی تشریح سمجھاتے ہوئے کہا۔ بچے نے چونک کر دادا کی طرف دیکھا اور کتاب بند کردی۔

''دادا جان! یہ بات آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا کسی کتاب میں لکھی ہے؟''

''بھئی اتنی اہم بات میں اپنی طرف سے کہاں کہوں گا۔ یہ ایک مشہور ادیب کا مشہور جملہ ہے جو میں نے تمہارے سامنے دُہرادیا، تاکہ غالب کی اہمیت تم پر واضح ہوجائے۔''

''دادا جان، اس ادیب کا نام کیا ہے؟''

''بھئی ایک صاحب تھے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا ''محاسنِ کلام غالب'' یہ فقرہ اسی مضمون میں استعمال ہوا تھا۔''

''کمال ہے اس سے پہلے یہ فقرہ میں نے سنا ہی نہیں۔ ہماری کتاب میں بھی نہیں ہے۔''

''ضروری نہیں کہ ہر بات ہر کتاب میں ہو۔ تمہارا مطالعہ ابھی اتنا نہیں کہ یہ جملہ کہیں پڑھا ہوتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے دادا جان لیکن میں نے تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا بھی نام نہیں سنا۔ کبھی اردو کے ٹیچر نے بھی یہ نام نہیں لیا۔''

''ہم مشرقی لوگوں کا یہی شیوہ ہے۔ اپنے محسنوں کو بہت جلد بھول جاتے ہیں کچھ دن پہلے تک تو لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس البیلے ادیب کی قبر کہاں ہے؟''

''ارے واہ! دفن کرکے بھول گئے۔''

''جی ہاں اور دفن بھی کسے کیا۔ جس نے صرف 33 سال کی عمر پائی۔ اس مختصر سی عمر میں اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر بھی گیا۔ ڈاکٹریٹ بھی کیا واپس بھی آیا۔ ایسے مضامین بھی لکھے جنہوں نے ادب کے میدان میں لافانی نقوش چھوڑے۔ اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہا اور ہاں..... شاعری بھی کی۔''

''اس نے یہ سب کچھ صرف 33 سال کی عمر میں کرلیا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جی ہاں، آپ کی طرح نہیں کہ چودہ سال کے ہو گئے اور غالب کے آسان، آسان سے شعر کا مطلب پوچھنے چلے آتے ہیں۔"

"ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری تو بڑے کمال کے آدمی تھے۔"

"جی ہاں، اتنے کمال کے کہ جب حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی تھی تو پرنسپل شپ کے لیے ان کا نام منظور کیا گیا تھا۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔"

"اتنے جوان ادیب۔"

"جی ہاں، جبکہ کیسے کیسے جغادری ادیب اور ماہرینِ تعلیم اس وقت موجود تھے۔"

"داداجان! آپ نے بڑی دلچسپ باتیں بتائیں۔ ان کے بارے میں شروع سے بتایئے کہ وہ کب پیدا ہوئے، ان کے والدین کون تھے، تعلیمی مراحل انہوں نے کیسے طے کیے؟ علمی مشاغل وغیرہ ہر ایک چیز کے بارے میں تفصیل سے بتایئے۔"

"یہ تو وہی بات ہو گئی کہ ان کی سوانح عمری آپ کے سامنے پیش کر دوں۔"

"جی ہاں، تاکہ میں بھی ویسا ہی بننے کی کوشش کروں۔"

"صاحب زادے خیال تو آپ کا بہت اچھا ہے لیکن سوانح عمری کو کتنا ہی مختصر کروں گا خاصا وقت لگے گا اور آپ بہت دیر تک ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والے ہیں نہیں۔"

"عبدالرحمٰن بجنوری کے لیے تو ٹک کر بیٹھنا ہی پڑے گا۔ آپ سنانا شروع کیجیے بلکہ میں قلم کاپی لے کر بیٹھ جاؤں گا خاص خاص باتیں نوٹ بھی کرتا جاؤں گا۔" پوتے کی فرمائش پر دادا نے عبدالرحمٰن بجنوری کی سوانح عمری بیان کرنی شروع کی جو ختم ہوئی تو ایک کہانی بن گئی، سبق آموز اور دل آویز۔

بابر بادشاہ نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے کمر ہمت باندھی۔ کابل سے نکلا اور لاہور وغیرہ کو فتح کرتے ہوئے پانی پت کے میدان میں جا پہنچا۔ سلطان ابراہیم خان لودھی فرماں روائے دہلی کا لشکر جرار اس سے مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ابراہیم کے پاس ایک لاکھ کا لشکر اور شاندار توپ خانہ تھا جبکہ بابر کے ہمراہ صرف بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا لیکن بابر کی فوج اس خوبی اور مہارت سے لڑی کہ ابراہیم لودھی مارا گیا اور اس کا لشکر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بابر فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوا۔

بابر نہایت پُرگو شاعر اور شاندار ادیب تھا۔ عالم و فاضل افراد کی قابلِ ذکر تعداد اس کے اردگرد جمع رہتی تھی۔ رزم ہو یا بزم یہ حضرات اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

وہ یہ عزم لے کر ہندوستان آیا تھا کہ ہندوستان کو دوسرا سمرقند بنا دے گا۔ ہر وقت کے مصاحبین کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ تھی۔ ان ہی میں ایک صاحب قاضی حسن زنجانی بھی تھے۔ یہ زبردست عالم تھے۔ فقہ، تفسیر اور حدیث میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ بڑے اچھے واعظ تھے اور بڑی بات یہ کہ بابر کے پسندیدہ لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جب بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو فتح آگرہ کی طرف روانہ کیا اور خود مقامی ہندو راجاؤں کے خلاف نبرد آزما ہوا جنہوں نے بابر کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

چھوٹے موٹے زمینداروں اور جاگیرداروں کی سرکوبی کے لیے اس نے اپنے مصاحبوں کی زیرِنگرانی چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ کیے۔ قاضی حسن زنجانی کو سیوہارہ کی جانب روانہ کیا۔ یہ قصبہ (سیوہارہ) بجنور کے قریب تھا۔ یہاں کا جاگیردار دینا رائے تھا۔

بابر کی ہیبت اور لشکر کی بہادری، دینا رائے نے مقابلہ ضرور کیا لیکن اسے شکست ہوئی اور یہ قصبہ سلطنت بابری میں شامل ہوا۔ فتح نامہ بابر تک پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا۔ قاضی صاحب کے علم و فضل اور خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بابر نے انہیں عہدہ قضا پر فائز کیا اور پنج ہزاری منصب عطا کیا۔

قاضی زنجانی اپنے تمام متعلقین کو دہلی سے سیوہارہ لے آئے۔ یہی قاضی حسن زنجانی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے جد امجد تھے۔

قاضی حسن زنجانی سیوہارہ میں مقیم ضرور ہو گئے تھے، لیکن دہلی کی یاد ہمیشہ ستاتی رہتی تھی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ دہلی بڑا شہر تھا اور سیوہارہ چھوٹا سا قصبہ۔ وجہ کچھ بھی ہو، قاضی صاحب بہت جلد سیوہارہ سے اُکتا گئے۔ اپنا منصب اپنے بیٹے قاضی عبدالرحمٰن کے سپرد کیا اور خود دہلی تشریف لے گئے۔

ان کے بعد پشت در پشت یہ عہدہ اسی خاندان میں رہا۔ جب شاہوں کی بادشاہت کا دور ختم ہوا۔ نہ قاضی رہے نہ عہدہ قضا تو بھی اس خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ قاضی لکھتے رہے۔ یہ لقب، ایک اعزاز تھا، ایک فخر تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اسی معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک نئی اور چونکا دینے والی قسط وار کہانی

مسافر

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر

لیکن اس داستان کے مسافر کا سفر طویل، سنسنی خیز اور دلچسپ ہے

حساس اور نرم دل کرداروں کا سفاک و سنگ دل حریفوں سے تصادم

رنگین و سنگین واقعات جو نازک جذبوں اور دل گداز لمحوں میں پروان چڑھتے ہیں

ان کے لیے جو اچھی کہانیوں کے رسیا ہیں

سطر سطر اپنی گرفت میں رکھنے والی اس یادگار سلسلے وار کہانی

آخری اترن، تماشائے عشق، مزاج آشنا اور جنت

کے تخلیق کار ناصر ملک کے قلم سے

سسپنس کے تازہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت کروٹیں بدلتا رہا۔ سفر طے ہوتا رہا۔ بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں کا دور رخصت ہوا۔ سیوہارہ میں قاضی خاندان پھلتا پھولتا رہا۔

انگریزوں کا دور آیا تو بادشاہوں کے درباروں میں رہنے والے انگریزوں کی ملازمت میں چلے گئے۔ اس خاندان کے ایک فرد قاضی نورالسلام تھے جنہوں نے انگریزی ملازمت حاصل کی۔ انگریزوں نے انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔

قاضی نورالسلام نہایت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انہیں فارسی سے عشق تھا۔ اردو میں شعر کہتے تھے اور انگریزی سے بہ خوبی واقف تھے۔ انگریزی سے واقف ہونا اس وقت قابلیت کی معراج سمجھا جاتا تھا۔

قاضی نورالسلام کی ملازمت کا انتظام ہوگیا تو ان کی شادی کے لیے لڑکیاں دیکھی جانے لگیں۔ ان دنوں شرفا کے خاندانوں میں یہ رواج عام تھا کہ شادی خاندان میں ہو۔ یہ خاندان اب مختلف شاخوں میں بٹ کر بہت پھیل چکا تھا لیکن یہ بھی ہوا تھا کہ بہت سے لوگ دوسری جگہوں پر منتقل ہو چکے تھے۔ جو لوگ سیوہارہ میں رہ گئے تھے ان میں مولوی ریاض الدین کی شرافت ونجابت کا بڑا تذکرہ تھا۔ انہیں ہر مکتبِ فکر کے لوگ عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مولوی ریاض الدین ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ مزاج میں قناعت اور جلال تھا۔ ساری عمر دنیا سے گریزاں ہی رہے۔

نورالسلام کے لیے لڑکی کی تلاش ہوئی تو مولوی ریاض الدین کی دختر آمنہ خاتون نگاہِ انتخاب میں آئیں۔ ایک ہی خاندان تھا۔ اس رشتے پر کس کو اعتراض ہوسکتا تھا؟ اگر اعتراض تھا تو یہ کہ لڑکا انگریزوں کی ملازمت کرتا ہے لیکن یہ محض اعتراض رہا انکار کا سبب نہ بن سکا۔ آمنہ خاتون بیاہ کر نورالسلام کے گھر آگئیں۔

آمنہ خاتون ایک مذہبی گھرانے کی فرد تھیں۔ یہ مذہبی رنگ ان کی ذاتی زندگی میں جھلکتا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور امورِ خانہ داری میں ماہر۔

نورالسلام کچھ دن سے پریشان تھے۔ ان کے تبادلے کے احکام آگئے تھے اور آمنہ خاتون امید سے تھیں۔ اس موقع پر وہ سیوہارہ سے باہر جانے کی متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ اس تبادلے کو رکوانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے پھر رہے تھے۔ آمنہ خاتون گھر کی سیدھی سادی عورت۔ میاں کی دفتری مصروفیات سے کیا واقف ہوتیں۔ وہ تو اپنے طور پر یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ نادانستگی میں ان سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ ایسی سیدھی خاتون تھیں کہ میاں سے یہ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کس بات پر خفا ہو لیکن جب کئی دن گزر گئے تو ہمت پکڑ ہی لی۔

''میں کئی دن سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی تھی۔''

''میکے جانا چاہتی ہو، فاصلہ کتنا ہے کسی ملازم کو ساتھ لے کر چلی جاتیں۔''

''میرا تو میکہ بھی آپ ہیں اور سسرال بھی آپ ہیں۔ میرے ہونٹوں پر تو کوئی اور بات تھی۔''

''کیا کہنا ہے، کہتی کیوں نہیں ہے؟''

''اب کیا کہوں آپ کے دل کی بات زبان پر آگئی۔ آپ تو مجھ سے اتنے خفا ہیں کہ مجھے میکے بھیجنا چاہتے ہیں۔''

''اللہ کی بندی میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ میں نے تو یونہی اندازے سے کہہ دیا کہ شاید تم میکے جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔''

''پھر کیا بات ہے کتنے دن ہوگئے آپ کے پاس مجھ سے بات تک کرنے کی فرصت نہیں؟''

''دفتر کی مصروفیات ہیں اور کچھ نہیں۔ بار بار بجنور جانا پڑ رہا ہے۔''

''دفتر کی مصروفیات تو پہلے بھی تھیں مگر اب تو مجھے آپ پریشان بھی دکھائی دے رہے ہیں۔''

''بات یہ ہے کہ میرے تبادلے کا حکم آگیا ہے۔ سیوہارہ سے باہر جانا پڑے گا۔ ترقی بھی مل رہی ہے لیکن تم اس حال میں بیٹھی ہو۔ میں کیسے جاسکتا ہوں؟ تبادلہ رکوانے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں بس یہ پریشانی ہے اور کچھ بھی نہیں۔''

''افوہ! میں تو ڈر گئی تھی کہ نادانستگی میں مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔''

''مجھے تو ارمان ہی رہا کہ تم کوئی غلطی کرو اور میں ڈانٹوں۔''

''مذاق کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔'' آمنہ خاتون نے کہا پھر فکرمندی سے کہا۔ ''نوکری پر کوئی آنچ نہ آجائے آپ چلے کیوں نہیں جاتے؟''

''میں تمہارے بغیر تو جانے سے رہا۔ پہلے بچے کی ولادت ہے۔ اپنے شہر اور خاندان والوں کے درمیان ہی اچھی لگے گی۔''

''آپ فی الحال اکیلے چلے جائیں۔ یہاں میری دیکھ بھال کرنے والے بہت ہیں۔''

''سچی بات یہ ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت کروں۔''

''چھوڑیے بھی۔'' آمنہ خاتون نے کہا اور کسی کام میں لگ گئیں لیکن دل سے یہ ملال جاتا رہا کہ میاں ان سے ناراض ہیں۔ قاضی نورالسلام کی کوششیں رنگ لائیں اور تبادلہ رک گیا۔

آمنہ خاتون کے دن پورے ہوئے ولادت کا وقت قریب آیا۔ پہلے بچے کی ولادت تھی، ماں باپ دونوں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ نورالسلام نے ولادت سے کئی دن پہلے چھٹی لے لی تھی۔

خاندان کی عورتوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ قاضی نورالسلام مردانے میں بیٹھے کسی خوش خبری کے منتظر تھے۔ یہ خبر آنے میں دیر نہیں لگی کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ پہلوٹھی کے بیٹے کی خوشی ہی دوسری ہوتی ہے۔ اس خوشی سے نورالسلام دوچار تھے۔ مضطرب تھے کہ کب اندر سے بلاوا آئے اور وہ اپنے نورِ نظر کو دیکھیں۔

مولوی ریاض الدین تشریف لے آئے تھے جنہیں بچے کے کان میں اذان دینی تھی۔ انہوں نے داماد کا ہاتھ پکڑا اور گھر میں نومولود کے پاس پہنچ گئے۔ بچے کے کان میں اذان دی۔

''میاں، اب برخوردار کو گھٹی تم چٹاؤ۔''

''گھٹی بھی آپ ہی چٹائیے۔ آپ کے ہاتھوں کی برکت سے یہ بھی آپ جیسا عالم وفاضل بنے گا۔''

''ہمارا زمانہ گیا صاحب زادے۔ اب انگریزی کا زمانہ ہے تم انگریزی داں ہو تمہارے ہاتھوں کی برکت سے یہ بچہ خوب ترقی کرے گا۔'' قاضی نورالسلام نے بچے کو گھٹی پلائی۔

نومولود کا نام قاضی عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر عبدالرحمٰن بجنوری اور پھر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے نام سے مشہور ہوا۔

پہلے بچے کی ولادت ہوئی تھی اور پھر گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ چھٹی چلے خوب اہتمام سے کیے گئے۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ اس کے بعد ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام حبیب الرحمٰن رکھا گیا۔ اوپر تلے چار بیٹیاں ہوئیں۔ روشن آرا بیگم، ستارہ بیگم، زیب النسا بیگم اور ظفر النسا بیگم۔

عبدالرحمٰن پڑھنے کی عمر کو پہنچے تو والد کا تبادلہ کوئٹہ (بلوچستان) ہوگیا۔ عبدالرحمٰن سیوہارہ سے اس طرح رخصت

> ایسے میں جب بچنے کی کوئی امید نہ تھی سرسید مرحوم شبِ ظلمت میں روشن ستارے کی طرح چمکے اور ترقی کا راستہ نمودار ہوا۔ سپہ سالار کے حکم سے افواجِ اسلام اس شاہراہ پر چلیں اور مولانا (حالی) بہ حیثیت نقیب ان کے ہمراہ ہوئے مگر جو مہم سر کرنی تھی وہ کوئی قدیم الایام کی لڑائی نہ تھی جس میں ان کو اجزخوانی سے ہمراہیوں کا دل بڑھانا ہوتا بلکہ وہ تنازع البقا میں مسلمانوں کی آخری کوشش تھی جس کی نسبت کردیا گیا تھا کہ شکست ہی شکست ہے۔ اس میں لوگوں کو جوش دلا کر توپ اور تفنگ کے مقابلے میں نہ لے جانا تھا جو کہ ایک نہایت آسان کام ہے بلکہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس لڑائی کے لیے تیار کرنا تھا اور اُبھارنا مقصود تھا جس میں قلم تلوار پر حاوی ہے۔

ہوئے کہ پھر انہیں دوبارہ سیوہارہ آنا نصیب نہیں ہوا۔

والد اور والدہ دونوں پرانے خیالات کے تھے لیکن تعلیم کے معاملے میں دونوں نہ صرف تعلیم کے طرفدار تھے بلکہ تعلیمِ نسواں کے بھی حامی تھے لیکن نہایت سختی کے ساتھ اس بات کے قائل تھے کہ ابتدائی تعلیم قرآن پاک اور مذہبی مسائل سے شروع ہونی چاہیے چنانچہ جب عبدالرحمٰن پڑھنے کی عمر کو پہنچے تو ابتدا قرآن پاک کی تعلیم سے ہوئی۔ ایک حافظ صاحب مقرر کیے گئے جو قرات سے واقف تھے۔

مسئلے مسائل کی ابتدائی سمجھ بوجھ کے لیے خود آمنہ خاتون موجود تھیں۔ مولوی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں لہٰذا اتنا تو جانتی ہی تھیں کہ بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دے سکیں۔ انہوں نے یہ فریضہ خود ادا کیا۔ اولاد کی تربیت میں ماں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ خان بہادر صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی لیکن والدہ نے کچھ ایسے خطوط پر تعلیم دینی شروع کی کہ مذہب مزاج کا حصہ بن جائے۔ اس کے بعد جو بھی تعلیم حاصل کرلی جائے اس پر مذہب کا رنگ غالب رہے۔ والد علوم مشرقی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ فارسی سے ذوق رکھتے تھے۔ اردو میں شعر کہتے تھے۔ اپنی مشرقیت کا رس کانوں میں گھولتے رہتے لہٰذا عبدالرحمٰن کی تعلیمی بنیاد میں مشرقیت کا خمیر شامل ہوگیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں ایک سرکاری اسکول میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داخل کر دیا گیا۔ اس وقت تعلیم کے سرچشمے صرف سرکاری اسکول ہی ہوا کرتے تھے جن میں انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

کوئٹہ کے سرکاری اسکول کا معیار بس واجبی سا تھا لیکن گھر میں دو اچھے اساتذہ موجود تھے۔ والدہ اُٹھتے بیٹھتے ادب و آداب سکھاتی رہتی تھیں اور والد جب اپنے بستر پر لیٹتے اور ننھا عبدالرحمٰن ان کے قریب لیٹا ہوتا تو خان بہادر صاحب فارسی کا کوئی شعر پڑھتے پھر اس کا مطلب بیان کرتے۔ شیخ سعدی کی کوئی حکایت سناتے یا پھر انگریزی زبان کے اسرار و رموز سمجھانے لگتے۔

اس توجہ کا اثر یہ ہوا کہ بہت جلد عبدالرحمٰن کا شمار اسکول کے ذہین و طباع لڑکوں میں شمار ہونے لگا۔ نیا شہر تھا جہاں ہم زبان بھی کم ہی تھے لہٰذا باہر نکل کر وقت گنوانے کے بجائے ساری توجہ حصولِ تعلیم پر مرکوز رہی۔

ان کی عمر 17 سال تھی اور 1902ء کا سال تھا جب انہوں نے کوئٹہ ہائی اسکول سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ انہیں اس وقت کے عام سے والدین ملے ہوتے تو میٹرک ہی بہت تھا لیکن نور السلام اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ خان بہادر کا خطاب ملا ہوا تھا۔ تعلیم کی اہمیت سے بھی واقف تھے۔ وسائل بھی مہیا تھے لیکن کوئٹہ کی حد تک یہ وسائل بے کار تھے کیونکہ یہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی جاتی۔ ان دنوں مسلمانوں کی تعلیم کا ایک ہی اہم مرکز تھا اور وہ تھا محمڈن کالج علی گڑھ جہاں مشرق و مغرب کا نہایت حسین سنگم نظر آ رہا تھا۔ خان بہادر شاید بہت پہلے سے سوچے ہوئے تھے کہ عبدالرحمٰن کو پڑھنے کے لیے علی گڑھ بھیجیں گے۔

ماں کی آنکھوں سے اتنی دور چلا جائے۔ ماما نے جوش مارا۔ ”یہ کیسی تعلیم ہے کہ میرا بیٹا میری آنکھوں سے اتنی دور چلا جائے گا۔“

”ہمارے دین میں تو یہ ہے کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے اور تم اسے روک رہی ہو۔“

”میں تعلیم کے خلاف نہیں ہوں بس اتنی دور بھیجنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ کیا یہاں کوئی انتظام نہیں ہو سکتا؟“

”یہاں کوئی ایسا ادارہ ہوتا تو میں کب چاہتا کہ وہ اتنی دور جائے۔ سرسید کا قائم کیا ہوا یہ ادارہ مشرق و مغرب کا سنگم ہے۔ اساتذہ انگریز بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ طالبہ پر مشرقی رنگ بھی چڑھتا ہے اور وہ موجودہ دور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لائق بھی ہو جاتے ہیں۔ تربیت ایسی ہے کہ چھپے ہوئے رنمودار ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھر کے اعلیٰ گھرانوں کے بچوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن وہاں رہے گا تو کسی قابل بن کر نکلے گا۔ چھٹیوں میں تم سے ملنے آتا بھی رہے گا۔ وقت چٹکی بجاتے گزر جاتا ہے، تم کیوں فکر کرتی ہو؟“

خان بہادر صاحب نے بڑی مشکل سے عبدالرحمٰن کی والدہ کو آمادہ کیا اور انہیں لے کر علی گڑھ چلے گئے۔ وہ صاحبِ حیثیت تھے کئی سفارشیں بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ تعلیمی ریکارڈ بھی اچھا تھا لہٰذا داخلے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ والد نے اپنے بیٹے کو کالج والوں کے سپرد کیا اور کوئٹہ واپس چلے گئے۔

علی گڑھ کالج کا علمی دور اس وقت عروج پر تھا۔ عبدالرحمٰن جیسے ذہین طالب علم کے لیے یہ موقع کافی تھا۔ بہترین اساتذہ نصیب ہوئے۔ شبلی نعمانی، مولانا حالی، نواب محسن الملک جیسی ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ذہین طالب علموں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جوہر جو اُن کے اندر موجود تھا دمکنے چمکنے لگا۔ ان کی طبیعت طرح طرح کے راستے تلاش کرنے لگی جن پر چل کر وہ اپنے پوشیدہ جوہر کا اظہار کر سکیں۔ انہوں نے خوب گھوم پھر کر اندازہ کیا کالج میں دو قسم کے طالبہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ایک کھلاڑی دوسرے وہ جو کالج یونین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یونین سے وہ طالبہ وابستہ ہوتے تھے جو تحریر و تقریر میں اور علمی اعتبار سے نمایاں ہوتے تھے۔ یونین کے جلسے برابر ہوتے رہتے تھے جن میں طلبہ اور اساتذہ دوش بدوش شریک ہو کر مختلف موضوعات پر روشنی ڈالتے بسا اوقات باہر کے مقررین بھی مدعو کیے جاتے جن سے ان جلسوں کی شان دوبالا ہو جاتی۔ عبدالرحمٰن نے ان جلسوں کے شان دیکھی تو وہ بھی ان جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ مقررین کو دیکھ کر انہیں بھی شوق ہوا کہ وہ کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے اسٹیج پر پہنچیں۔ انہوں نے اب تک جتنا مطالعہ کیا تھا۔ والد کی طرف سے جتنی ادبی تربیت ہوئی تھی انہوں نے وہ سب جمع کی اور پہلی تقریر لے کر اسٹیج پر پہنچ گئے۔

ایک سیدھا سادہ شرمیلا سا لڑکا جس کو بولتے ہوئے بھی بہت کم دیکھا گیا تھا تقریر کرنے کے لیے آیا تو ساتھیوں کو قدرے تعجب ہوا کہ یہ کیا تقریر کرے گا۔ کئی ہونٹوں پر ہنسی بھی آئی لیکن اس نے بولنا شروع کیا تو ہر طرف سکوت چھا گیا۔ ایک عالم تھا جو علمی نکات اُٹھا رہا تھا۔ وہ بول رہا تھا اور

سب سن رہے تھے۔

”زبان نے انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا ہے۔ عقل کے اظہار کا ذریعہ نطق ہے اور نطق انسانی کا مشرف پیرایہ عقل ہے۔ اتحاد زبان، تن قومی کی روح رواں اور جسم ملی کی جان ہے۔ زبان ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کی اساس قائم ہے۔ زبان ہی وہ معیار ہے جس سے یگانوں اور بے گانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود مذہب تک زبان کا تابع ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ زبان فاتح کی تلوار کی آواز کا نام نہیں ہے۔ فاتح اپنا خطبہ اور سکہ جاری کر سکتا ہے لیکن اپنی زبان نہیں جاری کر سکتا۔ مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کر سکتا ہے لیکن اس کی زبان اختیار نہیں کر سکتا۔ زبان ملک اور ملت کے قلب کی حرکت کی صدا ہوتی ہے۔

پہلی تقریر کے بعد تالیوں کی جو گونج اسے سنائی دی تھی وہ پھر کبھی نہیں تھی۔ وہ جب کسی جلسے میں شریک ہوتا اور تقریر کرتا تو یہ معلوم ہوتا جیسے معلومات کا سمندر ہے جو ٹھاٹیں مار رہا ہے۔

رفتہ رفتہ وہ کالج سے باہر ہونے والی کانفرنسوں میں بھی شریک ہونے لگا۔ انجمن ترقی اردو اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنسوں میں وہ باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا۔ بعد میں تو وہ اپنے مقالے بھی یہاں پڑھنے لگا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے اس کے خصوصی تعلقات قائم ہوئے۔ مولوی عبدالحق اس پر اتنا اعتبار کرتے تھے کہ اس سے انجمن کی ترقی کے لیے مشورے طلب کرتے۔

وہ بی اے کر چکا تھا کہ 1907ء میں اسے سال کے بہترین مقرر کا ایوارڈ کیمبرج اسپیکنگ پرائز ملا۔ یہ انعام اس طالب علم کو ملتا تھا جو اس سال کا بہترین مقرر رہا ہو۔

اس انعام کے حصول نے اس کی شہرت کو پرواز دے دی۔ ساتھیوں اور اساتذہ میں اسے ایسا وقار حاصل ہوا کہ اسی سال اسے یونین کا نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔

جو ایک مرتبہ علی گڑھ کالج آ گیا واپس جانے کو تیار کب ہوتا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد بھی وہ واپس نہیں گیا بلکہ اس نے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ یونین کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں اور ادبی سرگرمیاں بھی۔

وہ قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ کالج میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے سب کچھ ختم کر دیا۔ کالج کی تاریخ میں ایسی اسٹرائیک ہوئی جس کی مثال کالج کی زندگی میں نہیں ملتی۔ اس نے کالج کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ طلبہ اور انتظامیہ کے درمیان اختلاف ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اتنی سنگین شکل اختیار کر لی کہ کچھ عرصے کے لیے کالج کو بند کر دینا پڑا اور پھر بعض طلبہ کو کالج سے نکال دیا گیا۔ عبدالرحمٰن نائب صدر تھا لہٰذا وہ بھی اس کی زد میں آ گیا۔

علی گڑھ میں سالانہ نمائش لگتی تھی۔ یہ نمائش یہاں کی تہذیب کا ایسا جزو بن گئی تھی کہ سب ہی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ کالج کے طلبہ خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ جب تک نمائش لگی رہتی کالج کے طلبہ ٹولیوں کی شکل میں نمائش میں پہنچتے اور شرارتیں کرتے پھرتے۔

کالج کا ایک طالب علم غلام حسین ایک اسٹال کے سامنے کھڑا تھا۔ پہرے پر کھڑے ایک سپاہی نے اسے اسٹال پر رکھی اشیا کے قریب جانے سے روکا۔ اس پر دونوں کے درمیان تکرار ہو گئی۔ غلام حسین کے ہاتھ میں چھڑی تھی اس نے یہ چھڑی سپاہی پر کھینچ ماری۔ سپاہی نے شور مچا کر دوسرے سپاہیوں کو بلا لیا۔ کالج کے طلبہ جو اس وقت نمائش میں موجود تھے جھگڑا دیکھ کر بھاگتے ہوئے آئے۔ دیکھا تو ان کا ایک ساتھی پٹ رہا تھا۔ ان طلبہ نے سپاہیوں کو مارنا شروع کر دیا، یوں پولیس اور طلبہ میں تصادم ہو گیا۔ کچھ دیر میں پولیس افسران آ گئے انہوں نے طرفین کو روکا اور ہنگامہ ختم ہو گیا۔ یہ معاملہ یہیں رہ جاتا۔ میر ولایت حسین جو بورڈنگ ہاؤس کے انچارج تھے انہیں خبر ہو گئی تھی۔ وہ نمائش میں آ کر بپھرے ہوئے طلبہ کو سمجھا بجھا کر واپس لے بھی گئے تھے لیکن انتظام نمائش کے انچارج نے کالج کے پرنسپل مسٹر ارچیبولڈ کو خط لکھ دیا جس میں طلبہ کی ہنگامہ آرائی کی شکایت کی گئی تھی۔ پرنسپل نے یہ خط میر ولایت حسین کو بھیج دیا اور ان سے وضاحت طلب کی کہ اصل معاملے سے آگاہ کریں۔ میر ولایت حسین نے اپنی رائے میں لکھ دیا۔

”بے شک! غلام حسین کی زیادتی تھی۔ اس نے پولیس کے سپاہی کو جو اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا تھا اور جائز طور پر نمائشی اشیا کے قریب جانے سے روکا تھا مارا ہے۔ ہمارے طلبہ عموماً حکم کی خلاف ورزی کیا کرتے ہیں اور قواعد کی پابندی نہیں کرتے، غلام حسین کو سزا ملنی چاہیے۔“

پرنسپل انگریز تھا اور سخت گیر بھی۔ انگریز اساتذہ کے خلاف پہلے بھی اسٹرائیک ہو چکی تھی۔ انگریزوں کے خلاف طلبہ کے دلوں میں سخت غم و غصہ تھا۔ اس واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

پرنسپل نے غلام حسین پر بیس روپے جرمانہ کر دیا تھا۔ طلبہ نے غلام حسین کو بچانے کے لیے ہر طالب علم سے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک پیسہ وصول کر کے جرمانے کی کل رقم پیسوں کی شکل میں رومال میں باندھ کر پرنسپل کی میز پر رکھ دی۔

جرمانہ تو ادا ہو گیا لیکن پرنسپل کا انگریز ہونا ختم نہ ہو سکا۔ اختلافات کی خلیج نہ پاٹی جا سکی۔ طلبہ کا خیال تھا کہ اگر پرنسپل کوئی ہندوستانی ہوتا تو اس کا سلوک غلام حسین کے ساتھ ہمدردانہ ہوتا۔ طلبہ نے اسٹرائیک کر دی اور پرنسپل کو نکالے جانے کے مطالبے ہونے لگے۔ کالج کی عمارت میں روز جلوس نکلتے۔ انگریز گردی اور پرنسپل کے خلاف نعرے بازی ہوتی۔ پرنسپل نے کالج بند کر دیا لیکن طلبہ اب کہاں ماننے والے تھے۔ ہر رکاوٹ عبور کر کے عمارت میں داخل ہو گئے۔ پرنسپل اتنا گھبرا گیا کہ آفس میں تالا ڈلوا دیا۔ طلبہ کا جوش روز بہ روز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

جب حالات مخدوش ہونے لگے تو حکیم اجمل خان اور چند دوسرے ٹرسٹیوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔ عبدالرحمٰن تو یونین کا نائب صدر تھا اس سے بھی بات چیت ہوئی۔ ٹرسٹیوں نے کہا تم اپنے 15 قائم مقام منتخب کر لو۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں اور پرنسپل سے گفتگو کرتے ہیں۔ طلبہ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ انہوں نے یہ عذر کیا کہ ان قائم مقاموں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حکیم صاحب نے ذمہ لیا کہ انہیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

نواب محسن الملک بہادر نے بھی چند طلبہ کو طلب کیا اور کہا کہ ”تم معافی نامہ داخل کر دو۔ یقین رکھو کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تمہارا ذمہ دار ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں استعفیٰ دے دوں گا۔“ طلبہ نے آپس میں مشورے کے بعد ان کا مشورہ قبول کر لیا اور معافی نامہ داخل کرنے پر تیار ہو گئے۔ نواب صاحب کو اطلاع کر دی کہ ہم آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہیں۔

نواب صاحب نے فرمایا کہ میں پرنسپل کے پاس جاتا ہوں اور ملاقات کے لیے ان سے وقت لیے لیتا ہوں۔ نواب صاحب پرنسپل کے پاس گئے اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد فرمایا۔

”میں نے اور دوسرے ٹرسٹیوں نے طلبہ کو یقین دلایا ہے کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ تشریف لے چلیے۔ طلبہ سے ملاقات کیجیے اور ان کا معافی نامہ قبول فرمایئے تاکہ کالج کا ماحول ٹھیک ہو۔“ پرنسپل خوش ہونے کے بجائے برافروختہ ہو گیا۔

”آپ نے یہ کس اختیار سے کہا کہ طلبہ کو نقصان نہیں پہنچے گا؟ میں کوئی معافی قبول نہیں کروں گا۔“

پرنسپل کی طرف سے یہ کورا جواب سن کر نواب محسن الملک کمرے سے باہر نکل آئے اور طلبہ سے کہا ”..... تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔“ یہ اختلاف ٹرسٹیوں اور پرنسپل کے درمیان ہوا خمیازہ اس کا بعض طلبہ کو بھگتنا پڑا۔

ایک دن نہیں گزرا تھا کہ پرنسپل نے سات طلبہ کو کالج سے خارج کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ ان میں عبدالرحمٰن بجنوری کا نام بھی شامل تھا اور وہ یوں پہلے سال امتحان نہ دے سکا۔

ان اخراج شدہ طلبہ نے ملک و قوم کی فقید المثال خدمات انجام دیں۔ انگریز اسٹاف سے جو نفرت ان طلبہ کے دلوں میں بیٹھی تھی اس نے انہیں آگے چل کر حکومت کے خلاف تحریکات میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ ان لوگوں نے انگریزوں کو اُکھاڑ پھینکنے میں اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ عبدالرحمٰن نے اپنے قلم سے اپنے ملک کی ادبی نگارشات کا دفاع کیا۔

غلام حسین سے اس قضیے کا آغاز ہوا تھا۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ سے منسلک ہو گئے، جو کامریڈ انگریزوں کے خلاف تحریک چلا رہا تھا۔ جب محمد علی جوہر گرفتار ہوئے اور ان کا اخبار بند ہوا تو غلام حسین نے اپنا ذاتی اخبار NEW ERA جاری کیا جو انگریزوں کے خلاف شعلے اُگلتا رہا۔ ان نکالے جانے والے طالب علموں میں ایک نام تصدق احمد شرانی کا بھی تھا جنہوں نے آگے چل کر جدوجہدِ آزادی میں حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

سید محمود بھی علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے کیمبرج گئے۔ بار ایٹ لا ہو کر ہندوستان لوٹے اور وکالت شروع کی لیکن انگریزوں سے نفرت غالب آ گئی۔ کانگریس کی تحریکوں میں سرگرم رہے۔ انگریز مخالف تحریکوں میں حصہ لینے کی پاداش میں کئی بار جیل بھی گئے۔

عبدالرحمٰن بجنوری بھی اپنا ایک سال ضائع کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہیں اس اسٹرائیک کی پاداش میں بورڈنگ ہاؤس سے نکال دیا گیا تھا وہ گھر آئے ہوئے تھے کہ انہوں نے ماموں زاد بہن جمیلہ بیگم کو تصویرِ غم بنا دیکھا۔ جمیلہ بیگم کی شادی عم زاد نصیر الدین سے ہوئی تھی۔ شادی کو ایک سال ہوا تھا کہ شوہر کا انتقال ہو گیا۔

عبدالرحمٰن جب بھی اس کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں بسی اُداسی دیکھ کر سہم جاتا۔ سوچنے لگتا کہ اس کم عمری میں وہ کتنے بڑے صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ ہنسنا

بھول گئی ہے۔ گھر میں یوں پھرتی ہے جیسے سب سے لاتعلق ہو۔ کیا اس کے ہونٹوں پر دوبارہ ہنسی نہیں آ سکتی؟ یہی سوچ کر وہ ایک روز اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

”امی جان، میں جمیلہ کی طرف گیا تھا۔ کیا حالت بنا لی ہے اس نے اپنی۔“

”اس پر پہاڑ بھی تو ایسا ٹوٹا ہے۔ اس عمر میں بیوگی کا دکھ کوئی معمولی بات ہے۔“

”مجھے تو بہت ترس آیا اس پر۔“

”ترس تو سب ہی کو آتا ہے مگر کیا کیا جائے؟ پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے۔ اسی رنڈاپے میں کاٹنی پڑے گی۔“

”کیوں کاٹنی پڑے گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ آپ لوگ اس کی شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟“

”بیٹا بیوگی کا داغ ایک مرتبہ لگ چکا ہے اب اسے کون قبول کرے گا۔ قبول کر بھی لیا تو وہ باتیں بنیں گی کہ اللہ کی پناہ۔ بیواؤں کی کوئی شادیاں ہوتی ہیں؟“

”کمال ہے، یہ بات آپ کہہ رہی ہیں۔ ہمارے دین میں تو سختی سے کہا گیا ہے کہ بیوہ کو دوسری شادی پر رضامند کرو۔“

”بیٹا تم نہیں سمجھو گے۔ دین سے دنیا بھاری ہوتی ہے۔ شریفوں میں یہ بہت بُرا سمجھا جاتا ہے کہ بیوہ اپنا دوسرا بر تلاش کرے۔ یہاں تو ایک ہی کے نام پر ساری زندگی کاٹی جاتی ہے۔“

”امی جان، یہ تو ظلم ہے بے چاری جمیلہ پر۔“

”اب تم اسے جو بھی کہہ لو۔ وہ جانے اس کے ماں باپ جانیں، جو بہتر سمجھیں کریں۔“ عبدالرحمٰن اس کے سوا ماں سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چپ چاپ اُٹھ کر آ گیا۔ اس کے ذہن میں مولانا حالی کی نظم ”چپ کی داد“ گھوم رہی تھی جس میں انہوں نے بیوہ عورت کی نہایت مؤثر انداز میں تصویر کشی کی تھی اور یہ ثابت کیا تھا کہ ہندوؤں کے اثر سے مسلمانوں نے بھی یہ طریقہ اپنا لیا ہے کہ بیوہ عورت روتے سسکتے زندگی گزارتی ہے اور طرح طرح کے مفاسد جنم لیتے ہیں جو معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹا تو نہ چاہتے ہوئے بھی جمیلہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے گھر والے بھی عجیب ہیں، نوجوان لڑکی جس کی شادی کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا بیوہ ہو گئی اور وہ اس کی دوسری شادی کے لیے کوشاں نہیں ہیں۔

وہ صبح صبح اُٹھ گیا اور جمیلہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر

سوانحی خاکہ

نام: عبدالرحمٰن (بجنوری ڈاکٹر)
والد: خان بہادر نور الاسلام
والدہ: آمنہ خاتون
وطن: سیوہارہ، ضلع بجنور
تعلیم: بی اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی
درس گاہیں: کوئنہ ہائی اسکول، علی گڑھ کالج، لنکن ان لندن، فائی برٹش یونیورسٹی، جرمنی
سیر و تفریح: ترکی، روم، مصر، اٹلی، یونان، نیوزی لینڈ وغیرہ
ملازمت: وکالت، مراد آباد، مشیر تعلیمات، بھوپال
سن پیدائش: 10 جون 1885ء
سن وفات: 7 نومبر 1918ء

اس نے اپنی ممانی سے جمیلہ کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ یہاں سے بھی اسے وہی جواب ملا جو اس سے پہلے وہ اپنی ماں سے سن چکا تھا۔

”اسے اب کون قبول کرے گا؟ باتیں الگ بنیں گی۔ میری بچی کو اب یونہی زندگی گزارنی ہوگی۔“ وہ سمجھ گیا تھا کہ دکھ سب کو ہے، افسوس سب کر رہے ہیں لیکن رسم و رواج کے قیدی ہیں۔ بیوہ کی شادی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کوئی اسے منحوس سمجھ کر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

اس نے کوششیں جاری رکھیں کہ ممانی کو اس کی شادی پر تیار کر سکے۔ بالآخر انہوں نے ہامی بھر لی۔ انہیں یقین تھا کہ بیوہ سے شادی کون کرے گا؟ اسی لیے انہوں نے یہ ذمے داری اسے سونپ دی۔

”تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔ اگر کوئی اس سے شادی کو تیار ہے تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔“ عبدالرحمٰن کو اپنی کوششیں کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھیں مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس کس کی اصلاح کرے گا۔ اس نے دو تین گھروں میں بات کی لیکن بیوہ کہہ کر رشتہ ٹھکرا دیا گیا۔ اب اس نے دل ہی دل میں جمیلہ سے شادی کے لیے اپنا نام پیش کیا اور ماں کے پاس جا بیٹھا۔

”امی جان، میں اس مظلوم لڑکی جمیلہ سے شادی کرنے کا خواہاں ہوں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا کہا تم نے ذرا پھر سے کہنا..... تم جمیلہ سے شادی کرو گے؟"

"جی امی جان، اس کے دکھ بانٹ لوں گا۔ وہ بے چاری پھر سے زندہ ہو جائے گی۔"

"جانتے نہیں وہ بیوہ ہے۔"

"یہ کیا آپ لوگوں نے بیوہ بیوہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی بیوہ سے شادی کی تھی۔"

"اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں لیکن اتنا جانتی ہوں تمہارا اور جمیلہ کا کوئی جوڑ نہیں۔ میں تمہیں کبھی اجازت نہیں دوں گی۔ یاد رکھو ہم عام سے انسان ہیں پیغمبر یا ولی نہیں۔"

"امی جان، یہ بھی تو سوچیں میرے اس فعل سے اللہ تعالیٰ کتنا خوش ہوگا۔"

"اللہ کی رضا کے اور بہت سے کام ہیں۔ تم ابھی اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ یہ دنیا دکھوں سے بھری ہوئی ہے کس کس کے دکھ بانٹو گے؟"

"جو کر سکتا ہوں وہ تو کر لوں۔"

"بیٹا، اتنا بڑا فیصلہ میں اکیلی نہیں کر سکتی۔ خان بہادر صاحب سے بات کروں گی، وہی تمہیں سمجھائیں گے۔ میں جاہل تو تمہیں سمجھانے سے رہی۔ چار لفظ انگریزی کے پڑھ لیے ہیں۔ اب تمہاری سمجھ میں کس کی بات آئے گی؟"

"امی آپ تو بس یونہی....."

"کہہ جو دیا خان بہادر صاحب سے بات کروں گی۔"

"امی آپ کتنی اچھی ہیں۔ آخر ہیں نا عالمِ دین کی بیٹی۔"

"خوشامد چھوڑو جاؤ اپنا کام کرو، میں بات کرتی ہوں۔" وہ خوشی خوشی وہاں سے اُٹھ گیا۔ اس نے اپنی دانست میں ماں کو رضامند کر لیا تھا۔ برف پگھلنے لگی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ باپ کی طرف سے بھی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ والد تعلیم یافتہ ہیں ان کے خیالات مختلف ہوں گے لیکن خان بہادر کو معلوم ہوا تو گھر میں زلزلہ سا آ گیا۔ انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ جمیلہ کی ماں نے عبدالرحمٰن کو بھڑکایا ہے۔ انہوں نے عبدالرحمٰن سے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جمیلہ سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ عبدالرحمٰن اپنی ضد پر اڑا رہا۔ بالآخر والدین کو جھکنا پڑا۔ عبدالرحمٰن کی شادی جمیلہ بیگم سے ہو گئی۔ عبدالرحمٰن نے جمیلہ بیگم کا انتخاب کر کے عظیم ایثار، شرافت نفس اور انسانیت کا ثبوت دیا۔

خان بہادر اسے تعلیم کی دنیا میں بہت آگے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اس کی شادی کے بھی خلاف تھے لہٰذا جب وہ اپنی شادی کے ایک سال بعد ۱۹۰۹ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر چکا تو خان بہادر نے ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے اپنی آرزو کا تذکرہ کر دیا۔

"عبدالرحمٰن مجھے تو تمہاری ذہانت سے یہ امید تھی کہ تم تعلیم کے میدان میں بہت آگے جاؤ گے۔"

"تو کیا میں نے کہیں کوئی کوتاہی کی ہے، میں نے قانون کی ڈگری حاصل کی ہے۔"

"کیا بس یہی تمہاری معراج ہے؟"

"ابا جان آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے میری بات مان لی ہوتی اور شادی نہ کی ہوتی تو میں تمہیں بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجتا۔"

"ابا جان، شادی پاؤں کی زنجیر نہیں ہوتی۔ آپ کی خواہش اب بھی پوری ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری بیوی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ایک مرتبہ میں نے اس کے لیے ایثار کیا تھا، اب وہ کرے گی۔ آپ کی خواہشات کا احترام بھی تو میرے فرائض میں شامل ہے۔"

نیک بخت بیوی نے خوشی خوشی اجازت دے دی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلا گیا۔ باپ خان بہادر تھا، انگریزوں سے تعلقات تھے۔ لنکن ان جیسی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ یہ یونیورسٹی قانون کی تعلیم کی سب سے اچھی یونیورسٹی شمار ہوتی تھی۔ انگلستان کا ماحول اور پھر یونیورسٹی کا اعلیٰ معیار، وہ جوہر جو اب تک سامنے نہیں آئے تھے، ظاہر ہونے لگے۔ انگریز اساتذہ نے ایک ہندوستانی میں ایسی قابلیت دیکھی تو اس کے گرویدہ ہو گئے۔ کئی اساتذہ ایسے تھے جن سے اس کے ذاتی مراسم بن گئے تھے۔

اس نے لنکن ان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی لیکن پیاس تھی کہ بجھنے میں نہیں آتی تھی۔ اِدھر والد کا اصرار تھا کہ جب انگلستان چلے ہی گئے تو جتنا ہو سکے علمی استفادہ کر کے لوٹو۔ اساتذہ نے بھی مشورہ دیا۔ اس نے ہندوستان میں محسن الملک وغیرہ سے بھی خطوط کے ذریعے مشورے طلب کیے۔ ان سب کی روشنی میں وہ جرمنی چلا گیا۔ اسلامی قانون (فقہ) ماخذ پر جرمن زبان میں مقالہ لکھا۔ اس مقالے پر یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اب وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری تھا۔

مغربی ممالک کے قیام کے دوران اس نے مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا۔ اس سلسلے میں ترکی میں کافی عرصہ قیام کیا۔ ترکوں کے جذبہ حریت کو آنکھوں سے دیکھا، دل سے محسوس کیا۔ ہندوستان کے تناظر میں ان کی جدوجہدِ آزادی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ والد سے اس کا برابر رابطہ رہتا تھا۔ ترکی کے قیام کے دوران اس نے کئی خطوط والد کی خدمت میں روانہ کیے جن میں ترکوں کی جدوجہد، ان کے فوجی نظام اور معاشرتی و معاشی ترقی کو بڑے رشک کے ساتھ بیان کیا۔ یہ خطوط لکھتے وقت اس کے سامنے یقیناً محکوم ہندوستان ہوگا۔ ترکی سے نکل کر اس نے روم، مصر اور اٹلی کی بھی سیر کی۔ ان تمام مقامات کے بارے میں وہ اپنے والد کو برابر لکھتا رہا۔

"امید ہے کہ جو عریضہ یونان کے ساحل سے جہاز پر سے ارسال کر چکا ہوں پہنچا ہوگا۔ جب جہاز برنڈسی پر پہنچا تو چونکہ برنڈسی میں کوئی شے قابلِ دید نہیں ہے قیام کے بغیر ریل پر سوار ہو کر نیپلز پہنچا۔ نیپلز روما کے بعد اطالیہ میں سب سے عمدہ خوب صورت شہر ہے مگر جو چیز سب سے زیادہ مشہور ہے پمپی کے آثار ہیں جو صدیوں بعد اس..... زمانے میں کھود کر نمودار کیے گئے ہیں۔

دو روز قیام..... کر کے تمام ضروری اشیا کو دیکھ کر روم آیا ہوں۔ ایک دن سیر کر چکا ہوں، ایک دو روز اور دیکھ کر یہاں سے وینس جاؤں گا۔ فلارنس کا قصبہ چھوڑ دیا ہے کیونکہ تاخیر کا خیال ہے۔ وینس سے جرمنی اور وہاں سے لندن جاؤں گا۔" ان مقامات کے علاوہ اس نے اسٹینز، زیورخ اور نیوزی لینڈ وغیرہ کی بھی سیاحت کی۔ یہ سفر اس کے لیے بہترین تجربہ ثابت ہو رہے تھے جو آئندہ زندگی میں اس کے کام آنے والے تھے۔

وہ وعدے کے مطابق جرمنی ہوتا ہوا لندن آ گیا۔ اب ہندوستان واپسی کا سوال تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ ہندوستان پہنچ کر وہ معاش کی کون سی صورت اختیار کرے گا۔ اصولاً اسے یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا کیونکہ اس نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ واپس آ کر پیشہ وکالت سے وابستہ ہو سکتا تھا لیکن جب وہ اپنے اندر جھانکتا تھا تو اس پیشے میں اسے کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ وہ فلسفیانہ اور عالمانہ مزاج رکھتا تھا۔ تعلیمی شغل سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر علی گڑھ کالج میں اسے ملازمت مل جائے تو وہ یک سوئی سے علمی کاموں کی طرف راغب ہو جائے.... علی گڑھ سے اسے قلبی لگاؤ تھا۔ اپنی عمر کے بہترین سات سال یہاں گزارے تھے۔ یہاں کے نشیب و فراز دیکھے تھے..... علی گڑھ اس کا دوسرا وطن تھا۔ اب وہ وہیں واپس جانا چاہتا تھا۔ اس نے بہت سوچ کر بیرسٹر سید محمود کو خط لکھا۔

"یہ خط ایک نہایت ضروری امر کے متعلق رقم ہے جس میں تمہاری اور مسٹر تصدق کی امداد کا خواہاں ہوں۔ میرا قصد اور خیال یہ ہے کہ اگر علی گڑھ کالج والے مجھے پروفیسر قانون کی حیثیت سے کالج میں ملازمت دے سکیں تو پریکٹس کا خیال قطعاً ترک کر دوں اور ہندوستان مراجعت پر براہِ راست کالج چلا جاؤں۔ اس ارادے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ میری خاندانی مالی حالت اس قابل نہیں کہ پریکٹس کی ابتدا کرنے کے لیے قلیل سرمایہ بھی میرے پاس ہو جس سے ایک دو سال پریکٹس کے چل جانے کا انتظار کر سکوں۔ دوسرے چاہتا ہوں کہ زندگی کو تصنیف اور تحریر کے مشغلے میں صرف کرنے کی کوشش کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مندرجہ ذیل شرائط پر مسٹر تصدق سے صلاح کر کے سلسلۂ جنبانی کرو۔ ان کے علاوہ باقی معاملات تم پر چھوڑتا ہوں۔

۱۔ میں پریکٹس نہیں کروں گا۔

۲۔ قانون کے علاوہ کوئی مضمون نہیں پڑھاؤں گا۔

۳۔ معلمی کے ماسوا کوئی کام نہیں کروں گا۔

اگر یہ ممکن نہ ہوا تو ہندوستان آنے سے قبل کسی اور جانب رُخ کروں گا۔ ملک خدا تنگ نیست۔"

اس خط کو لکھنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ کچھ ضروری کتابیں خریدنی تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب گیتا نجلی (بہار نغمہ) شائع ہو کر بازار میں آ گئی تھی۔ یورپ کے بڑے بڑے شعرا اس کتاب کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ اسے بھی وہ کتاب خریدنی تھی۔ وہ اس مقررہ بک شاپ پر چلا گیا جہاں سے وہ اکثر کتابیں خریدتا تھا۔ اس نے جیسے ہی دکان میں قدم رکھا دکاندار نے خریداروں سے ازراہِ فخر کہا۔

"یہ ٹیگور کے ہم وطن ہیں۔" یہ سنتے ہی خریداروں نے اسے گھیر لیا۔

"آپ کو اور ہندوستان کو مبارک ہو۔"

کئی لوگ آگے بڑھے اور خود عبدالرحمٰن سے آٹو گراف لے ڈالے کہ ٹیگور سے تو کہاں ملاقات ہوگی اس کا ہم وطن ہی سہی۔ عبدالرحمٰن کو یہ گمان ہونے لگا جیسے یہ کتاب ٹیگور نے نہیں اس نے لکھی ہو۔ اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا خود ہندوستان میں کیا عالم ہوگا۔ لوگ فخر کر رہے ہوں گے ٹیگور جیسا شاعر ان کی خاک سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُٹھا ہے۔ بنگال کا تو عالم ہی دوسرا ہوگا کیونکہ ٹیگور کا تعلق بنگال سے ہے۔

اس نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی اس تاثر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جس کا تصور وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹیگور کی شاعری نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا لیکن اس کا یہ خواب ٹوٹ گیا۔ اس نے یہاں آکر دیکھا کہ عام تعلیم یافتہ حضرات تو ٹیگور کے نام تک سے واقف نہیں۔ خواص سے بات کی تو معلوم ہوا وہ ٹیگور کی خوبیوں کے معترف نہیں منکر ہیں۔ خود بنگال میں بھی ٹیگور کے لیے صدائے مخالفت بلند ہو رہی تھی۔

وہ یورپ کے شعرا کا مطالعہ کر چکا تھا۔ وہاں رہ کر ان سے ملاقاتیں کر چکا تھا۔ اس نے وہاں کے ادب کا بہ غور مطالعہ کیا تھا لیکن یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا کہ یہاں کے ادیب و ناقد احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مشرق و مغرب کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کہاں ہندوستان کی تیرہ خاک کہاں یورپ کی خلد گاہ۔ ٹیگور اور اقبال بڑے شاعر ہو ہی نہیں سکتے۔ ان شاعروں کو فرنگ کا ہم پلہ یا ان سے اعلیٰ قرار دینا سوءِ ادب بلکہ گناہ ہے۔ ہند کی خاک سے کوئی فرزانہ کب اُٹھ سکتا ہے۔

اس طرزِ عمل سے اس کے جذبہ حب الوطنی کو زبردست دھچکا پہنچا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اردو شعرا کا موازنہ انگریزی شعرا سے کر کے یہ ثابت کرے گا کہ ہمارے شعرا کسی بھی طرح انگریزی شعرا سے کم نہیں۔ اس نے سب سے پہلے ٹیگور کی گیتا نجلی پر قلم اُٹھایا۔

اس مضمون میں اس نے ٹیگور کے ادبی شعور اور مذہبی تصورات کا تجزیہ کیا اور اپنے وسیع مطالعے کا ثبوت پیش کیا۔ گیتا نجلی کے تفصیلی مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹیگور کی شاعری روحانی اقدار کی حامل ہے۔ وہ زندگی کی لذت جہاد حیات میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عمل ہی تمام مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔

''روحانی فلسفے کے متعلق اکثر ہندو مفسرین اس مغالطے میں پڑ گئے ہیں کہ ترکِ دنیا..... سے نروان ملتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی روحانیت کا نام آتے ہی ترکِ دنیا کی طرف خیال جاتا ہے۔ ٹیگور کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں۔ ٹیگور کا مذہب جبر یہ نہیں بلکہ قدریہ ہے۔'' اس مضمون میں آگے چل کر عبدالرحمٰن نے لکھا۔

''اگر کوئی شخص گیتا نجلی کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ٹیگور کی تعلیم اعتکاف اور چلہ کشی ہے تو اس سے زیادہ کوئی اور غلطی ممکن نہیں۔ گوشہ نشینی گناہ ہے کیونکہ معرفت الٰہی کام میں ہے آرام میں نہیں۔ جوزن و فرزند اور فرائض زندگی سے بھاگتا ہے وہ خدا سے بھاگتا ہے۔''

عبدالرحمٰن بجنوری نے تاریخ اقوام اور مذاہب عرب اقوام کا تذکرہ کیا اور اس ویران ریگستان کا نقشہ کھینچا جہاں کے لوگ تعلیم و تمدن سے عاری تھے۔ ایک خدا کے بجائے سیکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب عربوں نے ایران فتح کیا اور مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان روابط کے زیرِ اثر ایران میں تصوف کو فروغ ہوا اور شاعری میں اس نے جگہ پائی۔

ٹیگور کی شاعری میں ہندی عناصر موجود ہیں اسی لیے ان کی شاعری وحدت الوجود پر قائم رہی لیکن وہ لسانیت اور چلہ کشی کے قائل نہیں۔ ٹیگور کے فلسفۂ عمل کی تشریح کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ خدا کا جلوہ خانقاہ کی تنگ و تاریک فضا میں دیکھنے کے بجائے کائنات کے دوسرے مظاہر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

''خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تُو کس کی پرستش کر رہا ہے۔ دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں ہے وہ تو وہاں بھی ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے۔ جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے۔ وہ تو ان کے ساتھ دھوپ بارش میں ہے..... زاہدانہ اور فلسفیانہ گوشہ نشینی ایک ابدی قبر ہے۔ آزاد وہ ہیں جو بنی نوع کو ظالمانہ قیود سے آزاد کراتے ہیں۔''

عبدالرحمٰن، ٹیگور کے زبردست مداحوں میں تھا اور گیتا نجلی کو ایک لافانی تصنیف تصور کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ٹیگور کے تمام کلام کا اردو میں ترجمہ ہو جائے۔ اس نے اس کوشش کی پہل خود کی۔ ٹیگور کا تمام کلام جمع کیا اور ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ کچھ حصے کا ترجمہ کیا بھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ شاعرانہ قوت اس میں موجود نہیں، جو اس کام کے لیے درکار ہے۔

اپنی اس خواہش کو اس نے دیوان سنگھ مفتون کے نام ایک خط میں سپردِ قلم کیا۔

''گیتا نجلی کا اردو ترجمہ میرے پاس بھی بہ غرض ریویو آیا تھا۔ میں نے کسی قدر طویل ریویو لکھ دیا ہے اور تعریف کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ٹیگور کے جملہ کلام کو نثر میں ترجمہ کر دے۔ مجھ سے نہیں ہوتا اور ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اتنا ترجمہ جو نظم معریٰ میں شروع شروع

میں کیا تھا وہ بھی مجھے ناپسند ہوا اور اس لیے میں نے چند اشعار کو بچا کر حوالہ آتش کر دیا۔''

☆☆☆

وہ تلاش معاش میں سرگرداں تھا۔ علم کا سچا پرستار تھا اس لیے چاہتا تھا کہ علی گڑھ میں اسے پروفیسر شپ مل جائے لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے مجبور ہو کر وکالت شروع کرنی پڑی۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو ترقی دے کر مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی تحریک بیسویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ عمائد ملت حکومت سے مطالبہ کر رہے تھے کہ جلد از جلد ان کے مطالبات کو تسلیم کر کے کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دے لیکن حکومت لیت و لعل سے کام لے رہی تھی۔ اس تحریک نے زور پکڑا تو حکومت نے یونیورسٹی دینا تو منظور کر لیا لیکن اس کے قواعد و ضوابط ایسے بنانے چاہے جس سے یونیورسٹی کو خود مختارانہ حیثیت نہ ہو بلکہ اس کے انتظام میں حکومت کی بالادستی ہو۔

اس صورتِ حال نے معاملے کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ صاحب معاملہ دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ کچھ حضرات ان ہی شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنے کے حق میں تھے لیکن مسلمانوں کا بڑا طبقہ ان شرائط پر یونیورسٹی لینے کو تیار نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری بھی ان شرائط کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ایک کتابچہ لکھا اور ان شرائط کے ساتھ یونیورسٹی قبول کر لینے کے مُضر اثرات کا تجزیہ کیا۔

بجنوری نے یورپ و امریکا کی یونیورسٹی کے نظام پر غور کر کے ہندوستان کے واقعات و حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے نظام اساسی کے لیے ایک خاکہ تیار کیا تھا۔ نواب وقار الملک سے تبادلے کے بعد اس نے وہ کتابچہ شائع کیا جس کا نام مجوزہ مسلم یونیورسٹی تھا۔

☆☆☆

رابندر ناتھ ٹیگور پر کامیاب مضمون لکھنے کے بعد وہ اردو کے دوسرے شعرا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سرسید اور حالی کے تبحر پرستاروں میں تھا۔ سرسید سے اس نے مضمون نگاری کا فن سیکھا تھا اور حالی کی شاعری کا قدر دان تھا لہٰذا اس نے حالی کو خراج پیش کرنے کے لیے ان کی شاعری پر ایک مدلل مضمون تحریر کیا۔

بجنوری کے دل و دماغ پر مغربی ادب اور مغربی فنکار چھائے ہوئے تھے۔ اس نے ہر اس ہندوستانی فنکار کو جس پر اس نے قلم اُٹھایا کسی نہ کسی مغربی فنکار سے جوڑا۔ مولانا حالی کا رشتہ اس نے مشہور ڈراما نگار شیکسپیئر سے جوڑا۔

''شیکسپیئر کی طرح مولانا حالی کی زندگی کے بھی تین دور ہیں۔''

مضمون میں پہلے حالی کی مصلحانہ کوششوں کا تذکرہ کیا اور سرسید احمد خان کے دست راست کی حیثیت سے انہوں نے ملک و ملت کی جو خدمات انجام دیں اور ان پر روشنی ڈالی۔

اس کے بعد ان کی شاعرانہ صلاحیت کا جائزہ لیا۔ اس میں بھی سب سے پہلے مسدس حالی پر اظہارِ خیال کیا اور اس کو جدید شاعری کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔

''اس کی مثال اردو شاعری میں پیش کرنا محال ہے۔ مدوجزر اسلام کے تاریخی واقعے کو اس صحت اور خوبی کے ساتھ نظم کرنا مولانا حالی کا حصہ ہے۔ اس کے مختلف حصے ایسے باربط مرتب ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ نظم لکھنے میں خیال کو ایک ہی واقعے پر جما کے رکھنا اور اس واقع کا ایک ایسی تاریخ سے اخذ کرنا جو نصف دنیا اور ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے سے متعلق ہو کوئی آسان امر نہیں۔''

اس نظم کی خاطر خواہ وضاحت کے بعد عبدالرحمٰن نے برکھارت، نشاط امید، حب وطنی جیسی نظموں کو تعریفی تبصرے کا روپ بخشا۔ ان نظموں کے بارے اپنا خیال پیش کرتے ہوئے وہ جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ حالی کے بیان کی سادگی اور الفاظ کے انتخاب کا مرحلہ ہے۔ یہاں وہ حالی کا مقابلہ انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن سے کرتے ہیں۔

''الفاظ کی تعداد کی نسبت بلاخوف تردد کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کو ان کے استعمال پر خوب قدرت حاصل ہے اور اگر تعاون سخن کی رائے سے نامناسب ہندی اور تمام انگریزی الفاظ کو خارج بھی کر دیا جائے تو بھی مولانا اگر شیکسپیئر نہیں تو اردو کے ملٹن ضرور ہیں۔''

اس مضمون کے آخر میں اس نے مولانا حالی کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیا۔ مرثیہ سرسید اور مرثیہ غالب پر بھرپور بحث کی۔ مرثیہ سرسید فارسی میں جبکہ غالب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا گیا تھا وہ اردو میں تھا۔ عبدالرحمٰن پہلے تنقید نگار تھے جنہوں نے حالی کے مرثیہ نگاری کے جوہر سے اردو دنیا کو روشناس کروایا۔

انہوں نے مرثیہ غالب کو انگریزی کے صفِ اوّل کی شاعری ٹینی سن کے ہم رتبہ قرار دیا۔

''غالب کا مرثیہ تعلقات شخصی کے منقطع ہونے کی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دردانگیز تصویر ہے اور ٹینی سن کے ان میموریم کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کا مرثیہ قومی ماتم کا دردناک بیان ہے جس میں نالہ و بکا کی آواز ہر شہر و دیار کو اُٹھائے ہوئے ہے اور وہ قدیم یونان کی ان تقریروں سے مشابہ ہے جو بڑے آدمیوں کے جنازوں پر تدفین سے پہلے کی جاتی ہے۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مرثیوں کی مثال ہماری زبان میں نہیں۔"

وہ حالی پر تنقیدی مضمون لکھیں اور اقبال ان کی نظروں سے اوجھل رہیں یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ انہوں نے علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی پر مضمون سپردِ قلم کیا۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر نکلسن نے جب اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو جگہ جگہ اس سے استفادہ کیا اور اس کے حوالے دیے۔ اس مضمون سے اقبال کا تعارف یورپ سے ہوا۔

یہ اور اس جیسے دوسرے مضامین جب رسائل کی زینت بنے تو اردو کی ادبی دنیا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ایک ایسا ناقد ظہور میں آرہا ہے جو جدید تنقید کے اصولوں سے واقف ہے۔ مطالعہ وسیع ہے۔ کئی زبانوں پر عبور ہے۔ وہ مغرب سے مرعوب نہیں مشرق کے قدر دان ہیں۔ اپنی تمام قابلیت کو تنقیدی مضامین کے حوالے کررہے ہیں۔ وہ صرف ناقد نہیں قابلِ قدر انشا پرداز اور ادیب بھی ہے۔ ان کی یہ صفات ان کی تحریروں کو اثر انداز بنا دیتی ہیں۔

وہ ایک ایسے طرزِ تنقید کو پیش کررہے تھے جس کا موجد وہ خود تھے اور یہ بھی تقابلی تنقید۔ عبدالرحمٰن سے پہلے تقابل کی روایت موجود تو تھی لیکن شعرا کا مقابلہ یا موازنہ فارسی و عربی شعرا سے کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کے تقابلی مطالعے میں وسعت نہیں تھی۔ بجنوری نے اس روایت سے انحراف کرکے مغربی شعرا سے مقابلہ کیا اور اس طرح انہوں نے اردو تنقید کے دامن کو وسعت دی۔ خوبی اس تقابلی مطالعے کی یہ ہے کہ وہ شاعروں سے اپنے ممدوح کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مغرب کے بڑے سے بڑے فنکار کے مقابلے میں ہندوستانی شاعر کسی طرح بھی کم نہیں بلکہ ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

بجنوری نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا اور تعلیم حاصل کی اس وقت ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ ہندوستانی ذہنی طور پر یورپ سے مرعوب تھے۔ بجنوری کی تعلیم و تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ کئی مغربی ممالک کا سفر بھی کیا تھا۔ مغربی ادبیات کی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ذہنی طور پر مشرقی نظر آتے تھے۔ ان کی تنقید جذبہ حب الوطنی سے معمور تھی کیونکہ وہ ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے انگریزی مثالیں دے کر یہ ثابت کررہے تھے کہ ہمارے شعرا یا ہمارا ادب کسی طرح انگریزی ادب سے کم نہیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل آگے چل کر خوب پھلا پھولا۔ فراق، مجنوں اور رشید احمد صدیقی جیسے اصحاب سامنے آئے جنہوں نے یہی فریضہ انجام دیا۔

☆☆☆

شاعری کے شپ پاروں پر تنقیدی نظر ڈالتے ڈالتے انہیں خود بھی شوق ہوا کہ وہ شاعری کے میدان میں قدم رکھیں۔ یہ دور انگریزی شاعری کے اثرات کو قبول کرنے کا تھا۔ مولانا حالی کی کوششوں سے اردو شاعری میں نظم نگاری نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ صرف موضوع ہی نہیں تکنیکی تبدیلیاں بھی رونما ہورہی تھیں۔ بجنوری کا مطالعہ وسیع تھا۔ انہوں نے مغرب میں رہ کر انگریزی شاعری کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ انگریزی شاعری کے رموز و طلا سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے جب شاعری کی تو اس کا جھکاؤ لازماً جدید تکنیک اور جدید موضوعات کی طرف ہوا۔ وہ بڑے شاعر نہیں تھے، لیکن انہوں نے ایک راستہ ضرور دکھایا جس پر چل کر بعض شعرا نے عروض اور ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے۔ وہ خود بھی جانتے تھے کہ وہ تجربے ضرور کررہے تھے لیکن شاعری ان کا میدان نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی شاعرانہ نگارشات کو چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ بہت دنوں تک کسی کو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ وہ شاعر بھی ہیں۔

ایک روز وہ چند دوستوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ انگریزی شاعری کا تذکرہ چھڑا ہوا تھا۔ اسی گفتگو کے دوران یہ ذکر نکل آیا کہ ابتدا ہے اگر تراجم سے کام لیا جائے تو پڑھنے والوں کے ذہن عروض کی تبدیلیوں سے آشنا ہوجائیں گے۔ ابھی تک ہماری شاعری چند بحر تک محدود ہے۔ ایسے تجربے ہوا کے تازہ جھونکوں کے مانند ہوں گے۔

عبدالرحمٰن بجنوری نے قدرے شرماتے ہوئے اپنی ایک نظم بچے اور بڑے سنائی جو ایک انگریزی گیت کا ترجمہ تھی۔

دیکھا گیا ہے
گودی میں سوتے ہیں
سپنے میں بچے
دنیا کے نقشے
خواب سارے

دھوکے میں جن کے
دیکھا گیا ہے
گودی میں سوتے
اُٹھتے یہ بچے
ہیں سارے روتے
لیکن جب اُٹھتے
خواب گراں سے
بچے ہوں جیسے
ہیں سارے روتے

زبان سادہ اور سلیس تھی لیکن معانی و مفاہیم کچھ نہیں نکلتے تھے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسی نظم پہلے کبھی نہیں سنی گئی۔ جدت طرازی کی انتہا تھی۔ کچھ نے پسند کی کچھ نے اعتراض کیا لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ یہ ایک نئی چیز ہے۔

☆☆☆

انہوں نے گیتا نجلی کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا لیکن نامکمل رہ گیا۔ ایک سچے فنکار کی طرح انہوں نے اعتراف کرلیا کہ وہ اس کا اہل نہیں۔ یہ کام کوئی اور کرے تو بہتر ہے۔

موت جس دم دے گی دستک تیرے دروازے پر آ

کیا تواضع اپنے مہماں کی بجا لائے گا تو
مرحبا سلطان من، حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
توش جاں حاضر ہے بہر کرم فرما ہے

ان اشعار کو ترجمے کی اعلیٰ مثال قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کسی نئے تجربے کی بھی کوشش نظر نہیں آتی۔ روایتی انداز بھی کوئی ایسا شاندار نہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ ترجمہ ضائع کردیا۔

شاعری چونکہ صرف خیالات کی ترسیل کا نام نہیں بلکہ جذبے اور تخیل کی آمیزش کا نام ہے اور عبدالرحمٰن مفکر کا دماغ رکھتے تھے اس لیے شاعری میں کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ کہیں بھی وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب بھی ہوئے جیسے ان کی نظم نٹ راجا۔

لغزش نشہ کے بت طناز شرابی
سیمابی متقابل گرداب مماثل
تصویر برنجی میں ہے رقصاں تن شیوجی

لندن سے والدہ کے نام خط

امی جان مکرمہ مدظلہا

آپ نے جو رہنے اور خرچ وغیرہ کے متعلق حالات دریافت فرمائے ہیں سو عرض ہے کہ میں لندن کے جس حصے میں رہتا ہوں اس کا نام "چیزک" ہے۔ یہ شہر کے کنارے پر ہے اس لحاظ سے کہ شور و شغب شہر کے اور حصوں سے یہاں کم ہے۔ اچھا ہے ورنہ اور جگہ ٹرام اور گاڑیوں کی آمد و رفت سے گھر بیٹھے بات سنائی نہیں دیتی مگر اس لحاظ سے کہ لنکا نزان سے جہاں پڑھائی ہوتی ہے بہت دور ہے ذرا اچھا نہیں۔

مجھ کو ایک سو بیس روپے ماہوار ان کو کھانے اور رہنے اور کپڑوں کی دھلائی کا دینا پڑتا ہے۔ اس میں ایک سونے کا کمرا ہے۔ اس میں عمدہ فرش بچھا ہوا ہے۔ سونے کا پلنگ لوہے کا بہت بڑا ہے۔ بچھونا وغیرہ یہ خود دیتے ہیں۔ اس میں میز سنگ مرمر کی جس پر منہ دھونے کا تسلہ اور سامان موجود ہے۔ ایک اور میز دراز والی الماری ہے جس میں کپڑے ٹانگ سکتے ہیں۔ تیس بڑے بڑے آئینے مختلف مقامات پر ہیں۔ تصویریں نہیں چیزیں سجی ہوئی ہیں۔ آتش دان ہے تو لیا وغیرہ مہیا کرنا ان ہی کا کام ہے۔"

☆☆

دنیائے فانی طفلک افتادۂ غافل
ہیں انگلیاں ابیات کے جنبش میں خدائی
سرشوجی مدہوش
موسیقی خاموش
اعجاز ہے ہر حربہ انگشت حنائی

☆☆

اس نظم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ اردو میں واحد نظم ہے۔ موضوع کے علاوہ ہیئت کے اعتبار سے بھی یہ نظم ندرت کی حامل ہے۔

وہ شاعری کرتے ضرور رہے لیکن انہیں معلوم تھا کہ شاعری کے لیے جس صبر و سکون کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے پاس نہیں۔ انہوں نے ایک اور راستہ اختیار کیا جس کے ذریعے وہ اپنی شاعرانہ شخصیت کی تشفی بھی کرسکتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے اپنے مضامین میں انشا پردازی کے جوہر دکھائے اور ایک مخصوص اسلوب نگارش پیدا کیا۔ نثر میں شاعرانہ جملے لکھے اور نثر کو شاعری بنا دیا۔ یہ اسلوب اس وقت نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے ایسے کئی مضامین لکھے جن میں لفظوں کی بہار دکھائی گئی تھی۔ ایک مضمون کی جھلک دیکھیے۔

''حسنِ ظاہری پر فریفتہ ہو کر بھی شادی کرنی چاہیے کیونکہ جیسے دلکش سے، دلکش نظارہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہنے سے ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایسے ہی خوب صورت سے خوب صورت چہرہ بھی آج کا حسن کل ایک معمولی چہرہ معلوم ہوتا ہے لیکن حسنِ باطن نہایت سادہ چہرے میں ہمیشہ مانند آفتاب پرتو افگن ہوتا ہے۔ حسنِ باطن عمر کے ساتھ بڑھتا ہے اور وقت بجائے اس کے کہ حسنِ ظاہری کی طرح اس کو تباہ کر دے اور جلا دیتا ہے۔ ایک حسین بد دماغ عورت کے خاوند سے زیادہ کوئی شخص قابلِ رحم نہیں۔ تاہم حسن پہ ہمراہی صحت اور حسنِ باطنی کے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو صرف خوش قسمتوں کا حصہ ہے۔''

ان کے مضامین الفاظ عبارت کے اعتبار سے سہل نہیں تھے لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب جدید علوم وفنون کی مصطلحات عام نہ تھیں اور اسالیب ونقش محدود تھے۔ وہ زمانہ تو بعد میں آنے والا تھا جب مہدی افادی جیسے لوگ پیدا ہوئے اور نثر کو شاعری کا نمونہ بنا دیا لیکن اس کی داغ بیل عبدالرحمٰن بجنوری نے ہی ڈالی۔

☆☆☆

مراد آباد میں ان کی پریکٹس خوب چل رہی تھی کہ وہ کسی کام سے ریاست بھوپال گئے اور نواب حمید اللہ خان کے مہمان ہوئے جو اس وقت ریاست بھوپال کے چیف سیکریٹری تھے۔ وہ عبدالرحمٰن کے قدردان اور ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انہیں یہ دکھ بھی تھا کہ وہ وکالت کے دھندے میں پھنس کر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ وہ ملک وقوم کی بھلائی کے لیے کئی بڑے کام کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بجنوری کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیا تمہیں قدرت نے صرف بیرسٹر ہونے کے لیے پیدا کیا تھا؟''

''لگتا تو یہی ہے کیونکہ میں نہ چاہنے کے باوجود بیرسٹر ہوں۔''

''عدالت میں کتنے ہی ہوں گے جن کی فیس تم سے زیادہ اور صلاحیت تم سے کم ہوگی۔''

''ابھی تو میں نے پریکٹس شروع کی ہے۔''

''کیوں اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو؟ تم قومی بھلائی کے دیگر بڑے بڑے کاموں کے لیے بنائے گئے ہو اور پھنسے ہوئے ہو وکالت میں۔''

''میں نے تو بہت کوشش کی علی گڑھ والوں نے سوچا ہوگا مجھ سے بہتر پروفیسر انہیں مل سکتا ہے۔ میری درخواست ٹھکرا دی گئی۔ سوچ رہا ہوں حیدرآباد چلا جاؤں۔ بڑی ریاست ہے نواب قدردان ہے شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔''

''میری مانو تو حیدرآباد کا خیال ترک کر دو۔ تم جیسی طبیعت کا آدمی وہاں اپنی جگہ بنا نہیں سکے گا۔''

''وہاں مولوی عبدالحق ہیں۔ ان سے جیسے میرے تعلقات ہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے معاملات پر مجھ سے مشورے طلب کرتے رہتے ہیں۔ کہتے بھی رہتے ہیں کہ میں حیدرآباد آ جاؤں۔''

''اگر تم کسی ریاست کا رُخ کرنا ہی چاہتے ہو تو اس سے بہتر ریاست نہ بتاؤں؟''

''آپ تو بھوپال ہی کا نام بتائیں گے۔''

''جی ہاں، اگر حیدرآباد میں مولوی عبدالحق ہیں تو یہاں آپ کا قدردان میں ہوں۔ وہاں نظام حیدرآباد ہیں تو یہاں نواب سلطان جہاں بیگم ہیں۔ علما وفضلا کی ایسی قدردان ہیں کہ ہر اہلِ علم بھوپال کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے۔''

''حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم ہوا ہے۔ وہاں مجھے میرے مطلب کا کام مل سکتا ہے۔''

''اگر تم کہو تو میں بھوپال میں تمہارے لیے بھوپال کے شعبہ تعلیم میں کوئی جگہ تلاش کروں بلکہ تم پر زور دوں گا کہ میری بات مانو۔'' نواب حمید اللہ خاں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے مزید رضامند کرنے کے لیے اس کی ملاقات بھوپال کی حکمراں سلطان جہاں بیگم سے کروا دی۔ سلطان جہاں بیگم کی علم پروری اور قدردانی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا نام بھی انہوں نے سنا ہوا تھا۔ گفتگو کے بعد مزید متاثر ہوئیں۔ خاص طور پر اس بات پر کہ بجنوری نے اس کم عمری میں پورا مغرب گھوم لیا ہے اور اپنی تعلیم بھی وہیں مکمل کی ہے۔

''آپ نے مغرب کے قیام میں یقیناً وہاں کے نظام تعلیم کا بہ غور جائزہ لیا ہوگا۔ کیا آپ یہ نہیں چاہیں گے کہ اپنے تجربات سے ہماری ریاست کو فائدہ پہنچائیں۔''

''یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی۔''

''یہ ہماری بھی خوش نصیبی ہوگی کہ آپ بھوپال میں قیام فرمائیں۔''

عبدالرحمٰن بجنوری نے 1912ء میں مشیرِ تعلیمات کا عہدہ قبول کر لیا۔ پانچ سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ بجنوری نے مراد آباد کو خیرباد کہا اور بھوپال منتقل ہو گئے۔

ریاست بھوپال اس وقت اپنے عروج کی بلندی کو چھو رہی تھی۔ ایسے اصحاب جمع ہو گئے تھے جن کے دم قدم سے ادبی محفلیں آباد تھیں۔ عبدالرحمٰن وہاں پہنچتے ہی محفل کی جان بن گئے۔ ادبی فضا میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ شعری محفلیں آئے روز برپا ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں شرکت کے لیے وہ ایک مرتبہ پھر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے اپنی نظم صبح بنارس لکھی اور ایک مخصوص نشست میں پڑھی۔

یہ ستھری ستھری آنکھیں
یہ لمبی لمبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون
یہ سندر سندر درشن

مایا ہے سب مایا ہے
یہ گورے گورے گال
یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن
یہ بھرا بھرا جوبن

مایا ہے سب مایا ہے
کل جھوٹا ہے سنسار
اک سچا ہے سرجن ہار

☆☆☆

دنیا فانی ہے سب مایا ہے۔ حسن ہو یا دولت کسی کو ثبات نہیں۔ کوئی نیا خیال نہیں تھا لیکن ہیئت کا جو تجربہ اس نے کیا تھا وہ نیا تھا۔ مصرعوں کی ساخت نئے طرز کی تھی جسے پسند کیا گیا۔ یہی وہ تجربہ تھا جو وہ اپنی نظم بچے اور بڑے میں دُہرا چکے تھے۔

انہی دنوں لکھنو میں انجمن کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ بجنوری کے پاس بھی مولوی عبدالحق کا خط آیا جس میں ان سے شرکت کی استدعا کی گئی تھی۔ مولوی صاحب نے یہ فرمائش بھی کی تھی کہ وہ اس اجلاس میں کوئی مضمون بھی پڑھیں۔

وہ اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ اس وقت اس کے سامنے زبان اردو کی اصلاح وترقی کا مسئلہ تھا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ پورے ملک کی کوئی ایک قومی زبان نہیں ہے اور اس کا سبب ہندو مسلم اختلافات ہیں۔ مسلمان ضد میں آ کر اردو کو فارسی اور عربی آمیز بنا کر مشکل بنا رہے ہیں۔ اسی طرح ہندو اس کو سنسکرت آمیز کر کے غیر فطری اور مشکل بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دونوں زبانوں کے حامی اپنی اپنی زبانوں کو مشکل سے مشکل تر بنا رہے ہیں۔ انہوں نے مضمون شروع کیا۔

''اردو کا سب سے پہلا دشمن باہمی نفاق ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مادری زبان ہندی ہے، مسلمان کہتے ہیں اردو ہے۔ محض الفاظ نے دونوں کو مغالطہ دیا ہے۔ اگر دونوں برادرانِ وطن تعصب کی عینک اُتار ڈالیں تو حقیقت حال روشن ہو جائے کہ اردو ہندی سے اور ہندی اردو سے الگ زبان نہیں ہے بلکہ ہندی اردو کا اور اردو ہندی کا ہی نام ہے۔ اردو کو سنسکرت خط میں لکھتے ہیں تو اس کو ہندی کہتے ہیں اور جب فارسی خط میں لکھتے ہیں تو وہی اردو بن جاتی ہے۔'' اس مضمون میں بجنوری نے اردو کی ترقی کے لیے چند مشورے بھی دیے۔

''اب وہ وقت آ گیا ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنا رسالہ جاری کرے۔ اس وقت ہندوستان میں اردو کے ایک نہایت اعلیٰ پیمانے کے رسالے کی ازحد ضرورت ہے۔ آج کوئی بھی رسالہ نہیں جس کو اردو زبان کا نمائندہ کہا جا سکے۔''

اس وقت اعلیٰ رسالوں کی واقعی کمی تھی۔ چند رسالے تھے ضرور لیکن ان کے خاص مزاج تھے۔ ریسرچ اور تحقیقی اہمیت کے حامل کوئی رسالہ نہیں تھا۔

دوسری تجویز انسائیکلو پیڈیا کی اردو میں ترتیب واشاعت کے سلسلے میں تھی۔

''ایک اور ضرورت ملکی، قومی اور اسلامی یہ ہے کہ دائرہ المعارف کی ترتیب دی جائے جو ہندوستان اور اسلام کے متعلق جملہ مضامین پر حاوی ہو۔ برسوں کا کام ہے اور قابل ترین لوگ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں۔'' اس مضمون میں انہوں نے اردو ٹائپ جاری کرنے کی تجویز بھی دی تھی۔

وہ لکھنو جانے اور اجلاس میں مضمون پڑھنے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ عین وقت پر کوئی ایسا کام نکل آیا کہ ان کا جانا ملتوی ہو گیا۔ مضمون بھیجنا ضروری تھا۔ وہ موجود نہ ہوں لیکن مضمون سے تو شرکا مستفید ہو سکیں۔ انہوں نے مضمون سپردِ ڈاک کر دیا۔ یہ مضمون پہنچا لیکن اس وقت جب اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ ان کی تجاویز اَن سنی رہ گئیں شرکا تک نہ پہنچ سکیں محفوظ ضرور رہا لیکن بے اثر۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجمن نے آگے چل کر اس کی تجویز پر عمل کیا اور سہ ماہی اردو جاری کیا جس نے اردو علم وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ افسوس.....! یہ رسالہ اس وقت جاری ہوا جب عبدالرحمٰن بجنوری اس دنیا میں نہیں رہا..... ان کا بھیجا ہوا یہ مضمون اسی رسالے اردو میں مولوی عبدالحق کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

''انجمن ترقی اردو کا ایک غیر معمولی اجلاس 1912ء کے آخری ہفتے میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر (عبدالرحمٰن) نے میری (مولوی عبدالحق) درخواست پر جلسے میں پڑھنے کے لیے یہ مضمون بھیجا تھا۔ ڈاک خانے کی غلطی سے وقت پر نہ پہنچ سکا اور اب تک یونہی پڑا رہا۔ مرحوم نے منصوبے کے آخر میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اعلیٰ پیمانے پر انجمن ترقی اردو کی جانب سے رسالہ جاری کیا جائے۔ افسوس کہ یہ رسالہ اس وقت شائع ہوا جبکہ وہ عزیز اس ناپائدار دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی بے وقت موت کا صدمہ ہمیشہ یادگار رہے گا ورنہ ان کی ادبی قابلیت اور ان کے علم وفضل اور تنقیدی نظر سے اس رسالے کو بے انتہا مدد ملتی۔ اردو کے حامیوں اور بہی خواہوں سے یہی امید ہے کہ اس مضمون کو توجہ سے پڑھیں اور ان مسائل پر جن پر اس میں بحث کی گئی ہے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔''

☆☆☆

مولوی عبدالحق کا خط آیا رکھا تھا۔ اس خط میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ دیوانِ غالب کے مجوزہ ایڈیشن کے لیے مقدمہ تحریر کردے۔

یہ درخواست ان سے اس لیے کی گئی تھی کہ غالب محض شاعر نہیں تھے، بجنوری کے ہیرو تھے۔ غالب کے موضوعات کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان موضوعات کو سمیٹنے والا بھی اس شخص کو ہونا چاہیے تھا جس کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ عبدالرحمٰن اس وقت تک اردو کا واحد نقاد تھا جو دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھا۔ اس لیے اس سے امید کی جاسکتی تھی کہ وہ غالب کے ساتھ انصاف کریں گے۔

یہ موقع ہاتھ آیا تو عبدالرحمٰن بجنوری نے تنقیدی جوہر کھول کر سامنے رکھ دیے۔ انہیں ثابت کرنا تھا کہ ان کا ہیرو دنیا کی بڑی سے بڑی زبانوں کے شعرا سے بہتر شاعر ہے۔ دعوے اور دلیل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انہیں صرف دعویٰ نہیں کرنا تھا دلیل سے ثابت بھی کرنا تھا۔ انہیں ثابت کرنا تھا کہ گوئٹے ہو یا ورڈز ورتھ۔ بادلیر ہو یا ملاوے۔ غالب ان سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔

یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ایشیا کی ادیب انگریزی کی طرف سے سخت احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ انگریزی کا معمولی سا شاعر بھی بلند ترین تھا۔ اردو کا اعلیٰ شاعر بھی پست تھا۔ کسی انگریزی شاعر کے ساتھ غالب جیسے عظیم شاعر کا نام لینا بھی گستاخی سمجھا جاتا تھا۔

اس احساس کمتری کی ابتدا مولانا حالی سے ہوئی تھی۔ انہوں نے مقدمہ شعروشاعری میں تقریباً ثابت کردیا تھا کہ اردو شاعری وقت کے زیاں کے سوا کچھ ہے بھی نہیں۔ پوری سرسید تحریک نے یہ تاثر راسخ کردیا تھا کہ انگریزی ادب کے سامنے اردو میں کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اس میں کچھ حقیقت تھی کچھ افسانہ۔

ہمارے دانش ور گوئٹے، شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ کو دنیا کا عظیم ترین فنکار سمجھتے تھے اور ان کی پیروی کو معراج تصور کرتے تھے۔ لارڈ میکالے کا یہ نامعقول فقرہ بھی گردش میں تھا۔

''انگریزی ادب کا ایک شیلف ایشیا کے پورے ادب پر بھاری ہے۔''

عبدالرحمٰن بجنوری کو ثابت کرنا تھا کہ یہ تصور غلط ہے۔ جس زبان میں غالب موجود ہوں اس کے لیے تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک غالب پورے مغربی ادب پر بھاری ہے۔

''غالب کا دیوان محض دیوان نہیں بلکہ وید مقدس کی طرح مقدس ہے۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔''

عبدالرحمٰن تقابلی تنقید کے موجد تھے۔ انہوں نے غالب سے پہلے جتنے لوگوں پر مضامین لکھے تھے ان سب میں یہی طریقہ اپنایا تھا لیکن غالب پر لکھتے ہوئے انہیں نہایت وسیع میدان مل گیا۔ غالب کے شاعرانہ اعجاز کا موازنہ انگریزی کے بڑے سے بڑے شاعر سے کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے ایک ایک شاعر کا موازنہ غالب سے کیا اور غالب کی عظمت کو ثابت کیا۔

''کہاں المانی شاعر ہائن رش ہائنی جو محض مغنی ہے۔ جو عشق والفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی کے ساتھ بیاں کرکے خاموش ہوجاتا ہے۔ کہاں غالب جو دنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اُٹھائے ہے اور جس کا سرور سیارہ بہ سیارہ ہوتا ہوا ملک الافلاک تک پہنچتا ہے۔''

''مرزا کی دیوانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام برٹ

سے کچھ کم نہیں۔ مرزا اور مام برٹ دونوں ظلمات کی تاریکی میں داخل ہوتے ہیں لیکن مرزا صحیح سلامت خضر کی طرح واپس آگئے ہیں اور وہ غریب ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گیا۔''

''گوئٹے کا کلام قومی اور ملکی ترقی کا باعث ہوچکا اور اپنا خاص منشا پورا کرچکا۔ غالب کا کلام اب مقبول ہوا ہے اور آئندہ نسلیں اس امر کا موازنہ کریں گی کہ ان کی ترقی میں غالب کے کلام کا جز واعظم کہاں تک معاون ہوا ہے۔''

انگریزی شعرا میں ورڈز ورتھ قدرتی مناظر کا عاشق ہے۔ اس کے کلام میں فطری مناظر کے حسین جلوے نظر آتے ہیں۔ بجنوری نے غالب کا موازنہ اس سے بھی کیا اور غالب کی برتری کا پہلو نکالا۔

''مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر ایک نیا جلوہ پاتی ہے جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں ان میں سے اکثر سعدی اور ورڈز ورتھ کی طرح قدرت سے تماشائے بہار وخزاں، کہسار اور آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ اور لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا، خاموش مرغ زاروں سے زیادہ شہروں کے پُرشور کوچوں میں لگتا ہے جہاں زندگی شعاع منتظر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔''

''مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش وکرسی کے سائے میں ہے۔ وہ تسبیح جس پر وہ اسمائے الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں ہزار دانہ ہے اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں۔ کعبہ اور دیر، کلیسا اور کنشت اس کے رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتے ہیں۔ جہاں عوام وخواص کا مذہب منتہی ہوجاتا ہے مرزا کے مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔''

بجنوری نے اس مضمون میں اپنی تنقیدی صلاحیت کے ساتھ ساتھ انشا پردازی کے بھی اعلیٰ جوہر دکھلائے اور پورے مضمون کو دل فریب جملوں کا ایک گلستان بنادیا۔

''مرغ قفس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ کہاں فضائے نامحدود کہاں کنج قفس جس میں پروں کو پھیلانے تک کی جگہ مفقود۔ چمن کی ہوا اور ہمدموں کی صدا تک نہیں کوئی لیکن تقاضائے حیات پھر بھی نامشکور کوششوں کا خواستگار ہوتا ہے۔''

''تو یہ تھے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔'' دادا نے پوتے سے کہا جو بہت دیر سے یہ کہانی سن رہا تھا۔

''دادا جان، بڑی پُرلطف کہانی تھی مگر مجھے اب نیند آنے لگی ہے۔ باقی کہانی کل سنایئے گا۔''

قانون آفرینش

آفرینش کیوں ہنوئی عالم کا کیا ہے متقینا
فلسفی کہتے ہیں تکوین ابد اور ارتقا
بعض کہتے ہیں کہ ہے قانون اس کا انقلاب
پر اصل میں ہے مسلط اس پہ قانون فنا
الحسن اور ڈارون اس سے کریں گے اختلاف
پر ہے قانون فنا ہستی عالم کا مضاف
ہیں اندھیرے راستے ہو ارتقا یا انقلاب
''لا'' ہی وہ اک راہ ہے جس کو کہہ سکتے ہیں صاف
جب کہ دی منصور نے پہلے انا الحق کی صدا
سب نے اس کو قابلِ نفریں و دیوانہ کہا
دار پہ لیکن دیا جب موت نے عقدے کو کھول
تب یہ جانا سب نے تھا منصور میں پنہاں خدا
ظاہر انسان گو خالق سے اپنے دور ہے
نور ہے ذات خدا پر خاک میں مستور ہے
پر تمیز ماوتو رہتی نہیں بعد فنا
روح انساں بھی مثالِ ذات اکبر نور ہے
جب ہوا خالق کا انساں پر عتاب اولیں
جنت الفردوس سے بھیجا گیا سوئے زمیں
زندگانی ہے سزا اور موت راہِ بازگشت
تا ازاں راہبر مکان خوش باز آید کمیں

''بس اب کہانی ختم ہونے والی ہے۔''

''نہیں دادا جان، بڑے زور کی نیند آرہی ہے۔ باقی کہانی کل سنوں گا۔''

''ٹھیک ہے جاؤ سوجاؤ۔ باقی کل سن لینا۔'' بچہ اُٹھ کر چلا گیا اور دادا اپنے ذہن میں آیندہ کے واقعات جمع کرنے لگے اور پھر انہیں بھی نیند آگئی۔ دوسرے دن بچہ پھر دادا کے پاس آبیٹھا۔

''دادا جان، پھر کیا ہوا تھا آگے بتایئے؟'' دادا نے پھر کہانی سنانی شروع کی۔

''عبدالرحمٰن بجنوری نے یہ معرکتہ الآرا مضمون ختم کیا اور مولوی عبدالحق کی خدمت میں بھیج دیا۔ مضمون ایسا تھا جو اب تک نہیں لکھا گیا تھا۔ ایک ایسی کوشش تھی جو غالب کو دلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے تنگ گلی کوچوں سے نکال کر پوری دنیا کے سامنے لاسکتی تھی۔ عبدالرحمٰن کا نام بھی اسی مقالے سے زندہ رہا تھا لیکن مولوی عبدالحق کی مصروفیات نے اسے اشاعت سے ہم کنار نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ اللہ میاں کے گھر سے عبدالرحمٰن کا بلاوا آگیا۔ اس کو بھی کئی سال گزر گئے اور پھر جب عبدالرحمٰن کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی ترجمان رسالہ ''اردو'' جاری کیا تو اوّلین شمارے میں شائع ہوا اور پھر انجمن ہی نے اس مقالے کو ''محاسن کلام غالب'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ عبدالرحمٰن کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری سب کچھ تھے لیکن ان کی خصوصی حیثیت ماہر تعلیم کی تھی۔ بھوپال کے قیام اور مشیر تعلیم کے عہدے پر رہنے کی وجہ سے تجربہ بھی حاصل ہوگیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ غریب و نادار مسلمان اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے ہیں لیکن ان کے اتنے وسائل نہیں کہ وہ یہ بار برداشت کرسکیں۔ علی گڑھ کالج مسلمانوں کا ادارہ ضرور تھا لیکن یہاں کے اخراجات کھاتے پیتے گھرانوں کے طلبہ ہی برداشت کرسکتے تھے۔ ایک ایسے ادارے کی کمی سختی سے محسوس کی جارہی تھی جہاں غریب طلبہ کو اعلیٰ تعلیم دی جاسکے۔

وہ اس ادارے کے بارے میں سوچتے رہے۔ یہ کہاں قائم ہوگا، اس کا نصاب کیا ہوگا، کتنی رقم کی ضرورت پڑے گی وغیرہ وغیرہ؟ ایک خاکہ ذہن میں تیار ہوگیا تھا لیکن یہ کام اکیلے کرنے کا نہیں تھا۔ انہوں نے یہ منصوبہ اپنے بااثر اور باعمل احباب کے سامنے رکھا۔ رفتہ رفتہ ہم خیال احباب اس کے گرد جمع ہوگئے۔ سرعلی امام، نواب عماد الملک، ڈاکٹر انصاری، شعیب قریشی، سرعبدالرحیم جیسے مخلص احباب نے تائید کی۔

نواب زادہ حمیداللہ خان نے اس تحریک سے مکمل اتفاق کیا اور اسے کامیاب بنانے میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ ان احباب نے فرمانروائے بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم سے ملاقات کی اور اس منصوبے کا خاکہ ان کے سامنے پیش کیا۔ نواب سلطان بیگم غربا کی تعلیم کے حق میں تھیں اور چاہتی تھیں کہ قوم میں تعلیم کی روشنی پھیلائیں چنانچہ جب ان اصحاب کی جانب سے یہ منصوبہ پیش کیا گیا تو بہت خوش ہوئیں۔ تجویز سے ہمدردی فرمائی اور جب کمیٹی کی باقاعدہ تجویز پیش ہوئی تو نہایت حوصلہ افزا جواب مرحمت فرمایا۔ چار لاکھ روپے کا عطیہ بھی منظور کیا گیا۔ نظام حیدرآباد نے بھی تیس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔

اس کالج کا نام فرمانبروائے بھوپال کے نام پر ''سلطانیہ کالج'' تجویز کیا گیا اور دہرہ دون میں زمین بھی خرید لی گئی۔ اس مجوزہ کالج کے الہ آباد یونیورسٹی کے الحاق کے لیے کوششیں کی جانے لگیں۔ خط کتابت ہوتی رہی لیکن حوصلہ افزائی کے آثار نظر نہ آتے تھے چنانچہ ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں نواب زادہ حمیداللہ خان، حکیم اجمل خان اور مفتی انوارالحق شامل تھے۔ اس وفد نے صوبہ یوپی کے ڈائریکٹر تعلیمات مسٹر ویلڈ فورڈ اور لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن دونوں سے ملاقات کی اور انہیں قائل کرنا چاہا۔ دونوں حضرات نے کالج کے قیام کو منظور نہیں کیا۔

وفد نے ہار پھر بھی نہیں مانی۔ طے یہی ہوا کہ کوششیں جاری رکھی جائیں گی لیکن اب یہ محض کوششیں رہ گئی تھیں امید بہت کم تھی۔ اِدھر نظام حیدرآباد کی جانب سے یہ کوششیں کی جارہی تھیں کہ عبدالرحمٰن بجنوری حیدرآباد آجائیں۔ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آرہا تھا۔ اس جامعہ کے لیے یہ طے ہوا تھا کہ تمام مضامین حتیٰ کہ سائنس کی تعلیم بھی اردو میں دی جائے گی۔ اردو میں کتابوں کی فراہمی کے لیے ''دارالترجمہ'' قائم کیا گیا تھا۔ قابل ترین لوگ اس سے وابستہ ہوئے اور مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروا کر شائع کیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ کے سلسلے میں جب تمام مراحل طے ہوگئے تو پرنسپل کی تقرری کا مسئلہ سامنے آیا۔ مختلف نام زیرغور آئے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا نام بھی تھا۔ ابھی تیس سال سے اوپر عمر ہوئی تھی کہ ایسے اعلیٰ عہدے کے لیے ان کا نام تجویز کیا گیا۔

بجنوری کو اردو زبان سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ وہ مادری زبان میں تعلیم دینے کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

''جو قوم اپنی زبان سے غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پاسکتی ہے۔ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو پس پشت ڈال دیں اس کی خاک سے بھلا کب کوئی فرزانہ اُٹھ سکتا ہے۔ جو ملک اپنی زبان کو باعث ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایہ ناز خیال کرے اس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔ یہ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے کا اثر ہے کہ 1875ء سے اب تک مغربی تعلیم پانے کے باوجود کوئی قومی اور ملکی نتیجہ مرتب نہ ہوسکا۔''

''جب تک طلبہ کو ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے گی تعلیم جزو حیات بن ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے گا۔ اگر ہم میں سے ہر ایک کے سر میں ہزاروں دماغ ہوں تب بھی بے کار ہیں۔''

عبدالرحمٰن کے ان خیالات سے اہل علم واقف تھے۔ عبدالرحمٰن صرف انگریزی نہیں دنیا کی دیگر کئی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ مغرب کے نظام تعلیم سے بھی واقف تھے اور مشرق کے طریقہ تعلیم سے بھی آگاہ تھے۔ اردو کی ترویج وترقی کے لیے ان کے پاس بہت سی تجاویز تھیں۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے بجنوری کے نام پر اتفاق ہوگیا۔ ان کے نام کو نظام حیدرآباد کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے بھی بہ خوشی منظور کرلیا۔ ابھی تقرری کا عمل باقی تھا کہ قدرت کا فیصلہ سامنے آگیا۔

وہ بھوپال میں ہی تھے کہ ہندوستان کے کئی شہروں میں انفلوئنزا کا موذی مرض پھیلا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مرض نے وبائی شکل اختیار کرلی۔ سیکڑوں موتیں واقع ہوئیں۔ وہ شہر بھیج رہا تھا کہ بھوپال اس کے زد سے محفوظ ہے اور اس کے بیوی بچے اس سے محفوظ ہیں۔ وہ بھوپال میں محفوظ تھا لیکن حیدرآباد اس وبا کی زد میں آگیا۔ اس کی بہن زیب النسا حیدرآباد میں تھی۔ وہ اس مرض کا شکار ہوگئی۔ انتقال کی خبر بھوپال پہنچی تو عبدالرحمٰن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ چھوٹی بہن تھی عبدالرحمٰن اسے چاہتے بھی بہت تھے اور ابھی جوان تھی۔ وہ جیسا بیٹھے تھے ویسے ہی حیدرآباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ خوب جی بھر کے روئے رونے کے سوا کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کی تدفین کے بعد وہ بھوپال واپس چلے آئے اس دوران بھوپال میں اس وبا نے شدت اختیار کرلی تھی۔

لوگ گھروں میں بند ہوکر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں جراثیم نہ لگ جائیں۔ دفاتر بند ہوگئے، اسپتال بھر گئے، کاروبار ٹھپ ہوگئے، عام تعطیل کا اعلان کردیا۔

شاید عبدالرحمٰن کے گھر کا کوئی دروازہ کھلا رہ گیا تھا کہ موت داخل ہوگئی۔ عبدالرحمٰن کی اہلیہ اس مرض میں مبتلا ہوگئیں اور صرف دو تین دن کی مختصر علالت کے بعد انتقال کرگئیں۔ بہن کا غم ابھی تازہ تھا کہ اہلیہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ ابھی چار دن نہیں گزرے تھے کہ عبدالرحمٰن کا بدن بھی بخار سے جلنے لگا۔ شاید وہ یہ جراثیم حیدرآباد ہی سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

یہ عبدالرحمٰن تھے کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ پوری ریاست حرکت میں آگئی۔ ڈاکٹر انصاری علاج کے لیے پہنچ گئے۔ نواب زادہ حمیداللہ خاں نے علاج کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ خود سلطان جہاں بیگم کا پیغام بار بار آرہا تھا کہ عبدالرحمٰن کی جان ہر قیمت پر بچائی جائے۔ شعیب قریشی ان کے بستر کے قریب کھڑے دعا کررہے تھے۔ والد سفیر قندھار کی حیثیت سے قندھار میں تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے جیتے پر کیا گزر رہی ہے۔

دوستوں کی دوستی، طبیبوں کی طبابت، ہمدردوں کی ہمدردی سب رائگاں گئیں۔ موت کا داؤ چل گیا۔ 7 نومبر 1918ء کو یہ سرمایہ افتخار چل بسا۔

مرحوم نے صرف 33 سال کی عمر پائی۔ بھوپال میں لال کوٹھی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ سلطانیہ کالج کا منصوبہ بھی دھرا رہ گیا۔ عثمانیہ کالج میں بھی تقرری نہ ہوسکی۔ اس کا دکھ صرف اعزاء اور احباب ہی کو نہیں تھا۔ وہ پوری قوم کو تھا۔ پوری قوم نے ماتم کیا۔ ریاست بھوپال کی 1918ء کی سالانہ رپورٹ میں بجنوری کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اس کا ماتم کیا۔

''ہم کو یکایک اس خاموش کرنے والے اور اس نکتہ رس فلسفی کا ماتم کرنا پڑا ہے جس کو خدا نے ایک عالمانہ دماغ عطا فرمایا تھا۔ ایسا دماغ بہت کم لوگ دنیا میں لے کر آتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی سادگی، منکسرالمزاجی اور پھر ان کے ساتھ شجر علمی لوگوں کو اسلامی عہد رفتہ کے علما اور حکما کی یاد دلاتا ہے۔ مجوزہ مسلم یونیورسٹی جب بھی عالم وجود میں آئے گی تو اس کے اندر مرحوم کے دماغ قلم کے نقوش ہمیشہ صاف

خراجِ تحسین

حالی جدید تنقید کے رہنما ہیں، بجنوری صحیح معنوں میں پہلے جدید نقاد ہیں۔ حالی سادہ ہیں بجنوری بلیغ ہیں۔ حالی کی نظر محدود اغراض پر ہے بجنوری کی نظر انسانی تہذیب کی وسعت اور اس کے پیمانوں پر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا اسلوب اردو کے چند منفرد اسالیب میں سے ہے اور اس کی خوبی یہ ہے وہ ادب کے حسن توانائی اور تہ داری کو پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر وارد کردیتا ہے۔

(پروفیسر خورشید الاسلام)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظر آتے رہیں گے۔ اسی طرح مجوزہ سلطانیہ کالج بھی ان کے خداداد تخیل ثمر نورس ہے۔ افسوس ہے کہ عملی صورت میں وہ بھی مرحوم کی قابلیتوں سے محروم رہے گا اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم تحریک کا سرچشمہ اس تحریک کے بہترین علم پرداز کے رخصت ہوجانے سے کچھ اور بھی کم ہوجائے گا۔ ڈاکٹر بجنوری اردو زبان کے نہایت سرگرم اور دل سوز معاون تھے۔ اب جبکہ ان کی زندگی کا ایک شاندار مستقبل قریب آرہا تھا ہمیں خبر نہ تھی کہ وہ ہم سے رخصت ہونے والے ہیں۔''

اورینٹل کالج علی گڑھ کے ترجمان ''علی گڑھ منتھلی'' نے ان کے انتقال پر یہ خبر شائع کی۔

''خیالات معطل ہیں الفاظ گم ہیں، سینے میں آگ اور جگر میں درد ہے کہ آیا اس قوم کی کیا درگت ہونے والی ہے جس پر نظر پڑتی ہے وہی غائب ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور موت......! افسوس کتنی حسرتیں اپنے ساتھ لے گئے۔ کتنے مجوزہ نقشے ملیا میٹ کر گئے۔ حسرت کہ مولوی نورالاسلام سفیرِ قندھار ان کے والد کی عمر بھر کی کمائی خاک میں مل گئی۔''

مرثیے لکھے گئے۔

صبح کی آمد نہ تھی اے دیدۂ ظلمت نصیب
وہ کسی فوق النظر تارے کی تھی پہلی کرن
اس فضائے پر کدورت میں نہ تھا اس کا وطن
اب کہاں وہ نور شیریں ہاں مگر اس کی جھلک
ہو اگر باقی تو ہو شبنم کی باقی روشنی
یا سرِ شب کھلنے والی موتیا کی چاندنی

علامہ اقبال کو بھی بجنوری کی بے وقت موت سے سخت صدمہ ہوا۔ انہوں نے عبدالرحمٰن کے دوست شعیب قریشی کو خط لکھ کر اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

''کل شام آپ کے تارے خرمن صبر وقرار پر بجلی گرادی۔ افسوس گزشتہ ساٹھ سال کی تعلیمی کش مکش کے بعد ایک آدمی ہم میں پیدا ہوا تھا جو دل ودماغ وسیرت کے اعتبار سے قدیم حکمائے اسلام کا نمونہ تھا مگر مشیت ایزدی نے اسے ہم سے عین اس وقت جدا کرلیا جب کہ اس کی ضرورت تھی۔ شاید مرحوم اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا یا جس سوسائٹی میں اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا وہ اس کی قدر نہ پہچان سکتی تھی۔ ہندوستان کی اسلامی دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جن کو بجنوری کی پوشیدہ قوتوں کا احساس ہوگا اور کیا عجب کہ مرحوم کو خود بھی ان قوتوں کا احساس نہ ہو۔ اگر وہ دس سال ہم میں رہتا...تو آنکھیں اس کے کمالات کی آب وتاب سے خیرہ ہوجاتیں۔ ہم مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ اس کی تقدیر سے کس کو مفر ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اپنے حبیب پاک کے دربار کی حاضری نصیب کرے۔ آہ! ملت اسلامیہ بدنصیب ہے۔ ہر طرف بربادی وتباہی کے آثار ہیں مگر کیا یہ ویرانی کسی تازہ تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔''

کچھ دن اخباروں کے صفحات رسائل کے حاشیے عبدالرحمٰن کی موت کی خبروں سے سیاہ رہے اور پھر رفتہ رفتہ لوگ انہیں بھولتے گئے۔

خان بہادر نورالاسلام جس صدمے سے دوچار ہوئے تھے اس کا ازالہ یہی ہوسکتا تھا کہ عبدالرحمٰن کے تمام مضامین یکجا ہوکر کتابی صورت میں شائع ہوجائیں۔ انہوں نے عبدالرحمٰن کے رفقا کو خطوط لکھے کہ وہ ان مضامین کو یکجا کریں اور کتاب ترتیب دیں۔ وہ اخراجات برداشت کرنے کو بھی تیار تھے۔ شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی اور مولوی عبدالحق نے اس پر آمادگی بھی ظاہر کردی تھی لیکن یہ کام ٹلتا رہا۔ خان بہادر اس کتاب کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ان کا مشہور مقالہ ''محاسنِ کلام غالب'' بھی اہلِ علم کی نظر سے پوشیدہ رہا لیکن جب 1921ء میں انجمن ترقی اردو کا ترجمان سہ ماہی اردو شائع ہوا تو اس میں یہ مقالہ بھی شامل کیا گیا۔ یہ مقالہ شائع ہوتے ہی دانش وروں اور نقادوں کے درمیان ایک تنازع کا مسئلہ بن گیا۔ بعض ناقدین نے اس پر سخت تنقید کی اور اسے روح سرائی اور مبالغہ آرائی سے تعبیر کیا۔

''بجنوری نے کئی ایسے جملے لکھے ہیں جو وفور عقیدت مندی کا نتیجہ ہیں جن میں نہ تو اعتدال پسندی ہے نہ ہی توازن باقی رہ سکا ہے۔ وہ غالب کے ہر عیب کو ہنر سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی تعریف میں اتنے رطب اللسان ہیں کہ دیوانِ غالب کو الہامی کتابوں کے ہم پایہ تصور کرتے ہیں۔'' (شیخ محمد اکرام)

اسے سراہنے والے بھی کم نہیں تھے۔

''جس طرح اردو زبان کے شعر وادب میں غالب کا مقام مخصوص ہے اسی طرح غالب کے بے شمار مداحوں میں عبدالرحمٰن بجنوری اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے تھے۔ جس طرح غالب نے شعر وسخن کے میدان میں اپنے لیے ایک الگ اور نئی راہ پیدا کی عبدالرحمٰن بجنوری نے کلامِ غالب پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے تبصرے کا ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہیں کی، ورنہ مشرقی اور مغربی ادب اور خصوصاً عربی اور جرمن شاعری کے گہرے مطالعے کے بعد مرحوم اپنے زمانے کی نوجوان نسل کے لیے فکر و نظر اور جدید اور ترقی پسند رائے لے کر آئے تھے۔"

اس اختلاف اتفاق کے باوجود "محاسنِ کلام غالب" نے اسے زندہ رکھا۔ اس مضمون کی ایسی شہرت ہوئی کہ ان کے دیگر کارنامے نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن محاسن کلام غالب نے انہیں زندہ رکھا۔ ان کی یہ رائے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں وید مقدس اور کلامِ غالب۔"

زمانہ بڑا بے رحم ہے اور ہم ایشیائی تو اس معاملے میں بہت ہی بے رحم ہیں۔ وقت گزرتے کسی کو بھولنے میں دیر نہیں لگتی۔ عبدالرحمٰن بجنوری کو بھی لوگ بھول گئے۔ ان کی سوانح لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کی کوئی یادگار قائم ہونا تو بڑی بات لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کی قبر کہاں ہے؟ وطن تو بہت پہلے چھوٹ گیا تھا بھوپال بھی انہیں بھول گیا جہاں انہوں نے آخری سانس لی تھی جہاں کی زمین نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔ وہ بالکل ہی گوشہ گم نامی میں چلے گئے۔ نئی نسل کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

بجنوری کے صاحبزادے محمد فاتح فرخ نے چند مضامین، خطوط اور نظموں کو ترتیب دے کر "باقیات بجنوری" کے نام سے شائع کیا کچھ دنوں ہلچل مچی اور پھر خاموشی۔

1969ء میں غالب صدی کی تقریبات نہایت اہتمام سے ہوئیں۔ ان تقریبات میں جتنے مقالے پڑھے گئے ان میں کسی نہ کسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری اور محاسنِ کلام غالب کا تذکرہ ضرور آیا۔ ان مقالوں کو سن کر لوگوں کا دھیان اس طرف گیا۔ یہ احساس بھی ہوا کہ ہم نے محسنِ غالب کو فراموش کر دیا۔ اس کے ازالے کے طور پر کئی لکھنے والوں نے ان کے فن اور شخصیت پر مضامین لکھے۔ پہلی مرتبہ یہ انکشاف بھی ہوا کہ لوگوں کو ان کی آخری آرام گاہ کے بارے میں معلومات تھیں۔

ان مضامین کے جواب میں بھوپال کے ایک ادب دوست قاضی عزیز الرحمٰن نے ایک مراسلے کے ذریعے قبر کی نشاندہی کر دی کتبے پر یہ قطعہ درج ہے۔

ہیہات جہاں میں کیا قیامت آئی
ماتم ہے بپا
رحمٰن کی پیاری صورت آنکھوں سے چھپی
اندھیرا ہوا
یوں کہ دو سہیل مصرعہ سال وفات
تم کھینچ کے آہ
☆☆☆
عبدالرحمٰن ڈاکٹر بجنوری
۱۳۳۷ھ
اے آہ کجا
☆☆☆

دوسرا کتبہ بیرونی سمت میں ہے جس پر ڈاکٹر بجنوری کے ایک عزیز قاضی محمد تحسین بیدل بجنوری کا کہا ہوا تاریخی قطعہ کندہ ہے۔

اقوال جس کے زریں منقوش ہیں دلوں پر
درد زبان عالم ہے علم کا فسانہ
جس کا دم تکلم گوہر فشاں زباں تھی
کانوں میں گونجتی ہے تقریر عالمانہ
گم لعل بے بہا ہے بجنور کا یہاں پر
آغوش قبر میں ہے اپنا در یگانہ
خواب گراں سے غافل سوتا پڑا ہوا ہے
وہ کون عبدرحمان علامہ زمانہ
سال وفات لکھا یہ بیدل حزیں نے
اب علم ہے پنہاں اس گود میں خزانہ
۱۳۳۷ھ

پوتا بڑے غور سے یہ داستان سن رہا تھا۔ ایک مرحلے پر تو اس کے آنسو بھی آ گئے تھے۔

"دادا جان کتنے عجیب آدمی تھے عبدالرحمٰن بجنوری۔"

"کیوں بھئی تمہیں کیا عجیب بات لگی؟"

"دادا جان صرف 33 سال کی عمر میں اس آدمی نے کتنے کام کر لیے۔"

"ہاں بیٹا یہ تو ہے۔ وہ اگر زندہ رہتے تو زبان و ادب کی کتنی خدمت کرتے۔"

"بڑا ہو کر میں بھی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح بڑے بڑے کام کروں گا۔"

"شاباش! جاؤ اب سو جاؤ۔"

ماخوذ: ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری از ڈاکٹر محمد زاہد

شاطر مصلح

ابن کبیر

وہ فسوں کار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے گردوپیش کے ماحول کو مسحور رکھا۔ اہل ودانش اور اہل جاہ وثروت کے دماغوں کو مسخر کیا۔ دور سے دیکھنے والے کبھی اس کی ذات کے اسرار نہ جان سکے۔ جس نے جو سمجھا، قیاس کیا مگر وہ امریکی ٹی وی اور اخبارات میں بیان دیتا رہا، چیختا رہا کہ پاکستان کے شمالی علاقے، افغانستان کے شورش زدہ علاقے تبھی امن کا گہوارہ بنیں گے جب وہاں تعلیم عام ہوگی۔ آپ تعاون کریں میں وہاں اسکولوں کی قطار بناؤں گا۔ سیکڑوں گاؤں مستفیض ہوں گے۔ علم کی شمع ہر سو جل اُٹھے گی اور جہالت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ جہالت ختم ہوگی تو ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔ دہشت گردی اپنی موت آپ مرجائے گی۔ مگر جب اہلِ دل حضرات نے ڈالرز کی برسات کی تو راز کھلا کہ.....

لاکھوں لاکھ ڈالرز خرد برد کرنے والے ایک امریکی کا تذکرہ

بہتر ہے، میں آغاز ہی میں واضح کر دوں کہ یہ میری کہانی نہیں ہے!

دراصل میری بے رنگ زندگی میں ایسا کوئی اَن ہونا واقعہ رونما ہی نہیں ہوا جسے سن کر آپ محظوظ ہوں۔ اگر میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی کہانی سنانے کی کوشش بھی کی تو فقط سمع خراشی کا باعث بنوں گا اور میں ایسا قطعی نہیں چاہتا۔

میں تو آپ کو ایک ایسے منفرد امریکی کوہ پیما کی کہانی سنانا چاہتا ہوں، جس کا قصۂ زیست کئی برسوں تک بین الاقوامی دنیا کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ جس نے زندگی کے ایک خاص موڑ پر سماجی خدمت کے میدان میں قدم رکھا، پاکستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور افغانستان کے پس ماندہ دیہی علاقوں میں علم کی شمع روشن کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور اپنے جواں عزم سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

آپ ضرور تفصیلات جاننا چاہتے ہوں گے؟ سنیے، جذبے سے سرشار اس بلند حوصلہ شخص نے اب سے سولہ برس قبل ایک ایسی فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھی، جس کے تحت پاکستان اور افغانستان میں ڈیڑھ سو سے زائد اسکول قائم کیے گئے، وسائل اور بنیادی سہولیات سے محروم غریب طبقے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے پانچ سو سے زائد اساتذہ کا انتظام کیا گیا۔ اگر اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو ان درس گاہوں سے 64 ہزار بچے بچیاں علم کی روشنی سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ عزم و ہمت کے اس پیکر نے 9/11 جیسے تلخ سانحے کے بعد بھی اپنا نیک مشن جاری رکھا۔ امریکا کے افغانستان پر حملے کے بعد بھی اُس کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ یورش گروں کی بڑھتی قوت بھی اُسے نہیں توڑ سکی۔

وہ شخص۔۔۔ اوہ، ذرا ٹھہریے۔ میرے خیال میں مجھے یہاں اپنے اور اُس شخص کے تعلق کی وضاحت کر دینی چاہیے۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ میری کہانی اُس بہادر انسان کی کہانی سے جُڑی ہوئی ہے۔ شاید میں اُس کے بچپن کا دوست ہوں یا اُس کا قریبی ساتھی ہوں۔۔۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ نہ تو میں اس کے بچپن کا دوست ہوں، نہ ہی ساتھی! ہاں، چند برس قبل میری اُس سے ملاقات ضرور ہوئی تھی۔ انتہائی مختصر ملاقات۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں کئی برسوں تک اُسے اپنا آئیڈیل مانتا رہا۔

آپ میرا نام جاننا چاہتے ہیں؟ معذرت خواہ ہوں، میں آپ کو اپنا اصل نام نہیں بتا سکتا۔ البتہ آپ مجھے جارج کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ میرا تعلق امریکا کے شہر شگاگو سے ہے۔ میری عمر 34 برس ہے۔ میں ایک مارکیٹنگ منیجر ہوں اور اِس وقت ساحلِ سمندر پر بیٹھا، لہروں کے دل موہ لینے والے شور سے بے پروا اپنے لیپ ٹاپ پر یہ کہانی ٹائپ کر رہا ہوں جسے مکمل کرنے کے بعد میں اسے دنیا کے مختلف ممالک سے نکلنے والے جریدوں کے مدیران کو بہ ذریعہ ای میل ارسال کر دوں گا، لیکن اپنے اصل نام سے نہیں، بلکہ قلمی نام سے!

بہتر ہے کہ اِس مقام پر میں اُس کا شخص کا مختصراً تعارف کروا دوں، جسے میں کبھی قابلِ تقلید سمجھا کرتا تھا۔ یہ کہانی تو بہر حال اُسی کی ہے!

اُس کا نام گریگ مورٹنسن ہے۔ کبھی اُسے پہاڑوں کی چوٹیاں اپنی طرف پکارتی تھیں، لیکن پھر۔۔۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق پاکستان کے ایک پس ماندہ گاؤں ''کروفے'' میں پیش آنے والے ایک واقعے نے اُس کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور اُس نے خود کو علم کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ پھر اِس میدان میں ایسے ایسے کارنامے اُس سے منسوب ہوگئے کہ سُننے والے انگشت بدنداں رہ جائیں۔ ان ہی کارناموں کے پیشِ نظر 2009ء میں اسے نوبل انعام برائے امن کے لیے نامزد کیا گیا۔ دنیا کے کئی ممالک کی جانب سے اپنے اہم ترین شہری اعزازات سے نوازا گیا۔ ان ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے، جہاں اُسے ستارۂ پاکستان جیسا اعزاز ملا۔

اوہ۔۔۔ اصل بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ چند برس قبل گریگ نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اُس نے 93ء میں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے۔ ٹو سر کرنے کی مہم کی روداد بیان کی تھی جو ایک المیے کی شکل اختیار کر گئی تھی لیکن پھر اسی المیے کے باطن میں امید کے دیے روشن ہوئے اور اُس نے اپنا مقصدِ زیست پالیا۔

اِس کتاب نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اُس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اُسے متعدد ادبی اعزازات سے نوازا گیا۔ کیا آپ یقین کریں گے؟ یہ کتاب لگاتار چار برس تک نیویارک ٹائمز بیسٹ سیلرز کی فہرست کا حصہ بنی رہی۔۔۔ لگاتار چار برس!

ان ہی حیران کن کارناموں نے گریگ کو سماجی خدمت کا اہم ترین نام بنا دیا۔ ہزاروں نوجوانوں کا ہیرو۔ اُسے منارۂ اُمید، قابلِ تقلید قرار دیا جانے لگا۔ دنیا بھر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ وہ امریکا سمیت ترقی یافتہ ممالک کی اہم ترین یونیورسٹیوں میں لیکچرز دینے لگا۔ لوگوں کو عظیم مقاصد کے لیے جینے کا ڈھنگ سکھانے لگا۔ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے امن کے قیام کے لیے خود کو جُت دینے کا پیغام دیتا رہا۔ یہاں تک کہ 2011ء کا سال آگیا، جس کے بعد اچانک۔۔۔ بڑے ہی غیر متوقع انداز میں اس بین الاقوامی شہرت یافتہ کارکن کے زوال کا آغاز ہوگیا۔ اُس کی شہرت الزامات کی زد میں آگئی، اس پر انگلیاں اُٹھنے لگیں، اسے کرپٹ کہا جانے لگا، فنڈز میں گھپلوں کا ذمے دار قرار دیا جانے لگا۔ اُسے ایک چالاک مصلح سمجھا جانے لگا۔

الزامات کی اِس تیزابی برسات نے گریگ کے لاکھوں چاہنے والوں کو حیرت اور کرب کی کھائی میں دھکیل دیا۔ وہ اِن پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اس

وقت ششدر رہ گئے جب غفلت کے الزامات دُرست ثابت ہوئے۔ وہ واقعی جعل سازی کا مرتکب ہوا تھا۔ چیریٹی کے نام پر اکٹھی کی جانے والی رقم میں تھیلے ہوئے تھے۔

یوں دنیا کے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کرنے والا گریگ مورٹنسن یکدم ہیرو سے زیرو ہوگیا۔

گریگ کے چاہنے والوں کی طرح اس واقعے نے مجھے بھی دکھ دیا۔ اور میں گریگ سے متنفر ہوگیا۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے اُس نے میرے جذبات سے کھلواڑ کیا، مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں گہرے صدمے میں تھا اور مجھے گریگ سے نفرت ہوگئی تھی۔

اُن حالات میں میرے لیے اپنے کام پر دھیان دینا ممکن نہیں رہا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی فرم سے چند روز کی چھٹی لی، ضروری سامان اُٹھایا اور ایک دور افتادہ ساحلی شہر پہنچ گیا۔ اور ٹھیک اس لمحے، جب یہ کہانی ٹائپ کی جا رہی ہے، میں اُس شہر کے پُرسکون ساحل پر موجود ہوں۔

یہاں آنے کے بعد مجھے سکون سے اِس پورے معاملے پر غور کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سوچا، کیا میری نفرت درست ہے؟ کیا گریگ معاشرے کے لیے مضر ہے؟ کیا وہ حقیقتاً ایک جعل ساز ہے؟ مصلح بن کر لوگوں کو لوٹنے والا ٹھگ ہے؟

جُوں جُوں میں اس معاملے پر غور کرتا گیا، دھند چھٹنے لگی، ایک نئی تصویر اُبھرنے لگی اور میرے خیالات بدلنے لگے۔

شاید میں جذباتی ہوگیا تھا۔ شدید غصے میں تھا اِس لیے واقعات کا دوسرا رُخ دیکھنے سے قاصر رہا۔

یوں میرے دل میں یہ خواہش پنپنے لگی کہ دیگر افراد بھی جن میں میرے قریبی دوستوں کے علاوہ میری سابق گرل فرینڈ نکول بھی شامل ہے، اِس معاملے کا نئے زاویے سے جائزہ لیں۔ بس، یہی سوچتے ہوئے میں نے یہ کہانی لکھنے کا فیصلہ کیا جس کا باقاعدہ آغاز 2008ء کے موسمِ سرما کی اُس خوشگوار، نرم دوپہر سے ہوتا ہے جب گریگ مورٹنسن تاریخی اہمیت کی حامل کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک کے ''کولمبیا بزنس اسکول'' میں ایک لیکچر کے لیے آیا تھا۔ اُسی روز میری اُس سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی!!

''یہ قصہ طویل ہے، کیا آپ سُننا چاہیں گے؟'' اُس کی گرج دار آواز کولمبیا بزنس اسکول کے سیمینار ہال میں گونجی جہاں اُس شام تِل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

''ضرور ہم سُننا چاہیں گے۔'' سیکڑوں طلبا و طالبات

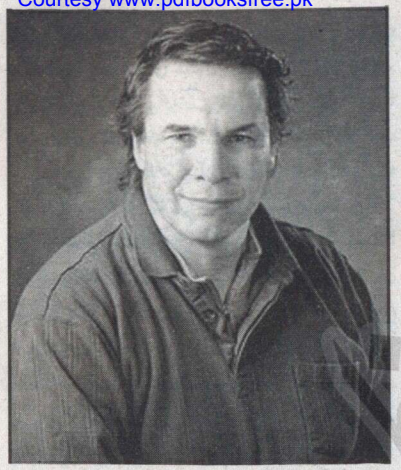

نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ اُن کے چہروں پر اشتیاق تھا، مسرت تھی۔ جب دراز قد گریگ اسٹیج پر آیا تھا تو انہوں نے بھرپور تالیوں سے اس کا استقبال کیا تھا۔

سیمینار کے منتظمین کے چہروں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ وہ خوش تھے کہ انہوں نے امریکا کے معروف ترین سماجی کارکن اور فروخت کے تمام تر ریکارڈ توڑ دینے والی کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' کے مصنف کو اپنی یونیورسٹی میں مدعو کرنے میں کامیاب رہے، جس کے اسٹیج پر آتے ہی یہ ثابت ہوگیا کہ یہ تقریب ضرور یادگار ثابت ہوگی۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک ہفتے قبل جیسے ہی یونیورسٹی میں یہ اعلان کیا گیا کہ موسمِ سرما کے آخری سیمینار میں مسٹر گریگ مورٹنسن لیکچر دیں گے، طلبا و طالبات جوش سے بھر گئے اور دو دن کے اندر اندر سیمینار ہال کی بیشتر سیٹیں بک ہوگئیں۔

حالانکہ ہال کافی بڑا تھا لیکن تقریب والے روز گریگ کی آمد سے قبل ہی تمام کرسیاں بھر چکی تھیں، کئی اسٹوڈنٹ نشست نہ ہونے کے باعث کھڑے رہنے پر مجبور تھے اور کرسیوں سے محروم اُن طلبا میں، میں بھی شامل تھا!

میں نے گریگ کے بارے میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ اُسے لیکچر کے لیے مدعو کیا گیا ہے تو میں نے اِس جانب زیادہ توجہ نہیں دی لیکن آنے والے چند دنوں میں جب طلبا و طالبات کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھے، اُن کے ہاتھوں میں گریگ کی کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' دیکھی تو تجسس کے زیرِ اثر میرے خیالات بدلنے لگے اور میں سیمینار میں شرکت کی بابت سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اصل بات یہ تھی کہ ''چائے کی تین پیالیاں'' کی ایک ساتھ اتنی زیادہ کاپیاں بکتے دیکھ کر میں بوکھلا گیا تھا اور میرے دل میں بھی یہ خواہش پنپنے لگی تھی کہ اِس کتاب کا مطالعہ کروں، تاہم جب میں نے یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کا رُخ کیا اور لائبریرین سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میرے سر پر سینگ ہوں۔

جب میں نے اُس بزرگ سے یوں مسلسل گھورنے کا سبب دریافت کیا تو گہرا سانس سینے میں اُتارتے ہوئے اُس نے مجھے بتایا کہ لائبریری میں موجود اِس کتاب کی تمام کاپیاں دو روز قبل ''ایشو'' کروائی جا چکی ہیں۔

جب میں نے اُس شریف النفس آدمی کے سامنے خیال ظاہر کیا کہ شاید یونیورسٹی کے دیگر شعبوں کے کتب خانوں سے یہ کتاب مل جائے تو اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے میری حماقت پر افسوس کا اظہار کیا اور پھر چہرے پر ہمدردی سمیٹتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ یونیورسٹی کے ہر کتب خانے سے یہ کتاب ایشو کروائی جا چکی ہے۔ بہتر یہ کہ میں انتظار کروں کیونکہ سیمینار کے اختتام سے قبل کتابوں کی واپسی ممکن نہیں۔

جب میں حیرت اور مایوسی کا بوجھ اُٹھائے لائبریری سے باہر جا رہا تھا، اُس نے یہ کہہ کر میرے دل میں سلگتی آخری چنگاری بھی بجھا دی کہ یہ کتاب شہر کے بک اسٹورز پر بھی دستیاب نہیں۔

''یہ نایاب ہو چکی ہے نوجوان!'' اُس نے عینک کے پیچھے سے گھورتے ہوئے کہا۔ یوں میں تحیر کے نرغے میں آیا جس کے زیرِ اثر میں اُس شام سیمینار ہال پہنچ گیا، جہاں اب میں سیکڑوں طلبا کی طرح کھڑے رہنے کی اذیت سہہ رہا تھا جنھوں نے نشست بک کروانے کے معاملے میں غفلت برتی۔

میں واضح کر دوں کہ یہ تمام تفصیلات میں بلاسبب بیان نہیں کر رہا۔ اِن کا مقصد پڑھنے والوں پر یہ عیاں کرنا ہے کہ گریگ کی آپ بیتی مقبولیت کی کس انتہا پر پہنچ چکی تھی۔

''۔۔۔ قصہ طویل ہے، کیا آپ سُننا چاہیں گے؟'' ڈائس پر موجود گریگ کی آواز گونجی اور تمام طلبا نے یک زبان ہو کر اثبات میں جواب دیا۔

''شکریہ دوستو!'' اس کے ہونٹوں پر پُراعتماد مسکراہٹ تھی۔ ''میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ بور نہیں ہوں گے!''

اُس نے ایک نظر ہال پر ڈالی جہاں موجود ہر چہرے پر اشتیاق تھا اور پھر اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ اب قیام امن کے لیے سرگرم گریگ جادوئی اسلوب میں اپنی ابتدائی زندگی کا قصہ بیان کر رہا تھا جو دلچسپی کے تمام لوازمات سے بھرپور تھا۔ پھر اُس کے بیان کرنے کا انداز بھی اتنا دلکش اور پُراثر تھا کہ ہر کوئی اُس کے سحر میں کھو گیا۔

گو کہ میرا بیانیہ اُس سا پُراثر اور مربوط تو نہیں، لیکن پھر بھی میں اپنے الفاظ میں اُس کی کہانی بیان کرنے کی کوشش کروں گا!

یہ سینٹ کلاڈ ہے، امریکی ریاست منیسوٹو (Minnesota) کا مرکزی شہر، جہاں کی آب و ہوا عجیب ہے کہ موسم گرما میں یہاں کے باسیوں کو جس میں سانس لینا پڑتا ہے دورِ موسم سرما میں برف باری جھیلنی پڑتی ہے۔ اِسی شہر میں گریگ نے 27 دسمبر 1957ء کو مذہبی تشخص کے حامل ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جو برسوں سے لوتھری عقائد پر کاربند تھا۔ ماضی میں اِس خاندان کے کئی افراد مذہبی مبلغ و مصلح کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے۔

گریگ کے باپ ارون کو خاندان میں کلیدی حیثیت حاصل تھا۔ وہ ایک باصلاحیت لیڈر تھا اور لیڈر شپ کی قابلیت گریگ کو اپنے باپ ہی سے ملی۔

گریگ پیدا تو امریکا میں ہوا لیکن اُس کا بچپن افریقا کے پُراسرار خطے میں گزرا۔ جب شعور کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو تنزانیہ کے ایک چھوٹے سے قصبے موسی میں پایا جس کا رقبہ فقط 59 کلومیٹر تھا۔ یہ افریقا کی بُلند ترین چوٹی کلیمنجارو کے نشیب میں واقع تھا۔

سبزے سے گھرے اُس قصبے کا ماحول انتہائی صحت بخش تھا۔ گریگ کا باپ ارون ''کلیمنجارو کرسچن میڈیکل سینٹر'' نامی ادارے کا ڈیولپمنٹ ڈائریکٹر تھا۔ یہ ادارے تنزانیہ میں قائم ہونے والا ایسا پہلا باقاعدہ اسپتال تھا جہاں طلبا و طالبات کے لیے تدریسی سہولت موجود تھی۔

گفتگو اور تقریر کے فن میں طاق ارون کا بنیادی وظیفہ اُس اسپتال کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ وہ اپنی شعلہ بیانی سے افریقا اور امریکا کے دولت مندوں کے دل میں ہمدردی کی آگ دہکاتا، انھیں اپنی تجوریاں کھولنے کی تحریک دیتا اور بیشتر معاملات میں وہ کامیاب رہتا۔

یہی کام مستقبل میں گریگ بھی انجام دینے والا تھا، تاہم کم سنی میں اُسے اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا۔ اس کے خواب تو کچھ اور تھے۔

اُسے پہاڑیوں کی چوٹیاں اپنی جانب کھینچتی تھیں۔

خصوصاً کیلی منجورو کی چوٹی جہاں ایک آتش فشاں تھا، خاموش، شانت جو اُسے اپنا دوست معلوم ہوتا۔

گریگ کی ماں جریرنی بھی اپنے شوہر کی طرح ایک مذہبی مبلغ اور سماجی کارکن تھی۔ وہ ایک خوبرو عورت تھی۔ گو کہ وجاہت گریگ کو اپنے دراز قد باپ سے ملی لیکن رنگ کے معاملے میں وہ اپنی ماں پر گیا تھا جو موسی میں قائم فلاحی درس گاہ کی پرنسپل تھی اور قصبے کے مقامی افراد میں بہت مقبول تھی۔

''جیسا دیس ویسا بھیس'' ارون اِس مقولے پر کامل یقین رکھتا تھا۔ گو کہ اسے اپنے امریکی ہونے پر فخر تھا تاہم ایک مذہبی مبلغ کی حیثیت سے وہ اس بات سے کماحقہ واقف تھا کہ لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مبلغ مقامی رنگ میں رنگ جائے۔ وہی زبان بولے جو اس کے اردگرد بسنے والے بولتے ہیں۔ ویسی غذا کھائے جو وہ افراد کھاتے ہیں جنھیں وہ اپنے عقائد کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی بیوی بھی اِن ہی خیالات کی حامل تھی۔ یہی سبب ہے کہ اِس جوڑے کو مقامی افراد بہت پسند کرتے تھے۔

اُسی ماحول میں گریگ پروان چڑھا۔ وہیں اُس کا بچپن گزرا۔ گھنے جنگلوں اور سرسبز پہاڑوں کے درمیان اُس نے بالیدگی کی جانب قدم بڑھایا۔ گو کہ جس کمیونٹی میں اُس کی رہائش تھی، وہاں چند غیر ملکی گھرانے بھی آباد تھے لیکن اُس نے اپنے باپ کی ہدایت پر مقامیوں سے بھی رابطہ رکھا۔ قصبے موسی کے کئی نوجوانوں سے اُس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ گھومتا پھرتا، پہاڑوں پر چڑھتا، دریا میں مچھلیاں پکڑتا۔ مقامی تہواروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ یوں اس نے خود کو مشرقی افریقا کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کا ہنر سیکھ لیا۔ وہ تنزانیہ کی مقامی زبان سووہیلی (Swahili) پر خوب گرفت رکھتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک خوشگوار زندگی گزار رہا تھا لیکن جب وہ پندرہ برس کا ہوا دُکھ کا طوفان پہلی بار اس کی پُرسکون زندگی میں وارد ہوا، جس نے اسے دہلا دیا۔

اُسے یہ سرسبز قصبہ، یہ ملک چھوڑنا تھا کیونکہ اُس کے باپ کی تنزانیہ میں تعیناتی کا عرصہ تمام ہو گیا تھا۔

جب اُسے یہ بات پتا چلی، وہ گہرے صدمے میں چلا گیا۔ ماضی میں وہ پانچ چھ بار اپنے خاندان کے ساتھ امریکا جا چکا تھا جو اُسے بہت اچھا لگا تھا لیکن اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اُسے اپنے پیارے دوست، وہ قصبہ جہاں اُس نے شعور کی آنکھ کھولی، وہ پہاڑ جو اُسے پکارتے تھے سب چھوڑ کر جانا پڑے گا۔

گریگ کے برعکس اُس کے ماں باپ بہت خوش تھے اور اُنھیں خوش ہونا بھی چاہیے۔ امریکا ان کا وطن تھا جو دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک تھا جہاں تعلیم و صحت سمیت ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ یہ تو پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی بیڑیاں تھیں جن کی وجہ سے اُنھیں مشرقی افریقا کے ایک دور افتادہ قصبے میں قیام کرنا پڑا۔

گو کہ اُنھیں موسی کے باسیوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ یہاں بہت خوش تھے لیکن اپنا وطن تو اپنا ہوتا ہے۔

دوسری جانب نوعمر گریگ کی ذہنی کیفیت یکسر مختلف تھی۔ وہ تو تنزانیہ ہی کو اپنا وطن سمجھ بیٹھا تھا۔ سو جب 72-71 میں اپنے اجداد کے قصبے مینیسوٹو پہنچا، اُسے وہاں کے ماحول، تیزی سے تبدیل ہوتے موسم سے ہم آہنگ ہونے میں خاصی دقت پیش آئی۔

اُسے روز ویلی کے علاقے میں قائم ریمسی ہائی اسکول میں داخل کروا دیا گیا جہاں ابتدائی دن بوریت سے بھرپور تھے۔ وہ کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں لے پاتا، چپ چپ رہتا۔ اُداسیاں اُس کے گرد ڈیرا ڈالے رکھتیں۔

شفیق ماں نے بیٹے کی دلجوئی کی بھرپور کوشش کی لیکن جب اُس نے محسوس کیا کہ گریگ کی حالت میں کوئی سدھار نہیں آ رہا تو اُس نے اپنے شوہر ارون کے سامنے مدعا بیان کیا۔

''ڈیئر، کیا تم نے نوٹ کیا، گریگ کھویا کھویا رہتا ہے؟''

ارون نے اخبار سے سر اُٹھا کر کہا۔ ''ہاں، مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔ اُسے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔''

''میں جانتی ہوں۔'' جریرنی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے خیال میں اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

اپنی بیوی کے لہجے سے جھلکتی سنجیدگی نے ارون کو چونکا دیا۔ اس شام میاں بیوی کے درمیان اس موضوع پر طویل گفتگو ہوئی۔ دوسری صبح جب گریگ بیدار ہوا تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ ڈیڈی نے اپنے دفتر سے تین دن کی چھٹی لے لی ہے اور اُس کا خاندان پکنک پر جا رہا ہے۔

''کیا واقعی؟'' اس کے لہجے میں مسرت تھی۔ اسکول نہ جانے کا خیال واقعی اُس کے لیے فرحت بخش تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں جونیر!'' اورون مسکرایا۔ ''ہم دریا کے قریب کیمپ لگائیں گے۔ مچھلیوں کا شکار کریں گے۔ قریبی جنگل کا بھی دورہ کریں گے۔''

''اوہ!'' گریگ کی آنکھیں چمک رہی تھیں، جنہیں دیکھ کر اس کی ماں جریرنی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ سینٹ کلاڈ کے شہری ماحول میں افریقا کے فطری رنگ ڈھونڈنے میں ناکامی کی وجہ سے اس کا بیٹا اُداسی کا شکار ہے۔ اسی نے اورون کو یہ مشورہ دیا کہ گریگ کو فطری نظاروں سے روبرو ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔

وہ تین دن یادگار تھے۔ نوعمر گریگ نے ہر وہ کام کیا جو وہ موسی میں قیام کے زمانے میں کیا کرتا تھا۔ جب وہ اپنے شہر لوٹا تو خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔

گھر کی دہلیز عبور کرنے کے بعد دراز قد اورون نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''جونیر میں تم سے ایک وعدہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کے بدلے تمہیں بھی ایک عہد کرنا ہوگا۔''

''میں سن رہا ہوں ڈیڈ!'' اُس نے کہا۔

''میں تمہیں ہر دو مہینے بعد کیمپنگ کے لیے لے جایا کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔۔۔'' اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''لیکن تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ تم خوب دل لگا کر پڑھو گے اور ہائی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد فوج میں خدمات انجام دو گے!''

''ضرور، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں!'' اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

گریگ نے اپنا وعدہ نبھایا۔ وہ اٹل ارادوں اور بلند حوصلے کا حامل ایک پُرجوش نوجوان تھا، بالکل اپنے باپ کی طرح جس چیز کا تہیہ کر لیتا، اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتا۔

سو اَب اس نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اسکول میں وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا اور کمال کا ایتھلیٹ تھا۔ خصوصاً فٹ بال کے کھیل میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

گفتگو کے فن میں مہارت تو اُسے باپ سے وراثت میں ملی تھی، سو اس نے جلد ہی نئے دوست بھی بنا لیے، جن کے ساتھ گھومنے پھرنے کا، موج مستی کرنے کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اورون نے اسے ہر دو ماہ بعد کیمپنگ پر لے جانے کا سلسلہ ترک کر دیا کہ وہ ہر ویک اینڈ پر خود ہی دریاؤں، پہاڑوں کی سمت نکل جاتا۔

گریگ نے اپنا عہد نبھایا۔ ہائی اسکول کا مرحلہ طے کرنے کے بعد وہ 1975ء میں امریکی آرمی کا حصہ بن گیا۔ اس زمانے میں ہر نوجوان فوج میں خدمات انجام دیا کرتا تھا۔ یہ ایک طرح سے لازمی تھا لیکن گریگ کے لیے فوج کا حصہ بننا جبری معاملہ نہیں تھا۔ وہ تو بہت خوش تھا کیونکہ آرمی سے وابستگی کے بعد اسے ایک ایسی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا تھا جو ایڈونچر سے بھرپور تھی۔

اُسے جرمنی میں خدمات انجام دینی تھی اور اس سلسلے میں وہ خاصا پُرجوش تھا۔

''مجھے ایک بار پھر نئے ماحول سے خود کو ہم آہنگ کرنے کا پُرلطف موقع ملے گا۔'' ایک روز اس نے اپنے دوست سے کہا، جو اس کے مزاج سے بہ خوبی واقف تھا۔

''ہاں برادر، امید ہے یہ تجربہ شان دار رہے گا!''

اور یہ تجربہ واقعی شان دار رہا۔ اس نے 1975ء سے 1977ء تک جرمنی کے مشکل ماحول میں خدمات انجام دیں جہاں کے تجربات نے اُسے مستقبل کے مصائب کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور انجانی راہوں پر نکل پڑنے کا جذبہ عطا کیا۔

وہ جرمنی میں قیام کے زمانے میں باقاعدگی سے اپنے والدین اور دوستوں کو خط لکھا کرتا، انہیں اپنے تجربات سے آگاہ کرتا اور ان سے مشورے کرتا۔

ایک جانب جہاں اس کے احباب مسرور تھے کہ گریگ محاذ پر اہم خدمات انجام دے رہا ہے، وہیں انہیں یہ اندیشہ بھی لاحق رہتا کہ کہیں اسے کوئی بھاری نقصان نہ اُٹھانا پڑے۔ کیونکہ بُری خبروں کا تانا بانا بندھا ہوا تھا جس کی وجہ سے فوج میں خدمات انجام دینے والے نوجوانوں کے خاندان ہمہ وقت پریشان رہا کرتے تھے۔

گریگ خوش قسمت رہا۔ وہ نہ صرف حادثے سے محفوظ رہا بلکہ اُسے شان دار خدمات کے عوض آرمی کی جانب سے توصیفی میڈل سے بھی نوازا گیا۔

وہ اُس کی زندگی کا یادگار ترین پل تھا۔ جب یہ اطلاع اورون کو ملی، اُس کا سینہ احساسِ تفاخر سے پھول گیا۔

''اب ہمارا بیٹا ایک حقیقی امریکی ہے!'' اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

جب گریگ جرمنی سے لوٹا، وہ توانائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ کر دکھانے کا جذبہ اُسے ہمہ وقت مصروف رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ ریاست کے کئی پہاڑی سلسلوں کے دورے کیے۔ دراصل کوہ پیما بننے کا جذبہ اُس میں بہ درجہ اتم موجود تھا۔ چوٹیاں سر کر کے وہ مسرت سے

بھر جاتا۔ وہ دنیا کے معروف کوہ پیماؤں کی آپ بیتیاں بڑی توجہ اور یکسوئی سے پڑھا کرتا تھا اور اُن سا بننے کا خواب دیکھتا۔

تعلیم کی اہمیت سے بھی وہ بہ خوبی واقف تھا۔ باپ سے کیا وعدہ یاد تھا، سو وہ کسی قسم کی غفلت نہیں برتنا چاہتا تھا۔ جب اس نے کالج میں جانے کا ارادہ باندھا تو باپ کے مشورے پر مورہیڈ کے علاقے میں قائم کورڈیا کالج کا چناؤ کیا جو اس زمانے کا بہترین کالج تھا۔ گو کہ داخلے کی شرائط خاصی سخت تھیں، تاہم ایک ایتھلیٹ اور آرمی کے جانب سے ایوارڈ یافتہ نوجوان کے لیے کالج کی انتظامیہ نے اپنے دروازے کھول دیے۔

1979ء میں اس نے کالج کا مرحلہ بھی کامیابی سے طے کر لیا۔ اُس عرصے میں گریگ کی صلاحیتوں کے طفیل کالج نے کھیلوں کے کئی مقابلوں میں فتح حاصل کی۔ مقامی اخبارات میں اس کی بابت خبریں بھی شائع ہونے لگیں جن کی کٹنگ وہ اپنے کمرے کی دیوار پر چسپاں کر دیتا تھا اور ہر رات سونے سے پہلے خواب دیکھتا کہ ایک روز دنیا بھر کے اخبارات میں اُس کے بارے میں خبریں شائع ہوں گی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں اُتر جاتا۔

اِس عرصے میں اس نے کوہ پیمائی کی مشق جاری رکھی۔ باقاعدہ تربیت بھی حاصل کی۔ گریگ نے مختلف ٹیموں کے ساتھ امریکا کی کئی ریاستوں کا دورہ کیا، وہاں کے پہاڑی سلسلوں میں ہفتوں قیام کیا۔ کئی اونچی اونچی چوٹیاں سر کیں۔

وہ فٹ بال کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے طفیل داد بٹورتا رہا۔ کچھ ہی برسوں بعد اُس نے یونیورسٹی آف ساؤتھ ڈیکوٹ سے گریجویشن کی سند بھی حاصل کر لی۔ الغرض اُس کی زندگی خوشیوں سے توانائیوں سے بھرپور تھی۔ آنکھوں میں مستقبل کی بابت حسین خواب تھے۔ امیدیں تھیں۔ اسی اثناء میں 1993ء کا سال آ گیا جس نے اُس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دی!

اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ تمام واقعات گریگ مورٹنسن نے ''کولمبیا بزنس اسکول'' میں ہونے والے اس سیمینار میں سنائے تھے، تو آپ غلط ہیں!

ہاں، اُس نے اپنے بچپن کی رُوداد مختصراً ضرور بیان کی۔ تنزانیہ کے شب روز کی چند یادیں بھی ہم سے بانٹیں۔ جرمنی کے چند قصے بھی سنائے تاہم اُس کا اصل موضوع تو بیسٹ سیلر کا درجہ حاصل کر لینے والی اُس کی کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' ہی تھی، جو 1993ء میں جنوبی ایشیا کی ایک ریاست پاکستان میں پیش آنے والے واقعے کی گرد گھومتی تھی جس نے اُسے زیست کے ایک نئے زاویے سے متعارف کروایا۔

تاہم اِس واقعے کو تفصیل سے بیان کرنے سے قبل گریگ نے چہرے پر روشن مسکراہٹ سجائے ہمیں اِس کتاب کی اشاعت سے جُڑا ایک واقعہ سنایا تھا جو ہمارے لیے خاصا حیرت انگیز ثابت ہوا۔

''میں نے سنا ہے کہ نوجوان میری سوانح عمری میں خاصی دلچسپی لے رہے ہیں، کیا یہ درست ہے؟'' جب اُس نے یہ سوال کیا تو ہال میں موجود تمام افراد نے بہ آواز بُلند جواب دیا۔ ''ہاں!''

گریگ مسکرایا۔ ''مجھے یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ گزشتہ برس کے اواخر میں شائع ہونے والی یہ کتاب ایک ہفتے میں کمیاب اور فقط ایک ماہ میں نایاب ہو گئی تھی۔ کیا یہ بھی درست ہے؟''

''بالکل۔۔۔ یہ درست ہے۔۔۔ یہ آج بھی نایاب ہے!'' ہال کے مختلف حصوں سے آوازیں بلند ہوئیں، جن میں میری دکھ بھری آواز بھی شامل تھی۔ میں بھی تو اُسے حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

گریگ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی انکشاف کرنے کو ہے، کچھ ایسا کہنے کو ہے جسے سن کر ہم ہکا بکا رہ جائیں گے۔

بالآخر چند لمحوں کی پُراسرار خاموشی کے بعد اس کے لب وا ہوئے اور اُس کی بارعب آواز ہال میں گونجی:

''کیا آپ یقین کریں گے کہ گزشتہ کئی ماہ سے بیسٹ سیلر کی فہرست میں نمبر ون کے درجے پر فائز میری کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' جس نے مجھ جیسے ایک عام انسان کو بین الاقوامی شخصیت بنا دیا ہے، 2006ء کی ایک ناکام کتاب تھی!''

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ اتنی گہری کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اس سناٹے نے گریگ کی مسکراہٹ کو مہمیز کیا۔ اس نے پھر سوال کیا۔ ''کیا آپ یقین کریں گے ''چائے کی تین پیالیاں'' ایک ناکام کتاب تھی؟''

''نہیں۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔۔۔ آپ مذاق کر رہے ہیں!'' اِس بار پر ہال کے مختلف کونوں سے تحیر زدہ آوازیں سنائی دیں جن میں میری آواز قطعی شامل نہیں تھی۔ اِس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انکشاف کے بعد میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں دوستو۔۔۔ میرے خیال میں پاکستان میں پیش آنے والے واقعے سے قبل اگر میں یہ قصہ بیان کردوں تو بہتر ہوگا۔۔۔''

ایک بار پھر گریگ مورٹنسن کی اُتار چڑھاؤ سے بھرپور آواز ہال میں رقصاں تھی۔

اُس نے بتایا، یہ کتاب 2006ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی تھی، لیکن مناسب تشہیر کے باوجود یہ عوام کی توجہ نہیں حاصل کرسکی اور اِس کی فقط بیس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں۔

''فقط بیس ہزار!'' اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ٹھنڈے ہال میں خاموشی تیر رہی تھی۔ ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ کتاب کی عدم پذیرائی کا سبب کیا رہا ہوگا۔

گریگ نے خود ہی اس کا جواب دے دیا۔ ''کتاب کا عنوان تو یہی تھا، یعنی چائے کی تین پیالیاں۔۔۔ مواد بھی لفظ بہ لفظ یہی تھا جو موجودہ پرنٹ میں موجود ہے۔ بس مسئلہ تھا ذیلی عنوان کا۔ فقط ذیلی عنوان۔۔۔ جس کی وجہ سے کتاب عوام کی توجہ حاصل نہیں کرسکی۔''

ہم چہرے پر تعجب لیے اُسے سنتے رہے۔

''۔۔۔ دوستو، اس وقت کتاب کا پورا نام کچھ یوں تھا۔ ''چائے کی تین پیالیاں: ایک شخص کی دہشت گردی کے خلاف جدوجہد!'' بس اسی سبب کتاب پذیرائی حاصل نہیں کرسکی۔ حالاں کہ یہ معمولی بات تھی، لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس ذیلی عنوان کی وجہ سے سارا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ سو میں اسے تبدیل کروانے کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔ ابتدا میں تو پبلشر میری بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے، میاں تمھیں کیا پتا پبلشنگ کا۔ چلو نکلو یہاں سے۔۔۔'' اُس نے ایک جان دار قہقہہ لگایا، جس کا ہم سب نے ساتھ دیا۔

''خیر۔۔۔'' اُس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''بالآخر میں نے اُنھیں ذیلی عنوان تبدیل کرنے کے لیے راضی کرلیا۔ 2007ء میں جب اس کا پیپر بیک ایڈیشن شائع ہوا، تو ذیلی عنوان کچھ یوں تھا ''ایک شخص کی جدوجہد امن کے فروغ کے لیے!'' جناب، اس معمولی تبدیلی نے جیسے سب کچھ بدل دیا۔ یہ کتاب بیسٹ سیلر بن گئی، چند ہفتوں میں!''

گریگ نے ایک نظر سامعین پر ڈالی اور پھر گویا ہوا۔ ''اس کا ایک سبب تھا، واضح سبب۔۔۔ دراصل جب آپ دہشت گردی کے خلاف لڑ رہے ہوتے ہیں، اس وقت آپ کے عمل کا محرک خوف ہوتا ہے لیکن جب آپ امن کے آرزومند ہوتے ہیں تو آپ کی جدوجہد پر امید سایہ فگن ہوتی ہے۔ اور یہ کتاب امید کی کہانی بیان کرتی ہے جسے میں نے معروف صحافی اور اپنے عزیز دوست ڈیوڈ اولور کے اشتراک سے لکھا ہے۔ یہ قصہ سنانے کا سبب یہ ہے کہ آپ سمجھ سکیں، کبھی کبھار معمولی سی تبدیلی انسان کی زندگی بدل دیتی ہے!''

ہال میں مکمل خاموشی تھی جس میں گریگ مورٹنسن کے لیے عقیدت تیر رہی تھی۔

اُس یادگار شام جس نے مجھ سمیت کئی نوجوانوں کی زندگیاں بدل دیں، گریگ نے قراقرم کے پہاڑی سلسلے میں پیش آنے والا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ 93ء میں کوہ پیمائی کے عشق میں مبتلا اِس نوجوان نے اپنے چند باہمت دوستوں کے ساتھ آزاد کشمیر کا رُخ کیا۔ بے شک اُسے نئی ثقافتوں سے روشناس ہونے کا شوق تھا، لیکن اس دورے کا اصل مقصد دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے۔ ٹو سر کرنا تھا۔

یہ خیال گریگ ہی کو سوجھا تھا۔ دراصل وہ کے۔ ٹو سر کر کے اپنی مرحوم بہن کرسٹا کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا تھا جس نے اپنی مختصر سی زندگی میں ہر محاذ پر گریگ کا ساتھ دیا۔ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ کرسٹا نوجوانی ہی میں جہانِ فانی سے کوچ کرگئی تھی اور اب گریگ اپنی بہن کی یاد میں کے۔ ٹو کی بلند ترین چٹان پر بہ طور نشانی اُس کا ایک ٹیکس چھوڑنا چاہتا تھا۔

مجھے یاد ہے، اُس دوپہر گریگ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''۔۔۔ دوستو، وقت کی کمی کے باعث میں مختصراً بیان کروں گا۔ اگر آپ تفصیلات جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو کتاب خریدنی پڑے گی، تاکہ مجھے اور میرے پبلشر کو کچھ فائدہ حاصل ہو۔''

اِس جملے پر ہم سب نے قہقہہ لگایا۔

اس نے بڑے ہی پُراثر انداز میں بیان کیا کہ کیسے اُس نے پہاڑ کے دامن میں تجسس سے بھرپور، ٹھٹھرتے ہوئے کئی ہفتے گزارے، جن میں سے ہر دن، نئی زندگی کی نوید بن کر آتا۔

ابتدائی تفصیلات کے بعد وہ اس موڑ پر آگیا، جب اُس نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ، زمین پر احساسِ تفاخر کے ساتھ ایستادہ برف سے ڈھکے پہاڑ کی چوٹی کی

جانب دشوار گزار سفر شروع کیا جس میں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں لیکن وہ ہمت کے سہارے، امید کو تھامے ہوئے آگے بڑھتے رہے، بڑھتے رہے۔۔۔ اِس یقین کے ساتھ کہ وہ چوٹی سر کرلیں گے لیکن پھر۔۔۔ ایک ہولناک حادثہ پیش آگیا، ویسا ہی حادثہ جو کوہ پیمائی کی طویل تاریخ میں کئی جانیں لے چکا ہے۔

اُن کا ایک ساتھی اُس برف پوش پہاڑ کے ایک حصے میں کچھ اس طرح پھنس گیا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُس کے زندہ رہنے کی امید مدہم پڑتی گئی۔ وہ خود اپنی مدد کرنے سے قاصر تھا، بے بس تھا، کلی طور پر اپنے ساتھیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ دوسری جانب اُس کے چاروں ساتھی جن میں گریگ بھی شامل تھا، بگڑتے موسم کی وجہ سے شدید مشکلات کا شکار تھے۔

اُنھیں چوٹی سر کرنے کی خواہش بھلا کر اپنے ساتھی کی مدد کرنی تھی، اُس کی جان بچانی تھی۔ گو کہ یہ آسان نہیں تھا کہ برف پوش پہاڑ اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ اُن سے مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ موسم اُن کے خلاف تھا لیکن بلند حوصلوں کا مالک گریگ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

وہ ''ریسکیو آپریشن'' 75 گھنٹوں پر محیط تھا، جس میں آنے والے اُتار چڑھاؤ کو گریگ کے پُراثر اندازِ بیاں نے ہمارے دلوں میں اُتار دیا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ اُس نے اپنے دوست کی زندگی بچالی لیکن سفر ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ ایک سانحہ ہونا باقی تھا۔

گریگ کے مطابق اُس روز جب وہ پہاڑ سے نیچے اُتر رہے تھے، بہ ظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا، موسم بھی خوشگوار تھا کہ اچانک انہیں خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو برف کا طوفان منہ کھولے اُن کی جانب آرہا تھا۔ وہ ایک قاتل تودے کی لپیٹ میں آنے والے تھے!

وقت کم تھا، اُنہیں اپنی جان بچانے کے لیے فوری فیصلہ کرنا تھا۔ ایسے میں اُنہیں جو محفوظ دراڑ نظر آئی، اُس کی جانب چھلانگ لگادی۔

اِس اچانک رونما ہونے والے حادثے کی وجہ سے گریگ اپنے ساتھیوں سے الگ ہوگیا۔ چند پلوں بعد جب اُس نے اُنہیں تلاش کرنے کی کوشش کی تو موسم اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ وارد ہوگیا۔ اُسے کئی گھنٹے ایک کوہ میں گزارنے پڑے۔ جب موسم بہتر ہوا، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا ہے۔ اُس کے پاس ساز و سامان کی کمی تھی۔ اب زندہ رہنے کا ایک ہی آسرا تھا کہ وہ ہمت جٹائے اور نیچے اُترنے کی کوشش کرے۔

مہم کے آغاز میں ترتیب دیے جانے والے منصوبے کے مطابق پانچوں کوہ پیماؤں کو چوٹی سے اُتر کر قراقرم کے پہاڑی سلسلے میں موجود ایک چھوٹے سے گاؤں اسکولے میں اکٹھے ہونا تھا۔

گریگ اندازے کے مطابق نیچے اُترتا رہا۔ موسم کے تھپیڑے سہتے ہوئے، بھوک برداشت کرتے ہوئے، کمزوری کے باوجود، اس یقین کے ساتھ کہ وہ جلد یا بدیر اسکولے پہنچ جائے گا لیکن جب اس کے پاؤں زمین سے لگے، ایک صدمہ منہ کھولے اُس کا منتظر تھا۔

وہ بھٹک چکا تھا۔ ہاں، اس کے سامنے انسانی آبادی تھی، زندگی تھی، لیکن یہ وہ مقام نہیں تھا۔۔۔ دوسری جانب مقامی افراد حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے اس تھکے ہارے انسان کو دیکھ رہے تھے، جو خستہ حالی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

گریگ کے بہ قول وہ ایک تنگ گھاٹی میں موجود، بنیادی سہولیات سے یکسر محروم کروفے (Korphe) نامی چھوٹا سا گاؤں تھا۔

گریگ تو امید چھوڑ بیٹھا تھا لیکن گاؤں کے شریف النفس باسیوں کی مہمان نوازی اُس کے لئے مرہم ثابت ہوئی۔ اُن کی محبت نے اُس کی کھوئی ہوئی توانائی بحال کردی اور اُن کی نیک طبیعت نے گریگ کو نئی فکر سے متعارف کروایا۔

یوں تو وہاں موجود ہر شخص محبت اور دوستی سے بھرپور تھا لیکن گاؤں کا سربراہ حاجی علی ایک ایسا انسان تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ ایک شفیق باپ کی طرح پیش آیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد جس شے نے گریگ کو سب سے زیادہ حیران کیا، وہ یہ تھی کہ گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔

جب گریگ وہاں سے لوٹ رہا تھا، اس نے گاؤں والوں سے وعدہ کیا کہ ایک دن وہ واپس آئے گا اور اُن کے گاؤں میں ایک اسکول قائم کرے گا۔

''۔۔۔ بس دوستو، اس وعدے نے مجھے بدل دیا۔'' گریگ نے ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے کہا۔ ایک نظر دستی گھڑی پر ڈالی، پھر بات آگے بڑھائی۔ ''میں نے پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کو اپنا مقصدِ زیست بنالیا لیکن یہ کسی طور آسان نہیں تھا۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے۔ٹوسر کرنے سے بھی مشکل تھا۔"

اس نے گہرا سانس لیا، ایک نظر سامعین پر ڈالی۔

"۔۔۔اس کے لیے بھاری سرمائے کی ضرورت تھی۔ میں نے کئی افراد سے رابطہ کیا، مستحکم تنظیموں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا لیکن کوئی پاکستان کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اسکول قائم کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ کسی کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں کے باسی کتنے ملن سار اور نیک فطرت ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں مایوس ہو گیا تھا، لیکن پھر میری ملاقات فرشتہ صفت جین ہورنی سے ہوئی جو سلیکون ویلی کی ایک بااثر اور قابلِ احترام شخصیت تھے۔ انہوں نے مجھے وہ عطیہ دیا جس کی مدد سے میں نے دوبارہ پاکستان کا رُخ کیا اور گاؤں کے باسیوں سے اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے کروفے میں ایک اسکول قائم کیا۔"

سامعین کی آنکھوں میں دلچسپی تھی اور گریگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔۔۔"دوستو، میں بہت خوش تھا۔۔۔ میں نے اپنا وعدہ نبھایا تھا، لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ایک اسکول تعمیر کرنا کافی نہیں، مجھے اس پس ماندہ علاقے میں مزید اسکول قائم کرنے ہوں گے، خصوصاً وہاں کی لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہوگا تاکہ وہ مستقبل میں بہتر ماں ثابت ہوں۔ بس یہی سوچ کر میں نے پھر جدوجہد شروع کر دی۔ پھر متمول افراد کے دروازے کھٹکھٹانے لگا۔ اس بار بھی جین ہورنی ہی سامنے آئے۔ گو کہ وہ اس وقت خاصے بیمار تھے، لیکن اُنھوں نے اِس نیک کام میں میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا بالآخر 1996ء میں ہم نے "سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ" نامی سماجی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد پاکستان اور افغانستان کے دور افتادہ علاقوں میں اسکول قائم کرنا تھا۔ یوں ایک عظیم مشن کا آغاز ہوا جس نے مجھے اور مجھ سے وابستہ ہر انسان کو بدل دیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!"

سب سانس روکے بیٹھے تھے اور گریگ گہری نگاہوں سے سامعین کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا جس پر اُس کے لیے احترام دمک رہا تھا۔

"دوستو، اسی عظیم مشن کے نتیجے میں، اسی نیک جدوجہد کے طفیل، گریگ مورٹنسن، ایک عام انسان، ایک کوہ پیما۔۔۔ بین الاقوامی شخصیت بن گیا۔ ایک رہنما بن گیا۔ اس نے اساطیری شہرت حاصل کر لی، لیکن حقیقتاً۔۔۔ وہ آپ جیسا ایک عام انسان ہے، اسے خاص بنایا ایک مقصد نے جس کی تفصیلات میری کتاب میں موجود ہیں۔ یہاں، اس خاص موقع پر میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ کیا آپ اس نیک مقصد میں میرا ساتھ دیں گے؟"

"ہاں!" سب نے یک زبان ہو کر کہا جیسے وہ کسی سحر کے زیرِ اثر ہوں۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔

گریگ نے اپنے دونوں بازو ہوا میں بلند کر لیے۔

"چلو دوستو، اُٹھ کھڑے ہو۔ میرا ساتھ دو، امن کے قیام کے لیے، دنیا کو بہتر مقام بنانے کے لیے۔۔۔ تعلیم سے محروم بچوں کے لیے۔۔۔ تمہارے سامنے ایک پلیٹ فورم ہے، سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ۔۔۔ اس نیک مشن کا حصہ بن جاؤ، تاکہ خدا کی رحمت تم پر نازل ہو۔ میں تمہاری محبتوں کا منتظر ہوں۔۔۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ دوستو!"

ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ تمام لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ فرطِ جذبات سے بیشتر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تقریب کے اختتام پر مجھ سمیت وہاں موجود کئی نوجوانوں نے اپنی جیبوں میں موجود رقم کا بڑا حصہ "سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ" کو دان کر دیا۔

بیکڑوں طلبا و طالبات کی طرح میں نے بھی اُس سرد شام جذبات سے کانپتے ہوئے گریگ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ساتھ دینے کا عزم کیا اور تقریب ختم ہوتے ہی نیویارک کے بک اسٹورز کی جانب دوڑ پڑا۔

آج سوچتا ہوں، ہم نوجوان واقعی دیوانے ہوتے ہیں۔۔۔ خوابوں میں جینے والے!

اُس برس موسمِ سرما اپنی پوری شدت کے ساتھ نیویارک پر حملہ آور ہوا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی سڑکوں پر ٹریفک غائب ہو جاتا تھا۔ شہری گرم گھروں میں خود کو آرام دہ پاتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ شاپنگ مال، سنیما گھروں اور ریسٹورنٹ انڈسٹری کی آمدنی خاصی گھٹ گئی تھی۔ جو تھوڑے بہت افراد ان مقامات کا رُخ کرتے بھی، وہ سارا وقت خود کو کوستے رہتے کہ انہوں نے اتنی سردی میں گھر سے باہر قدم ہی کیوں رکھا!

اور جس شام کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ تو سناٹے سے بھرپور تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ویرانی تھی اور "کولمبیا اسکول آف بزنس" کے سیمینار ہال سے نکلتے طلبا ٹھٹھرتے ہوئے شہر کے بک اسٹورز میں بھٹک رہے تھے۔

وہ جس اسٹور پر بھی جاتے، ایک ہی مایوس کن جواب ملتا۔ "کتاب ختم ہو گئی ہے، انتظار کریں۔۔۔ بہتر ہے آرڈر بک کروا دیں!"

اُس شام ایک بک اسٹور سے دوسرے کا رُخ کرنے والے نوجوانوں میں، میں بھی شامل تھا۔

میں دو اسٹورز پر ناکامی کا تلخ ذائقہ چکھ چکا تھا، اس لیے جب کوئنز اسٹور کے فلور منیجر نے بھی کتاب کا نام سن کر نفی میں سر ہلایا، میں ٹوٹ سا گیا اور شکستگی میرے چہرے سے ٹپکنے لگی جس نے بے چارے منیجر کے دل کو پگھلا دیا۔

"دیکھو نوجوان۔۔۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن شاید بروکلے اسٹور پر دو کاپیاں موجود ہوں۔ اگر تمہیں بہت جلدی ہے تو وہاں کا رُخ کرو!"

جب میں کوئنز اسٹور سے باہر نکلا، ایک سرد لہر میرے وجود سے ٹکرائی اور روح میں اُتر گئی۔ میں نے مفلر لپیٹا، جیکٹ میں ہاتھ گھسائے اور بروکلے اسٹور کی جانب چل دیا۔

جب میں وہاں پہنچا، اسٹور میں اُلو بول رہے تھے۔ سیلز مین نے جب کتاب کا نام سنا تو چند ساعت خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا گودام کی جانب چلا گیا۔

میرا اضطراب آخری سطح کو چھو رہا تھا، انتظار کا ہر لمحہ ایک صدی کے مانند تھا۔

چند منٹوں بعد جب وہ لوٹا، خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں۔ کتاب اُس کے ہاتھ میں تھی۔

"یہ آخری کاپی ہے برادر!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اپارٹمنٹ کی جانب لوٹتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد میں کافی کا گرم مگ ہاتھ میں لئے آرام دہ صوفے پر کتاب تھامے بیٹھا تھا۔

2007 میں منظرِ عام پر آنے والی وہ دلچسپ کتاب سال 2003ء تک کی داستان بیان کرتی تھی اور واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اگلے تین گھنٹوں تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ ایک ہی نشست میں کتاب ختم کی اور جب میں کھڑا ہوا، توانائی میرے بدن میں دوڑ رہی تھی۔ مجھے زندگی گزارنے کا مقصد مل گیا تھا، جس کے لیے میں گریگ کا ممنون تھا۔

رات گئے میں نے سڈنی میں بیٹھی اپنی گرل فرینڈ نکول کو ایک ای میل کی۔

"ڈیئر، آج میری ایک نابغۂ روزگار شخصیت سے ملاقات ہوئی، اس کی آپ بیتی پڑھی، جس کا نام گریگ مورٹنسن ہے۔ اس عظیم انسان کی نیک جدوجہد نے میری سوچ بدل دی۔ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا ہے۔"

میں نے "سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ" کی ویب سائٹ بھی وزٹ کی اور ادارے کے نام ایک پیغام چھوڑا جس میں انہیں اپنے کلی تعاون کا یقین دلایا۔

جب غنودگی میرے ذہن پر دستک دے رہی تھی، مجھے نکول کی ای میل موصول ہوئی، اُس نے لکھا تھا۔

"خدایا، تمہیں وہ کتاب کہاں سے مل گئی؟ میں اُسے سڈنی میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکی ہوں۔۔۔ کتاب فوراً مجھے روانہ کر دو!"

میں نے کہانی کا باقاعدہ آغاز 2008ء کے موسمِ سرما کی ایک اُجلی دوپہر سے کیا تھا، جس کے اختتام پر ایک سرد شام در آئی تھی جو سیاہی چھانے کے بعد ٹھٹھرتی رات میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن اُس رات نے مجھے امید سے، یقین سے بھر دیا۔

میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا کیونکہ اُسی دن میں نے گریگ سے ملاقات کی۔ اس کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس کی آپ بیتی "چائے کی تین پیالیاں" پڑھی اور سونے سے قبل خود کو اس کی جدوجہد سے وقف کر دیا۔ گو کہ بعد میں مجھے اِس فیصلے پر پچھتانا پڑا!

یہ چار سال پرانا واقعہ ہے اور آج ہم 2012ء کے وسط میں موجود ہیں۔ بہت سا پانی پُلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہے، حالات بدل چکے ہیں، گریگ کی عظمت کا بت پاش پاش ہو چکا ہے اور میں تفصیلات سے آگاہ ہوں لیکن یہ از حد ضروری ہے کہ میں آپ کو 2008ء کے بعد کے برسوں کی کہانی، کتاب میں درج قصّوں اور سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ (CAI) کی بابت قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے، مربوط انداز میں آگاہ کروں۔ ورنہ تو یہ داستان پیچیدگیوں کا شکار ہو جائے گی۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ اِس تنظیم کی بنیاد رکھنے کے بعد اگلے ہی برس نیک فطرت جین ہورنی کا انتقال ہو گیا۔ اب ادارے کی تمام تر ذمے داری گریگ کے کاندھوں پر تھی جس کی مشکلات میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا لیکن وہ بھی ارادوں کا پکا تھا۔

کتاب میں درج تفصیلات کے مطابق آنے والے برسوں میں گریگ کو قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان اور افغانستان کے پس ماندہ علاقوں میں جہاں سہولیات کا فقدان تھا، کام کرنا کسی طور سہل نہیں تھا۔

ہر سطح پر رکاوٹ، ہر موڑ پر مسائل۔ لوگوں کو چندہ دینے کے لیے متحرک کرنا بھی تو ایک بڑا چیلنج تھا۔ کوئی پس ماندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاقوں میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ بہرحال اسے چند نیک دل متمول افراد کی سرپرستی میسر آ گئی۔ اچھے ساتھی بھی مل گئے جن کی مدد سے اُس نے پاکستان میں کام شروع کیا۔

نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی قابلیت اور لسانی رکاوٹوں کو عبور کرنے کی مہارت کے طفیل وہ جلد ہی پاکستان کے شمالی علاقوں کے سادہ لوح باسیوں میں گھل مل گیا۔ اُسے پاکستان اپنا گھر لگنے لگا۔ کچھ برسوں بعد اس نے اپنی توجہ افغانستان کی جانب مبذول کرلی۔

گریگ اپنی کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' میں لکھتا ہے کہ اُن علاقوں کے باسیوں میں خاصا مذہبی رجحان پایا جاتا تھا جسے چند افراد نے گریگ کے خلاف استعمال کرتے ہوئے اُس کی جدوجہد کی راہ میں سماجی و مذہبی رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کر دیں۔ گریگ اُن علاقوں کی معصوم لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن وہاں بسنے والے جاگیردار اس خیال کے مخالف تھے، اس لیے اسے دھمکیاں بھی ملیں۔

گریگ نے لکھا کہ فنڈز حاصل کرنے اور مقامی افراد کو اپنا حامی بنانے کے بعد اُس کے لیے اگلا چیلنج مذہبی انتہاپسندوں کو قائل کرنا تھا، جو اسکولوں کے قیام کے کسی طور حق میں نہیں تھے۔ پھر اِسی عرصے میں 9/11 کا واقعہ پیش آ گیا جس نے دنیا کو یکسر بدل دیا۔

امریکا نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اس احمقانہ فیصلے کے باعث شمالی علاقوں سمیت پاکستان بھر میں امریکا مخالف جذبات پنپنے لگے۔ خصوصاً طالبان کے حامیوں میں شدید غم و غصہ پھیل گیا، جس کا براہِ راست اثر گریگ کے مشن پر پڑا۔

کتاب میں درج واقعات کے مطابق گریگ نے پاکستان و افغانستان کے سرحدی علاقوں میں جان کی بازی کھیل کر 55 اسکول قائم کئے۔ گو کہ اُسے قتل کی دھمکیاں ملیں، لیکن اس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔

دوسری جانب جب ترقی یافتہ ممالک میں یہ خبر پہنچی کہ ایک امریکی پاکستان اور افغانستان کے جنگ سے متاثرہ علاقوں میں امن کے قیام اور تعلیم کے فروغ کے لیے سرگرم ہے، اُس کے قد اور شہرت میں اضافہ ہونے لگا اور مغربی میڈیا میں اُس کی بابت تواتر سے خبریں شائع ہونے لگی۔

مجھے یاد ہے، 2003ء میں ایک اسٹوری امریکی اخبارات کی زینت بنی تھی جس میں گریگ کی پاکستان کے شمال مغربی علاقے کے سفر کی رُودادر بڑے ہی ڈرامائی انداز میں بیان کی گئی تھی اور اسے ایک ایسے نیک دل اور بہادر انسان کے روپ میں پیش کیا گیا تھا، جس پر تعلیم عام کرنے کے ''جرم'' میں طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ اُسے مذہب دشمن قرار دیا گیا۔ قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔

یہی قصہ اُس کی آپ بیتی ''چائے کی تین پیالیاں'' کی بھی زینت بن گیا جس میں اُس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مذکورہ سفر کے دوران اُسے عسکریت پسندوں نے اغوا کر لیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ اُن کی قید سے جان بچا کر فرار ہوا۔

اس نوع کے واقعات کے طفیل وقت کے ساتھ ساتھ گریگ کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ مخیر حضرات اور ادارے اس کی فلاحی تنظیم کی جانب متوجہ ہونے لگے، اسے دنیا بھر میں لیکچرز کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔

اُس نے مختلف پلیٹ فورم پر یہ بات متعدد بار دُہرائی کہ پاک افغان سرحدی علاقوں میں لڑکیوں کے اسکول قائم کئے بغیر اس خطے کی ترقی کا کوئی امکان نہیں اور اِس ضمن میں اُسے بین الاقوامی دنیا کی مدد کی ضرورت ہے۔

وہ جہاں کہیں بھی لیکچر کے لیے جاتا، اِن علاقوں کے مسائل، تعلیم و صحت کی بنیادی سہولیات سے محرومی کی داستان، امن کی ضرورت اور اسکول کے قیام کے قصے بڑے ہی جان دار دلائل کے ساتھ اتنے پُراثر انداز میں پیش کرتا تھا کہ سامعین کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ بٹوے خالی کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔

9/11 کے بعد دہشت گردی کا مسئلہ گرما گرم موضوع بن گیا۔ دنیا بھر میں اس بابت بحث جاری تھی۔ ناول لکھے جا رہے تھے۔ فلمیں بن رہی تھیں۔ پینٹنگز تخلیق کی جا رہی تھیں۔ الغرض یہ سانحہ مغرب کے لئے پسندیدہ ترین مباحثے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اُن حالات میں گریگ کے جدوجہد کی داستان نے مغرب کو بہت متاثر کیا اور بین الاقوامی دنیا میں اسے دہشت گردی کے خلاف برسرِ پیکار شخص کے طور پر پیش کیا جانے لگا جس نے غیروں کے لئے اپنی زندگی تج دی۔

بے شک اِس تشہیر سے اُس کے مداحوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا، لیکن گریگ اپنی شناخت کے لیے اس حوالے کو زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ سو ایک لیکچر کے دوران اس نے وضاحت کر ہی دی کہ وہ دہشت گردی کے خلاف برسرِ پیکار نہیں، بلکہ اُس کا اصل مقصد امن کا فروغ ہے۔

''ہماری ضرورت امن ہے۔ امن ہی کے ذریعے دنیا کو جینے کے لیے بہتر مقام بنایا جا سکتا ہے۔ دہشت گردی

کے خلاف جنگ بھی تو ایک طرز کی جنگ ہی ہے۔ میں کسی جنگ کا حصہ نہیں ہوں، بلکہ جدوجہد کا حصہ ہوں، قیامِ امن کے لیے جدوجہد!''

جس روز اس سیمینار کی اسٹوری اخبارات کی زینت بنی، اس کے قد میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ فقط بین الاقوامی دنیا میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ مسلم ممالک، خصوصاً پاکستان کے روشن خیال حلقوں نے بھی اس کے کام کو سراہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پاکستان میں ہونے والے کئی سیمینارز میں یہ کہہ چکا تھا ''آپ بم گرا سکتے ہیں، سڑکیں تعمیر کر سکتے ہیں، بجلی فراہم کر سکتے ہیں لیکن جب تک اس ملک کی لڑکیاں تعلیم سے فیض یاب نہیں ہوں گی، سماج میں تبدیلی نہیں آئے گی!''

اُس نے یہ بھی کہا کہ پاکستان میں بسنے والے افراد علم دوست اور امن پسند ہیں، یہی سبب ہے کہ اُس کے قائم کردہ اسکول انتہائی حساس علاقوں میں ہونے کے باوجود کامیابی سے چل رہے ہیں کیونکہ اُسے مقامی افراد کی مکمل حمایت حاصل ہے۔

جُوں جُوں یہ سرگرمیاں میڈیا کی زینت بننے لگیں، اُس کی حمایت میں اضافہ ہونے لگا۔ چندہ دینے والے سامنے آنے لگے۔ اُسے بین الاقوامی سطح پر مختلف اعزازات سے نوازے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

2007ء میں جب اُس کی شہرہ آفاق کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' منظرِ عام پر آئی، گریگ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ وہ عزم و ہمت کا استعارہ بن گیا۔ اسے قابلِ تقلید قرار دیا جانے لگا۔ 39 ممالک میں یہ کتاب بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔ اس کی چار ملین کاپیاں فروخت ہوئیں۔

کتاب کی اشاعت کے بعد اس نے امریکا بھر کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے۔ ایسے ہی ایک لیکچر کے لیے وہ کولمبیا بزنس اسکول بھی آیا جہاں میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ آخری ملاقات!

کہتے ہیں، جب قسمت آپ پر مہربان ہو تو آپ کے ہاتھ لگاتے ہی مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔ گریگ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ قسمت کی دیوی اُسے عجیب ڈھنگ سے نواز رہی تھی۔ گو کہ یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہنے والی تھی۔۔۔ یہ عارضی تھی!

خیر، جب افغانستان کی جنگ میں امریکی مفادات کے لیے سرگرم رہنماؤں کی بیگمات نے ''چائے کی تین پیالیاں'' پڑھی تو وہ بہت متاثر ہوئیں اور اُنھوں نے اپنے شوہروں کو گریگ کے تجربے سے استفادہ کرنے پر قائل کر لیا۔

یہ ایک حیرت انگیز معاملہ تھا۔ جنگی ماہرین ایک سماجی کارکن سے مشورہ کر رہے تھے۔

ابتدا میں گریگ سے پختہ عمر افغان رہنماؤں سے گفتگو کرنے کے لئے مشورہ کیا گیا۔ آنے والے چند ماہ میں لوگوں نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ گریگ امریکی جنگی ماہرین کی ٹیم کے ساتھ افغانیوں کے وفود سے ملاقات کر رہا ہے۔

جن دنوں اُس کی اِن سرگرمیوں کی خبریں مل رہی تھیں، اخبارات میں یہ اسٹوری بھی شائع ہوئی کہ وہ یہ خدمات بلامعاوضہ انجام دے رہا ہے، اس کے عوض کسی اعزاز یا عہدے کا خواہش مند نہیں۔

جب اُس سے اِس بابت پوچھا گیا، اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری زندگی کا مقصد تو فقط امن کا فروغ ہے!''

ابھی پہلی ہی کتاب موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی کہ 2009ء میں اُس کی دوسری کتاب Stones into Schools بھی منظرِ عام پر آ گئی، جو اُس مقام سے آگے کی کہانی بیان کرتی ہے، جہاں پہلی کتاب ختم ہوئی تھی۔ یعنی اُس میں 2003ء کے بعد کی جدوجہد اور کوششوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔

توقع کے عین مطابق یہ کتاب بھی بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔ گریگ کے ہزاروں مداحوں کے مانند میں نے بھی یہ ضخیم کتاب خریدی، جس میں اس کی سماجی تنظیم کی سرگرمیوں کی تفصیلات بڑے ہی شان دار اسلوب میں بیان کی گئی تھیں۔ واضح رہے کہ 2008ء میں پاکستان کی شمالی سرزمین زلزلے سے لرز اٹھی تھی، جس کی وجہ سے ہزاروں جانوں کا ضیاع ہوا اور کئی اسکول تباہ ہو گئے۔

اِس کتاب میں زلزلے کے بعد CAI کی جانب سے بحالی کے کاموں کی تفصیلات درج تھیں اور یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح گریگ اور اُس کے ساتھیوں نے زلزلے سے متاثر ہونے والے علاقوں میں تعلیم کے بجھتے چراغ کو روشن رکھنے کی جدوجہد کی۔ خیمہ اسکول قائم کئے، طبی سہولیات اور خوراک فراہم کرنے کی کوشش کی۔

اِس کتاب نے سماجی کارکن کی حیثیت سے گریگ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔

اُسی برس اُسے نوبل انعام برائے امن کے لئے نامزد کیا گیا۔ مجھ سمیت کئی جاننے والوں کو یقین تھا کہ یہ انعام اسے ہی ملے گا۔ شاید گریگ نے بھی یہی سوچا ہو، لیکن اُس برس یہ انعام امریکی صدر بارک اوباما کے حصے میں آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس فیصلے پر خاصی تنقید ہوئی۔ لوگوں نے کہا، ''بمباری سے تباہ حال خطے میں علم کے چراغ روشن کرنے والے انسان کے بجائے ایک ایسے شخص کو امن کا نوبل انعام دے دیا گیا، جو بم گرانے والوں کا سرغنہ ہے!''

تاہم گریگ کا ردِعمل خاصا معتدل تھا۔ اس نے کہا کہ اُسے کسی اعزاز کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی محبت ہی اُس کا اصل اعزاز ہے۔

گریگ CAI کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا جس کا شمار بین الاقوامی دنیا کے اہم ترین سماجی اداروں میں ہونے لگا تھا۔ 2010ء میں CAI نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ تفصیلات فراہم کیں کہ یہ فلاحی ادارہ اب تک پاکستان اور افغانستان کے دیہی علاقوں میں 171 اسکول قائم کر چکا ہے، جہاں اندازاً 64 ہزار بچے زیرِ تعلیم ہیں، جن میں 54 ہزار لڑکیاں ہیں۔

یہ اعداد و شمار پیش کرنے کے بعد گریگ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ اُس نے اپنے خواب کی تعبیر پالی ہے لیکن وہ رکنے والا نہیں، وہ اپنا سفر جاری رکھے گا۔

اس مشن میں گریگ کے چاہنے والے، اس کے حامی اور تیکڑوں مخیر حضرات اُس کے ساتھ تھے۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا!

2006ء سے 2011ء تک گریگ مورٹنسن اپنی کتابوں کے تشہیر اور فنڈز اکٹھا کرنے میں مصروف رہا۔ لیکچرز بھی دیتا رہا۔ مختلف ممالک کی جانب سے اعزازات بھی وصول کرتا رہا اور ہر پلیٹ فورم سے لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت اُجاگر کرتا رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ ''آئی کون'' کا درجہ حاصل کر گیا تھا۔ ہیرو بن گیا تھا۔ لوگ اسے آئیڈیل قرار دینے لگے تھے جن میں مجھ جیسے لاکھوں نوجوان بھی شامل تھے جو اس کے لیے چندہ جمع کرتے، اس کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کرتے اور اپنی بساط میں رہتے ہوئے CAI سے تعاون کرتے۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ گریگ سماجی خدمت کے میدان میں ایک ایسی مثال قائم کرے گا جس کا اثر آنے والے زمانوں میں بھی قائم رہے گا لیکن کہتے ہیں ناں۔۔۔ حالات کبھی یکساں نہیں رہتے۔ ہر آغاز کا ایک انجام ہوتا ہے اور ہر عروج کو زوال ہے!

یہ 2010ء کا سن تھا جب گریگ کی زندگی میں ایک عظیم بگاڑ کا آغاز ہوا۔

گریگ اس وقت خاصا مصروف تھا۔ وہ تواتر سے مختلف ممالک کے دورے کر رہا تھا۔ تشہیری مہم کے لیے مختلف اداروں میں لیکچر دے رہا تھا۔

یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ بیشتر تشہیری لیکچرز کے اہتمام کا خرچہ اس کا ادارہ ہی اُٹھاتا تھا۔ گریگ اپنی کتابوں کی رائلٹی بھی وصول کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ادارے کے فنڈز سے بھی لیکچر کے عوض اُسے معاوضہ ملتا تھا۔

ماضی میں چند حلقوں کی جانب سے اِن معاملات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ 2009ء میں ایک اخباری رپورٹ منظرِ عام پر آئی تھی، جس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ رواں برس گریگ کی کتابوں کی تشہیر، چندہ جمع کرنے کی مہم اور لیکچرز پر CAI لگ بھگ 4.6 ملین ڈالر جیسی خطیر رقم خرچ کر چکا ہے۔

اُس وقت تک ہر دوسرا شخص گریگ کے سحر میں مبتلا تھا۔ اس کی کرشماتی شخصیت نے سب پر جادو کر دیا تھا۔ سو کسی نے اِس رپورٹ کی جانب توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ مجھے یاد ہے، جب گریگ کے ایک مخالف نے دلائل دیتے ہوئے اس رپورٹ کا حوالہ دیا تو میں اس سے لڑ پڑا اور اُسے امن دشمن کا خطاب دے بیٹھا۔

لیکن حالات بدل رہے تھے۔ مختلف حلقوں کی جانب سے گریگ کی انتظامی قابلیت پر سوالات اُٹھائے جانے لگے تھے۔

اسی زمانے میں CAI کے اندرونی ذرائع سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی ایک رپورٹ نیویارک سے نکلنے والے ایک اخبار کی زینت بنی جس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ 2009ء میں ادارے نے جو چندہ اکٹھا کیا تھا، اُس کا فقط 41 فیصد اسکولوں کی تعمیر پر خرچ ہوا۔

واضح رہے کہ ڈیلی ٹیلی گراف میں 2008ء میں ایک برطانوی صحافی جونیتھن فورمین کی طویل رپورٹ شایع ہوئی تھی۔ اپنی رپورٹ میں اُس صحافی نے گریگ کی انتظامی قابلیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ آخری لمحات میں فیصلہ کرنے کا عادی ہے، جو ایک خطرناک عادت ہے تاہم اُس کے بیشتر فیصلے درست ثابت ہوئے۔

جب یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی، اُس وقت حالات اچھے تھے، لیکن جب گریگ تنقید کی زد میں آگیا، اُس کے مخالفین نے اِس رپورٹ کو بنیاد بناتے ہوئے اعتراضات کی برسات کر دی۔

ایک اخبار نے تحقیر آمیز سرخی لگائی ''آخری لمحات میں فیصلہ کرنے والا شخص، جو کبھی وقت پر نہیں پہنچتا!''

17 اپریل 2011ء کی شام گریگ کے مداحوں کے

لئے اذیت ناک ثابت ہوئی!

اُس روز ''سی بی ایس نیوز'' سے نشر ہونے والے مشہور پروگرام 60 Minutes کا موضوع گریگ تھا۔ اِس پروگرام کے نمائندے اسٹیو کورافٹ نے اُس پر الزامات کے ایسے تیر چلائے کہ ناظرین ششدر رہ گئے۔

''ناظرین کیا آپ یقین کریں گے، گریگ کی دونوں کتابیں افسانوی ہیں۔۔۔ جھوٹ کا پلندہ ہیں۔۔۔ یہی نہیں، اس کی سماجی تنظیم بھی کئی بے ضابطگیوں کا شکار ہے۔''

جب ٹی وی شو کے میزبان کی زبان سے ادا ہونے والے یہ جملے میری سماعتوں سے ٹکرائے، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ''بکواس، وہ ایک سچا آدمی ہے!''

لیکن میری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور وہ بدمعاش پوری تیاری سے آیا تھا۔ اسٹیو کہتا رہا ''مسٹر گریگ کہتے ہیں کہ وہ کے۔ ٹو سر کرنے کی مہم کے دوران اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر کروفے پہنچ گئے تھے۔۔۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ 1996ء میں انہیں دہشت گردوں نے اغوا کر لیا تھا۔۔۔ موصوف نے اپنی کتاب میں یہ لکھ تو دیا لیکن کیا وہ اسے ثابت کر سکتے ہیں۔۔۔ میرے خیال میں اس کا جواب نہ میں ہے۔۔۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا۔

''۔۔۔ سوال یہ ہے کہ CAI نے جتنے اسکول تعمیر کرنے کا دعویٰ کیا ہے کیا حقیقتاً اتنے اسکول تعمیر ہوئے ہیں؟ کیا گریگ یہ ثابت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہماری اطلاعات کے مطابق جو اعداد و شمار انہوں نے پیش کیے ہیں، وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔۔۔ یہی نہیں عزیزو، ہمارے پیارے مسٹر گریگ مورٹنسن اسکولوں کی تعمیر کے لئے حاصل ہونے والے فنڈز کو اپنی کتابوں کی تشہیر کے لیے بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، ہمارے یہ صلح، خاصے شاطر ہیں۔۔۔''

میں ان باتوں پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''گریگ جلد ان کا جواب دے گا۔'' میں نے خود کو تسلی دی لیکن پروگرام ٹیم پوری تیاری سے آئی تھی۔ اب میزبان کہہ رہا تھا۔

''۔۔۔ دلچسپ امر یہ ہے ناظرین کہ ہم نے شو نشر کرنے سے قبل مسٹر گریگ مورٹنسن سے رابطہ کیا تھا۔ ان کے سامنے اپنے سوالات رکھے تھے اور درخواست کی تھی کہ وہ پروگرام میں شرکت کر کے ان کا جواب دیں لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔۔۔''

اس پروگرام میں معروف مصنف اور کوہ پیما جون کریکویر سے بھی سوالات کئے گئے، جو ماضی میں گریگ کی اخلاقی و مالی معاونت کرتا رہا تھا، اُسے 75 ہزار ڈالر جیسی خطیر رقم کا عطیہ دے چکا تھا۔ اُس نے بھی گریگ کی سرگرمیوں پر تحفظات کا اظہار کیا۔

دوسرے دن کے اخبارات الزامات سے بھرے ہوئے تھے۔۔۔ ''گریگ جھوٹا تھا۔۔۔ کے۔ ٹو کی مہم۔۔۔ کروفے میں اسکول تعمیر کرنے کا واقعہ۔۔۔ سب بکواس ہے۔۔۔ اور اسی واقعے کی بنیاد پر اُس نام نہاد سماجی کارکن نے اپنے مشن کا آغاز کیا تھا۔۔۔ افسوس ناک!''

ایک اخبار نے لکھا: ''گریگ کا ادارہ جو اسکول تعمیر کرنے کا دعویٰ کرتا ہے، اُن میں سے بیشتر یا تو کبھی تعمیر ہی نہیں ہوئے، یا تعمیر کرنے کے بعد چھوڑ دیے گئے۔ اب وہاں علم کے دیے نہیں جل رہے، بلکہ انہیں گوداموں اور اوطاق کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔۔۔ قوی امکان ہے کہ مسٹر مورٹنسن اُن کا کرایہ وصول کرتے ہوں۔۔۔''

ایک میگزین نے کتابوں کی تشہیر اور گریگ کے غیر ملکی دوروں پر خرچ ہونے والی رقم پر سوال اُٹھایا ''موصوف غریبوں کے نام پر چندہ لیتے تھے لیکن اُسے اپنی تشہیر کے لیے خرچ کیا کرتے تھے۔ شرم کی بات ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ انہیں امن کا نوبل انعام نہیں ملا۔۔۔''

چند روز بعد جون کریکویر کا ایک طویل، دھماکے دار مضمون اخبارات کی زینت بنا جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ گریگ مورٹنسن، سماجی کارکن، ایک ہیرو۔۔۔ حقیقت میں بھٹک گیا ہے!

اس نے لکھا ''۔۔۔ شروع شروع میں تو مجھے اس کی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اس کی معاونت کی، اپنے دوستوں کو تحریک دی لیکن پھر اس کی بابت مجھے عجیب عجیب خبریں ملنے لگیں۔ الزامات کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ میں نے گریگ سے کئی بار کہا کہ اِن الزامات کا جواب میڈیا پر آکر دے۔ اس نے ہر بار وعدہ کیا لیکن پھر مکر گیا۔ حتیٰ کہ ایک بار تو وقت دے کر انٹرویو بھی منسوخ کر دیا!''

اِن الزامات نے کھلبلی مچا دی۔ انھیں بہت سنجیدگی سے لیا گیا۔ کئی یونیورسٹیوں نے جو ماضی میں گریگ کو اعزازی ڈگریوں اور اعزازات سے نواز چکی تھیں، اُس کی حمایت سے دستبردار ہو گئیں اور اُسے دی... جانے والی ڈگریوں کو منسوخ قرار دے دیا۔

الزامات کی اِس بوچھار سے قبل گریگ کے لیے چند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعزازات کا اعلان ہو چکا تھا جو اُسے آنے والے چند ماہ میں وصول کرنے تھے لیکن جن اداروں نے ایوارڈز کا اعلان کیا تھا، وہ پیچھے ہٹ گئے۔۔۔ الغرض حالات نے اسے اپنے شکنجے میں کسنا شروع کر دیا تھا۔

اپریل 2011 واقعی عذاب ناک تھا۔ گریگ کا بت چٹخنا شروع ہو گیا تھا اور اس کے مداحوں کے دل میں تبدیلی کی ہوائیں چلنے لگی تھیں!

بالآخر چند روز کے انتظار کے بعد آؤٹ سائیڈ نامی میگزین میں گریگ کا انٹرویو شائع ہوا جس میں اُس نے اپنا موقف پیش کیا۔

اُس نے بتایا کہ اُس کے سابق ساتھی مسٹر کریکویر نے فقط ایک بار اُس سے رابطہ کیا تھا۔ ۔۔۔اُن کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ کافی عرصے سے مجھے انٹرویو کے لئے راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارا صرف ایک بار رابطہ ہوا تھا اور میں نے رضامندی ظاہر کر دی تھی لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ معاملہ بہت گمبھیر ہے، اس لئے میں انٹرویو سے پیچھے ہٹ گیا!"

اس نے پروگرام 60 Minutes کے نمائندے اسٹیو کے دعویٰ کو بھی مضحکہ خیز قرار دیا"۔۔۔ مجھے اُن کی کوئی ای میل نہیں موصول ہوئی۔ انہوں نے رابطہ ہی غلط ڈھنگ سے کیا۔ جب میں ملک سے باہر ہوتا، وہ میرے گھر فون کرتے۔ جب میں مصروف ہوتا، وہ مجھ سے ٹائم مانگتے وغیرہ وغیرہ!"

بے شک اِس انٹرویو کے بعد گریک کے پرستاروں کا حوصلہ کچھ بحال ہوا لیکن کئی سوالات ابھی تشنہ تھے۔

کچھ عرصے بعد گریگ کا ایک بیان اخبارات کی زینت بنا جس میں اس نے کہا کہ وہ اپنی کتاب میں تحریر کردہ ایک ایک لفظ پر قائم ہے۔ CAI نے کئی اسکول قائم کئے، جہاں 60 ہزار سے زاید بچوں نے تعلیم حاصل کی اور وقت آنے پر وہ یہ ثابت کر دے گا!

وہ میڈیا کے محاذ پر جنگ تو لڑ رہا تھا لیکن اُس کے مخالف بھی پوری تیاری سے آئے تھے۔ وہ ایسے ایسے سوالات اُٹھا رہے تھے، جن کا واضح جواب دینے سے گریگ قاصر نظر آتا تھا۔

پھر گریگ کے ایک دوست اور قابلِ احترام کوہ پیما اسکاٹ ڈیرسن کی ایک ای میل منظر عام پر آئی جس میں اُس نے پروگرام 60 Minutes کی رپورٹ اور کریکویر کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا تھا۔

اِس میل کے منظرِ عام پر آنے کے بعد گریگ کے حامیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ اُسے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر شیئر کیا۔ اُس پر تبصرے کئے۔ لیکن کہتے ہیں ناں، جب وقت بُرا ہو، تو مثبت نظر آنے والے معاملات بھی منفی رنگ اختیار کر جاتے ہیں۔

کریکویر نے اسکاٹ کے الزام کے جواب میں یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کہ ایک بار اسکاٹ نے خود اُسے یہ بتایا تھا کہ 1993 میں کے۔ٹو کی مہم کے دوران گریگ کروفے نامی کسی بھی گاؤں کی موجودگی سے لاعلم تھا!!

"اب یہ صاحب کس بنیاد پر گریگ کی حمایت کر رہے ہیں؟ حالانکہ ماضی میں اُن کے اختلافات کی خبریں میڈیا کی زینت بن چکی ہیں۔

جب ٹی وی اسکرین پر کریکویر نے یہ سوال داغا، اُس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

اسکاٹ نے اِس کے جواب میں کہا کہ ابتداً اُسے اِس کہانی پر یقین نہیں تھا لیکن آج اُسے احساس ہوتا تھا کہ اس کا شک نیم پختہ تھا۔ اس بات کا امکان ہے کہ گریگ ایک دور افتادہ گاؤں پہنچ گیا ہو جہاں کے باسیوں سے اُس نے ایک اسکول تعمیر کرنے کا وعدہ بھی کیا ہو۔ اُس نے مزید کہا۔ "میرے اور گریگ کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں!"

الزامات کے اُس موسم میں CAI نے بھی ایک فہرست جاری کی، جس میں اپنے تمام منصوبوں کی تفصیلات فراہم کیں۔ توقع کے عین مطابق مخالفین نے اس فہرست کو غیر حقیقی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔

صورتِ حال بگڑ رہی تھی۔۔۔ گریگ کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اُس روز تو گریک کو شدید دھچکا لگا، جب اُسے اطلاع ملی کہ بات الزامات سے آگے بڑھ کر اب قانونی مقدمے تک پہنچ گئی ہے۔

دراصل مئی 2011ء میں ریاست مونٹینو سے تعلق رکھنے والے ڈیموکریٹک پارٹی کے دو ترجمان جین پرائس اور مائیکل رین ہارٹ نے گریگ کے خلاف دھوکا دہی کا مقدمہ دائر کر دیا تھا۔

انہوں نے وفاقی جج سے تقاضا کیا کہ گریگ کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی کتابوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ٹرسٹ کے لئے وقف کر دے کیونکہ رائلٹی کی مد میں وہ لاکھوں کما رہا ہے، ایسے میں دیگر افراد سے چندہ کی درخواست کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اُس وقت گریگ کو اپنی دونوں کتابوں سے اندازاً پانچ ملین ڈالر

کی آمدنی ہو چکی تھی۔

اُسی عرصے میں الی نوئے سے تعلق رکھنے والی ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ڈیبورنیٹر نے بھی گریگ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔

گریگ پر نہ صرف ٹرسٹ کی رقم کے غیر مناسب استعمال کا الزام تھا بلکہ کتاب میں درج واقعات کو بھی غیر ضروری طور پر بڑھا چڑھا کر، اپنے مطلب کے لئے توڑ موڑ کر پیش کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ خصوصاً کے۔ٹو کی مہم کے دوران پیش آنے والے واقعے پر سوال اُٹھایا گیا تھا جسے بنیاد بنا کر اُس نے سماجی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز کیا۔

وہ انتہائی کٹھن دن تھے۔ گریگ یاسیت کا شکار ہو گیا۔ اُس نے مقدمہ لڑنے کا اعلان تو کیا اور اپنے چاہنے والوں کو یہ یقین بھی دلایا کہ وہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دے گا لیکن مجھ سمیت اس کے حامیوں کو واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا وہ بکھر رہا ہے۔

خوش قسمتی سے چند ماہ بعد جین پرائس نے یہ کہتے ہوئے دھوکا دہی کا مقدمہ واپس لے لیا کہ اُس نے گریگ کی کتابیں پڑھی ہی نہیں ہیں۔ بعد میں کتاب کے تعلق سے دائر کئے جانے والے دیگر مقدمات بھی واپس لے لئے گئے تاہم حالات میں کسی قسم کا سدھار نہیں آیا۔

غبن کے الزام میں تحقیقات شروع ہو چکی تھیں۔ اب گریک کو ایک ایک پیسے کا حساب دینا تھا۔ اور یہ مرحلہ اس کے لیے انتہائی کٹھن ثابت ہوا۔ ہمیں واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مشکل میں ہے۔

گریگ کے حامیوں نے اُس کے حق میں مظاہرہ کیا۔ مختلف پلیٹ فورمز سے آواز بلند کی، اپنی حمایت کا یقین دلایا لیکن ان سرگرمیوں کے دوران مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے حامی تذبذب کا شکار ہیں، ان کے ذہنوں میں شک جڑ پکڑ چکا ہے۔

میں واضح کر دوں کہ دیگر امریکیوں کے مانند مجھے بھی اپنے عدالتی نظام پر پورا بھروسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عدالت کسی قسم کی حلق تلفی نہیں کرے گی اور حقائق سامنے لانے میں جانبداری سے اجتناب برتے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ عدالت ہی ہمارا آخری سہارا تھی۔ اگر وہ گریگ کو بے قصور قرار دے دیتی تو مخالفین کے منہ خود ہی بند ہو جاتے، سو ہم عدالتی فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔

اور یہ انتظار طویل اور اذیت ناک ثابت ہوا۔ مقدمہ پورے ایک سال چلا۔ اس دوران اس کا میڈیا ٹرائل بھی ہوتا تھا جس نے اس کی شہرت کو داغ دار کر دیا۔

بالآخر اپریل 2012ء میں فیصلہ آ گیا۔۔۔ ایک ایسا فیصلہ جس نے مجھے اور مجھ جیسے لاکھوں نوجوانوں کو توڑ دیا۔

گریک، جسے ہم قابلِ تقلید خیال کرتے تھے، فرشتہ سمجھتے تھے، وہ انسان نکلا!

ہاں، وہ قصوروار ثابت ہوا تھا۔ تحقیقات کے بعد یہ عیاں ہو گیا کہ اُس نے ٹرسٹ کے لیے مختص 6 ملین ڈالر کی رقم کو غیر مناسب انداز میں استعمال کیا تھا۔

گو کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ وہ سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ کا بانی تھا، اس کا روحِ رواں تھا لیکن ٹرسٹ کے لئے مختص رقم کا استعمال۔۔۔؟ آئینے میں دراڑ پڑ چکی تھی۔

اس مقدمات کی سماعت مونٹینو کے اٹارنی جنرل اسٹیو بلاک کر رہا تھا، جس نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "شاید شعوری طور پر مسٹر مورٹنسن نے اپنے ادارے کے گورننگ بورڈ کو دھوکا نہ دیا ہو، شاید انہوں نے اپنے ملازمین کو بیوقوف نہ بنایا ہو، لیکن یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا مناسب ریکارڈ نہیں رکھا، رقم خرچ کرنے کے معاملے میں احتیاط نہیں برتی۔ اِن حالات میں یہ قطعی مناسب نہیں کہ وہ سینٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ کے عہدے پر فائز رہیں!"

بزرگ سچ ہی تو کہتے تھے، کوئی انسان غلطیوں سے مبرّا نہیں ہوتا۔ ہم خود ہی بت بناتے ہیں، ان کی پرستش کرتے ہیں اور جب ہمارے ہیرو، ہم جیسے عام انسان ثابت ہوتے ہیں۔ ہم ٹوٹ جاتے ہیں۔

یقین کریں، میں اکیلا نہیں تھا جس کی روح زخمی ہوئی، میرے جیسے لاکھوں انسان تھے جو بکھر گئے اور پھر ہمارے زخموں پر گریگ ہی کے ایک بیان نے نمک چھڑکا۔ مقدمے کا فیصلہ آنے کے بعد اُس نے کہا۔ "میں تلافی کے لیے اپنی جیب سے ادارے کو ایک ملین ڈالرز دینے کے لیے تیار ہوں!"

خدایا، اس نے تسلیم کر لیا۔ وہ واقعی غلط تھا۔۔۔ قصوروار تھا۔۔۔ وہ ویسا نہیں تھا، جیسا ہم سوچتے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ بدنامی کا داغ لگنے کے بعد گریگ کس کرب سے گزرا، البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں نے کتنی اذیت برداشت کی۔ بے عزتی کے احساس سے میں لرز رہا تھا۔

ایک بار تو ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ مونٹینو کے علاقے بوزمین جاؤں جہاں گریگ کا شاہانہ مکان ہے، جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے اور اُسے۔۔۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھری کھری سناؤں۔

میرے پاس گریگ کی بابت معلومات کا ذخیرہ تھا۔ اُس کے بارے میں شائع ہونے والی خبریں، اُس کے تحریر کردہ مضامین، اُس کے لیکچرز کی سی ڈیز، اُس کے پراجیکٹ کے حوالے سے تعارفی مواد۔۔۔ اور یہ بوجھ میرے لیے عذاب بن گیا تھا جس نے میری آنکھوں سے نیند چھین لی۔

جذبات سے کانپتے ہوئے ایک صبح میں نے گریگ سے جڑی ہر یاد کو، ہر ورق، ہر تصویر کو نذرِ آتش کر دیا۔

اور یہی وہ موقع تھا۔۔۔ مئی 2012ء۔۔۔ جب عدالتی فیصلہ نے گریگ کو زمین پر لا پٹکا تھا۔۔۔ میں نے دفتر سے چھٹی لی، ضروری سامان سمیٹا اور ایک دور افتادہ شہر کی جانب نکل گیا۔ ہوٹل میں سامان پھینکتے ہی میں نے ساحل کا رُخ کیا، جہاں میں گھنٹوں نم ریت پر لیٹا آسمان کو تکتا رہا۔ گھنٹوں!!

پُرسکون ماحول نے مجھے گریگ کی بابت ٹھنڈے دماغ سے غور کرنے کا موقع فراہم کیا جو ایک نعمت ثابت ہوا۔ اور دھیرے دھیرے مجھے سمجھ میں آنے لگا کہ میری نفرت، میرے غصے کا اصل سبب کیا ہے۔

میری خستہ حالی کی اصل وجہ گریگ نہیں تھا بلکہ میں خود تھا!

یہ میں ہی تھا جس نے بنا سوچے سمجھے، جذباتی فکر کے ساتھ اُسے اپنا ہیرو بنالیا، اُسے خطاؤں سے پاک مان لیا اور اپنے گرد ایک افسانوی دنیا بسالی۔

حقیقتاً میرے کرب کی وجہ یہ نہیں تھی کہ گریگ قصوروار ثابت ہوا۔ اصل سبب تو وہ وابستگی، وہ تعلق تھا جو میرے خوابوں کو اُس کے دعوے سے جوڑتا تھا۔ میں اُس جیسا بننے کا خواہش مند تھا اور جب وہ بدعنوان ثابت ہوا، میری آرزوؤں کا قتل ہو گیا۔ میں بکھر گیا۔ بے عزتی کا صدمہ مجھے غصے سے بھر گیا۔

البتہ ساحل کی پُرسکون ریت پر لیٹے ہوئے، ٹھنڈے دماغ سے سوچ بچار کرنے کے بعد میں آہستہ آہستہ سنبھلنے لگا۔ میں نے سوچا۔ ''بے شک، گریگ چند معاملات میں قصوروار نکلا لیکن کیا اُس کے کارناموں، پاکستان اور افغانستان میں درس گاہوں کے قیام کی کوششوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ اُس نے کئی اسکول قائم کئے، ہزاروں بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اُس خطے کے مسائل سے بین الاقوامی دنیا کو آگاہ کیا۔۔۔ ہوسکتا ہے، جو اعداد و شمار گریگ نے پیش کئے ہوں، وہ سو فیصد درست نہ ہوں لیکن اگر وہ پچاس فیصد بھی درست ہیں، تب بھی ہمیں اُس کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ اُس نے 9/11 کے بعد بھی انتہائی کٹھن حالات میں پاک افغان خطے میں کام کیا۔ فقط اِسی بات کے لئے ہمیں اُسے خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے۔ اور پھر اُس کے گناہوں کی نوعیت کیا ہے؟ ہاں، اس نے لوگوں کا بھروسا توڑا، ٹرسٹ کی رقم کے استعمال میں کوتاہیاں کیں، لیکن کسی کو قتل تو نہیں کیا، کسی پر بم تو نہیں گرایا، کسی کو اغوا تو نہیں کیا۔۔۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اسے معاف کردیں؟''

میں نے اُس کی شہرہ آفاق کتاب ''چائے کی تین پیالیاں'' میں درج کے۔ٹو مہم کی روداد اور اس کے بعد کرونے پہنچنے کے واقعے پر بھی غور کیا۔ یہی وہ واقعہ تھا، جس پر گریگ کے تحظیم کارناموں کی کثیر المنزلہ عمارت کھڑی تھی اور اِس پر اتنے اعتراضات اُٹھائے جاچکے تھے کہ وہ شبہات کی زد میں آگیا تھا، افسانوی معلوم ہونے لگا تھا، لیکن۔۔۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ کوئی اُسے غلط ثابت نہیں کرسکا تھا۔

''ممکن ہے، یہ سچ ہی ہو!'' میں نے خود سے کہا۔ ''اور اگر ہم مان لیں کہ یہ سچ نہیں تھا۔ گو کہ کے اِسے ثابت کرنے میں گریگ کے مخالفین ناکام رہے، تب بھی اُس نے اِس جھوٹ کو ایک نیک مقصد ہی کے لئے استعمال کیا ناں دنیا میں تباہی پھیلانے کے لیے تو نہیں۔ اِس پُرآشوب دور میں، جہاں قاتلوں، ٹھگوں اور زانیوں کی بھرمار ہے، گریگ نے ایسا کیا جرم کردیا کہ اُسے قابلِ نفرت گردانا جائے؟ آپ اسے ایک شاطر مفلح تو کہہ سکتے ہیں، لیکن بدمعاش اور لٹیرا نہیں!''

یوں سمندر کی لہروں کے حسین شور کے ساتھ میرے خیالات بدلنے لگے۔ درحقیقت اِس کہانی کو بیان کرنے کا سبب اُن تمام افراد سے مخاطب ہونا ہے، جنہوں نے بھی گریگ کا ساتھ دیا تھا اور آج اُس سے متنفر ہوگئے ہیں۔

میں اُن سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں نفرت اپنے سینے میں دبائے رکھنے کے بجائے آگے بڑھنا چاہیے۔ پاکستان اور افغانستان کے پس ماندہ علاقوں میں علم کی شمع روشن کرنے کے نیک مقصد سے وابستہ رہنا چاہیے، کیونکہ یہ ایک عظیم مقصد ہے۔ صرف اِس باعث کہ ہمارا رہنما بھٹک گیا، ہم اِس سفر کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں چلتے رہنا ہوگا، تعلیم سے محروم بچے ہمارے منتظر ہیں!

شرپا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

برصغیر میں لاتعداد قبائل آباد ہیں۔ عجیب وغریب رسوم ان میں رائج ہیں۔ نیپال کے اس کنارے پر جہاں تبت کی سرحدیں ملتی ہیں، ایک منفرد قبیلہ آباد ہے۔ اس قبیلے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جفاکشی میں یکتا ہے۔ ہر مشکل کام ان کے لیے آسان ہے، کوہ پیمائی کی مہم میں شریک ہر پارٹی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھے۔ ان کی رسوم سب سے الگ ہیں اور یہ دنیا بھر میں ان معنوں میں سب سے الگ ہیں کہ ان کی عورتیں بیک وقت دو شوہر رکھ سکتی ہیں۔

ایک جفاکش مگر عجیب الفطرت قبیلے کا تذکرہ

براعظم ایشیا میں ایسے کئی علاقے ہیں جو پُراسراریت کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ انہی میں سے ایک علاقہ تبت بھی ہے۔ برف پوش پہاڑوں سے گھرے اس پورے علاقے کی تہذیب، ثقافت اور مذہبی رسومات میں پُراسراریت پنہاں ہے مگر ان میں سب سے دلچسپ وعجیب قبیلہ شرپا کا ہے۔

تبت کی سرحدیں جہاں جنوب میں نیپال سے ملتی ہیں۔ انہی سرحدوں کے ساتھ ساتھ شرپا قبائل آباد ہیں۔ مشرق میں بھوٹان اور سکم کی نیپالی سرحدوں کے اندر بھی مختلف شرپا قبائل آباد ہیں۔ ان کی بستیاں اور گاؤں سطح سمندر سے آٹھ سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ شرپا دنیا کے انتہائی جفاکش لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نیپال کے شمال اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شمال مشرق میں ان کی آبادی تین حصوں میں منقسم ہے۔ کمبو، پھر کے اور سولو۔ ان علاقوں کے بہت سے گاؤں ایسی جگہوں پر واقع ہیں جہاں آس پاس کافی زمین کاشت کے لیے موجود ہے۔ اس کے علاوہ شرپا گاؤں کی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ مکان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نہیں بنائے جاتے بلکہ گلی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز مشکل سے ہی نظر آئے گی۔

شرپا دراصل تبت کے وہ باشندے ہیں جو مختلف اوقات میں تلاشِ معاش یا کسی دوسرے وجوہ کی بناء پر وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوگئے اور رفتہ رفتہ کم اونچے علاقوں میں آباد ہوتے چلے گئے۔ ایک متوسط شرپا اپنا مکان بناتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی ''خانہ بدوشی'' کا رنگ لیے ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ برف باری اور سرد موسم ختم ہوتے ہی یہ اپنے مویشیوں کے ساتھ ایسی جگہوں کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں چراگاہیں ہوتی ہیں۔ سولو اور پھر کے کے لوگ موسم سرما میں کاشت کرتے ہیں مگر دوسرے علاقوں کی زمین موسم سرما میں برف باری کی وجہ سے قابلِ کاشت نہیں ہوتی۔ کاشت اپریل سے اکتوبر تک کے مہینوں میں کی جاتی ہے۔

کاشتکاری کے لحاظ سے شرپا دنیا کے دوسرے کسانوں سے بالکل الگ ہیں۔ یہ زیادہ تر مویشیوں کی جگہ انسانوں سے کام لیتے ہیں۔ ایک عام ہل کو تین یا چار مرد کھینچتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں ہل کی ہتھی ہوتی ہے اور ایک عورت اس کے پیچھے پیچھے کاشت شدہ زمین میں بیج گراتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یاک کو بھی ہل میں جوتا جاتا ہے۔

کاشت کی جانے والی فصلوں میں گندم، مکئی، جوار اور جو وغیرہ شامل ہیں لیکن آلو سب سے بڑی پیداوار ہے حالانکہ آلو پہلے پہل نیپال میں پچھلی صدی کے وسط میں متعارف ہوا تھا۔ کاشت کے علاوہ شرپا تجارت بھی کرتے ہیں۔ موسم سرما میں وہ عموماً نیپال کی ملحقہ ریاستوں اور دارجیلنگ کی طرف تجارتی سفر اختیار کرتے ہیں۔

علاقہ کمبو کے شرپا ہنرمند ہیں لیکن ان کی یہ ہنرمندی زیادہ تر اپنے لیے ہوتی ہے اور وہ شاذ ہی اسے پیشہ ورانہ حیثیت دیتے ہیں۔ کمبو شرپا کپڑا بننے، بڑھئی، موچی اور معمار کا کام بڑی عمدگی سے سرانجام دے لیتے ہیں۔ درزی اور جوتا ساز عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو تبت سے اِدھر آکر سکونت اختیار کرتے ہیں۔ ویسے شرپا جوتے گانٹھنے اور ان کے تلے لگانے کی حد تک ہنرمند ہوتا ہے۔

شرپا بڑے بڑے اٹھارہ قبیلوں کی صورت میں مختلف جگہوں میں آباد ہیں۔ ایک قبیلے کو دوسرے پر کسی طور برتری حاصل نہیں۔ البتہ تبت سے آنے والے ایک قبیلے کے افراد کھمبا کو دوسرے تمام قبیلے حقیر جانتے ہیں۔ ہر چند کے کھمبا قبیلے کے افراد کھمبا معاشرت میں ایک عام شرپا کی طرح سود مند ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک کھمبا چاہے کتنا ہی خوش حال کیوں نہ ہو وہ چوری سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولتا ہے، تمام بُرے کام اس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ گالی گلوچ اور دنگا فساد کے دوران اگر حریف کھمبا ہو تو یہ فقرے ضرور سننے میں آتے ہیں کہ ''آخر ایک کھمبا سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے؟'' اور شاید اس طعنہ زنی کی وجہ یہ ہے کہ کھمبا جب دوسرے علاقوں سے شرپا بستیوں میں پہنچتے ہیں تو بالکل کنگال ہوتے ہیں لیکن محنت مزدوری اور اپنی سوجھ بوجھ کی بنا پر جلد ہی اچھی خاصی حیثیت بنا لیتے ہیں۔

شرپا خود کو ''اچھے ہنر والا'' کہتے ہیں لیکن ایک کھمبا ''کھمنڈ وا'' (بُرے ہنر والا) سمجھا جاتا ہے۔ شرپا دعوتوں یا دوسری مذہبی تقریبات میں شراب وغیرہ پیتے ہیں تو وہ ایک ہی پیالے کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے استعمال کرتے ہیں لیکن ایک کھمنڈ وا کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں اور اگر کوئی شرپا کسی کھمنڈ وا کے پیالے میں پانی وغیرہ پی لے تو وہ بھرشٹ ہوجاتا ہے لیکن لامہ کو کچھ پیسے نذر کرنے کے بعد پھر پوتر ہوجاتا ہے۔ کھمبا کو بھی جرمانے کے طور پر پیسے کا نذرانہ دینا پڑتا ہے۔

ایک شرپا گاؤں بیک وقت سیاسی اور مذہبی رسوم کا مرکز ہوتا ہے۔ اس گاؤں کے باشندوں میں سے کچھ با اثر افراد پر گاؤں کے نظم و نسق کی ذمے داری ہوتی ہے بعض مذہبی امور کے ذمے دار ہوتے ہیں اور بعض با اثر افراد مجلس امور کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ان ذمے دار افراد کا انتخاب گاؤں کے لوگ مشترکہ طور پر کرتے ہیں۔ گاؤں کے محافظ کو ''ناوا'' کہا جاتا ہے۔ ناوا جہاں گاؤں کے لوگوں کی ضروریات اور بہبود کا خیال رکھتا ہے وہاں وہ نظم و نسق توڑنے والوں کو جرمانے کی سزائیں بھی دے سکتا ہے۔

''شنگو ناوا'' جنگلات کا محافظ ہوتا ہے بعض اوقات ایک ہی فرد بیک وقت جنگل اور گاؤں کی محافظ کے کام انجام دیتا ہے۔ محکمہ جنگلات کے محافظ کے ذمے جنگلات کی دیکھ بھال اور ان کی بہبود کے فرائض ہوتے ہیں۔ جنگل سے لکڑی کاٹنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ عمارتی اور جلانے کی لکڑی کے لیے اس مخصوص جنگل پر دور کے جنگلات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

شرپا جب اپنے گاؤں کی ملحقہ زمین پر فصل کاشت کرتے ہیں تو ناوا کے ذمے یہ بھی ہوتا ہے کہ گاؤں میں کوئی مویشی موجود نہ ہو فصل کی کاشت کے بعد مویشیوں کو دور دراز کے علاقے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ شرپا قائل ہیں کہ اگر مویشی گاؤں میں رہے تو فصل اچھی نہیں ہوگی۔ فصل بڑھنے اور پکنے تک مویشی ممنوعہ کھیتوں تک نہیں آسکتے اور اس اصول کی خلاف ورزی پر ناوا جرمانے کرتا ہے۔ تمام جرمانے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ جرمانے کی رقم کو بعد میں گاؤں کی بہبود کے کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

شرپا سوسائٹی میں سب سے زیادہ اہمیت ''پمبو'' کو حاصل ہوتی ہے۔ پمبو ایک قسم کا سرکاری افسر ہوتا ہے جو مالیہ اور لگان وغیرہ وصول کرتا ہے۔ پمبو کو جو رقم یا اجناس وصول ہوتی ہے وہ ہر سال ایک بار اور دوسری بار سرکاری افسر جسے دوری کہا جاتا ہے وصول کرتا ہے۔

شرپا خاندان انتہائی مختصر ہوتا ہے۔ وہ لوگ نہ تو لمبی چوڑی رشتے داریوں کے قائل ہیں اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو خاندان در خاندان منسلک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆☆☆

آزاد اور کھلی فضا کے یہ متوالے عجیب و غریب عقائد اور رسوم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر ایک عورت خاوند کی موجودگی میں دوسری شادی کرسکتی ہے۔ شرپا خاندان ایک بیوی، ایک یا دو خاوند اور ان کے بن بیاہے بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جونہی بچے جوان ہوکر شادی کے قابل ہوتے ہیں انہیں اپنے آبائی گھر چھوڑنے کی تیاری شروع کر دینا ہوتی ہے اور شادی ہوتے ہی ماں باپ کی تمام ذمے داریاں ختم ہوجاتی ہیں۔ مرد شرپا اپنے باپ سے فوراً علیحدہ ہوکر اپنی نویاہتا بیوی کے ساتھ ایک نئے خاندان کی داغ بیل ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح نویاہتا بیوی بھی اپنے والدین کے ساتھ اپنے تمام رشتے توڑ لیتی ہے۔ نیا شادی شدہ جوڑا ایک الگ مکان میں نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

شرپا اپنی اولاد کی شادیوں کے وقت عجیب و غریب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ دولہا کو اس کے بھائی بند ایک جلوس کی شکل میں لے کر دلہن کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ شراب کی کافی مقدار لیے ہوتے ہیں۔ ادھر دلہن کے لواحقین بھی ناؤ نوشی کا پورا پورا انتظام کرتے ہیں۔ ایک کھلے سے کمرے میں تخت بچھا دیے جاتے ہیں جن کی اونچائی بہت کم ہوتی ہے۔ برات کا استقبال جام ٹکرانے سے ہوتا ہے۔ مہمان جب بڑے کمرے میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں تو شراب کے دور کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہنسی مذاق بعض اوقات حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور لطف تو یہ ہے کہ دولہا تمام وقت بالکل بھی نمایاں نہیں ہوتا۔ ادھر دلہن پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ بھی اپنے مہمانوں کی آؤ بھگت میں گھر کی دوسری عورتوں کی طرح کام کرتی نظر آتی ہے۔

لڑکی کا رشتہ مانگنے کے لیے لڑکے کا باپ لڑکے والوں کے گھر جاتا ہے اور شراب کی ایک صراحی بطور تحفہ پیش کرتا ہے۔ اگر لڑکی کے باپ کو یہ رشتہ منظور ہو تو وہ یہ تحفہ قبول کر لیتا ہے اور شادی بیاہ کے متعلق امور طے کر لیے جاتے ہیں۔ اگر انہیں یہ رشتہ منظور نہ ہو تو تحفہ لینے سے انکار نہیں کرتے بلکہ تحفہ قبول کرنے کے بعد یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ رشتے کے

میرے والد نے کابل کا ارادہ کیا۔ میرے بھائی نے خطوں سے مجھے دو بزرگوں کے بارے میں اطلاع دی۔ ان میں سے ایک شیخ شاہ دولہ دریائی تھے جو گجرات خورد میں سکونت رکھتے ہیں۔ دوسرے حاجی عبداللہ تھے جنہوں نے تال جلال گکھڑ کے حوالی میں گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ جب ہماری سواری گجرات پہنچی تو میں نے اپنے ایک خواجہ سرا کے ذریعے شاہ دولہ کے پاس نیاز بھیجی اور فیض کی درخواست کی مگر جو کچھ میں چاہتی تھی وہ مجھے حاصل نہ ہوا۔ جب ہم تال جلال گکھڑ کے قریب پہنچے تو حاجی صاحب سے بھی کسب فیض کرنا چاہا۔ میں نے جو نذر بھیجی تھی، وہ انہوں نے واپس کر دی اور اپنی طرف سے ایک تسبیح اور جائے نماز بھیجی۔ یہ جائے نماز انہوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی۔ وہ کسب حلال سے روزی کماتے تھے اور اسی کسب حلال سے انہوں نے دو روٹیاں بھی مجھے بھیجیں۔ میں نے ان میں سے ایک ٹکڑا کھایا تو میرا دل روشن ہوگیا اور مجھے روحانی تسکین اور جمعیت خاطر حاصل ہوئی۔ یہ دو روٹیاں میں نے تین روز تک خود بھی کھائیں اور اپنی کنیزوں کو بھی کھلائیں۔

جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہاں کی سرگزشت

مرسلہ: عترت حسن، نوشکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارے میں سوچ سمجھ کر اور لڑکی کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے۔

منگنی کے وقت لڑکا اپنے والد کے ساتھ اپنے ہونے والے سسرال نہیں جاتا، چاہے وہ اپنی شادی سے پہلے اکثر وہاں آتا جاتا رہا ہو۔

شادی کی رسم کی ادائیگی مذہبی پیشوا جسے لامہ کہا جاتا ہے ادا کرتا ہے۔ دولہا، دلہن کے سروں پر مکھن مل دیا جاتا ہے' دولہا کا باپ بہ آواز بلند اعلان کرتا ہے۔

''تمہیں میرے بیٹے کی دلہن بن کر رہنا ہے اگر تم کسی دوسرے مرد کے ساتھ گئیں تو اس کا ہرجانہ دینا پڑے گا۔ تم جگ جگ جیو ایک گلہری بھی تمہارا راستہ نہ کاٹے۔ پرندے اونچے اونچے نہ اڑ سکیں اور ہوا تک تمہارے درمیان دیوار نہ بن سکے۔''

اس طرح دلہن کا باپ بھی لڑکی کو اسی قسم کی نصیحت کرتا ہے۔ جونہی وعظ و نصیحت کا یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ براتی زور زور سے کھڑک بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ نعرے لگاتے ہیں اور ناچتے ہیں اِدھر لاما یا پروہیت اشلوک پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ ناچنے والے یاسی (پہاڑی گائے) کی دُمیں لگا لیتے ہیں۔ وہ دُمیں ہلا ہلا کر پیتل کے ساز بجاتے ہیں۔ برات دلہن کے گھر کئی روز ٹھہرتی ہے بشرطیکہ فریقین غریب نہ ہوں۔ سارا گاؤں باری باری برات کو اپنے اپنے گھر ٹھہراتا ہے۔ اگر پہلی رات تمام گاؤں والے برات کو اپنے ہاں مدعو نہ کر سکیں تو یہ سلسلہ دوسری رات بھی جاری رہتا ہے اور بعض اوقات یہ سلسلہ ... تین چار رات جاری رہتا ہے۔ دلہن کی رخصتی سے پہلے گاؤں والے لڑکی اور لڑکے کو تحفہ پیش کرتے ہیں۔

غریب ہونے کی صورت میں یہ رسمیں معمولی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ شادی کے لیے آسان راستہ اسی طرح اختیار کیا جاتا ہے کہ دلہن کے والد کو چھ روپے ادا کر دیے جاتے ہیں اور بغیر کسی رسم کے باپ اپنی لڑکی کو دولہا کے حوالے کر دیتا ہے۔

شوہر کو پورے پورے حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں اور ان کے بچوں کو بھی آگے چل کر مطعون نہیں کیا جاتا۔ شادی کی یہ سادہ سی رسم غریبوں میں ہی رائج نہیں بلکہ یہ رسم اس وقت بھی ادا کی جاتی ہے جب دلہن کے ماں باپ شادی میں غیر ضروری تاخیر سے کام لیتے ہیں۔ دوسری شادی کے وقت بعض امیر آدمی بھی سادہ سی رسم کا سہارا لیتے ہیں۔ جس کے علاوہ شرپا خاندانوں میں شادی کی ایک اور رسم کا رواج بھی پایا جاتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت بغیر کسی نکاح کے ایک گھر میں میاں بیوی کے طرح رہنا شروع کر دیتے ہیں اور مل کر مزدوری کرتے ہیں۔ اس شادی کو ملاپ کا نام دیا جاتا ہے اور جب فریقین کا جی چاہتا ہے الگ ہو جاتے ہیں اور علیحدگی کے وقت تمام اثاثے کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ علیحدگی پر انہیں کسی قسم کا طعنہ نہیں دیا جاتا اور اگر اس دوران میں صاحب اولاد ہو جائیں تو ان کی بلوغت تک وہ علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے طور پر ان کی ذمے داریاں سنبھالتے رہتے ہیں۔ دوبارہ اس سے زیادہ شادیاں کرنے والے مرد عموماً اس ملاپ کا نسخہ استعمال کرتے ہیں چاہے وہ کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں۔

میاں بیوی کے حقوق کے سلسلے میں نہ تو میاں کو بیوی پر کوئی فوقیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی بیوی، شوہر پر کسی قسم کی فوقیت رکھتی ہے۔ شوہر بیوی کی تمام ذمے داریاں پوری کرتا ہے اور بیوی نہ صرف گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتی ہے بلکہ خاوند کے کام میں بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے اور اس طرح وہ جو جائداد بناتے ہیں وہ ان کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ یہ فریقین میں سے ایک کی موت یا طلاق کی صورت میں تقسیم کر لی جاتی ہے۔ شادی کے وقت جوڑے کو جو نصیحتیں کی جاتی ہیں وہ میاں بیوی کے فرائض یا حقوق پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتیں۔ نیپال کے ہندوؤں کی طرح بیوی شوہر کی داسی نہیں سمجھی جاتی اور نہ ہی مرد کے کام کاج کو عورت کے کام کاج پر فوقیت دی جاتی ہے بلکہ عورت اور مرد کے کام کاج کی یکساں اہمیت ہے۔ مرد کی ذمے داریوں میں زیادہ تر اجناس کی خرید و فروخت ہے۔ چھوٹا موٹا کاروبار، کھیتی باڑی اور کسی حد تک مویشیوں کی دیکھ بھال کے فرائض عورت انجام دیتی ہے کیونکہ مرد زیادہ تر گھر سے باہر دور دراز کے علاقوں میں چلے جاتے ہیں اس لیے تمام لین دین کا کاروبار عورتیں ہی سرانجام دیتی ہیں۔ بہت سی عورتیں تو خاوند کی غیر موجودگی میں تجارت اور سود پر روپیا دینے کا کام بھی بہ خوبی سرانجام دیتی ہیں۔ اقتصادی امور میں شرپا عورت کی یہ آزادی ان کے تعلقات پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتی اور ہندو کی طرح نہ تو یہ عورتیں کاہلی کو اپنا شعار بناتی ہیں اور نہ ہی کام کاج سے گھبراتی ہیں۔

بعض اوقات شرابی یا غصیلے مرد غیروں کی موجودگی میں بیوی کے ہاتھوں پٹ جاتے ہیں۔ مزاح کو شرپا بہت پسند کرتے ہیں اور میاں بیوی کی نوک جھونک سے مہمان یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ ان کی گھریلو فضا خوشگوار ہے۔ ہر معاشرے کی طرح شرپا عورتیں اور مرد آپس میں جھگڑتے

ہیں اور یہ جھگڑے اگر زیادہ بڑھنے لگیں تو میاں بیوی دل میں کوئی عناد رکھے بغیر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ شرپا مرد اور عورتوں میں برداشت کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور علیحدگی کے بعد بھی وہ سوسائٹی میں اس طرح ملنے جلنے لگتے ہیں جیسے ماضی میں ان کا تعلق تھا۔

شادی کے بعد اگر ایک شرپا مرد کا کسی عورت سے ناجائز تعلق کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے تیس روپے ہرجانہ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے علاوہ کسی غیر مرد کی ہو جائے تو اسے بھی یہی سزا دی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ سزا بھی نہیں دی جاتی اور بیئر کی ایک بوتل یا ایک آدھ تحفے سے سارا معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ مجرم اگر لامہ یا بھکشو ہو تو غمزدہ خاوند یا بیوی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔

شرپا خاندان میں بچوں سے بڑا نرم اور محبت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف بچہ جونہی ہوش سنبھالتا ہے ماں باپ اس کی نگہداشت کے فرائض سے تقریباً اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں۔ ایک شرپا گاؤں سے گزرتے ہوئے یہ منظر عام طور پر دکھائی دیتا ہے کہ ہر عمر کے بچے اپنے اپنے گھروں میں مختلف قسم کے کھیل کود میں مصروف ہیں اور ان کے ماں باپ گاؤں سے دور کھیتی باڑی اور دوسرے کام کاج میں منہمک ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ تین چار سال کے بچے گھر پر رہتے ہیں اور ان سے ذرا بڑے عمر کے بچے ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اِدھر بچے کی عمر آٹھ سال ہوئی اُدھر اس پر مویشی چرانے کی ذمے داری ڈال دی جاتی ہے اور جب بچہ بارہ سال کا ہوتا ہے تو اس کا باپ اسے اور زیادہ ذمے داریاں سونپ دیتا ہے۔ اب وہ یاک کی گلہ بانی کا کام شروع کر دیتا ہے اور یہ کام اس لیے خاصا مشکل ہوتا ہے کہ ان کم سن بچوں کو گاؤں سے باہر رات کو بھی گلے کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ شروع شروع میں باپ بھی لڑکے کا ساتھ دیتا ہے لیکن سخت بود و باش کی وجہ سے یہ مرحلہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ بچے کو دور دراز پہاڑے میں کھانا خود پکانا پڑتا ہے اور اتھاہ تنہائی میں مہینوں الگ تھلگ رہنا پڑتا ہے۔ اس عمر کی لڑکیاں خانہ داری کے امور میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ کھیت میں کام کرتی ہیں اور اگر کسی خاندان میں کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو لڑکیوں کو گلہ بانی کے فرائض بھی سرانجام دینا پڑتے ہیں۔ لڑکیاں زیادہ وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ کام کاج میں گزارتی ہیں اور ایک لڑکی بیس سہیلیوں کے گھر میں بیس روز کام کرتی ہے تو اکیسویں رات کو بیس سہیلیاں مل جل کر اس کے کام سنوار دیتی ہیں۔

شرپا جائداد اور اس کی تقسیم کے امور پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنی کمائی خرچ کرنے کی پوری پوری آزادی ہوتی ہے۔ بچوں کو چھوٹی موٹی تجارت کرنے کی بھی کھلی چھوٹ ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا کہ شادی کے وقت ایک شرپا لڑکی تجارت کے اکثر رموز سے آگاہ ہوتی ہے۔ یہ تجربہ آئندہ زندگی میں فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ لڑکی کو شادی پر جو جہیز دیا جاتا ہے وہ اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ اور تمام اشیا کا ذکر ایک فہرست میں موجود ہوتا ہے اگر کسی وجہ سے شادی کامیاب نہ ہو تو لڑکی اپنا جہیز واپس لے لیتی ہے۔ بچے ہو جانے کی صورت میں بیوی کے جہیز کی ملکیت محدود ہو جاتی ہے اور الگ ہونے یا طلاق لینے کی صورت میں عموماً وہ جہیز کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتی۔

مذہبی امور کی بجا آوری کے سلسلے میں شرپا بہت زیادہ توہم پرست ہیں اس کا اندازہ آپ اس کہانی سے لگا سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سات بدروحوں نے بہت سے انسانوں کو ہلاک کر ڈالا۔ ان میں سے ایک بدروح کے 500 بچے تھے۔ وہ بھی اپنی ماں پر گئے تھے اور پانچ سو کے پانچ سو بچے ہر روز مزید پانچ انسانوں کو کھا جاتے تھے۔ چنانچہ مذہبی رہنما (لامہ) نے ایک روز اس بدروح بچوں میں سے ایک کو اغوا کر کے کہیں چھپا دیا۔ جس پر بدروح ماں انتہائی پریشان ہو گئی اور مذہبی رہنما (لامہ) کے پاس پہنچی۔

لامہ نے کہا ''تم ہر روز 500 انسانوں کو قتل کر دیتی ہو اور تمہارا ہر بدروح بچہ روزانہ پانچ انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ تم ایک بچے کی گمشدگی پر اتنی ہراساں ہو ذرا ان ماؤں کے بارے میں بھی سوچو جن کے کئی بچے روزانہ تمہاری بدی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اگر وعدہ کرو کہ مظلوم انسانوں کی ہلاکت سے تم باز آ جاؤ گی تو تمہارا بچہ تمہیں واپس مل سکتا ہے۔''

اس طرح انسانوں کو اس بدروح سے نجات ملی کیونکہ بدروح خود مشکل میں پڑ کر دوسروں کی مشکل سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اس طرح لامہ نے ان لوگوں کو جن کا مقدر ہلاکت ہو چکی تھی یہ نصیحت کی کہ وہ تین سال تک باقاعدہ عبادت کریں تاکہ ان کے گناہ معاف ہو جائیں۔

یہ ایک قسم کا مذہبی تہوار یا رسم کا آغاز تھا۔ خاص تہوار میں شریک افراد برت رکھتے ہیں اور جب یہ برت (روزہ) ختم ہوتا ہے تو لاوا تمام شرکا کے لیے کھانے پینے کا انتظام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے ہیں اور اس دعوت میں گھی، شکر، چاول اور قہوے کا شاندار اہتمام ہوتا ہے۔ لاوا (منتظم) یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مکھن کے چراغ تقریب کے دوران میں جلتے رہیں۔ ان کی بیویاں دوسرے لوگوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں اکٹھی کرتی رہتی ہیں۔ مندر کے باورچی خانے میں سارا دن خوراک کے انبار لگے رہتے ہیں۔ ادھر عبادت گزار رات بھر مندر میں عبادت کرتے رہتے ہیں صبح ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ برت ختم کرتے ہیں۔ لباس تبدیل کرتے ہیں اور مندر واپس آجاتے ہیں۔ اب ان کے ساتھ وہ گاؤں والے بھی ہوتے ہیں جو رسم میں شریک نہیں تھے۔ یہ دیہاتی ہی خوراک کی کثیر تعداد جس میں مکئی کا آٹا، اُبلے ہوئے چاول، آلو اور میٹھی روٹیاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ قربان گاہ کے سامنے ڈھیر کردیتے ہیں۔ یہ خوراک شرکا میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس رسم کو اوشو کہا جاتا ہے۔ اس طرح مجی کا جشن بھی بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ اس رسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرپا چراگاہوں کی طرف کوچ کررہے ہیں اور وہ اب ایک لمبے عرصے کے لیے ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے۔ مجی تہوار آٹھ روز تک جاری رہتا ہے اور اس میں امیر، غریب، بچے، بوڑھے اور نوجوان شریک ہوتے ہیں اور خوب ہنستے کھیلتے ہیں۔

جب کسی خاندان میں موت واقع ہوتی ہے تو سوگوار کنبے کے افراد پے در پے رسم پر رسم کرتے چلے جاتے ہیں جن کی نوعیت خالص مذہبی ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص مہلک بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے تو شرپا روحوں کو بلانے والوں کی تلاش شروع کردیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں روحیں بلانے والے ہی مریض کی بیماری کا سبب بتاسکتے ہیں۔ اگر اس پر بھی مریض تندرست نہ ہو تو وہ لاماؤں اور بھکشوؤں سے علاج کرنے کی درخواست کرتے ہیں جس کے لیے انہیں سینکڑوں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں پھر یہ لامہ اور روحیں بلانے والے مل جل کر مریض کا علاج کرتے ہیں ایک امیر آدمی بیک وقت 30 لاماؤں کو اپنے گھر بلالیتا ہے۔

مریض اگر موت کے منہ میں چلا جائے تو میت کو سفید کپڑے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے اور اس وقت تک اسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا جب تک کسی لامہ کو بلا نہ لیا جائے۔ لامہ کے آنے کے بعد تجہیز و تکفین کی رسوم شروع ہوجاتی ہے جن میں گھر کا کوئی فرد حصہ نہیں لیتا بلکہ جو لوگ اس کام میں شریک ہوتے ہیں وہ پیشہ ور ہوتے ہیں۔ لامہ آتے ہی لاش کے سر کے کچھ بال نوچ لیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس کی روح سر کے راستے نکل جائے گی ساتھ ہی ساتھ وہ کچھ پڑھتا بھی جاتا ہے۔

شرپا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ روح 49 دن تک بھٹکتی رہتی ہے اور اگر اس مدت میں تمام رسوم ادا کرلی جائیں تو وہ بھٹکنے سے بچ جاتی ہے۔ لامہ روح کی نجات کے لیے ایک خاص قسم کے زائچے سے مدد حاصل کرتا ہے کہ میت کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے۔ وہ اس کے لیے مندرجہ ذیل امور سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ مرحوم کی عمر، پیدائش کے پہلے بارہ سال کے حالات، موت کا وقت، ہفتے کا دن اور مہینا، موت کے وقت ستاروں کے مقامات کا تعین اور ایک خاص پرندے کی حالت کا تعین (یہ پرندہ انسانی جسم سے مشابہ ہوتا ہے اور زائچے میں اس کی گردش کے مختلف مقامات دیے گئے ہیں)

اسی زائچے کے حساب سے لامہ فیصلہ کرتا ہے کہ کون جسم کو پہلے ہاتھ لگائے اور آیا اسے جلایا جائے، دفن کیا جائے یا دریا میں پھینکا جائے..... شرپا لاش کو جلانا باعث تکریم سمجھتے ہیں اس لیے مرنے والے کے لواحقین اس پر اصرار کرتے ہیں۔

جونہی لامہ لاش تیار کرنے والے کو حکم دیتا ہے وہ شخص ایک رسے کی مدد سے لاش کو بٹھادیتا ہے۔ لاش سفید کپڑے میں لپٹی ہوتی ہے۔ لاش کے آس پاس کچھ جادوئی نشانات لٹکادیے جاتے ہیں تاکہ بدروحیں انہیں دیکھ کر لاش کے قریب نہ آئیں۔ لاش کے عقب میں جو قربان گاہ بنائی جاتی ہے اس کی دو سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ پہلی سیڑھی پر تورما (خاص قسم کی روٹی) اور مقدس پانی پھینکنے کا برتن رکھا ہوتا ہے۔ نچلی سیڑھی پر پیتل کے پیالے رکھے ہوتے ہیں۔ ان پیالوں میں کسی میں پانی ہوتا ہے..... کسی میں گھر کے لوگوں کے کھانے کے لیے روٹیاں اور خوراک کے وہ ٹکڑے ہوتے ہیں جو بدروحوں کے بھینٹ کیے جاتے ہیں۔ لاش کے سامنے ایک میز پر مکھن سے جلنے والے چراغ اور کھانے پینے کی اشیا رکھ دی جاتی ہیں۔ اس میز کے ساتھ ہی دو ٹوکریوں میں تلی ہوئی روٹیاں اور بھنی ہوئی مکئی رکھی ہوتی ہیں جو شرکا میں تقسیم کی جاتی ہیں۔

موت اور میت کے جلانے کا درمیانی وقفہ تین راتیں اور تین دن ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ وقفہ 4 بھی کردیا جاتا ہے۔ لاش اگر کم عرصہ کے لیے گھر پر رہے تو اسے اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا البتہ لاش ٹھکانے لگانے میں جتنی دیر ہوتی ہے اسے بہتر سمجھا جاتا ہے اور عموماً یہ تاخیر اس لیے ہوتی ہے کہ

لاش کو جلانے کے لیے مناسب دن کا انتظار کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک لاش کئی کئی روز تک بھی گھر میں پڑی رہتی ہے۔ لامہ جب تک اشلوک پڑھتا رہتا ہے نہ تو شراب پیتا ہے نہ ہی کسی قسم کا گوشت استعمال کرتا ہے بلکہ دودھ، دہی اور سبزیاں کھانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لاش جتنے دن گھر پر رہتی ہے لامہ ڈھول پیٹتے، ساز بجاتے، اشلوک پڑھتے ہیں۔ اڑوسی پڑوسی ماتم کرنے والوں سے اظہار ہمدردی کرنے کے لیے آتے ہیں اور شراب یا بیئر نذرانے کے طور پر پیش کرتے جاتے ہیں۔ آنے والے سب سے پہلے لامہ کا جام بھردیتے ہیں پھر ایک خالی پیالے میں شراب ڈال دیتے ہیں جو مرنے والے کا حصہ ہوتا ہے اور آخر میں گھر کے سب سے بڑے فرد کو شراب پیش کی جاتی ہے۔

ماتم کی مختلف رسوم 49 دن تک جاری رہتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ''گے وا'' ہے جس پر بے پناہ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی خیرات ہے۔ بعض اوقات اس رسم میں شامل ہونے کے لیے دور دراز کے دیہاتی بھی آتے ہیں۔ امیر آدمی مکھن، چاول اور نقد روپے تقسیم کرتے ہیں۔ عام آدمی صرف چاول اور نمک کی تقسیم پر اکتفا کرتے ہیں۔

شرپا عقائد کے مطابق روحیں اور دیومی، دیوتا ایک خاص قسم کے سحر کے تحت بلائے جاسکتے ہیں۔ یہ روحیں انسان کو نقصان پہنچاسکتی ہیں۔ ان روحوں پر قبضہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان کے عقائد کے تحت ''شرندی روحیں'' سب سے زیادہ خوف ناک ہوتی ہیں جو غول در غول انسانوں پر حملہ آور ہوتی ہیں لیکن لامہ انہیں اپنی عبادت کے زور سے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ ان روحوں کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک گروہ کبھی کسی انسانی جسم میں تبدیل نہیں ہوتا اور دوسرا گروہ ایسے انسانوں کا روپ دھار لیتا ہے جو حد سے زیادہ گناہ گار ہوتے ہیں۔

شرندی روحوں کو بھگانے کے لیے شرپا سال میں دوبار خاص رسوم ادا کرتے ہیں۔ شرپا یقین رکھتے ہیں کہ لامہ روحیں بلانے والے اور روحوں کا عمل جاننے والے (لہاوا) ان کو دیکھ سکتے ہیں، ان سے بات چیت کرسکتے ہیں اور ان سے ہدایات حاصل کرسکتے ہیں۔

روحیں بلانے کا منظر بڑا دلچسپ اور حیرت ناک ہوتا ہے۔ ایک کمرے میں روحیں بلانے والے (لہاوا) کو بٹھایا جاتا ہے۔ یہ لہاوا ایک بڑا سا آئینہ اپنے سامنے رکھ لیتا ہے جس پر وہ مسلسل نظریں گاڑے رکھتا ہے۔ اس کے چہرے کی حالت رفتہ رفتہ متغیر ہونا شروع ہوجاتی ہے جیسے وہ انتہائی کرب میں مبتلا ہو پھر اچانک اس کے چہرے پر سکون کی سی کیفیت چھا جاتی ہے۔ اس سارے عمل کا یہ مطلب ہوتا کہ آسمانی روحیں آئینے میں موجود تھیں اور چونکہ ان کا پسندیدہ دیوتا آئینے میں نہیں تھا اس لیے اس کی حالت متغیر ہورہی تھی اور جونہی اسے اپنا دیوتا آئینے میں دکھائی دیا، اسے سکون مل گیا۔ دوسری طرف ایک اور چھوٹے سے آئینے میں یہی لہاوا بدروحوں کو بلاتا ہے اور جب یہ روحیں اس آئینے میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو وہ انہیں شراب پیش کرتا ہے (ایک دو گھونٹ خود بھی شراب ... پی لیتا ہے) اور ساتھ ہی عجیب وغریب آواز میں کہتا ہے کہ شرندی (بدروح) کہہ رہی ہے کہ یہ شراب اچھی نہیں ہے لہٰذا اسے عمدہ قسم کی شراب پلائی جائے پھر یہ لہاوا روحوں سے مختلف قسم کے سوالات کرتا ہے۔ وہ اپنی نشانیاں بتاتی ہیں بعض اوقات بدروحیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ کس طرح فلاں آدمی کی موت کا باعث وہ بننے والی تھیں کہ فلاں لامہ کی وجہ سے وہ خاص آدمی ان کا شکار ہونے سے بچ گیا۔

لہاوا بننے کے لیے بڑے کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک تونامی لہاوا کا بیان ہے کہ وہ 12 سال تک روحوں سے نبرد آزما رہا ہے جو اسے جنگل میں ملتی تھیں اور اسے بیمار کردیتی تھیں۔ بعض اوقات جب وہ پہاڑی علاقوں میں سفر کررہا ہوتا تھا تو اچانک پہاڑ غائب ہوجاتے تھے اور وہ ایسے میدانی علاقوں میں گھوم رہا ہوتا تھا جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو کسی ایسے مکان میں پاتا تھا جس میں ہجوم کے چہرے ہی چہرے نظر آتے تھے یہ اور اس قسم کی دوسری داستانیں ان کے عقائد میں شامل تھیں۔

لہاوا اور لامہ میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ لامہ جہاں روحیں بلانے کا فرض انجام دے لیتا ہے وہاں وہ ایک قسم کا طبیب بھی ہوتا ہے اور جڑی بوٹیوں سے بھی ان کا علاج کرتا ہے۔ اس فرق کے باوجود پیشے کے لحاظ سے لہاوا اور لامہ ایک دوسرے کے حریف نہیں ہوتے۔

شرپا چڑیلوں، آفات اور آسیب کے بھی قائل ہیں جنہیں وہ ''پم'' کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمام بیماریاں انہی کی وجہ سے ہوتی ہیں اور حادثات بھی انہی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ چڑیل وہ ایک ایسی عورت کو کہتے ہیں کہ جو اتنی طاقت حاصل کرلیتی ہے جس سے وہ مختلف لوگوں کو نقصان پہنچاسکتی ہے ان کے نزدیک کوئی عورت پیدائشی طور پر چڑیل نہیں ہوتی بلکہ رشک، حسد، فاسد خیالات اور بُرے عمل اسے چڑیل بنادیتے ہیں۔ ایک مشہور چڑیل کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہا جاتا ہے کہ یہ عورت اس لیے چڑیل بن گئی کہ اس نے اپنے رشتے داروں کو ایذا دیتی تھی اور اس چڑیل کا خاتمہ بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا کچھ عرصہ پہلے اس کا بیٹا ایک پہاڑی مہم کے دوران برف کے ایک تودے کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا اور چند ہی ہفتوں بعد ایک پہاڑی ڈھلان سے پھسلنے کے بعد یہ عورت ایک بپھری ہوئی ندی میں بہہ گئی۔ چند دنوں بعد اس کی لاش دو چٹانوں میں الجھی ہوئی ملی لیکن کسی کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ تھی کیونکہ لاماؤں نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی لاش کو چھونے سے گاؤں پر آفت نازل ہوسکتی ہے۔

چڑیلوں کے علاوہ شرپا بھوت پریت پر بھی یقین رکھتے ہیں جنہیں وہ ''نورپا'' کہتے ہیں۔ نورپا ان کے نزدیک ان لوگوں کی روحیں ہوتی ہیں جو گناہ گار ہوتے ہیں اور جن کی روحیں اپنے گناہ کی وجہ سے ہمیشہ بھٹکتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر متذکرہ بالا چڑیل کا بیٹا جو برف کے نیچے دب کر مرگیا تھا ''نورپا'' میں تبدیل ہوجاتا ہے لیکن جب ایک لہاوا اس کی روح سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ اپنی ماں کو اپنی موت کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے کہ ''مجھے خوامخواہ مشکل مہم پر بھیجا گیا۔'' وہ گرم خوراک اور شراب کا تقاضا کرتا ہے جو لہاوا کو مہیا کردی جاتی ہیں اور اس طرح اس لڑکے کی روح سکون حاصل کرلیتی ہے۔

نورپا روح عموماً اکیلی نہیں بھٹکتی بلکہ اس کے ساتھ دوسری بدروحیں بھی ہوتی ہیں جنہیں سانپ اور پانی کی بد روحیں کہا جاتا ہے۔ یہ روحیں ہندوستان ناگ دیوتا حکایات لیے ہوئے ہیں۔ شرپا اس روح کو جب مجسم کرتے ہیں تو اپنی تصویروں میں ایک ایسا مرد یا عورت دکھاتے ہیں جس کا نچلا دھڑ ٹانگوں کی جگہ سانپ یا ناگ سے مشابہت رکھتا ہے ہر چند کہ یہ روح پانی کی روح کہلاتی ہے لیکن ہر گھر میں اس کے مجسموں کو پوجا جاتا ہے۔ یہ روح صرف اسی وقت نقصان پہنچاتی ہے جب اسے غصہ دلایا جاتا ہے۔ شرپا یقین رکھتے ہیں کہ یہ روحیں موسم گرما میں تبت کی طرف چلی جاتی ہیں اور موسم سرما اور ساون کے مہینے میں واپس آجاتی ہیں۔ عام طور پر ان کے خیال میں یہ روح ایک عورت ہوتی ہے اس لیے ہر گھر میں عورتیں ہی اس کی پوجا کرتی ہیں۔ خاص طور پر شادی کے وقت دلہن کی حفاظت کی جاتی ہے تاکہ یہ روح دلہن کے ساتھ اس کے سسرال نہ چلی جائے۔

شرپا عجیب وغریب، متضاد اور انوکھے عقائد رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بدھ مت کے پیروکار ہیں لیکن دوسری طرف عملی طور پر ان کے نظریات انتہائی اُلجھے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ان کے مذہب کا تعلق ہے ان کے نزدیک لڑنا، جھگڑنا، چوری کرنا اور دھوکا دینا گناہ ہے، کسی دوشیزہ سے اس کی رضامندی پوچھے بغیر شادی کرنا بھی گناہ ہے، غیبت، چغل خوری، جاندار کو مارنا حتیٰ کہ پھول توڑنا یا درختوں کو نقصان پہنچانا بھی ان کے نزدیک گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔

شرپا نیکی اور بدی کے جو تصور رکھتے ہیں وہ کچھ مسلمانوں کے منکر نکیر کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے خیال میں ہر انسان کے دونوں کندھوں پر نیک اور بد روحیں نامہ اعمال تیار کرتی رہتی ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو بدروح سیاہ رنگ سے اس کی بدی کی فہرست میں ایک نئی بدی کا اضافہ کردیتی ہے۔ اگر ایک شخص زیادہ نیکیاں کرتا ہے تو وہ جنت کا حق دار ہوگا اور اگر گناہوں کی فہرست نیکیوں سے طویل ہے تو وہ جہنم رسید ہوگا لیکن جنت یا جہنم کا کوئی واضح تصور ان کے پاس نہیں۔ گناہ یہ تصور ان کی عملی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

شرپا سادہ دلی اور خلوص کے بھی انتہائی قائل ہیں۔ ان کے خیال میں اگر ایک شخص کی نیت نیک نہیں اس کے ارادوں میں خلوص نہیں اور اس کے اعمال میں سادہ دلی کارفرما نہیں تو نہ تو عبادت کسی کام آسکتی ہے نہ ہی رسوم کی ادائیگی پر بہت زیادہ خرچ کرنے سے کوئی فائدہ ہوسکتا ہے۔ وہ لاماؤں کو اس لیے واجب الاحترام جانتے ہیں کہ ان کے خیال میں ایک لامہ اس وقت تک مذہبی عالم نہیں بن سکتا جب تک وہ خلوص کو اپنا شعار نہیں بناتا اور اس کا سارا علم فضیلت اور مرتبہ محض اس کے خلوص کا نتیجہ ہیں۔

خلوص کے آگے وہ دولت کو بھی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ ان کے خیال میں دولت غربا میں تقسیم کرنے کے لیے ہے نہ کہ آئے دن اس میں اضافہ کرنا ہے۔ یہی وجہ کہ دوسروں کے حقوق کی نگہداشت اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا بھی شرپا سوسائٹی میں ایک انتہائی مستحسن فعل سمجھا جاتا ہے ان کے خیال میں وہی دولت مند ایک عمدہ اور بہتر زندگی بسر کرتا ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے۔

شرپا تجارت کے بہت دلدادہ ہیں نفع ونقصان کے اسی جذبے کے تحت شرپا مہموں میں تیزی سے سرگرم نظر آتے ہیں۔ مزدوری اور بوجھ اٹھانے کے ساتھ جان لیوا کام کے ساتھ وہ اپنا کاروباری ذوق بھی پورا کرتے رہتے ہیں۔

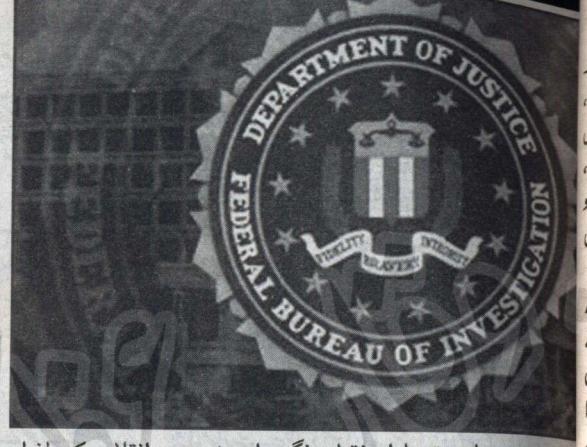

ایف بی آئی کا جنم

صائمہ اقبال

عظیم تبدیلیاں فقط جنگوں اور خوں ریز انقلاب کے طفیل جنم نہیں لیتیں، ایک معمولی سا واقعہ بھی کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں وقوع پذیر ہوا، جسے تاریخ میں ''صدی کا سب سے بڑا جرم'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

دنیا کے سب سے بڑے تفتیشی ادارے کے قیام کا پس منظر

یکم مارچ 1932ء کی سرمئی، خوشگوار شام نیوجرسی پر اُتر چکی تھی۔ آسمان پر دبیز بادل تیر رہے تھے۔ تازگی سے ہمکتی ہوا میں نمی گھلی تھی۔ زندگی کی علامت تصور کیا جانے والا سورج کرنیں بکھیر کر غروب ہوچکا تھا اور اب چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔

محکمۂ موسمیات نے آج رات بارش کی پیشگوئی کی تھی اور نیوجرسی کے پُرسکون قصبے ایسٹ ایم ول کے باسی دعا کر رہے تھے کہ پیشگوئی درست ثابت ہوتا کہ وہ اُس رات کے حسن سے جی بھر کر لطف اندوز ہوسکیں۔

اِسی قصبے میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ہوا باز، مہم جُو اور مصنف کرنل چارلس لِنڈ برگ کا مکان تھا جہاں غروب آفتاب تک سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔

گھنے درختوں میں گھری اُس کی عالی شان قیام گاہ کی کھڑکیوں پر نم ہوا دستک دے رہی تھی۔ باورچی خانے میں عشائیے کی تیاری جاری تھی اور تازہ کھانے کی مہک گھر کے باسیوں تک پہنچ رہی تھی جن کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مسکراتی شام جلد ایک المیے کی شکل اختیار کرنے والی ہے۔ جلد ہی... سب بدلنے والا ہے!

آٹھ بجے کے لگ بھگ فربہی کی جانب مائل بیٹی گونے ڈیڑھ سالہ چارلس لِنڈ برگ جونیئر کو پنگوڑے میں لٹایا۔ وہ اُس کی آیا تھی۔ اُس وقت بچے کے ماں باپ نچلی منزل پر کھانے کی میز کے سامنے موجود تھے۔

پنگوڑے میں لیٹا ننھا چارلس لِنڈ برگ جونیئر نیند کی وادی میں اُتر چکا تھا۔ چہرے پر معصومیت کا نور دمک رہا تھا۔ گو کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کے حوالے سے خبط میں مبتلا بیٹی گو کی مالکن اینا نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ کوئی بچے کو بوسہ نہ دے لیکن آیا اُس لمحے خود کو روک نہیں سکی۔ اُس نے جھک کر بچے کا ماتھا چوم لیا۔ وہ آخری موقع تھا جب کسی نے اُس معصوم پر اپنا پیار نچھاور کیا!

بارش شروع ہوچکی تھی۔ ہوا میں تیرتی ٹھنڈ کے پیشِ نظر بیٹی گو نے بچے پر کمبل ڈال کر اُس کے کناروں پر دو سیفٹی پن لگا دیں تاکہ وہ زیادہ ہل جُل نہ سکے۔ جاتے ہوئے بڑی آہستگی سے اُس نے کمرے کا دروازے بند کیا اور زینے سے نیچے اُتر گئی۔ بچے کا کمرا پہلی منزل پر گھر کے جنوب مشرقی حصے میں تھا جس کے ٹھیک نیچے چارلس کا کُتب خانہ تھا جہاں وہ طعام سے فارغ ہوکر اب بیٹھا مطالعہ کررہا تھا۔

لگ بھگ ساڑھے نو بجے کتاب پر جھکے چارلس کو ایک مشکوک آواز سنائی دی۔ اُسے لگا جیسے کوئی دھم سے زمین پر کودا ہو۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں بارش کے دھیمے سُر رقصاں تھے۔

اُسے مزید کوئی آواز سنائی نہیں دی، مکان میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ دوبارہ کتاب میں گم ہوگیا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد بیٹی گو دوبارہ بچے کی آرام گاہ میں داخل ہوئی جہاں ایک سانحہ اُس کا منتظر تھا۔ پنگوڑا خالی تھا۔

حیرت اور خوف کے زیرِاثر اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں سناٹا رینگ رہا تھا جس نے اُسے بے چینی سے بھر دیا۔ اُس نے کھڑکی کے باہر جھانکا جہاں تاریکی اور نمی منہ چڑا رہی تھی۔

''وہ... کہاں گیا؟'' اُس نے خود سے سوال کیا۔

آنکھوں میں اندیشے لیے بیٹی گو فوراً ساتھ والے کمرے کی جانب دوڑی جو چارلس اور اینا کی خواب گاہ تھا۔ اُسے امید تھی کہ بچہ اپنی ماں کے پاس ہوگا، تاہم اُسے شدید مایوسی ہوئی۔

تولیہ سے بال سُکھاتی اینا نے جب بیٹی گو کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھیں تو گھبرا گئی۔

''جونیئر... وہاں نہیں ہے۔'' آیا نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

''کیا مطلب وہاں نہیں؟'' اینا کی آنکھوں میں خدشات سمٹ آئے۔ قدم بچے کے کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔ بیٹی گو نے اُس کی تقلید کی۔

خالی جھولا دیکھ کر اینا کے ہوش اُڑ گئے۔ بچے پر ڈالا جانے والا کمبل فرش پر پڑا تھا اور اندیشوں کو مہمیز کر رہا تھا۔

''نیچے جاؤ... چارلس کو مطلع کرو فوراً۔'' اینا کی آواز میں ایک ماں کا غم تھا۔

جونہی آیا کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ چارلس کی سماعتوں سے ٹکرائے، وہ اوپری منزل کی جانب دوڑ پڑا جہاں اُس کی بیوی آنکھوں میں آنسو لیے دکھ سے کانپ رہی تھی۔

کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ خالی پنگوڑا دیکھتے ہی اُس کا دل حلق میں آیا لیکن اُس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ پھر اُس کی نظر کھڑکی کے چوکھٹے پر رکھے ایک سفید لفافے پر پڑی جو کمرے کے ماحول سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

گھر میں کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ اسٹور روم کی جانب دوڑا جہاں اُس کی رائفل پڑی تھی۔

مسلح چارلس نے گھر کا چپا چپا چھان مارا لیکن وہاں اندیشوں اور خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں!

بیس منٹ کے اندر اندر پولیس اہل کار اور میڈیا کے نمائندے چارلس لنڈ برگ کی جاگیر پر پہنچ گئے، سب کے چہروں سے اضطراب عیاں تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ خبر جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور آنے والے چند دنوں میں اِس نے عظیم مالیاتی بحران کے بعد امریکا میں جنم لینے والی دوسری بڑی خبر کا درجہ حاصل کرلیا!

جائے وقوع پر پہنچنے والے پولیس اہل کاروں میں ہوپ ویل پولیس ڈیپارٹمنٹ کا چیف ہیری وولف بھی شامل تھا جس کی معاونت کے لیے فوراً ہی نیوجرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ٹیم پہنچ گئی۔

ہیری وولف نے چند ہی لمحوں میں اندازہ لگالیا کہ یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہے۔ جس کا ثبوت وہ خط تھا جو کھڑکی کے چوکھٹے سے ملا تھا۔

پولیس نے چارلس لنڈ برگ کی جاگیر کی سمت آنے والے تمام راستے بند کردیے۔ اب وہ سراغ تلاش کررہے تھے۔

جس کمرے سے بچہ اغوا ہوا تھا اُس کی کھڑکی کے عین نیچے ٹائر کا ایک نشان تھا۔ یہ اُس مقام پر کسی اجنبی کی خفیہ آمد کا پہلا سراغ تھا۔ قریب ہی جھاڑیوں سے تین حصوں پر مشتمل بڑی مہارت سے تیار کی ہوئی ایک سیڑھی بھی ملی جس کی بابت یہ گمان ظاہر کیا گیا کہ اِسی کی مدد سے اغوا کاروں نے پہلی منزل تک رسائی حاصل کی ہوگی۔ اگلے چند گھنٹوں میں گھر کے اردگرد ایک میل کے حصے کو کھنگال ڈالا گیا لیکن یہ مشق نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ دراصل وہاں موجود صحافیوں کے جمِ غفیر کے باعث معاملات خاصے پیچیدہ ہوگئے تھے۔

آدھی رات کے وقت فنگر پرنٹس کا ماہر جائے واردات پر پہنچا۔ جس کمرے میں واردات ہوئی تھی وہاں سر کھپانا لاحاصل رہا۔ کمرے سے کسی قسم کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔ البتہ سیڑھی سے انگلیوں کے نمونے اکٹھے کرلیے گئے جو خاصے مبہم تھے۔ سیڑھی پر جوتے کے چند نشانات بھی تھے جنہیں محفوظ کرلیا گیا۔ رخصت ہونے سے قبل ماہر نے اندیشہ ظاہر کیا کہ شاید اکھٹے کئے جانے والے نمونے تفتیشی عمل میں زیادہ مددگار ثابت نہ ہوں۔ اِس بات نے چارلس لنڈ برگ کو برانگیختہ کردیا لیکن وہ خاموش رہا۔ دراصل اُس وقت قانون نافذ کرنے والے امریکی ادارے آج کے مانند جدید خطوط پر استوار نہیں تھے، تفتیش کا عمل خاصا سست رو تھا اور ٹیکنالوجی کے استعمال کو درخورِ اعتنا نہیں جانا جاتا تھا۔

اب تھکے ہارے افسران مکان کے دالان میں جمع تھے اور سامنے میز پر اغوا کاروں کی جانب سے چھوڑا جانے والا عجیب وغریب خط پڑا تھا۔

خط میں قواعد انشا کی کئی غلطیاں تھیں، زبان بھی بھونڈی تھی۔ تاوان کا مطالبہ کرنے والوں نے خط کا آغاز ''جنابِ محترم'' کے الفاظ سے کیا تھا، جو غیر متوقع تھا۔ اُن کا مطالبہ پچاس ہزار ڈالر تھا۔ اِس رقم کو مختلف مالیت کے کرنسی نوٹ یا سرٹیفکیٹ کی صورت تیار رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے یہ عندیہ دیا گیا تھا کہ اگلے دو سے چار روز میں اغوا کار مسٹر چارلس سے رابطہ کر کے اُسے مطلع کریں گے کہ رقم کہاں اور کس طرح پہنچائی جائے؟ ساتھ ہی اُسے پولیس سے دُور رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

خط کے آخری حصے میں دو دائرے تھے جو ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔ دو سوراخ اُن دائروں کے بیرونی طرف جبکہ ایک درمیان میں تھا۔

ان چیستانی دائروں اور سوراخوں کی بابت پولیس کا اندازہ تھا کہ اُنہیں اغوا کاروں نے دستخط کے طور پر استعمال کیا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی چارلس لنڈ برگ کے وارث کے اغوا کی خبر پورے ملک میں پھیل گئی۔

اس واقعے نے اعلیٰ حکام کو ہلا دیا۔ چارلس کی بین الاقوامی حیثیت کے پیشِ نظر امریکی صدر ہربرٹ ہوور نے ''بیورو آف انویسٹی گیشن'' (BOI) کے ڈائریکٹر جے ایڈگر کو اِس ضمن میں فوری اقدامات کی براہِ راست ہدایت جاری کردی۔

آج امریکی تاریخ کا متنازعہ ترین شخص تصور کیا جانے والا جے ایڈگر اُس وقت بھی کئی تنازعات میں گھرا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا انا پرست شخص تھا، جو اپنے ادارے کا دائرۂ اختیار بڑھانے کے حوالے سے انتہائی سخت گیر موقف رکھتا تھا۔ کمیونسٹوں کو ریاست کا دشمن نمبر ایک گرداننے والا ایڈگر ساتھی افسران کا چناؤ بھی ذاتی پسند کی بنیاد پر کیا کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک آمر تھا۔

بہ ظاہر وہ بلند آہنگ میں بات کرنے والا ایک پُراعتماد اور بارعب شخص تھا لیکن بہت کم لوگ یہ بات جانتے تھے کہ بچپن میں ایڈگر بُری طرح احساسِ کمتری میں مبتلا تھا، اعتماد کی شدید کمی تھی اور وہ بات کرتے ہوئے ہکلاتا تھا۔ اِن ہی خامیوں پر قابو پانے کی کوششوں نے اُسے سخت گیر بنا دیا۔

1895ء میں پیدا ہونے والے ایڈگر کو 1924ء میں فقط 29 برس کی عمر میں ولیم جے برنس کی جگہ ''بیورو آف انویسٹی گیشن'' کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ واضح رہے کہ اُس وقت یہ ادارہ موجودہ ایف بی آئی سے یکسر مختلف تھا۔ اُس کے اختیارات خاصے محدود تھے جن کا ایڈگر کو شدید قلق تھا تاہم اپنی مؤثر حکمت عملی سے وہ اِسے فعال اور بااثر بنانے میں کامیاب رہا۔ 1935ء میں یہ ادارہ ''ایف بی آئی'' میں بدل گیا۔ ایڈگر پہلا ڈائریکٹر مقرر ہوا اور اگلے 36 برس یعنی اپنی موت تک ایک آمر کی طرح اُس عہدے سے چمٹا رہا۔ اُس نے چھ امریکی صدور کے ساتھ کام کیا۔ کہتے ہیں، اُس نے سیاست دانوں اور فوجی جرنیلوں .... سمیت کئی اہم عہدوں پر فائز افراد کی بابت خفیہ فائلیں تیار کر رکھی تھیں جن کی بنیاد پر وہ اُنہیں بلیک میل کیا کرتا۔ یہی سبب ہے کہ انتہائی ناپسندیدہ ہونے کے باوجود کوئی اُسے ایف بی آئی کے ڈائریکٹر کے عہدے سے الگ نہیں کرسکا۔

گو کہ وہ متنازعہ ٹھہرایا گیا، تاہم اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ضدی ایڈگر کی حکمت عملی نے ایک معمولی وفاقی ادارے کو دنیا کا مضبوط اور بااثر ترین تفتیشی ادارہ بنا دیا۔ اُس نے اپنے حق میں کئی قوانین پاس کروائے، مختلف شعبوں کے ماہرین کو ایک چھت تلے جمع کیا اور تفتیشی عمل کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ اور یہ سب اُس نے چارلس لنڈ برگ جونیئر ہی کے کیس کو بنیاد بنا کر کیا۔

جس حبس زدہ رات ایڈگر کو صدر کا فون موصول ہوا، وہ خاصا تھکا ہوا تھا، تاہم دنیا کے بااثر ترین شخص سے ہونے والی گفتگو نے اُسے توانائی سے بھر دیا۔ اُسے بہ خوبی اندازہ تھا کہ یہ کیس اُسے آسمان پر پہنچا سکتا ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، صدر سے بات کرنے کے بعد اس نے اپنے ڈپٹی اور منظورِ نظر کلاڈ ٹالسن کو فون ملایا۔ ''تیار رہو، ہم نیوجرسی جارہے ہیں!''

اِس سے قبل کہ یہ اطلاع نیوجرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ تک پہنچتی کہ وفاقی اہل کار اِس کیس کی چھان بین کے لیے آرہے ہیں، ایڈگر اور ٹالسن چارلس کی جاگیر پر پہنچ چکے تھے۔

ایڈگر نے موقع پر موجود افسران کی آنکھوں میں اپنے لیے واضح ناپسندگی محسوس کی۔ وہ اُس سے تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اُنہیں اِس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اُن کے سامنے بیورو آف انویسٹی گیشن کا ڈائریکٹر کھڑا ہے۔

وہ مسٹر چارلس سے ملنے کا خواہش مند تھا جو ایڈگر کی آمد کے وقت بالکونی میں کھڑا سگار کا دھواں اُڑا رہا تھا، تاہم اُسے خاصا انتظار کرنا پڑا، کیونکہ چارلس پستہ قد وفاقی افسر سے زیادہ توقع نہیں رکھتا تھا اور اُس سے ملنا وقت کا ضیاع تصور کرتا تھا۔ اسے علاقائی حکام پر بھی اعتبار نہیں تھا اور اس ضمن میں وہ اپنے ذرائع استعمال کرنے کے منصوبے ترتیب دے رہا تھا۔

ایڈگر نے یہ کہہ کر وہاں موجود پولیس افسران کو تعاون کرنے پر قائل کرنے کی کوشش کہ وہ صدر امریکا کی خصوصی ہدایت پر یہاں آیا ہے، پھر بھی وہ زیادہ متاثر نظر نہیں آئے۔ دراصل اُس زمانے میں اغوا کا جرم وفاق کے دائرے اختیار میں نہیں آتا تھا۔ یہ ریاستی معاملہ تھا اور نیوجرسی کے حکام کو یہ بات انتہائی ناگوار گزری تھی کہ وفاقی اہل کار اُن سے سوال جواب کررہے ہیں۔

بہرحال، کسی نہ کسی طرح ایڈگر کی چارلس سے ملاقات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو ہی گئی جس کی آنکھوں سے ناپسندگی عیاں تھی۔

ایڈگر نے جائے وقوع کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد وہاں موجود پولیس افسر جارج کلین سے شکایت کی کہ اُس نے تفتیش کا ثبوت دیتے ہوئے کئی سراغ ضائع کر دیے ہیں۔ جواب میں جارج کلین کاندھے اُچکا کر رہ گیا۔

ایڈگر نے اغوا کاروں کی جانب سے چھوڑے جانے والے خط میں خصوصی دلچسپی لی۔ اُسے یقین تھا کہ یہ کاغذ کا پرزہ ایک اہم سراغ ہے جو اغوا کاروں تک پہنچنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ''یہ کسی غیر ملکی باشندے کی تحریر ہے، الفاظ کے ہجے سے اُس کا اجنبی لہجہ عیاں ہے!'' ایڈگر نے ٹالسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اغوا کاروں نے کھڑکی تک پہنچنے کے لیے جو سیڑھی استعمال کی تھی اُس نے ایڈگر کو چونکا دیا۔ یہ واضح تھا کہ اُسے ایک خاص مقصد سامنے رکھتے ہوئے ڈیزائن کیا گیا تھا۔

''اگر ہم لکڑی کے تجربے سے یہ معلوم کر لیں کہ یہ کن جنگلات سے حاصل کی گئی ہے، تو ہم اُن کارخانوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں جو یہ سپلائی کرتے ہیں۔ قوی امکان ہے کہ ہم اس شخص تک بھی پہنچ جائیں جس نے اِسے تیار کیا تھا۔'' ایڈگر نے سیڑھی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ڈپٹی سے کہا۔

اِس بات پر وہاں موجود افسر جارج کلین نے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ ''جناب، آپ تو کسی جاسوس کی طرح سوچ رہے ہیں۔ یہ باتیں ناولوں میں تو اچھی لگتی ہیں، لیکن اصل زندگی میں اِن کی کوئی اہمیت نہیں!''

ایڈگر کو جارج کی بات ناگوار گزری۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں جناب کہ آپ لوگ مجرم تک پہنچنے کے لیے کیا اقدامات کر رہے ہیں؟'' اُس نے سوال کیا۔

''میں آپ کو جواب دینے کا پابند نہیں!'' جارج نے کاندھے اُچکائے۔

''بے شک تم ابھی پابند نہیں ہو لیکن جلد تمھیں میرے ہر سوال کا جواب دینا پڑے گا۔'' ایڈگر کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

''میں انتظار کروں گا۔'' جارج نے جمائی لی۔

چارلس لِنڈ برگ کے مکان سے رخصت ہوتے وقت اُس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اُسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ اِس واردات کے بعد کئی بااثر افراد نے چارلس لِنڈ برگ سے رابطہ کیا تھا جن میں تین ملٹری افسران بھی شامل تھے۔ اِس کے علاوہ سپرنٹنڈنٹ آف نیوجرسی اسٹیٹ پولیس، ہربرٹ نورمن بھی اِس معاملے میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔

''چارلس اور اُس کے دوستوں کو یقین ہے کہ یہ کسی منظم گروہ کی کارروائی ہے۔'' ایجنٹ ٹالسن نے ایڈگر کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' ایڈگر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں ملزم اناڑی ہے۔ خطرہ ہے کہ کہیں چارلس اور اُس کے دوست تحقیقات کو غلط سمت پر نہ ڈال دیں۔''

''پیچیدگیوں میں اضافے کا ایک سبب اخبارات کا منفی رویہ بھی ہے۔'' ٹالسن نے ساتھ والی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اطلاعات کے مطابق چند بااثر صحافیوں نے کرنل چارلس کو مدد کی پیشکش کی تھی، تاہم اُس نے انکار کر دیا اور اب وہ صاحبان اِس ضمن میں اپنے طور پر کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''کیا تم یقین کرو گے...'' ایڈگر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''چند جرائم پیشہ افراد بھی اپنی خدمات پیش کر چکے تھے جن میں مشہور زمانہ گینگ الکیپونو بھی شامل ہے جو اِس وقت نیوجرسی کے مرکزی جیل میں قید ہے۔ اُس نے ایک بیان جاری کیا ہے کہ اگر اس کی سزا میں نرمی برتی جائے تو وہ پولیس کی مدد کر سکتا ہے۔''

''دلچسپ!'' ٹالسن مسکرایا۔ وہ تیزی سے اپنی نوٹ بک کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ ''یہ اطلاع تو اخبارات میں آ ہی چکی ہے کہ نیوجرسی کی پولیس نے بچے کی بہ حفاظت واپسی کے عوض پچیس ہزار ڈالر کی انعامی رقم کا اعلان کیا ہے لیکن اندرونی ذرائع سے پتا چلا ہے کہ لِنڈ برگ خاندان اپنی جانب سے اُس رقم میں پچاس ہزار ڈالر کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یعنی مجموعی طور پر 75 ہزار ڈالر!''

''وہ بھی مالیاتی بحران کے اِس زمانے میں...'' ایڈگر گہری سوچ میں غرق تھا۔ ''یہ بڑی رقم ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ پیشکش سودمند ثابت ہوگی!''

''میرا بھی یہی خیال ہے!'' ایجنٹ ٹالسن نے جواب دیا۔ ''تو پھر آپ کا کیا منصوبہ ہے مسٹر ایڈگر؟''

''منصوبہ طویل ہے، خاصا طویل!'' ایڈگر نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

رعونت پسند ایڈگر نے واشنگٹن پہنچتے ہی شور مچا دیا۔ اُس نے اٹارنی جنرل سمیت کئی اعلیٰ افسران کے سامنے یہ مسئلہ اُٹھایا کہ بیوروکا دائرۂ اختیار انتہائی محدود ہے۔

''جناب محترم، اگر فوری طور پر مجھے خصوصی اختیارات تفویض نہیں کیے گئے تو نیوجرسی کے نااہل افسران اس معاملے کو اتنا بگاڑ دیں گے کہ مجرم تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔'' اُس نے باقاعدہ دہاڑتے ہوئے ستر سالہ وزیر داخلہ سے کہا جو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

''ہمیں سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو نوجوان!'' وزیر داخلہ نے جواب دیا۔

''سوچ لیجیے جناب، لیکن یاد رکھیں، آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں!'' ایڈگر نے دانت پیستے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

فیصلہ سازی کے عمل پر اثر انداز ہونے کے لیے اُس نے اپنا پرانا ہتھکنڈا اپنایا۔ وزیر داخلہ سے ملاقات کے بعد اس نے ایک سنسنی خیز بیان داغ دیا۔ ''میں چارلس لِنڈ برگ جونیئر کی زندگی کے تعلق سے شدید خدشات میں مبتلا ہوں!''

جونہی یہ بیان اخبارات کی زینت بنا، واشنگٹن میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اعلیٰ انتظامیہ سر جوڑ کر بیٹھ گئی۔

ایڈگر کو اندازہ تھا کہ لوہا گرم ہے، پورا ملک اِس کیس میں دلچسپی لے رہا ہے، کیس میں اِسے حل کرنے کا وعدہ کر کے وہ قانون ساز اداروں سے ہر قسم کے اختیارات حاصل کر سکتا ہے۔ سو اُس کی ہدایت پر ایجنٹ ٹالسن نے اگلے ہی روز ایک بیان میں قانون میں ترمیم کا شوشہ چھوڑ دیا جس نے اعلیٰ ایوانوں میں کھلبلی مچا دی۔

پہلی کامیابی ایڈگر کو اُس وقت ملی جب حکام کی جانب سے نیوجرسی کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو یہ ہدایت جاری کر دی گئی کہ لِنڈ برگ اغوا کیس میں وفاقی ادارے کی بھرپور معاونت کی جائے۔

احکامات جاری ہوتے ہی ایڈگر نے اغوا کاروں کی جانب سے چھوڑا جانے والا خط اور موقع سے ملنے والی سیڑھی اپنی تحویل میں لے لی۔ ساتھ ہی اُس نے نیوجرسی پولیس کے اعلیٰ افسر جارج کلین کو اس کیس پر کام کرنے سے روک دیا۔

اُس کے ذہن میں دو منصوبے تھے، ایک تو وہ کثیر لاگت سے ایک کرائم لیب تشکیل دینا چاہتا تھا جہاں سائنسی بنیادوں پر جائے واردات سے اکٹھے کیے جانے والے ہر شواہد کا تجزیہ کیا جائے۔ ساتھ ہی وہ ملکی قانون میں تبدیلی کا خواہش مند تھا تاکہ اُس کا ادارہ ہر جرم کی براہِ راست تفتیش کر سکے اور ایڈگر کی بڑھتی مقبولیت و رسوخ کے باعث دونوں منصوبوں کی تکمیل کے قوی امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

جن دنوں ایڈگر ایوان بالا کے سامنے اپنا کیس پیش کرنے کی تیاریوں میں لگا تھا نیوجرسی میں معاملات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔

اغوا کے چند ہی روز بعد چارلس لِنڈ برگ کو ایک خط موصول ہوا جو نیویارک کے علاقے برونکس سے روانہ کیا گیا تھا۔ اُس پر بھی واردات کی رات اغوا کاروں کی جانب سے چھوڑے جانے والے خط کے مانند سرخ اور نیلے دائرے تھے۔ پولیس سے رابطہ کرنے کے بجائے اُس نے یہ خط ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جو جرائم کی دنیا میں خاصا اثر و رسوخ رکھتا تھا اور چارلس کو یقین دلا چکا تھا کہ وہ اس معاملے میں پُل کا کردار ادا کر سکتا ہے۔

اِس سے قبل کے معاملات آگے بڑھتے کسی طرح اِس خط کی ایک کاپی اخبارات کے ہتھے چڑھ گئی اور اگلے ہی دن ملک بھر میں پھیل گئی۔ اس بے احتیاطی کے بعد چارلس اُس شخص سے مایوس ہو گیا، سو جب اُسے برونکس سے روانہ کیا جانے والا ایک اور خط موصول ہوا، اُس نے پولیس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ دونوں خطوط برونکس سے روانہ کیے گئے تھے، اِس لیے نیویارک پولیس حرکت میں آ گئی۔ کمشنر نیویارک سٹی پولیس، مَل رونی پُر یقین تھا کہ اغوا کاروں کا تعلق برونکس ہی سے ہے۔ اُس نے بچے کی بازیابی کے لیے چارلس کے سامنے ایک چھاپا مار ٹیم تشکیل دینے کی سنسنی خیز تجویز رکھی، تاہم چارلس نے اِس ایڈونچر کی اجازت نہیں دی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ اِس اقدام سے اُس کے بیٹے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

واشنگٹن میں موجود ایڈگر کو بہ خوبی علم تھا کہ نیویارک میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر اُسے یقین تھا کہ چارلس لِنڈ برگ نیویارک پولیس سے تعاون نہیں کرے گا کیونکہ اُسے پولیس کی صلاحیتوں پر ذرّی برابر اعتبار نہیں تھا۔

جس روز چارلس نے کمشنر مَل رونی کی تجویز رد کی، اُسی روز اُسے اغوا کاروں کی جانب سے ایک اور خط موصول ہوا جس میں پولیس کو اِس معاملے میں شامل کرنے کی ''پاداش'' میں تاوان کی رقم پچاس ہزار سے بڑھا کر ستّر ہزار ڈالر کر دی گئی تھی!

☆☆☆

اُن ہی دنوں نیویارک کے قصبے برانس سے نکلنے والے اخبار ''برانس ہوم نیوز'' میں ایک اسکول ٹیچر جون کونڈون کا خط شائع ہوا، جس میں اُس نے چارلس لِنڈ برگ کی مدد کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے اغوا کاروں کو مخاطب کیا تھا کہ وہ فریقین کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

صورتِ حال اُس وقت انتہائی دلچسپ ہو گئی جب جون کونڈون کو چند روز بعد ایک خط موصول ہوا، جسے لکھنے والے نے اپنی شناخت اغوا کار کی حیثیت سے کرواتے ہوئے اُس سے رابطہ کرنے کا پورا طریقہ بیان کر دیا تھا۔ اُس خط پر بھی سرخ اور نیلے دائرے تھے۔

جون کونڈون یہ خط لے کر چارلس لِنڈ برگ کے پاس پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب اغوا کاروں نے کسی تیسرے شخص سے اِس ضمن میں رابطہ کیا تھا۔ چارلس اپنے بیٹے تک پہنچنے کا یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ سو اُس نے جون کونڈون کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے اغوا کاروں کے بیان کردہ طریقہ پر عمل درآمد کرنے کے لیے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کونڈون نے خط میں درج ہدایات کے مطابق فرضی نام ''جیفسی'' سے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا: ''رقم تیار ہے!''

اشتہار شائع ہونے کے دو دن بعد اُس کی وڈلون قبرستان میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس نے اپنا چہرہ مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔

اُس پُراسرار آدمی نے کونڈون کو بتایا کہ وہ ایک ملاح ہے، بچہ اُس کے گروہ نے اغوا کیا ہے جو تین مرد اور دو عورتوں پر مشتمل ہے۔

''بچہ زندہ ہے... اور ایک کشتی میں ہے... تاہم ابھی ہم اُسے رہا کرنے کے لیے تیار نہیں!'' اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے۔

''مجھے تمہارے بیان پر شک ہے۔ کیا تم کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟'' جون کونڈون نے اونچی آواز میں کہا کیونکہ وہ شخص خاصے فاصلے پر کھڑا تھا۔

''ہاں، میں تمہیں وہ لباس بھجوا سکتا ہوں جو اُس رات بچے نے پہن رکھا تھا۔'' اُس آدمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا!'' یہ کہہ کر کونڈون جانے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ اُس شخص کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''سنو... اگر... اگر بچہ مر چکا ہو... تو کیا... مجھے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کونڈون کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ''کیا وہ مر چکا ہے؟''

''نہیں... وہ زندہ ہے!'' اُس شخص نے کہا اور تیزی سے تاریکی میں غائب ہو گیا۔

قبرستان سے لوٹنے کے بعد کونڈون کی چارلس سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے مبینہ اغوا کار سے ہونے والی میٹنگ کی روداد سناتے ہوئے جان بوجھ کر گفتگو کا وہ ٹکڑا حذف کر دیا جس میں بچے کی موت کا موضوع زیرِ بحث آیا تھا۔

گو کہ چارلس نے نیویارک پولیس کو اندھیرے میں رکھا تھا، تاہم کمشنر مُل رونی کی اطلاع میں یہ بات آ گئی تھی کہ ''جیفسی'' کے نام سے اشتہار دینے والا آدمی چارلس سے رابطے میں ہے۔ پولیس نے چارلس کو کریدنے کی کوشش کی لیکن اُس نے ''جیفسی'' کی شناخت ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔

واردات کے ٹھیک سولہ دن بعد جون کونڈون کو ایک پیکٹ موصول ہوا جس میں ایک بچے کا لباس تھا۔ وہ یہ پیکٹ لیے چارلس کے گھر پہنچ گیا۔ آیا بیٹی گو نے پہلی ہی نظر میں لباس کو پہچان لیا۔

اب کونڈون نے ''جیفسی'' کے نام سے ایک اور اشتہار دیا ''نہ تو پولیس، نہ ہی خفیہ ایجنسی، میں تنہا آؤں گا، رقم تیار ہے!''

یکم اپریل کو کونڈون کو ایک خط موصول ہوا۔ اغوا کاروں نے ملاقات کے لیے ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

ایف بی آئی ڈائریکٹر جے ایڈگر کو نیویارک کے اخبارات میں دیے جانے والے مشکوک اشتہارات کی اطلاع مل چکی تھی، تاہم چارلس کے عدم تعاون کی وجہ سے وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ ہاں، اُس نے یہ پیغام نیوجرسی ضرور پہنچا دیا۔

''محترم چارلس لِنڈبرگ، اگر آپ اغوا کاروں کو کسی قسم کی رقم ادا کر رہے ہیں، تو برائے مہربانی اُسے مارک کر دیں!''

چارلس کو کہ ایڈگر کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن یہ بات اُس کے دل کو لگی۔ وہ تاوان کی ادائیگی ''گولڈ سرٹیفکیٹ'' کی شکل میں کر رہا تھا۔ اُس زمانے میں رائج یہ سرٹیفکیٹ مختلف مالیت کے ہوتے تھے، لین دین میں عام تھے اور اُنھیں استعمال کی غرض سے بینک سے بھنوایا جاتا ہے۔

چارلس نے کونڈون کی اطلاع میں لائے بغیر تمام سرٹیفکیٹس کے سیریل نمبر نوٹ کر لیے۔ رقم لکڑی کے جس صندوق میں رکھی گئی تھی، اِس پر بھی چند نشانیاں لگا دیں۔

دو اپریل کی شام چارلس اور کونڈون اُس تاریک سڑک پر پہنچ گئے، جس کا تعین اغوا کاروں نے اپنے خط میں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک مشکوک ٹیکسی وہاں آ کر رکی، جس کے ڈرائیور نے اُنھیں ایک رقعہ تھما دیا، جس میں دس منٹ کے اندر اندر دریا کے کنارے پہنچنے کی ہدایت درج تھی۔

لب دریا ایک اور ٹیکسی اُن کی منتظر تھی۔ یہ طریقہ کئی بار دُہرایا گیا۔ بالآخر وہ مین ہٹن میں واقع سینٹ رے موئنڈ قبرستان پہنچ گئے۔

کونڈون گاڑی سے اُتر کر قبرستان کی جانب گیا، جبکہ... اغوا کاروں کی ہدایت کے مطابق چارلس گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔

ایک بار پھر کونڈون کا سامنا ایک ایسے آدمی سے ہوا جس نے مفلر سے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

''ہم فقط پچاس ہزار ڈالر ہی کا انتظام کر سکے۔'' کونڈون چلایا۔

''ٹھیک ہے... رقم اپنی دائیں جانب والی دسویں قبر پر رکھ دو، وہاں ایک خط پڑا ہے۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

''اور بچہ؟'' کونڈون نے سوال کیا۔

''تمام تفصیلات اس خط میں ہیں۔'' اغوا کار نے جواب دیا۔

جونہی کونڈون گاڑی میں سوار ہوا، مضطرب چارلس نے اُس کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا۔ اس میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایک پیغام درج تھا۔

''بچہ 'نیلی' نامی ایک کشتی میں ہے، جو میسے چوسٹس کے جنوب میں واقع جزیرے مارتھاز وینیارڈ کے ساحل پر لنگر انداز ہے۔ بچہ دو عورتوں کی تحویل میں ہے، جو معصوم ہیں، اُن کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں!''

چارلس اِس معاملے میں پولیس کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو وہ اپنے ذاتی جہاز میں بتائے ہوئے مقام پر پہنچ گیا، جہاں اُس کے ہاتھ فقط مایوسی آئی۔ وہاں ''نیلی'' نامی کوئی کشتی نہیں تھی۔

چوبیس گھنٹے پر محیط لاحاصل تلاش کے بعد وہ سمجھ گیا کہ اسے بیوقوف بنایا گیا ہے۔ اب شکستہ دل چارلس کے پاس پولیس سے رابطہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

چارلس کی کہانی سننے کے بعد پولیس کا پہلا شک کونڈون پر گیا۔ اُنہوں نے فوراً اُسے گرفتار کر لیا لیکن یہ کارروائی بے سود رہی۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا اور فقط دس گھنٹے بعد اُسے رہا کرنا پڑا۔

☆☆☆

بچہ کہاں ہے؟ کس کے پاس ہے؟ زندہ بھی ہے یا مر گیا؟

اِن سوالوں نے گزشتہ آٹھ ہفتوں سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اخبارات بھی نئے نئے مفروضے پیش کر رہے تھے، ریڈیو اور ٹی وی چینلز پر بھی یہی خبر چھائی ہوئی تھی۔

ایڈگر کو مسئلے کی شدت کا اندازہ تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اِس کیس پر مرکوز تھی۔ وزیرِ داخلہ کی شدید مخالفت کے باوجود اُس نے اپنے دفتر میں ایک لیبارٹری قائم کر لی تھی جہاں موقع واردات سے ملنے والے سیڑھی کا تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ وہ ملک بھر میں پھیلے ملزمان کے فنگر پرنٹ ریکارڈز ایک جگہ اکٹھے کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور حسبِ روایت اِس معاملے میں بھی اسے شدید مخالفت کا سامنا تھا۔

اور پھر ایک واقعہ رونما ہوا، جس نے پورے امریکا پر سکتہ طاری کر دیا۔

اغوا کے ٹھیک چھ ہفتے بعد 12 مئی 1932ء کو چارلس لِنڈبرگ کے مکان سے 7 کلومیٹر دور، گھنے درختوں کے درمیان، جھاڑیوں میں چھپائی ہوئی ایک بچے کی انتہائی خستہ حال لاش ملی۔

یہ لاش ولیم الین نامی ایک ٹرک ڈرائیور نے دیکھی تھی جس نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ ڈاکٹر کے ابتدائی تجزیے کے بعد خیال ظاہر کیا کہ ڈیڑھ سالہ بچے کی یہ لاش لگ بھگ پانچ ہفتے پرانی ہے، جس کی موت سر پر لگنے والی گہری چوٹ کے باعث ہوئی ہے۔

جونہی یہ خبر ملی، دُکھی چارلس آنکھوں میں اندیشے لیے پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے۔ لاش اُس کے بیٹے ہی کی تھی۔ چارلس لِنڈبرگ جونیئر مر چکا تھا!

☆☆☆

جس لمحے ایجنٹ ٹالسن نے جے ایڈگر کو اِس افسوس ناک خبر سے آگاہ کیا، وہ ایک فائل پر جُھکا ہوا تھا۔

چند ساعت وہ یونہی خاموش بیٹھا رہا، پھر اُس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ''اچھا ہے ٹالسن، اچھا ہے!'' اُس نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں فقط قاتل کو تلاش کرنا ہے!''

''مسٹر ایڈگر میں سوچ رہا ہوں کہ...'' ٹالسن کرسی گھسیٹ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''... لاش ملنے کے بعد کانگریس پر دباؤ خاصا بڑھ جائے گا اور اب... اغوا کو وفاقی جرم تسلیم کروانا آپ کے لیے چنداں مشکل نہیں ہوگا۔''

''تم دُرست ہو!'' ایڈگر نے کرسی پر جھولتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ یاد آنے پر یکدم سیدھا ہو گیا۔ ''سیڑھی کے بارے میں کیا اطلاعات ہیں، کچھ پیش رفت ہوئی؟''

''بالکل۔'' ایجنٹ ٹالسن نے جواب دیا۔ ''تجزیے سے پتا چلا ہے کہ وہ سیڑھی واردات سے کچھ ہی عرصے قبل تیار کی گئی تھی۔ اندازاً پانچ چھ ماہ قبل۔ اُس پر کسی قسم کے موسمی اثرات نہیں ملے، غالباً وہ گھر کے اندرونی حصے میں زیرِ استعمال تھی۔ اُسے تیار کرنے والا بڑھئی ماہر ضرور تھا لیکن یہ اُس کا خاندانی پیشہ نہیں کیونکہ تیاری میں خاصے غیر روایتی طریقے اپنائے گئے ہیں۔''

''خوب، یعنی اب ہمیں ایک ایسے بڑھئی کو تلاش کرنا ہے جس نے لگ بھگ دس برس قبل یہ پیشہ اختیار کیا ہو، جو غیر ملکی... اور غالب امکان ہے کہ جرمن ہو اور نیویارک میں مقیم ہو۔'' ایڈگر نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''بالکل، لیکن ہم تفتیش اُسی وقت شروع کر سکتے ہیں، جب نیا قانون پاس ہو جائے!'' ٹالسن نے کہا۔

''اس کی فکر مت کرو، اب اُن کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں!'' ایڈگر کے چہرے پر شاطر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

مشکلات میں گھری نیوجرسی پولیس اب نئے خطوط پر کام کر رہی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اِس جرم میں کوئی اندر کا آدمی شامل ہے۔ اُنہیں وائلیٹ شارپ نامی ایک ملازمہ پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شک تھا جو بچے کی لاش ملنے کے بعد شدید دباؤ کا شکار نظر آئی تھی۔ تاہم تفتیش شروع ہونے کے چند ہی روز بعد اُس عورت نے خودکشی کر لی۔ اس سانحے کے بعد پولیس کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا، تفتیش کے نام پر شہریوں کو ہراساں کرنے کے الزام نے نیوجرسی پولیس کی ساکھ کو خاصا نقصان پہنچایا۔

جون کونڈون بھی خفیہ طور پر اِس کیس پر کام کر رہا تھا۔ جب نیویارک پولیس کو اس کی مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع ملی، اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا لیکن اس بار بھی وہ اُس کے خلاف کوئی ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہی۔

ریاستی پولیس کی ناکامی کے بعد اب عوام ایف بی آئی کی جانب دیکھنے لگے تھے جس کا شاطر ڈائریکٹر کئی بار یہ دعویٰ کر چکا تھا کہ اگر اُسے کھلی اختیار دیا جائے تو وہ یہ کیس حل کر لے گا۔

اور ایسا ہی ہوا!

جون 13 کو کانگریس نے ایک قانون "Federal Kidnapping Act of 1932" پاس کیا اور اغوا کے معاملے کو وفاقی جرم کی فہرست میں ڈالتے ہوئے ایف بی آئی کو تفتیش کی کھلی ذمے داری سونپ دی۔

اخبارات نے اِس نئے قانون کو "لِنڈ برگ لا" کہہ کر پکارا۔ ساتھ ہی لکھا کہ لِنڈ برگ کیس کو بنیاد بنا کر نیا قانون پاس کروانے والے ایڈگر کے مستقبل کا دارومدار اُس کی کارکردگی پر ہوگا۔

اپنی کامیابی پر مسرور ایڈگر کو حالات کی نزاکت کا ادراک تھا۔ جونہی قانون پاس ہوا، اُس نے اپنے بہترین افسر، ایجنٹ تھامس سسک کو اِس کیس کی ذمے داری سونپ دی۔

"آج کے بعد تم براہِ راست ایجنٹ ٹالسن کو رپورٹ کرو گے۔ مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں۔" اُس نے ایجنٹ تھامس سے کہا۔

"میں آپ کی امیدوں پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا سر!" نوجوان تھامس نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس مجرم کی تحریر کا نمونہ ہے، ایک سیڑھی ہے، جس سے ہمیں کافی معلومات مل چکی ہے۔ اِس کے علاوہ تاوان کے طور پر جو رقم ادا کی گئی ہے، وہ گولڈ سرٹیفکیٹ کی شکل میں ہے، مجرم کو اُسے کیش کروانا پڑے گا۔"

"اور یہی چیز اس کی شناخت افشا کر دے گی۔" ایڈگر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔

ایجنٹ تھامس کے نیویارک روانہ ہونے کے ایک ہفتے بعد اُسے ایک نیا خیال سُوجھا۔ اس نے ٹالسن کو اپنے دفتر میں بلوا لیا۔

"ایک کام کرو۔" گہری سوچ میں غرق ایڈگر نے کہا۔ "تاوان کے عوض ادا کی جانے والی رقم کے سیریل نمبرز پر مشتمل ایک پمفلٹ تیار کرو جس کی کاپیاں پورے نیویارک میں پھیلا دو۔ ہر مارکیٹ، ہر بینک، ہر پیٹرول پمپ اسٹیشن کے مالک کو اس کی کاپی بھجواؤ۔"

"نیویارک بہت بڑا ہے۔ آپ کے خیال میں ہمیں کتنی کاپیاں درکار ہوں گی جناب؟" ٹالسن کی آنکھوں میں اُلجھن تھی۔

"کم از کم دو لاکھ کاپیاں!" ایڈگر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ضرورت پیش آئے تو مزید۔ یاد رکھو... یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے!"

ایڈگر کی یہ کوشش ابتداً نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ ایجنٹ تھامس کو چند ایسی ادائیگیوں کی اطلاع ضرور ملی، جن میں نشان زدہ کرنسی استعمال کی گئی تھی لیکن جن علاقوں میں یہ ادائیگیاں ہوئی تھیں، اُن کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ تھا، قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کے درمیان رابطے کے شدید فقدان کے باعث وہ اُن افراد تک نہیں پہنچ سکا۔

اور پھر ایک روز ایجنٹ تھامس کو ایسی اطلاع ملی جس نے اُسے چونکا دیا۔ مین ہٹن کے نواحی علاقے میں موجود ایک بینک سے لگ بھگ تین ہزار ڈالر کے ایسے گولڈ سرٹیفکیٹ بھنوائے گئے تھے جو نشان زدہ تھے۔

توانائی سے بھرپور تھامس نے فوراً اس معاملے پر کام شروع کر دیا لیکن اُسے مایوسی نے آن گھیرا، جب اُسے پتا چلا کہ یہ واقعہ دو ہفتے قبل پیش آیا تھا۔ دراصل بینک اہل کار اتنے غافل تھے کہ رقم کی ادائیگی کے وقت وہ اِس جانب توجہ ہی نہیں دے سکے کہ سرٹیفکیٹ نشان زدہ ہیں، انہیں بہت بعد میں اس کا ادراک ہوا۔

اب آخری امید وہ فارم تھا جو سرٹیفکیٹ بنوانے کی غرض سے بینک آنے والے شخص نے بھرا تھا۔ اس نے اپنا نام جے فیلکنر لکھا تھا۔ فارم پر اُس کا پتا بھی درج تھا۔

واشنگٹن میں بیٹھے ایڈگر نے ایجنٹ تھامس کو خصوصی اختیارات سونپتے ہوئے فوراً متعلقہ شخص کو گرفتار کرنے احکامات جاری کر دیے۔

یہ کوشش لاحاصل ثابت ہوئی، کیونکہ فارم پر درج ایڈریس پر جے فیلکنر نامی کوئی شخص نہیں رہتا تھا۔

ایڈگر مایوس نہیں ہوا، اُس نے ایجنٹ تھامس کو چھان بین جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ چند روز بعد پتا چلا کہ فارم پر درج ایڈریس پر کئی برس قبل جینی فیلکنر نامی ایک خاتون رہا کرتی تھی، جس نے ایک جرمن شخص سے شادی کر لی جس کے بعد وہ غائب ہو گئی۔

"جرمن شخص..." ایڈگر بڑبڑایا۔ اُس وقت وہ نیویارک میں موجود ایجنٹ تھامس سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا۔

"چاہے زمین کھودنی پڑی، اُس عورت کو تلاش کرو!"

ایک ایسی عورت کو ڈھونڈ نکالنا جس کا کوئی اتا پتا نہ ہو، بہ ظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن باصلاحیت تھامس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور اُس جوڑے تک پہنچ ہی گیا۔ لیکن ایک بار پھر اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جوڑے کا اِس واردات سے دور کا بھی واسطہ نہیں نکلا۔

جب ایجنٹ تھامس نے اِس ناکامی کی اطلاع اپنے باس ایڈگر کو دی تو اُس نے ایک سرد آہ بھری۔

"کوشش جاری رکھو تھامس، کوشش جاری رکھو... مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔"

"شکریہ سر... وہ..." دوسری طرف موجود تھامس کے لہجے میں تذبذب تھا۔ "سر میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔"

"بولو میں سن رہا ہوں۔" ایڈگر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ تو جانتے ہیں سر، غیر ملکیوں سے تفتیش کے حوالے سے ہمارے قوانین کتنے بھونڈے ہیں لیکن اگر یہ بات حتمی ہے کہ وہ شخص جرمن ہی ہے تو ہم نیویارک میں مقیم جرمن باشندوں کو شاملِ تفتیش کر سکتے ہیں۔ فرداً فرداً تو تفتیش ممکن نہیں لیکن ہم جرمن کمیونٹی سینٹرز سے رابطہ کر سکتے ہیں، تاہم اِس کارروائی کے لیے ہمیں مزید اختیارات درکار ہوں گے۔"

"ہوں..." ایڈگر چند ساعت خاموش رہا۔ "تھامس آئیڈیا اچھا ہے۔ اختیارات کی فکر مت کرو، میں ابھی اٹارنی جنرل سے رابطہ کرتا ہوں۔ تم کام جاری رکھو، مجھے ہر صورت نتائج چاہئیں۔" یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹارنی جنرل سے بات کر رہا تھا۔

☆☆☆

"اُس کارخانے کا پتا چل گیا ہے جہاں وارداتِ میں استعمال ہونے والی سیڑھی کے لیے لکڑی خریدی گئی تھی۔" ایجنٹ ٹالسن کے منہ سے ادا ہونے والے یہ جملہ سن کر فائل پر جُھکا ایڈگر چونک اٹھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا، اِس امید پر کہ اُس کے ڈپٹی کا چہرہ دمک رہا ہوگا لیکن وہاں فقط مایوسی تھی۔

"پھر... کیا پیش رفت ہوئی؟" ایڈگر کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"بے کار۔" ایجنٹ ٹالسن نے گہرا سانس سینے میں اُتارتے ہوئے کہا۔ "جس کارخانے سے وہ لکڑی خریدی گئی، وہ نیویارک شہر کے نواحی علاقے میں واقع ہے، تاہم... اُن کے پاس اپنے خریداروں کا کوئی ریکارڈ نہیں۔"

"کیا مطلب؟" ایڈگر نے سوال کیا۔

"مطلب یہ ہے کہ وہ احمق نہیں جانتے کہ اُن سے لکڑی خریدنے والا شخص کون ہے۔"

"تو اُن کے پاس کوئی ریکارڈ نہیں۔" ایڈگر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آہ بھری۔

"نہیں۔ کارخانے کے بدحواس مالک کا کہنا ہے کہ وہ کاغذوں کو رقتی برابر اہمیت نہیں دیتا اور گودام میں کچرا جمع کرنے کا قائل نہیں۔" ایجنٹ ٹالسن کے چہرے پر شکست خوردہ مسکراہٹ تھی۔

"بیٹھ جاؤ ٹالسن۔" ایڈگر نے دھیرے سے کہا۔ ٹالسن کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ چند ساعت کمرے میں خاموشی چھائی رہی، پھر ایڈگر کی آواز گونجی۔ "مجھے 1919ء کی وہ رات یاد ہے، جب دہشت گردوں نے اٹارنی جنرل اے پالمر کا گھر دھماکا خیز مواد سے اُڑانے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ اِس حملے میں محفوظ رہے۔ جُوں ہی مجھے اطلاع ملی میں فوراً جائے وقوع پر پہنچ گیا۔ اُس روز پہلی بار مجھے کرائم سین کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اُن دنوں ہمارے احمق پولیس افسران کرائم سین تباہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔"

"آج بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔" ٹالسن مسکرایا۔

ایڈگر نے سگار جلایا، ایک گہرا کش لیا۔ "جب مجھے پالمر صاحب نے انتہا پسند مخالف سیل کی ذمے داری سونپی، میں نے سب سے پہلے ملک دشمن عناصر کی ایک فہرست مرتب کی۔ لائبریری آف کانگریس میں گھنٹوں کام کیا، تمام کاغذات اور فائلوں کی خصوصی ترتیب کے ساتھ ایک چھت تلے اکٹھا کرنا میرا مقصد تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر تمام کاغذات ایک چھت تلے موجود ہوں... ہر شہری کا ریکارڈ دستیاب ہو، تو تفتیشی عمل بہت سہل ہو جائے گا۔ زمانہ نوجوانی کی اُسی محنت کے طفیل میں نے کئی کیسز حل کیے۔ درجنوں انتہائی مطلوب دہشت گردوں کو گرفتار کیا۔ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل ہمارے احمق تفتیش کاروں کو کاغذات کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا، میری محنت رائگاں نہیں جائے گی۔"

"مجھے یقین ہے سر!" ٹالسن نے کہا۔

"سنو ٹالسن۔" ایڈگر نے ایک اور کش لیا۔ "گو کہ وارداتِ میں استعمال ہونے والی سیڑھی سے کوئی خاص سراغ نہیں ملا لیکن اُس کے طفیل ہم ایک جدید کرائم لیب قائم کرنے میں کامیاب رہے، زیادہ نا امید مت ہو دوست۔ تھامس قابل افسر ہے، اُسے پیغام پہنچا دو کہ کاغذات کی جانچ پڑتال کی ضمن میں غفلت نہیں برتے۔ وہی ہمیں مجرم تک پہنچائیں گے۔"

ایڈگر دُرست تھا۔ دراصل یہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی تھا جس نے پیچیدگیوں کے شکار لِنڈ برگ کیس کو سلجھا دیا۔

اُس وقت ایجنٹ تھامس کے ساتھ نیویارک پولیس کا سراغ رساں جیمس فن کام کر رہا تھا۔ دونوں افسران نے ایڈگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی خصوصی ہدایت کے پیشِ نظر اپنی کلی توجہ نشان زدہ گولڈ سرٹیفکیٹ پر مرکوز کر رکھی تھی۔

انہیں نیویارک کے مختلف حصوں سے ایسے کئی بلز موصول ہوئے جن کی ادائیگی نشان زدہ کرنسی کی مدد سے کی گئی تھی۔

دونوں افسران نے صورتِ حال واضح کرنے کے لیے ایک نقشہ ترتیب دیا جس سے اُنہیں اندازہ ہوا کہ بکھراؤ کی شکار معلوم ہونے والی اِن ادائیگی میں ایک بہت واضح ربط پایا جاتا ہے۔ بیش تر ادائیگیاں کنسٹن ایونیو سب وے پر واقع دکانوں اور پیٹرول پمپ اسٹیشنوں پر ہوئی تھیں۔ یہ سڑک برانکس کے علاقے سے جُوی ہوئی تھی جو مین ہٹن کے مغربی حصے میں واقع تھا اور جس کے پڑوس میں یورک ویلی کا علاقہ تھا جہاں جرمن اور آسٹریلوی باشندے آباد تھے۔

دورانِ تفتیش دونوں افسران کی توجہ کا مرکز گولڈ سرٹیفکیٹ تھے، کیونکہ یہی مجرم تک پہنچنے کی آخری امید تھے لیکن پھر... اُن کی راہ میں ایک رکاوٹ کھڑی ہوگئی۔

دراصل امریکی صدر روزویلٹ کی جانب سے خصوصی حکم جاری کیا گیا تھا کہ تمام امریکی شہری گولڈ سرٹیفکیٹ اپریل 1933ء تک بھنوالیں تاکہ اُنہیں بتدریج ختم کیا جاسکے۔ اِس حکم کی وجہ سے یہ خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ شاید ایف بی آئی مجرم کی شناخت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھودے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ... ایڈگر اور اُس کی ٹیم کے لیے ایک مایوس کن مہینا تھا، خصوصاً ایجنٹ تھامس تو قنوطیت کا شکار ہوگیا تھا، لیکن خوش قسمتی سے عوام نے صدر کے ہدایت پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ سرٹیفکیٹ تاحال گردش میں تھے، عوام کا ایک بڑا طبقہ انہیں استعمال کر رہا تھا، تاجر بھی اُنہیں بہ خوشی قبول کرلیا کرتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق جولائی 1934ء میں بھی 161 ملین ڈالر عوام میں گردش کر رہے تھے جس کی وجہ سے اغوا کاروں تک پہنچنے کے امکانات تاحال موجود تھے۔

18 ستمبر 1934ء کو ایجنٹ تھامس کو ایک مشکوک گولڈ سرٹیفکیٹ کی صورت ہونے والی ادائیگی کا علم ہوا۔ یہ دس ڈالر کی مالیت کا نشان زدہ سرٹیفکیٹ تھا جسے برانس کے کورن ایکسچینج بینک میں بھنوایا گیا تھا۔

جب یہ سرٹیفکیٹ ایجنٹ تھامس تک پہنچا، اُس کے ایک کونے پر پینسل سے ایک نمبر لکھا ہوا تھا جسے پہلی نظر میں تو تھامس نہیں سمجھ سکا لیکن یہی نمبر مجرم تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔

بینک کے کھاتے میں مذکورہ سرٹیفکیٹ بھنوانے والے شخص نے بالائی مین ہٹن میں واقع ایک پیٹرول پمپ کا پتا درج کروایا تھا۔

چند ہی گھنٹوں بعد ایجنٹ تھامس اور سراغ رساں جیمس اس شخص کے سامنے کھڑے تھے۔ اُس کا نام والٹر لیلے تھا اور وہ اُس پمپ اسٹیشن کا منیجر تھا۔

اُس نے افسران کو بتایا کہ ایک صارف نے چند روز قبل پیٹرول بھروانے کے بعد مذکورہ سرٹیفکیٹ سے ادائیگی کی تھی۔

''کیا اُس شخص کا نام پتا معلوم ہے؟'' ایجنٹ تھامس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''نہیں، لیکن مجھے اس کا حلیہ یاد ہے۔ وہ... وہ پتلا دبلا تھا۔ درمیانہ قد تھا، کاندھے چوڑے تھے، شکل سے جرمن لگتا تھا۔''

''اور کوئی خاص بات؟'' سراغ رساں جیمس نے سوال کیا۔

''وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا اور... جناب... کیا آپ اسے تلاش کر رہے ہیں؟'' منیجر نے سوال کیا۔

''اور کیا ہم جھک مار رہے ہیں؟'' ایجنٹ تھامس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''اِس احمقانہ سوال کے لیے معذرت خواہ جناب، لیکن آپ بہ آسانی اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ دراصل وہ مجھے مشکوک لگا، اس لیے سرٹیفکیٹ پر میں نے اُس کی گاڑی کا نمبر پینسل سے لکھ لیا تھا۔ مجھے امید ہے، اگر گاڑی نیویارک میں ہوئی تو آپ بہ آسانی اس تک پہنچ جائیں گے۔''

''اوہ...'' ایجنٹ تھامس نے فوراً جیب سے سرٹیفکیٹ نکالا۔ کونے پر پینسل سے ایک نمبر لکھوا ہوا تھا جو یہ پیغام دے رہا تھا کہ وہ منزل کے بے حد قریب ہیں۔

☆☆☆

''سر ہم قاتل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جو شخص تاوان کے طور پر ادا کیے جانے والے سرٹیفکیٹ بھنوا رہا ہے، وہ ایک گہری نیلی رنگ کی ڈوج چلاتا ہے، اُس کا نام برونو ہوپ مین ہے اور ابتدائی اطلاعات کے مطابق وہ جرمن ہے۔ سر... ہمیں فوری کارروائی کی اجازت دی جائے۔'' ٹیلی فون پر ایجنٹ تھامس کی آواز لرز رہی تھی۔

دوسری طرف موجود ایڈگر مسکرایا۔ ''تمہیں اجازت ہے... فوری کارروائی کرو... میں اور ٹالسن بھی پہنچ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا اور سامنے بیٹھے ٹالسن کی طرف دیکھا۔ ''سفر کی تیاری کرو دوست!''

19 ستمبر کا سورج طلوع ہونے سے قبل پولیس افسران نے ہوپ مین کے گھر کا پتا لگالیا۔ وہ قصبے برانس کی 222 ویں ایسٹ اسٹریٹ پر مقیم تھا اور اُس خوشگوار صبح اِس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ باہر مستعد پولیس اہل کاروں کی پوری ٹیم اُس کی منتظر ہے۔

جونہی وہ اپنی گاڑی میں باہر نکلا، پولیس نے تعاقب شروع کردیا۔ سڑک پر اس صبح ٹریفک خاصا کم تھا، یہی سبب

ہے کہ جب مجرم نے سیاہ شیشوں والی تین گاڑیوں کو اپنے دائیں بائیں پوزیشن لیتے دیکھا، اُس نے فوراً اندازہ لگالیا کہ اُس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ جواب میں اُس کا تعاقب کرنے والی گاڑیوں کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا۔

مضطرب ہوپ مین کا پاؤں ایکسیلیٹر پر تھا۔ اسٹیرنگ وہیل اُس نے پوری قوت سے تھام رکھا تھا، اُس نے ٹریفک سگنل کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ پولیس اہل کاروں کو شکست دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن قسمت اُس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تیز رفتاری کے باعث گاڑی قابو سے باہر ہوگئی اور سامنے سے آتے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی... چند لمحوں بعد اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

چارلس لنڈ برگ جونیئر کے قاتل تک پہنچنے کا کارنامہ ایجنٹ تھامس اور سراغ رساں جیمس نے انجام دیا تھا لیکن اصل سہرا ایڈگر کے سر تھا جس نے اِس معاملے کو سلجھانے کے لیے امریکی کانگریس کو قانون بدل دینے پر مجبور کردیا تھا۔

وہ نیویارک پہنچ چکا تھا اور جب ہوپ مین کو میڈیا کے سامنے پیش کیا گیا، ایڈگر نے اُس کا گریبان تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر تکبر تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جب کیمروں کا فلیش چمکا، اس لمحے ایجنٹ تھامس اور سراغ رساں جیمس موجود نہیں تھے۔

دوسرے دن کے اخبارات میں سرخی لگی۔

''صدی کا سب سے بڑا مجرم گرفتار!''

ایک اور اخبار نے کچھ یوں لکھا: ''ایڈگر نے دنیا کے مکروہ ترین شخص کو گرفتار کرلیا!''

ایک کالم نگار نے ان الفاظ میں اپنا تجزیہ پیش کیا ''اب صدی کا سب سے بڑا مقدمہ شروع ہوگا!''

اور ایسا ہی ہوا۔ 1935ء میں شروع ہونے والے اُس مقدمے نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ یہ نیوجرسی کی عدالت میں 2 جنوری سے 13 فروری تک جاری رہا۔

ثبوتوں نے بہ آسانی ہوپ مین کو مجرم ثابت کردیا۔ اُس کے مکان سے نشان زدہ چودہ ہزار ڈالر ملے۔ اُس کی لکھائی اور تاوان کے لیے تحریر کردہ خطوط میں بھی مماثلت واضح تھی۔ اُس کے علاوہ پولیس کو گھر کی ایک دیوار پر درج اسکول ٹیچر جون کونڈون کا ایڈریس بھی مل گیا۔

کرائم لیب میں سیڑھی پر کی جانے والی تحقیق بے ثمر نہیں گئی۔ پولیس نے سیڑھی کی تیاری کے لیے درکار تمام بنیادی اوزار ہوپ مین کے گیراج سے ڈھونڈ نکالے۔ وہاں اس لکڑی کی باقیات بھی ملیں، جو سیڑھی کے لیے استعمال ہوئی تھی۔ ایک ایسی نوٹ بک بھی مل گئی جس میں واردات میں استعمال ہونے والی سیڑھی کا حال تھا۔

اُن تمام افراد نے ملزم کو شناخت کرلیا، جنہیں گزشتہ ڈیڑھ برس میں اُس نے گولڈ سرٹیفکیٹ کے ذریعہ ادائیگی کی تھی۔ واردات والے روز اُسے نیوجرسی میں چارلس کے مکان کے نزدیک دیکھنے والے گواہ بھی سامنے آگئے۔

وہ کافی عرصے سے بے روزگار تھا، تاہم اُس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ جو اس جانب اشارہ تھا کہ اس نے کسی ذریعے سے بھاری رقم حاصل کرلی ہے۔

ہوپ مین جرم سے انکاری تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو رقم اس کے گھر سے ملی ہے، وہ ایک دوست اسیدورفس نے اُس کے پاس امانتاً رکھوائی تھی جو گزشتہ برس جرمنی گیا اور وہیں ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا، تاہم اسیدورفس نامی جرمن شخص کی کرائم سین پر موجودگی کبھی ثابت نہیں ہوئی۔

مضبوط شواہد کے پیشِ نظر ہوپ مین کو مجرم ٹھہراتے ہوئے موت کی سزا سنادی گئی۔ اِس عرصے میں وہ مسلسل خود کو بے قصور قرار دیتا رہا۔ اُس نے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی، اپنی بقا کی جنگ لڑنے کی بھرپور کوشش کی، تاہم برونو ہوپ مین کی تمام اپیلوں کو رد کردیا گیا۔

3 اپریل 1936ء کو اُسے الیکٹرک چیئر کے حوالے کر دیا گیا۔ اُس کے آخری الفاظ تھے ''میں اُس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں، جس کے لیے مجھے سزائے موت سنائی گئی!''

ہوپ مین کی موت کے بعد اخبارات میں بہت کچھ لکھا گیا۔ کسی نے کہا۔ ''دنیا کا مکروہ ترین آدمی موت کی وادی میں اُتر گیا!'' کسی نے سرخی لگائی۔ ''سب سے بڑے مقدمے کا اختتام، ہوپ مین کی موت!''

گو کہ قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں نے صدی کے سب سے بڑے جرم کی فائل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردی لیکن مختلف تحقیق کار برسوں اِس پر کام کرتے رہے۔ سوالات اُٹھائے گئے، کیا ہوپ مین نے تنہا یہ جرم کیا؟ کیا وہ واقعی مجرم تھا؟ کیا پولیس نے اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اُسے نشانہ بنایا؟

ان سوالات کا جواب تو نہیں ملا لیکن یہ بات حتمی ہے کہ اِس کیس نے جے ایڈگر کو اتنا پُرقوت بنا دیا کہ آنے والے برسوں میں اس نے کانگریس سے اپنے دائرۂ اختیار میں اضافے کے لیے کئی قانون پاس کروائے، سائنسی تحقیق اور لیبارٹریوں کی توسیع کے نام پر کروڑوں ڈالرز کا بجٹ مختص کروایا اور اپنا اثر و رسوخ اتنا بڑھالیا کہ خود ایک مافیا بن گیا۔ اور یوں اغوا کی ایک واردات کے طفیل ایف بی آئی نے دنیا کے شاطر ترین تفتیشی ادارے کی حیثیت اختیار کرلی!! ✪

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسط 205

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پروازمیں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں درداستاں سرگزشت

غالب نے کہا تھا۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اب وہ دور آ گیا ہے کہ ''کچھ'' صورتیں بھی باقی نہیں رہیں جنہیں دیکھ کر غالب کو یہ خیال سوجھا تھا۔ اب تو صرف ان کا ذکر اذکار ہی رہ گیا ہے اور وہ بھی روز بہ روز کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں دنیا میں، لوگوں میں، رہن سہن میں اور مزاجوں میں اتنی تیزی سے اور اس قدر حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آئندہ زمانے کا کیا رنگ ڈھنگ ہوگا۔ ہر روز ایک نئی ایجاد اور ایک نئی تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے۔ ایجادات تو خیر اس سے پہلے بھی ہوتی تھیں مگر بہت سست رفتاری سے اور پھر ان کی وجہ سے انسانوں اور معاشروں پر بہت آہستگی سے تبدیلیاں رونما ہوتی تھیں، ایک سو سال یا ڈیڑھ سو سال پہلے کی ایجادات نے صحیح معنوں میں انسان کو سہولتیں اور آسائشیں فراہم کی تھیں مثلاً جب پہیا ایجاد ہوا تو اس کو بہت بڑی انقلابی ایجاد کا درجہ دیا گیا۔ پہیے کی وجہ سے رفتہ رفتہ تبدیلیاں آنے لگیں اور انسانوں کی زندگی پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان اور پُرآسائش ہوگئی۔ اسی طرح بجلی، بلب بے تار برقی، ہوائی جہاز اور دیگر ایجادات نے شروع شروع میں انسانوں کو بہت مسرور اور مطمئن کیا تھا مگر جب ان ایجادات کو ہلاکت خیزی کے لیے استعمال کیا جانے لگا تو دنیا درہم برہم ہوکر رہ گئی۔

گزشتہ نصف صدی میں جس تیزی سے نئی نئی ایجادات اور ان کے ہمراہ تیزی سے انسانی معاشروں میں تبدیلیاں آئی ہیں، گزشتہ ہزاروں سال میں بھی ان کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی لیکن جب آپ سکون سے بیٹھ کر سوچتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کی زندگی کو بہتر اور آسان بنانے کے نام پر جو ایجادات کی گئی ہیں، کیا انہوں نے واقعی انسان کو سکھی کردیا ہے؟ اس کے برعکس انسانی خواہشات اور ضروریات میں بے انتہا اضافہ ہوچکا ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانوں کی مجبوریاں، بھاگ دوڑ اور بے سروسامانیوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ذہنی سکون عنقا ہوچکا ہے۔ امریکا اور یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں بھی انسان محض مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ اطمینان، سکون، آسودگی کے لمحات کا اب وہ صرف تصور ہی کرسکتا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب وہ ان کا تصور تک نہیں کرسکے گا اور یہ سب چیزیں محض خواب وخیال بن کر رہ جائیں گی۔

آپ سمجھیں گے کہ میں انسانی ارتقاء اور ترقی کے موضوع پر لکھنے لگا ہوں۔ یہ درست نہیں ہے۔ مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسانی رویّے اور انداز فکر بدل چکا ہے۔ مثلاً ہمارے بچپن اور جوانی میں ہم اپنے ماضی کے کرداروں سے بہ خوبی واقف تھے اور ان کے کارناموں سے بھی۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے یہ قابلِ ذکر افراد سینہ بہ سینہ لوگوں کے ذہنوں میں آباد تھے۔ ان کی خوبیاں، کارنامے، کمزوریاں اور ناکامیاں سبھی کچھ ہمارے علم میں تھیں حالانکہ اس وقت معلومات کا واحد ذریعہ کتاب تھا۔ لیکن اب جبکہ کمپیوٹر، فلم، نیٹ، ٹی وی کا زمانہ ہے، ہم ماضی قریب کے لوگوں کو بھی فراموش کرتے جارہے ہیں۔ علم وادب، فنون لطیفہ، سائنس وہنر ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ممتاز ترین افراد کا اب تذکرہ تک سننے میں نہیں آتا۔ البتہ کبھی کبھی کسی حوالے سے ان کا مختصر سا ذکر ہوجاتا ہے اور بس۔ ہماری نئی نسل جدید ترین اور انتہائی ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کی موجودگی کے باوجود پچھلے لوگوں اور واقعات سے قطعی ناواقف اور ناآشنا ہے۔ انہیں کل کی طرف دیکھنے یا کل کے بارے میں سوچنے کی قطعی فرصت نہیں ہے۔ ان کی توجہ اور کوششوں کا محور صرف آج ہے۔ اس بہانے وہ آنے والے کل کے بارے میں بھی کچھ سوچ لیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو ''آج'' کے سوا کسی اور چیز سے سروکار نہیں ہے۔ آج انہیں کسی چیز کی ضرورت ہے، آج کے تقاضے کیا ہیں؟ آج کے معروف لوگ کون ہیں، آج کے فن کار کون سے ہیں؟ ان کا علم صرف اسی حد تک محدود ہے۔ گزشتہ کل کون لوگ اور کون سی مایہ ناز ہستیاں ان شعبوں کو اپنے علم وہنر اور فن کی روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں، وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ نہ ہی جاننا چاہتے ہیں۔

ان کالموں میں بھارتی فلمی صنعت کے حوالے سے افراد اور واقعات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ وہ کیا تھے، ان کی خدمات کیا تھیں؟ ان کی صلاحیتیں کیا تھیں؟ وہ اس زمانے میں کس طرح پوجے جاتے تھے؟ ان کہانیوں کو بیان کرنے کا مقصد صرف ماضی کی یادیں تازہ کرنا ہیں۔

ایک زمانے میں کہا جاتا تھا کہ انسان ماضی پرست ہوتا ہے۔ اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرتا ہے اور انہیں بار بار بیان کرتا ہے۔ تاریخ کے کرداروں اور علم وہنر سے متعلق افراد سے قطع نظر شوبزنس پر ہی ایک نظر ڈالیے تو یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔ ایک زمانے میں لوگ تان سین، سہگل، پنکج ملک، کے لحن کو فراموش نہیں کرسکتے تھے۔ ہماری نوعمری بلکہ نوجوانی کے زمانے میں بھی ان گلوکاروں کی آوازیں سنی جاتی تھیں۔ کانن دیوی، خورشید امیر بائی کرنا ٹکی، بیگم اختر کے گانے ہر ایک کو زبانی یاد تھے مگر پھر زمانہ سکڑ گیا۔ انسانی ذہن بھی مختصر ہوگیا۔ آج کا نوجوان سہگل کو تو کیا جانے گا وہ تو مکیش، محمد رفیع تک سے ناآشنا ہوتا جارہا ہے۔ کبھی دیویکا رانی ہر دل اور ذہن میں آباد تھی اب چند سال پہلے کی ہیروئن بھی طاق نسیاں کی زینت بن چکی ہیں۔ وجنتی مالا، مینا کماری، نرگس کو اب کتنے فلم بین یاد کرتے ہیں؟ اور تو

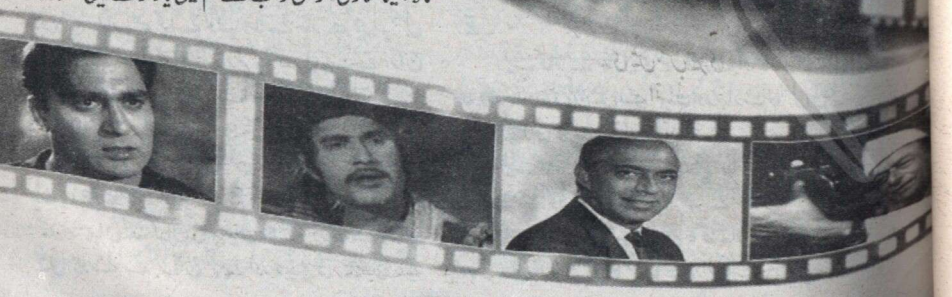

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مینا کماری

باوجود نئی نسل دلیپ کمار، راج کپور، دیوآنند، بلراج ساہنی کو بھولتی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ چندرموہن اور موتی لال تو ان کے لیے انوکھے نام ہیں۔

آیئے، آپ کو وہ کہانیاں سنائیں اور ان فن کاروں کے بارے میں بتائیں جو کبھی دلوں پر راج کیا کرتے تھے۔ آج کا سب سے بڑا سپر اسٹار بھی ان کے پاسنگ نہ تھا۔ عامر خان، سلمان خان، شاہ رخ خان کی دلیپ کمار، راج کپور اور دیوآنند کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟ نہ اداکاری کے لحاظ سے اور نہ ہی رکھ رکھاؤ اور وضع داری کے اعتبار سے۔ مگر وہ دن بھی دور نہیں ہے جب شاہ رخ خان، سلمان خان اور عامر خان کے نام لوگوں کے ذہنوں سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

ہندوستان کی فلمی صنعت میں بڑے بڑے ہیروز جلوہ گر رہے ہیں۔ چندرموہن، موتی لال کے نام کا سکہ چلا کرتا تھا مگر پھر 1940ء کے بعد ایک نیا دور آیا۔ یہ تھیٹر کے اثرات سے آزادی اور سنیما تکنیک کی ترقی کا دور تھا۔ زمانے کے تقاضوں کے مطابق فلمیں بنائی جانے لگیں تو اس کے مطابق کہانیوں میں کردار تخلیق کیے گئے۔ ان کرداروں کو ادا کرنے کے لیے ایسے ہی اداکاروں کی ضرورت تھی جو وقت کے تقاضوں کو نباہ سکیں۔

1940ء کے بعد بمبئی کی فلمی صنعت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ تین اہم اداکاروں نے اپنا رنگ جمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی فلمی دنیا پر چھا گئے۔ یہ دلیپ کمار، راج کپور اور دیوآنند تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اداکارانہ صلاحیتوں کے معاملے میں دلیپ کمار کا ان دونوں کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں تھا مگر کیونکہ ملک میں فلمی دنیا میں اور ذرائع ابلاغ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اس لیے ہندوانہ نام رکھنے کے باوجود دلیپ کمار کے مقابلے میں ہندو اداکار لاکر کھڑے کرنے ضروری تھے۔ راج کپور اور دیوآنند اسی ضرورت کے تحت لاکر ''تین بڑوں'' میں شامل کردیے گئے تھے۔

دلیپ کمار نے ساری عمر خود کو صرف اداکاری تک ہی محدود رکھا اور اس فن میں ایسی شہرت اور مہارت حاصل کی کہ جیتے جی لیجنڈ کی حیثیت اختیار کرلی۔

دلیپ کمار کی فلمی صنعت میں کوئی سفارش تھی اور نہ ہی اس سے پہلے کوئی پہچان۔ صوبہ سرحد کے سنگلاخ شہر پشاور سے تعلق رکھنے والے اس نوجوان کا خاندان قدامت پسند اور کٹر مذہبی تھا۔ فلم میں کام کرنا تو دور کی بات ہے، فلم دیکھنا

اور ہیما مالنی اور سری دیوی جو کل تک دلوں پر راج کرتی تھیں، آج فراموش کردی گئی ہیں۔ حالانکہ ذرائع ابلاغ بے انتہا ترقی کرچکے ہیں۔ پھر بھی کل کے لوگ آج فراموش کیے جاچکے ہیں۔

وہ موسیقار، ہدایت کار، فلم ساز، ہنرمند جن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا، آج کسے یاد ہیں؟ اب تو یہ عالم ہے کہ جو معروف ہیروئن ایک دو سال تک اسکرین پر نظر نہیں آتی، اسے بھی فلم بین بھلا دیتے ہیں۔ ممتاز، راکھی، نوتن آج کسے یاد ہیں؟ حالانکہ اپنے دور میں دھومیں مچایا کرتی تھیں۔ لوگوں کی یادداشت کمزور ہوگئی ہے یا پھر ہم ''آج کے پجاری'' ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہ ماضی کے ہیرو اور ہیروئن کو یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ جس تیزی سے ترقی ہورہی ہے اور نئے لوگ آرہے ہیں اسی رفتار سے پرانے لوگ بھلائے جارہے ہیں۔ بمل رائے، محبوب، شانتارام، کیدار شرما تو دور کی بات ہے، راج کپور بھی لوگوں کے حافظوں سے اُتر چکا ہے۔

اداکاری کے شعبے میں بھی یہی حال ہے۔ پہلے زمانے میں پرانی فلموں کی دستیابی ناممکن نہیں تو بہت مشکل تھی اس کے باوجود نیو تھیٹرز اور بمبئی ٹاکیز کی یادگار فلمیں لوگوں کو یاد تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی کہانیاں، گانے اور مکالمے تک وہ نہیں بھولے تھے مگر آج کمپیوٹر اور ویڈیو کی سہولتوں کے

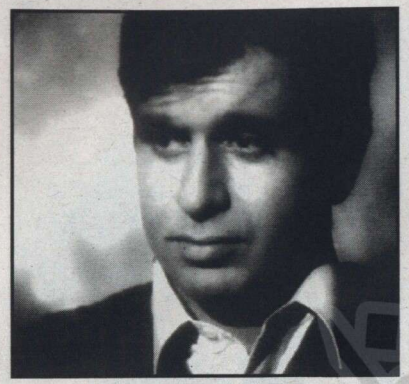

دلیپ کمار

ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور بٹھانے کی کوشش کی جاتی رہی کہ یہ تینوں اداکار ہم پلہ ہیں۔ انہیں انڈین انڈسٹری کے ''بگ تھری'' کا نام دیا گیا تھا۔ حالانکہ فلم بین جانتے تھے کہ انتہائی تعصب کے باوجود دلیپ کمار کو جو ہر دلعزیزی، مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی، وہ کوشش کے باوجود کسی دوسرے ہم عصر کے حصے میں نہیں آسکی۔

دلیپ کمار کا تعلق ایک غیر فن کار خاندان سے تھا لیکن خداداد صلاحیتوں پر کون بند باندھ سکتا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے اداکار ہی بننے کے لیے پیدا کیا تھا۔ جب اسے موقع ملا تو اس نے کسی تربیت یا فلمی پس منظر کے بغیر اداکاری کا ایسا انوکھا معیار پیش کیا کہ سب کو چونکا دیا۔ وہ فلمی اداکاری اور فلمی دنیا میں خوشبودار تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند تھا۔ اس کے آتے ہی دوسرے تمام ستارے ماند پڑ گئے۔ اس وقت انڈین فلم انڈسٹری میں تھیٹر کا انداز ختم ہورہا تھا لیکن پھر بھی کچھ کچھ اثرات باقی تھے۔ بالکل سادہ، حقیقی اور روزمرہ جیسی اداکاری کرنے والوں میں دلیپ کمار سے پہلے صرف موتی لال ہی سرفہرست تھا۔ اس کی فلم دیکھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اداکاری کررہا ہے۔ ہلکی پھلکی کامیڈی میں بھی وہ سب سے آگے تھا مگر ڈرامائی اور ٹریجڈی کے مناظر میں اس کے چہرے کے تاثرات اور آواز مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اس وقت فلمی دنیا کا واحد نیچرل اداکار خیال کیا جاتا تھا۔

دلیپ کمار کے آتے ہی موتی لال نے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ''فلم ہنٹر'' میں ایک مضمون لکھا جس میں دلیپ کمار کی اداکاری کی بے پناہ بھی ان کے ہاں معیوب سمجھا جاتا تھا مگر اداکاری کا شوق کشاں کشاں ان کو کوچۂ فلم میں لے گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دلیپ کمار سے پہلے ان کا چھوٹا بھائی ناصر خان فلمی اداکار بن گیا تھا۔ دلیپ کمار کی باری بعد میں آئی مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ نہ صرف اپنے بھائی سے بلکہ اپنے عہد کے تمام اداکاروں سے میلوں آگے نکل گیا۔ شوق، لگن، اَن تھک محنت اور سب سے بڑھ کر خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے دلیپ کمار کو ابتدائی سالوں ہی میں شہرت اور عظمت حاصل ہوگئی تھی۔ جگنو، ملن اور انداز میں دلیپ کمار نے اداکاری کا جو معیار قائم کیا تھا اس کے بعد اس میں اضافہ ہی کرتا رہا اور بتدریج شہرت اور مقبولیت کے زینوں پر چڑھتا رہا۔ دلیپ کمار کی فلمی زندگی پچاس سال سے زائد ہے مگر وہ ایسا اداکار ہے جس کی مقبولیت اور مانگ میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی فلم میں کام کرنے کا قائل تھا اور زندگی بھر اسی اصول پر قائم رہا۔ ورنہ اس کی مانگ اتنی زیادہ اور معاوضے کی رقوم اس قدر ناقابلِ یقین تھیں کہ اگر وہ چاہتا تو ابتدائی چند سالوں میں ہی کروڑ پتی بن جاتا مگر اس نے ایک وقت میں ایک فلم کا اصول کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ فلم کی کہانی اور اسکرپٹ پڑھ کر اس میں کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا تھا اور پھر جان لڑا دیتا تھا۔ انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ دلیپ کمار سے بھی اندازوں کی غلطیاں ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض فلمیں فلاپ ہوگئیں مگر دلیپ کمار پھر بھی فلاپ نہ ہوا۔ فلاپ فلم میں بھی دلیپ کمار کی اداکاری قابلِ دید ہوا کرتی تھی اور وہ کردار یادگار بن جاتے تھے۔ ایسی بہت سی فلموں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں مثلاً ملن، جوگن، امر وغیرہ جو خلافِ توقع فلاپ ہوگئیں مگر ان میں دلیپ کمار کی اداکاری کا نقش آج بھی قائم ہے۔

راج کپور کا تعلق بھی پشاور سے تھا۔ راج کپور اور یوسف خان (دلیپ کمار) بچپن ہی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دوستی بھی تھی جو ساری زندگی قائم رہی مگر پیشہ ورانہ چشمک اور رقابت کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کا آغاز ہمیشہ راج کپور کی جانب سے ہوتا تھا۔ دیکھا جائے تو اداکار کی حیثیت سے راج کپور اور دلیپ کمار کا موازنہ ہی غلط ہے مگر ہندو پریس نے ان دونوں کو ہم پلہ بنا دیا تھا بلکہ جب راج کپور والا پلڑا ہلکا رہا تو اس میں دیوآنند کے وزن کا بھی اضافہ کردیا۔ پلڑا پھر بھی دلیپ کمار ہی کا بھاری رہا۔

دیوآنند اور راج کپور کی اداکاری دلیپ کے مقابلے میں مصنوعی اور اوپری اوپری سی لگتی تھی مگر مسلسل پروپیگنڈا کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعریف کرتے ہوئے اسے کچھ مشورے بھی پیش کیے تھے۔ دلیپ کمار واحد اداکار تھا جس کے بارے میں موتی لال جیسے وقت کے سپر اسٹار کو سراہنے اور مشورے دینے کی ضرورت پیش آئی۔

دلیپ کمار نے ہلکے پھلکے نیچرل مناظر میں موتی لال کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، اس کے ساتھ ہی جب اس نے المناک اور ڈرامائی مناظر میں ایک انوکھی دردناک اداکاری کا نمونہ پیش کیا تو دیکھنے والے ساکت رہ گئے۔ ایسا اداکار انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بھی انڈین اسکرین اس جیسا دوسرا فن کار پیش کرنے سے قاصر ہی رہی۔

دلیپ کمار کے المناک مناظر، چہرے کے تاثرات، آواز کا اُتار چڑھاؤ دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔ وہ ایک دردناک سماں پیش کر کے دیکھنے والوں کو اپنی اداکاری کے طلسم میں اسیر کر لیتا تھا۔ بہت جلد دلیپ کمار کو ''ٹریجڈی کا بادشاہ'' کا لقب دے دیا گیا۔

دلیپ کمار اس حد بندی کا قائل نہ تھا۔ اس کی صلاحیتیں ہمہ گیر اور بے پناہ تھیں۔ اس کے مقابلے میں راج کپور ہلکے پھلکے رومانی مناظر کے لیے مشہور تھا۔ دیو آنند کا ایک مخصوص انداز تھا جو آج تک قائم ہے۔ اس کا اداکاری کا منفرد انداز تھا مگر اس میں تصنع جھلکتا ہوا صاف نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود ہلکے پھلکے رومانی اور ڈرامائی مناظر میں وہ راج کپور سے بہتر تھا۔ لیکن اس کا میدان محدود تھا۔

راج کپور کو قدرت نے اداکاری سے زیادہ فلم سازی اور ہدایت کاری کی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اداکاری میں وہ اوسط درجے کا فن کار تھا مگر اسے بجا طور پر انڈیا کا ''گریٹ شومین'' کہا جاتا تھا۔ اسے فلم سوچنے اور بنانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ ہدایت کاری شاید اسے پیدائشی طور پر ملی تھی۔ اس نے اپنی پہلی فلم ''آگ'' ہی میں اپنی ہدایت کاری سے سب کو چونکا دیا تھا۔ اس کے بعد برسات اور پھر آوارہ سے اس نے ہندوستان کی فلمی دنیا میں ایک اَن مٹ نقش قائم کر دیا۔ وہ ایک خوبصورت، خوش گفتار اور خوش اخلاق رومانٹک آدمی تھا۔ ہدایت کاری کے تمام رموز اس نے کیدار شرما جیسے مایہ ناز ہنرمند کا معاون رہ کر سیکھے تھے۔ باقی کسر خداداد صلاحیت نے پوری کر دی تھی۔ موسیقی کا اس کو اتنا شعور تھا کہ شاید ہی کسی اور ہدایت کار کو ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر وہ اداکار اور ہدایت کار نہ ہوتا تو بہت بڑا موسیقار ہوتا۔

راج کپور پیدائشی اداکار اور ہدایت کار تھا۔ تعلیم میں وہ پسماندہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے میٹرک پاس کر لیا تو اس کے والد پرتھوی راج نے اس کو کالج میں داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ پرتھوی راج نے تھیٹر اور فلم میں بہت نام پیدا کیا تھا۔ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے باعث تعصب کے باوجود مسلمان تک پرتھوی راج کا احترام کرتے تھے۔ اس نے اپنا رکھ رکھاؤ اور وضع داری آخری دم تک جاری رکھی۔ ایک زمانے میں جب جوش ملیح آبادی بمبئی گئے اور شالیمار سے علیحدہ ہونے کے بعد بیکار ہو گئے تو حمید اختر نے جوش ملیح آبادی سے پرتھوی راج کی ملاقات کرائی۔

پرتھوی راج نے ان کی بہت تعظیم کی۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ آپ تو شاعرِ انقلاب ہیں۔ ہندوستان کا مان ہیں۔ مجھے بھی خدمت کا موقع دیجیے۔

جوش صاحب کی مالی مشکلات سے وہ آگاہ تھا اس لیے فوراً یہ پیشکش کی کہ وہ پرتھوی تھیٹرز کے لیے نغمات لکھیں۔ معاوضے کے طور پر دو ہزار روپے مہینا کی پیشکش کی۔ اس وقت کے دو ہزار آج کے کم از کم ڈیڑھ دو لاکھ سمجھ لیجیے۔

حمید اختر اس بات کے راوی ہیں کہ جب تک جوش صاحب بمبئی میں رہے اور اس کے بعد بھی دو ہزار روپے ماہانہ باقاعدگی سے انہیں ملتا رہا حالانکہ انہوں نے پرتھوی تھیٹرز کے لیے ایک گیت تک نہیں لکھا تھا۔ اس سے پرتھوی راج کی انسانی عظمت اور قدر دانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

راج کپور اسی بلند اخلاق، شائستہ اور قدر دان باپ کا بیٹا تھا۔ وہ پشاور میں یوسف خان (دلیپ کمار) کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ دونوں میں دوستی بھی تھی مگر کاروباری چشمک اور رقابت بھی ہمیشہ جاری رہی۔ راج کپور دراصل دلیپ کمار کے مقابلے میں احساس کمتری ہو گیا تھا۔ وہ خوبصورت تھا، بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا، ہیرو تھا، بڑا فلم ساز اور ہدایت کار تھا مگر دنیا دلیپ کمار کی عظمت کے گن گاتی تھی۔ ہیروئن اس کے ساتھ کام کرنا اپنا اعزاز سمجھتی تھیں اور اس کے عشق میں مری جاتی تھیں۔ دلیپ کمار کی ایک نگاہ غلط انداز یا مسکراہٹ ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ نرگس سے لے کر مدھو بالا، وجنتی مالا تک دلیپ کمار کی توجہ کی طالب تھیں۔ دلیپ کمار کی بے اعتنائی سے بگڑ کر نرگس نے راج کپور کی طرف توجہ دی تھی مگر پھر راج کپور نے اس کے اردگرد ایسا جالا بنا کہ وہ دس سال تک اس کے جال میں گرفتار رہی۔ راج کپور نے اس سے بہت فائدے اُٹھائے۔

یہاں تک کہ نرگس جو صحیح معنوں میں اس سے محبت کرنے لگی تھی رفتہ رفتہ اس کی اصلیت سے واقف ہو کر اس

نرگس

سے دور ہو گئی۔ دس سال کے زیاں کا پچھتاوا نرگس کو زندگی بھر رہا۔ راج کپور نے اسے واقعی فریب دیا تھا اور وہ بڑے خلوص سے فریب کھاتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ راج کپور کی خودغرضی اور مفاد پرستی اس پر پوری طرح واضح ہو گئی اور محبت شدید نفرت میں بدل گئی۔

نرگس کو دلیپ سے برگشتہ اور دور کرنے کے لیے راج کپور نے بہت اچھی منصوبہ بندی کی تھی جس میں وہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد بھی وہ دلیپ کمار کی طرف راغب ہونے والی ہیروئنوں کو مختلف طریقوں سے اپنی طرف مائل کرتا رہا مگر یہ احساس کبھی اس کے دل سے نہ نکل سکا کہ اس کے حصے میں ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ ہیروئن ہی آتی تھیں جنہیں دلیپ کمار کی طرف سے مایوسی ہو جاتی تھی۔

مدھو بالا نے تو کبھی راج کپور کو اہمیت ہی نہیں دی۔ وجنتی مالا کو جب ''نیا دور'' میں کام کرنے کے لیے دلیپ کا ایک ٹیلی فون ملا تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس سے پہلے وہ فلم ساز و ہدایت کار چوپڑا کو اس قدر عجلت میں اتنی زیادہ تاریخیں دینے سے انکار کر چکی تھی۔ اس فلم میں پہلے مدھو بالا ہیروئن تھی مگر اس کے والد کی بدعہدی اور بدنیتی سے تنگ آ کر دلیپ کمار بھی برگشتہ ہو گیا اور اسے فلم سے کٹ کر کے وجنتی مالا کو کاسٹ کرنے کا مشورہ دیا۔

''وجنتی بہت مصروف ہے، وہ کیسے اتنا وقت دے سکے گی؟'' چوپڑا نے کہا۔

دلیپ نے کہا ''آپ آج شام اس کے پاس جا کر بات تو کریں۔ میں بھی اس سے بات کروں گا۔''

وجنتی مالا نے فون پر اچانک دلیپ کمار کی آواز سنی تو یقین نہیں آیا، اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ کہاں دلیپ کمار اور کہاں وہ؟

وہ بوکھلا گئی ''جی، کہیے، کیسے یاد کیا؟''

''وجنتی، آج شام چوپڑہ صاحب ''نیا دور'' کے لیے تمہارے پاس آئیں گے۔ ان سے معاملات طے کر لینا، ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' وجنتی کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

فون بند ہو گیا مگر وجنتی مالا کے دل کی دھڑکن بند نہیں ہوئی۔

''میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کروں گی؟ اس کی خواہش پر اور مدھو بالا کی جگہ؟''

یہ سوچ کر وہ دم بہ خود رہ گئی تھی ''تو کیا میں اس کے دل میں بھی مدھو بالا کی جگہ لے سکوں گی؟''

اس کے دل کی دھڑکنیں قابو میں نہیں تھیں۔

یہ وہی وجنتی مالا ہے جسے لبھانے کے لیے راج کپور نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔ مگر دال نہیں گلی تھی اور بات فلرٹ سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔

وجنتی مالا کا دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنا، ساری فلم انڈسٹری کے لیے ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ راج کپور کے لیے تو یہ بہت بڑا ذاتی صدمہ تھا۔

وجنتی مالا کو دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے اپنے فن کا نچوڑ اس فلم میں پیش کر دیا۔ یہ اس کی خوش نصیبی کی انتہا تھی۔ اس کے بعد وہ اور سب کو فراموش کر چکی تھی۔ مدھو متی، دیوداس اور پھر سب سے بڑھ کر گنگا جمنا جو فلمی صنعت میں ایک سنگ میل ہے۔ مسلسل ساتھ کام کرنے کے بعد وجنتی مالا دلیپ کمار کی محبت جیتنے کا خواب دیکھنے لگی تھی مگر وہ راج کپور نہ تھا۔ اسے کسی ہیروئن کے نام کی ضرورت نہ تھی۔ دوسری ہیروئنوں کو مستقبل بنانے کے لیے اس کے نام کی ضرورت تھی۔ جس نے اس کے ساتھ کام کیا، اس کی زندگی بن گئی، وہ امر ہو گئی۔

دلیپ کمار کی محبت حاصل کرنے میں ناکام ہو کر وجنتی مالا مایوسی اور محرومی کا شکار ہو گئی تو ایک بار پھر راج کپور موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے فوراً ''سنگم'' شروع کر دی۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محبت کی تکون میں وہ دلیپ کمار کو کاسٹ کرنا چاہتا تھا مگر اس نے دلیپ کمار نے بڑی خوش اسلوبی سے معذرت کرلی۔ اسے علم تھا کہ اپنی ذاتی فلم اور ذاتی ہدایت کاری میں وہ دلیپ کمار کو اُبھرنے کا موقع نہیں دے گا۔ محبوب صاحب کی فلم ''انداز'' کا تجربہ اس کو یاد تھا۔ اس فلم کے دونوں کرداروں کی محبوب صاحب نے پہلے راج کپور کو آفر کی تھی جس نے بوجوہ نرگس کا محبوب یعنی ہیرو کا کردار پسند کیا اور فلم کا رول دلیپ کمار کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ ہندوستان کی ایک یادگار اور تاریخ ساز فلم تھی۔ اس کے بعد یہ تینوں فن کار پھر کبھی کسی فلم میں یکجا نہیں ہوئے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد اب راج کپور وجنتی مالا اور دلیپ کمار کے ساتھ یہ تکون ایک بار پھر بنا کر فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

دلیپ کمار اور راج کپور کا تعلق ''محبت اور نفرت'' کا تھا۔ ان کے مابین کشمکش اور محاذ آرائی ہمیشہ جاری رہی۔ جب راج کپور کے بطور فلم ساز وہدایت کار عظمت کا سورج پورے عروج پر تھا تو دلیپ کمار نے بھی ایک فلم بنا کر پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ گنگا جمنا بہ حیثیت فلم ساز اس کی پہلی اور آخری فلم ثابت ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس کی کہانی سے لے کر ہدایت کاری تک ہر چیز میں دلیپ کمار کا دخل تھا۔ اپنی نوعیت کی انوکھی فلم تھی۔ ایسی فلم جس میں نوریلوں کے بعد ہیروئن مرجاتی ہے اور پھر کوئی دوسری لڑکی اسکرین پر نظر نہیں آتی۔ اس کے باوجود کہانی، مکالموں، ہدایت کاری اور سب سے بڑھ کر دلیپ کمار کی اداکاری کے بَل پر فلم کے آخری منظر تک دیکھنے والے سانس روکے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ایک ہی فلم بنا کر دلیپ کمار نے راج کپور کو آئینہ دکھا دیا تھا کہ دیکھو، ہم بھی فلم بنا سکتے ہیں اور ایسی فلم بناتے ہیں۔

دلیپ کمار پر ''ٹریجڈی کنگ'' کا ٹھپا لگ گیا (حالانکہ یہ درست نہ تھا) ندیا کے پار، شبنم وغیرہ میں وہ ہلکی پھلکی کامیڈی اور رومانس پیش کرچکا تھا۔ اس وقت دلیپ کمار نے کامیڈی کردار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آزاد اور پھر کوہ نور میں اس نے مزاحیہ اداکاری کا ایسا معیار پیش کیا جسے آج تک کوئی نہیں اپنا سکا۔

راج کپور کے بارے میں پہلے کہا جاچکا ہے کہ وہ پیدائشی فلم والا تھا۔ بڑی مشکل سے میٹرک پاس کیا تو باپ نے کالج بھیجنے کا ارادہ کیا۔

راج کپور نے ڈرتے ڈرتے کہا ''پاپو، جب کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو اسے میڈیکل کالج میں داخل کراتے ہیں۔ انجینئر بننے کے لیے انجینئرنگ کالج میں داخل کراتے ہیں۔ میں فلم انڈسٹری میں جانا چاہتا ہوں، مجھے آپ کسی کالج میں کیوں داخل کرنا چاہتے ہیں؟''

پرتھوی راج کی سمجھ میں یہ نکتہ آ گیا۔ اس نے راج کپور کو فلم اسٹوڈیو میں داخل کردیا اور کیدار شرما جیسے ہدایت کار کے سپرد کردیا۔ راج کپور نے خود کو ایک مکمل اور عظیم فلم والا ثابت کردکھایا۔

دیوآنند نے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ خوبصورت اور خوش اطوار نوجوان تھا۔ کالج کے ڈراموں میں بھی حصہ لیا۔ اس کا خاندان تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھا۔ ایک بھائی چیتن آنند نے بھی فلموں میں بہت نام اور مقام پیدا کیا اور دوسرے بھائی نے بھی ہدایت کاری میں بہت کچھ کرکے دکھایا۔ دیوآنند نے ہدایت کاری اپنے بھائی سے ہی سیکھی۔ وہ رومانٹک مزاج تھا۔ پہلے ثریا سے عشق کیا پھر اپنی ساتھی ہیروئن کلپنا کور سے محبت اور شادی کرلی مگر یہ شادی کامیاب نہ رہ سکی۔ جلد ہی دونوں میں دوری پیدا ہوگئی۔ صرف زمانہ سازی کا تعلق قائم رہا۔

دیوآنند کے فلمی روماںس زیادہ نہیں ہیں حالانکہ پرستاروں کی کمی نہ تھی مگر وہ دل پھینک تھا، آخر تک ویسا ہی رہا۔ فلم ساز اور ہدایت کار تھا اور نوخیز ہیروئن کا انتخاب کرکے اس کے ساتھ عشق ضرور کرتا تھا۔ شاید یہی بڑھاپے میں اس کی جوانی کا راز تھا۔ اس نے درجنوں فلمیں بنائیں اور ڈائریکٹ کیں مگر کامیاب فلموں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے باوجود وہ فلمیں بناتا رہا۔ پہلے پہل وہ خود اپنی فلم کا ہیرو ہوتا تھا مگر شاید اس نے اعترافِ شکست کرلیا اور اپنے بیٹے کو ہیرو بنا دیا۔ دیوآنند کی مردانہ وجاہت اور کشش میں کلام نہیں تھا۔ اس کا اداکاری کا ایک مخصوص انداز تھا جو آخر تک برقرار رہا۔ دلیپ کمار کی اداکاری میں جو رنگا رنگی اور مختلف پہلو تھے، ان سے راج کپور اور دیوآنند دونوں محروم تھے۔ ہندو پریس ان دونوں کو مسلسل اور مستقل دلیپ کمار کا حریف اور مقابل ثابت کرتا رہا مگر بات نہ بن سکی۔ دلیپ کمار اداکار کی حیثیت سے ان سے کئی گنا بڑا اداکار تھا اور آج بھی ہے۔

دیوآنند نے بھی یہ کمی فلم ساز اور ہدایت کار بن کر دور کرنی چاہی مگر دلیپ کمار کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔ اس کی تمام فلمیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور دوسرے میں دلیپ کمار کی ''گنگا جمنا'' رکھی جائے تو پلڑا ''گنگا جمنا'' کا ہی بھاری ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ آج تک کوئی اداکار دلیپ کمار کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔ راج کپور دنیا سے رخصت ہوگیا۔ کئی سال پہلے ہی وہ موٹا بھدا اور بیماریوں کا شکار ہوچکا تھا۔ دیوآنند بھی اب

اس دنیا میں نہیں ہے جبکہ دلیپ کمار آج بھی تروتازہ اور فٹ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی عظمت کو جھٹلانے کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک لیجنڈ ہے۔ پچاس سال تک فلمی دنیا پر حکمرانی کرنے والا آج بھی اس کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس عرصے میں اس نے صرف پچاس فلموں میں کام کیا ہے۔ ہندوستان کے ہر اداکار نے اس سے متاثر ہونے اور اس کے عظیم ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ آج بھی سب اس کو مثال اور گرو مانتے ہیں۔

امیتابھ بچن آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح چھا گیا۔ مگر وہ ایک ہی قسم کے کرداروں تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ پھر بھی میڈیا نے اسے عظیم ترین بنانے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ امیتابھ بچن کو انڈیا کا دیوقامت سپر اسٹار قرار دیا گیا۔ اس زعم میں آکر اس نے دلیپ کمار کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی کیونکہ یہی بڑائی کا معیار تھا۔ اس کے بغیر وہ دلیپ کمار کی بادشاہت کو چیلنج نہیں کرسکتا تھا۔

''شکتی'' میں وہ دونوں یکجا ہوئے تو جیسے قیامت آ گئی۔ فلم ریلیز ہوئی تو امیتابھ بچن کو اپنی کوتاہی اور چھوٹائی کا احساس ہوگیا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ دلیپ کمار کا نام احترام کے ساتھ لیتا ہے۔

امیتابھ کی عظمت کا اندازہ یوں لگائیے کہ دس سال کے بعد ہی اس کا زوال شروع ہوگیا۔ اب امیتابھ ایک بھولی ہوئی کہانی بن چکا ہے۔ بدقسمتی سے اس نے اپنا سب کچھ کاروبار میں لگا دیا جو فلاپ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کا ذاتی گھر بھی نیلام ہوگیا۔ اب وہ دوبارہ کام کرنے پر مجبور ہے حالانکہ اس نے کروڑوں کمائے ہیں۔ انڈیا کے فلم اسٹاروں میں اس سے زیادہ معاوضہ اس وقت تک نہ کسی نے لیا تھا اور نہ ہی اتنے نخرے اُٹھوائے تھے۔ پے در پے آخری چند فلموں کی ناکامی نے امیتابھ کو اس کا اصل مقام یاد دلا دیا۔ پھر وہ ٹی وی سیریلز بنانے لگا۔ فلموں میں کام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ سب سے زیادہ دولت کمانے والا اداکار سب سے کم مایہ اور غریب ہوگیا۔ یہاں تک کہ کرائے کے مکان میں رہنے پر مجبور ہوگیا۔

یہ انڈین اسکرین کے بڑوں کی داستان ہے۔ کسی نے زوال کا مزہ چکھ لیا ہے مگر دلیپ کمار کی عظمت کا مینار آج بھی وہیں قائم ہے۔ اس سے زیادہ بلند اور پائیدار کسی اور اداکار کی نشانی نہیں ہے۔

دلیپ کمار نے ہدایت کار کے طور پر ایک فلم ''کالکا'' شروع کی تھی جو سالہا سال سے مختلف اسباب کی بنا پر نامکمل

دیوآنند اور کلپنا کارتیک

پڑی ہے۔ مگر جنہوں نے یہ نامکمل فلم دیکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ فلم انڈسٹری میں لکیر پھیر دے گی لیکن اگر مکمل ہوکر ریلیز ہوگی تب۔ جس کا ابھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

دلیپ کمار صرف ایک اداکار تھا۔ آج بھی وہ اداکار ہے۔ اداکاری ہی اس کی پہچان ہے اور اس فن کو اس نے معراج تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے زیادہ فلموں میں کام نہیں کیا۔ لالچ کیا نہ حرص، مگر اپنا پیسا سنبھال کر رکھا اور عقل مندی سے سرمایہ کاری کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی ایک مطمئن اور پُرآسائش زندگی بسر کررہا ہے۔ اس کی عظمت کو دیکھنے کے لیے سر اُٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے جس سے کئی ٹوپیاں گر جاتی ہیں۔ وہ اپنی عمر کی پون صدی گزار چکا ہے مگر دیکھنے میں بہ مشکل پینتالیس پچاس کا لگتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مطمئن انسان ہے۔ اس کا سرمایہ اس کا ذہن اور اندازِ فکر ہے۔ اس کا مطالعہ بے پناہ ہے۔ بڑے بڑے فاضل، لکھے پڑھے عالموں کو وہ لاجواب کردیتا ہے۔ وہ سیاست سے دور ہے مگر ہر جماعت اس کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی خواہش مند ہے۔ سماجی کاموں میں بھی وہ پیش پیش ہے۔ وہ بے خوف ہے، کسی حکومت یا بال ٹھاکرے کی دھمکیوں سے نہیں ڈرتا۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے دیا ہوا پاکستانی ایوارڈ ہزار کوشش کے باوجود اس نے واپس نہیں کیا۔ وہ اصولوں پر سمجھوتا کرنے اور خوف زدہ ہونے کا قائل نہیں ہے کیونکہ وہ ایک سچا اور کھرا پٹھان ہے۔ کچھ عرصہ قبل انڈیا کے متعصب پریس اور میڈیا نے شور مچا کر آسمان سر پر اُٹھالیا کہ کارگل کی جنگ کے بعد دلیپ کمار پاکستان سے ملنے والا ایوارڈ واپس کردے مگر دلیپ کمار نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس کے خلاف مہم چلائے اور اس کا گھر جلانے کا ڈراوا دیا گیا مگر دلیپ کمار نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردیا۔ یہاں تک کہ متعصب بال ٹھاکرے نے کھلم کھلا دلیپ کمار سے مطالبہ کیا کہ اگر اس نے پاکستان کا دیا ہوا اعزاز واپس نہیں کیا تو ثابت ہوجائے گا کہ وہ غدار ہے۔ اس کے باوجود دلیپ کمار کٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے نئی دہلی جاکر اس وقت کے وزیراعظم واجپائی سے ملاقات کی اور کافی طویل گفتگو کے دوران میں انہیں بتایا کہ یہ ایوارڈ مجھے فنی خدمات پر دیا گیا ہے اور آپ کی اجازت سے میں نے یہ ایوارڈ وصول کیا تھا۔ اب مجھے ایوارڈ واپس دینے کے لیے کیوں کہا جارہا ہے اور مجھے غدار وطن کیوں قرار دیا جارہا ہے؟ آخر بھارت کے مسلمان کب تک غداری کا لیبل لگا کر زندگی گزاریں گے؟ انہیں ہر ایک سے حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے کیوں کہا جارہا ہے جبکہ بھارت کے دوسرے شہریوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا؟

واجپائی صاحب نے بہت توجہ سے دلیپ کی باتیں سنیں اور اسے یقین دلایا کہ حکومت کی طرف سے اس کو مکمل تحفظ دیا جائے گا۔ اس کو ایوارڈ واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دلیپ کمار نے یہ دلیل بھی دی تھی کہ بھارت کے ایک سابق وزیراعظم مرارجی ڈیسائی کو بھی پاکستان کی حکومت نے ایوارڈ دیا تھا مگر ان پر نہ تو غداری کا الزام لگا اور نہ ہی انہیں ایوارڈ واپس کرنے کے لیے کہا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ ہندو تھے اور میں مسلمان ہوں؟

دلیپ کمار کے اس بے خوف موقف پر بھارت کے دوسرے دانش وروں نے بھی متعصب حلقوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور دلیپ کمار کی حمایت میں بیانات اور مضامین لکھے۔ اس طرح یہ مسئلہ بالآخر ختم ہوگیا مگر دلیپ کمار نے اپنی اصول پرستی اور بے خوفی کا ایک بار پھر مظاہرہ کرکے ثابت کردیا کہ اسے خوف زدہ نہیں کیا جاسکتا۔

دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند دو دہائی سے زائد عرصے تک بھارتی فلمی صنعت پر راج کرتے رہے ہیں۔ دلیپ کمار نے ہمیشہ دوسروں سے کہیں زیادہ معاوضہ وصول کیا۔ بھارت کی مقبول ترین ہیروئن کا معاوضہ اس کے معاوضے سے نصف بھی نہ تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی فلم میں کام کرتا تھا اور منہ مانگا معاوضہ وصول کرتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو بیک وقت درجنوں فلموں میں کام کرکے کروڑوں روپے کما سکتا تھا مگر اس نے لالچ سے کام نہ لیا۔ اس زمانے میں جب بڑے بڑے ہیرو اور ہیروئنز ستر اسی ہزار معاوضہ وصول کرتے تھے، دلیپ کمار لاکھوں میں معاوضہ لیتا تھا اور وہ بھی نقد۔ پھر بھی فلم ساز اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے تھے اور اس کو بہت بڑی رقوم کا لالچ دیتے تھے مگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

ایک طرف تو یہ اصول تھا اور دوسری طرف مروت اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگوں سے وہ معاوضہ لیتا ہی نہ تھا یا پھر یہ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیتا تھا۔ فلم ''داغ'' کے ہدایت کار امید چکرورتی وہ شخص تھے جو دلیپ کمار کی پہلی فلم ''جوار بھاٹا'' کے ہدایت کار تھے۔ دلیپ ان کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولا۔ جب انہوں نے اپنے محدود وسائل سے فلم ''داغ'' کا آغاز کیا تو دلیپ کمار نے محض ایک روپیا معاوضہ لے کر اس فلم کام کرنے کی ہامی بھرلی۔ یہ فلم دلیپ کمار کی یادگار فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ محبوب خاں سے بھی اس نے معاوضے کے سوال پر کبھی بات نہیں کی۔ وہ جو بھی دیتے تھے، چپکے سے قبول کرلیتا تھا۔ یہ اس کی مروت اور اعلیٰ ظرف کا ثبوت تھا۔

ایک دہائی پہلے دیو آنند نے اپنے، راج کپور اور دلیپ کمار کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''جب تین کی ایک کمپنی ہوا کرتی تھی'' یہ ایک بہت دلچسپ مضمون ہے جس میں ایک ہم عصر نے اپنے دوسرے ہم عصروں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا۔

''جب میں پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں اور اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں جب میں، راج کپور اور دلیپ کمار فلموں میں کام کرتے تھے تو خدشہ رہتا ہے کہ ان واقعات کو خودستائی نہ سمجھا جائے۔ جب ہم کام کررہے تھے تو ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ چالیس سال بعد لوگ ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ہم نے کیا پایا اور کیا نہیں پایا اس کا فیصلہ تو زمانہ ہی کرسکتا ہے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ چالیس سال تک ہم مختلف بدلتے ہوئے رجحانات اور فیشن کے ساتھ چلتے رہے اور ان کا مقابلہ کرتے رہے۔

ہم میں سے ہر ایک کی اداکاری ہر فلم کے ساتھ نکھرتی رہی کیونکہ تجربے سے ہمارے اندر خود اعتمادی اور پختگی پیدا ہورہی تھی۔ ہمارا اصول تھا کہ ایک وقت میں زیادہ فلموں میں کام نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہم تینوں نے اپنا علیحدہ انداز اور اسلوب بنانے کی کوشش کی تاکہ اداکاری میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں۔ آج کے ہیروز کی طرح ہمارے اندر یکسانیت نہیں تھی۔ نہ تو شخصیت اور حلیے میں اور نہ ہی اداکاری میں۔ میں، دلیپ اور راج کپور، اداکاری کے اسٹائل میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ دلیپ ٹریجڈی کا بادشاہ تھا۔ اس بے چارے کو کبھی ہیروئن نہیں ملتی تھی اس

لیے وہ ساری فلم میں غم زدہ اور روتا ہی رہتا تھا۔ وہ نم ناک اداکاری اور آنسو بہانے کے معاملے میں اسپیشلسٹ تھا۔ اس میدان میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ اسکرین پر اسے دیکھتے ہی لوگ اُداس اور لڑکیاں آب دیدہ ہوجاتی تھیں۔ ان سب کے دلوں میں اس کے لیے ترس اور ہمدردی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا تھا۔

راج ایک سیدھا سادا، چارلی چپلن کے ٹائپ کا مزاحیہ اداکار تھا جو مزاح کے ساتھ معاشرے پر طنز بھی کرتا تھا اور ہنسی ہنسی میں معاشرے کی دکھتی رگوں کو چھیڑ دیتا تھا۔ اس کی فلم ''میرا نام جوکر'' اس کی سوچ اور اداکاری کے انداز کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ راج کو دوسروں کی فلموں کے مقابلے میں خود اپنی فلموں میں کام کرکے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس نے اپنے فلم ساز ادارے آر کے فلمز کے لیے جو فلمیں بنائیں ان میں اپنے دلی جذبات اور خیالات کی پوری طرح عکاسی کی اور خود اپنے لیے پسندیدہ کردار لکھوائے۔ وہ ڈائریکٹر بھی بہت اچھا تھا اس لیے چند کے سوا کوئی دوسرا ہدایت کار اس کی صلاحیتوں سے پوری طرح فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ راج کی فلموں کا موضوع عموماً رومانس ہوتا تھا۔ اس نے ہمیشہ رومانی فلمیں بنائیں مگر آخر میں ''رام تیری گنگا میلی'' اور ''حنا'' میں یہ رنگ بدل گیا تھا۔ ''حنا'' کا پراجیکٹ وہ باوجود خواہش کے خود مکمل نہ کرسکا اور اپنے بچوں کے لیے یہ ذمے داری چھوڑ گیا۔ سچ پوچھیے تو راج بہت جلد دنیا سے چلا گیا۔ پھر سب اس کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں بھی اس کی بنائی ہوئی مزید فلموں کی بھی تمنا تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ راج ایک زندگی سے بھرپور اور نت نئے خیالات سے بہرہ مند فن کار تھا۔ اس کی سوچ دوسروں سے بہت مختلف تھی۔ مجھ میں اور اس میں کئی چیزیں مشترک تھیں مگر میں، دلیپ اور راج کپور ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔

میں ان دونوں سے بہت مختلف تھا۔ میں نے شعوری طور پر کبھی مخصوص دیو آنند اسٹائل بنانے کی کوشش نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ شروع شروع میں جب میں نے اداکاری کا پیشہ اختیار کیا تو میں خوش نہ تھا۔ میں بہت زیادہ خود میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ کیمرے کے سامنے مجھے بے کلی سی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے اداکاری وغیرہ خود ہی سیکھی ہے۔ کیونکہ اس وقت تربیت دینے والا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ میں نے ہلکے پھلکے منچلے قسم کے کرداروں سے آغاز کیا تھا لیکن میں کم سے کم مکالمے بولنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر میں کسی بے روزگار اور مفلس نوجوان کا کردار کرتا تھا، اس وقت بھی مجھے دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ میں پریشان حال اور فکرمند ہوں۔ میں نے کبھی دیہاتی کردار بھی نہیں کیا اس لیے کہ میں کسی طور بھی دیہاتی نظر نہیں آتا تھا۔ دھوتی کے مقابلے میں پتلون قمیص پہن کر میں زیادہ خوشی اور آسانی محسوس کرتا تھا اس لیے گھر پر بھی یہی لباس پہنتا تھا اور فلموں میں بھی، جب میں اپنی نوکیٹن کی فلموں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے تیس فلمیں بنائیں مگر ان سب کی کہانیاں مختلف تھیں۔ اگر ''سنتوش'' میں مجھے احمقانہ کامیڈی کرنی پڑی تو ''کالا بازار'' اور ''جیول تھیف'' میں مجھے مجرمانہ کردار ادا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

ہر اداکار اپنا ایک منفرد تاثر قائم کردیتا ہے اور یہی تاثر اور انداز کسی اداکار میں کرشماتی کشش پیدا کردیتا ہے۔ فلم بینوں کو وہ ایک جیتا جاگتا کردار محسوس ہونے لگتا ہے۔ آج کی نسل کے اداکار دلیپ کمار اور راج کپور کی فلموں کے ویڈیو ضرور دیکھتے ہیں۔ وہ میری فلموں کا ویڈیو بھی دیکھ کر اپنے لیے ایک منفرد امیج اور شخصیت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل آج کی فلموں میں نہ تو اداکاروں کے لیے کوئی مخصوص انداز اور امیج بنانے کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر فلم میں ایک مختلف امیج پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی خاص انداز سے منسوب نہیں کیے جاتے۔ لیکن نئی نسل کے کئی اداکاروں نے ہم لوگوں کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہم تینوں کی نقل نہیں کی بلکہ چند خصوصیات منتخب کرکے اپنا ایک الگ اسلوب بنانے کی کوشش ضرور کی ہے۔

ایک زمانے میں میرے بال پھولے پھولے ہوتے تھے یہاں تک کہ میں اس، ہیئر اسٹائل سے اُکتا گیا۔ ''گائیڈ'' کے آخری نصف حصے میں میرے بالوں کا انداز بدل گیا تھا۔ میں نے بجائے بالوں کو اوپر کی جانب پھلانے کے، انہیں پیشانی پر ڈالنے کا انداز اپنالیا۔ دلیپ کمار کا ہیئر اسٹائل ہمیشہ یکساں ہی رہا ہے۔ اس کے بالوں کی لٹیں، اس کی پیشانی پر گری ہوئی بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک کھویا کھویا سا تاثر نظر آتا تھا جیسے کہ یہ شخص ہر وقت گہرے خیالوں میں ڈوبا رہتا ہے۔

راج ایک مسخرا تھا جو لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کی نیلی شوخ آنکھیں اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت تھیں۔ اس نے یہ بات کبھی نہیں چھپائی کہ وہ چارلی چپلن سے متاثر ہے۔ میں نے اور راج نے سوئزرلینڈ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چارلی چپلن سے ملاقات بھی کی تھی۔ ان دنوں وہ امریکا چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ منتقل ہوگیا تھا۔ میں اور راج ایک فلمی وفد کے ساتھ ماسکو جارہے تھے جب ہم نے سوئٹزرلینڈ میں چارلی چپلن سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ یہ تمام منصوبہ راج نے سرانجام دیا تھا اور اس کا سارا بندوبست اسی نے کیا تھا۔

جب ہم چارلی چپلن سے ملے تو میں نے دیکھا کہ راج اس سے بے حد مرعوب ہے۔ چارلی نے اپنے گھر کا نام ''وہائٹ ہاؤس'' رکھا تھا۔ ہم اسے چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے بغیر دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ یہ مونچھیں فلموں میں اس کی شخصیت کا لازمی جزو بن چکی تھیں۔ اس کے سر پر مخصوص ہیٹ بھی نہ تھا۔ چپلن نے ہمارے ساتھ بہت شفقت اور اخلاق سے بات چیت کی۔ اس نے اپنی زندگی کا فلسفہ بیان کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جو بھی پیش آئے اس کا ہمت سے سامنا کرنا چاہیے۔ اس کی بیوی اونا نے پیانو پر بہت خوبصورت دھن بجا کر سنائی، ہم نے بہت اچھا وقت گزارا۔ جب ہم ایک بس میں سوار ہوکر واپس لوٹے تو راج نے کھڑکی میں ہاتھ ہلا کر اس سے کہا ''الوداع۔ آپ ہمیشہ دنیا کے عظیم ترین مختصر انسان رہیں گے۔''

دلیپ سنجیدہ اداکاری کی طرف مائل تھا۔ وہ لارنس اولیور اور پال مینی کے انداز کو پسند کرتا تھا۔ دلیپ کمار نے لارنس اولیور کی ایک فلم ''ورنگ ہائٹس'' سے متاثر ہوکر بنائی گئی فلم ''دل دیا درد لیا'' میں کام بھی کیا تھا۔ لارنس اولیور کی کئی اور فلموں کے انداز میں بنائی گئی فلموں میں وہ بہت شوق سے کام کرتا تھا۔ وہ لارنس اولیور سے بہت متاثر تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اداکاری میں اپنی آواز اور آنکھوں سے بہت خوبصورت کام لیتا تھا۔

1940ء اور 50ء کی دہائی میں ہم سب اداکار ہالی وڈ کے اداکاروں کی فلمیں دیکھا کرتے تھے جن میں گیری کوپر، سپنسر ٹریسی، جیمز اسٹیورٹ، کیری گرانٹ، گریگوری پیک، وغیرہ ہمارے پسندیدہ اداکار تھے۔ جس طرح آج کے اداکار ہماری اداکاری دیکھ کر اثر لیتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں ہم ہالی وڈ کے بڑے اداکاروں سے متاثر ہوا کرتے تھے۔

دلیپ اداکاری میں مجھ سے دو سال سینئر تھا۔ اس کی پہلی فلم بمبئی ٹاکیز کی ''جوار بھاٹا'' تھی، وہ بمبئی میں پالی ہل پر رہتا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات اس کے چھوٹے بھائی ناصر خاں نے کرائی تھی۔

میری پہلی فلم پربھات کی ''ہم ایک ہیں'' تھی۔ راج اس زمانے میں کیدار شرما کا اسسٹنٹ تھا۔ جب ہم تینوں نے شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تو پھر یہ سوال نہیں تھا کہ ہم میں سے زیادہ اچھا اداکار کون ہے؟ اس زمانے میں نمبر ون اور نمبر ٹو کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہمارے درمیان محاذ آرائی اور مقابلہ بازی بھی نہ تھی۔ البتہ کام کے معاملے میں ہم ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ ہم تینوں بہت مصروف تھے۔ ہمارے درمیان ایک دوسرے کی فلمیں چھین لینے کا بھی کوئی سوال نہ تھا کیونکہ ہم تینوں مختلف قسم کے اداکار تھے اور ایک ہی کردار ہم تینوں کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا اس لیے یہ ڈر نہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے حق پر ڈاکا ماریں گے۔

1960ء میں میرے بھائی گولڈی (وجے آنند) نے ایک بار یہ کوشش کی تھی کہ ایک ایسا اسکرپٹ تیار کیا جائے جس میں ہم تینوں ایک ساتھ کام کریں اور ہمارے کردار بھی متوازن ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہم تینوں کے ساتھ برابر انصاف کرے گا۔ مگر یہ منصوبہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ہم تینوں کو کسی ایک فلم میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع کبھی نہ مل سکا۔

ایک بار راج نے مجھ سے اپنی فلم ''سنگم'' میں ایک متوانہی کردار کرنے کے لیے بات چیت کی تھی لیکن ان دنوں میں اپنی ایک فلم میں اتنا مصروف تھا کہ اس کو زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ میں نے دلیپ کے ساتھ مدراس میں ایک فلم ''انسانیت'' میں کام کیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ تجربہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں پُرسکون نہیں تھا۔ دلیپ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ فلم مدراس میں بن رہی تھی اور مجھے مدراس اور بمبئی کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ میں تین وقت پر شوٹنگ کے لیے مدراس پہنچتا تھا اور اپنا کام کرکے واپس آجاتا تھا۔ ڈائریکٹر اور دوسرے ساتھی اداکاروں کے ساتھ مل بیٹھنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اس لیے کچھ مزہ نہیں آیا۔ ایک چمپینزی بھی اس فلم میں تھا جو مناظر میں اداکاروں سے زیادہ توجہ حاصل کرتا رہا۔

جانوروں کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل کام ہے جبکہ جانور بھی چمپنزی ہو۔

میں دلیپ کمار اور راج اکثر ملتے رہتے تھے۔ اداکاروں کی انجمن ''ایکٹرز گلڈ'' اس زمانے میں بہت طاقتور تھی، اس کی تشکیل میں میرا بہت زیادہ حصہ تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا صدر بنادیا گیا۔ ہم سیاست دانوں اور حکمرانوں کے سامنے اداکاروں کے مسائل کی ترجمانی کرتے تھے۔ ہم پارٹیوں میں بھی ملتے رہتے تھے مگر میں ان دونوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنی ڈرنکس سے خوب لطف اندوز

اے آر کاردار

ہوتے تھے جبکہ ان کا ساتھ دینے کے لیے میں ایک دو سے زائد پیگ نہیں لے سکتا تھا اس لیے پیچھے رہ جاتا تھا۔ ہم نئی فلموں کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ سیاست کے علاوہ اپنی ہیروئنوں کے بارے میں بھی بات چیت ہوا کرتی تھی مگر اس سلسلے میں ایک خاص حد سے بڑھ کر ہم اپنی نجی زندگی کے معاملات ڈسکس نہیں کرتے تھے۔ بہت سی پرائیویٹ باتیں ایک دوسرے سے چھپانے والی ہوتی ہیں۔ میرا مطلب آپ سمجھ گئے ہیں نا؟

ہم تینوں میں سب کے بعد دلیپ کی شادی ہوئی۔ سارا ہندوستان اس کی شادی کا منتظر تھا اور کروڑوں لڑکیاں دلوں میں ارمان لیے بیٹھی تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سی ہیروئنیں بھی آس لگائے بیٹھی تھیں مگر دلیپ نے جب اچانک سائرہ بانو سے شادی کا فیصلہ کیا تو سب حیران رہ گئے۔

میں اس شادی میں آخر وقت تک موجود تھا۔ یعنی جب تک دلیپ سہاگ رات کے لیے اپنے کمرے میں نہیں چلا گیا، میں وہیں رہا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب میں نے کلپنا کارتک سے شادی کی تو ہماری شادی میں کوئی بھی نہیں شامل ہوا۔ دراصل ہماری شادی بالکل اچانک اور بہت چپ چاپ ہوگئی تھی۔ ان دنوں ہماری فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' کی شوٹنگ ہورہی تھی۔ جب کھانے کا وقفہ ہوا تو میں اور کلپنا کارتک (جو اس فلم کی ہیروئن تھی) چپکے سے کھسک کر آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں چلے گئے۔ یہاں چند دوستوں کی موجودگی میں ہماری شادی ہوگئی۔ اس سے پہلے میرے بارے میں کچھ اسکینڈلز بھی مشہور ہوئے تھے مگر شوبزنس میں تو ایسا ہوتا ہی ہے اس لیے میں نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ہمیشہ سے شوبزنس کا حصہ سمجھا گیا ہے۔ وہ اداکار یا ایکٹریس ہی کیا جس کا کوئی اسکینڈل تک نہ بنے۔ راج بھی اسکینڈلز کو نظر انداز کردیا کرتا تھا مگر دلیپ اس معاملے میں بہت زیادہ حساس تھا۔ وہ اس قسم کی خبروں سے بہت پریشان ہوجاتا تھا۔

راج اور میں دونوں اپنی فلمیں بھی بناتے تھے۔ بعض اوقات ہم دونوں کی فلمیں بیک وقت ریلیز ہوجاتی تھیں۔ میں نے ایک فلم ''جانی میرا نام'' میں کام کیا تھا، جس کے فلم ساز و ہدایت کار گلشن رائے تھے۔ ان ہی دنوں راج کی فلم ''میرا نام جوکر'' بھی بن رہی تھی مگر اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ میں تو محض ''جانی میرا نام'' میں اداکاری کررہا تھا اور بس۔

دلیپ اپنے کردار بہت سوچ سمجھ کر منتخب کیا کرتا تھا اور درجنوں بلکہ سیکڑوں فلم سازوں سے معذرت کردیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اہم مرکزی کرداروں کے لیے مخصوص ہوکر رہ گیا۔ آج کل وہ پہلی فلم ''کالنگ'' ڈائریکٹ کررہا ہے۔ میرے خیال میں تو اسے اتنی سوجھ بوجھ ہے کہ بہت پہلے ہی اسے ڈائریکٹر بن جانا چاہیے تھا۔ سالہا سال کام کرنے کے بعد ہدایت کاری کا شعور خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ جن دنوں میں ''گائیڈ'' میں کام کررہا تھا اسی وقت میں نے ہدایت کار بننے کی تیاریاں شروع کردی تھیں کیونکہ صرف اداکار کی حیثیت سے میں دوسروں کی کاروباری ضرورتوں پر قربان ہونے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ ڈائریکشن میرے دل کو لگتی تھی کیونکہ اس طرح میں اپنے پسند کی فلمیں بنا سکتا تھا۔ میں ہمیشہ چربہ سازی کے خلاف رہا ہوں۔ ویڈیو دیکھ کر فلمی کہانیاں چوری کرنا بھی میرے نزدیک جرم ہے۔ زندگی میں کہانیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جن سے آپ متاثر ہوکر فلم بنا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار میں نے اخبار میں ایک مشہور کھلاڑی کے قتل کی خبر پڑھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس قتل میں اس کی بیوی اور ایک سیاست داں کا بھی ہاتھ تھا۔ اس خبر سے متاثر ہوکر میں نے فلم ''سوکروڑ'' بنائی تھی۔

جرائم کی کہانیاں مجھے ہمیشہ سے پسند رہی ہیں۔ راج میوزیکل اور رومانی کہانیوں کو ترجیح دیا کرتا تھا۔ نرگس اور راج فلمی دنیا کی معروف رومانی جوڑی بن گئے تھے۔ باکس آفس پر لوگ ان کے دیوانے تھے۔ انہیں اسکرین پر دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اداکاری کررہے ہیں۔ وہ فلم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگار میں پریس کانفرنس

میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ راج کی بیوی کرشنا نے اس پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ دراصل وہ بہت مضبوط عورت ہے جس نے راج کو فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔

یوں تو میں نے بہت سی ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا ہے مگر نوتن، وحیدہ رحمان اور ہیما مالنی کے ساتھ میری فلمیں لوگوں نے بہت زیادہ پسند کیں۔ میرے خیال دلیپ کی جوڑی کامنی کوشل کے ساتھ بہت اچھی تھی۔ چند فلموں میں نرگس اور دلیپ نے بھی بہت اچھی اداکاری کی اور مقبول ہوئے۔

دلیپ کی اداکاری کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں مگر خاص طور پر اس کی فلم ''گنگا جمنا'' میں اس کی اداکاری کے سحر سے میں آج تک باہر نہیں نکل سکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ اس کی بہترین اداکاری کا نمونہ ہے۔ آنے والی نسلوں کے اداکار اسے دیکھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ آج کے سپر اسٹارز کو بھی دلیپ سے سیکھنا چاہیے۔ راج نے بھی ''انداز'' میں بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ محبوب خاں کی ہدایت کاری میں راج نے ایک شوخ اور چلبلے نوجوان کا کردار خوب نبھایا جبکہ دلیپ کا کردار انتہائی ڈرامائی تھا۔ ایک بات اور بتاؤں کہ دلیپ اور راج کی آپس میں جتنی زیادہ اچھی دوستی تھی، اتنی میری ان دونوں سے نہیں تھی۔ وہ بہت گہرے اور بے تکلف دوست تھے۔ وہ دونوں پشاور میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں سے دوست بن گئے تھے۔

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میری بہترین اداکاری کس فلم میں ہے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ ہر اداکار کی اداکاری میں کچھ خامیاں اور خوبیاں ضرور ہوتی ہیں۔ کوئی اداکار یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلاں فلم میں اپنی اداکاری سے پوری طرح مطمئن ہے۔ لیکن جن تین فلموں میں کام کرکے مجھے بہت لطف آیا وہ ہم دونوں، جیول تھیف اور گائیڈ ہیں۔ جب کوئی اداکار کسی کردار میں لطف محسوس کرتا ہے تو فلم بین بھی اس کا مزہ لیتے ہیں۔

میں آخر میں اتنا کہوں گا کہ دلیپ نے، راج نے اور میں نے اپنی زندگی اور کام کے ہر لمحے سے لطف اُٹھایا ہے۔ ہم نے جو بھی کام کیا ہنسی خوشی، دل لگا کر کیا۔ کل کیا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہوتا ہے کہ کل کا دن بھی چمک دار اور خوبصورت ہوگا۔ پُرامید اور خوش فہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں اور انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

دیو آنند نے یہ مضمون 1991ء میں ایک انگریزی اخبار کے میگزین کے لیے لکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت راج کپور وفات پا چکا تھا اور دلیپ کمار نے اپنی فلم ''کالنگا'' کی ہدایت کاری شروع کردی تھی جو دس سال گزرنے کے بعد بھی مکمل نہیں ہوسکی ہے۔ رہا دیو آنند تو آخر تک فلمیں بناتا رہا۔ بہت بعد تک وہ اپنی فلموں میں خود ہی ہیرو کا کردار ادا کرتا تھا مگر پھر اس نے یہ جگہ اپنے بیٹے کے لیے خالی کردی تھی۔ دیو آنند ایک اَن تھک اور پُرامید انسان تھا۔ اس کی زیادہ تر فلمیں فلاپ ہوئی ہیں مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل فلمیں بناتا رہا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلسل فلاپ فلموں کے باوجود اسے سرمایہ لگانے والے ملتے رہے اور آخر تک ملتے رہے۔ اس نے اپنا دل ہمیشہ جوان رکھا۔ نوجوان، حسین اور کم عمر ہیروئنوں کے ساتھ ہیرو کے طور پر کام کرتا رہا۔ کئی خوبصورت اور مشہور ہیروئنیں اسی کی دریافت ہیں۔ وہ ہر فلم میں ایک نئی ہیروئن لیتا تھا۔ یہ بھی ایک قابلِ تعریف بات ہے۔ دیو آنند کا شمار بہت بڑے اداکاروں میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کا بیشتر کام اوسط درجے کا ہے۔

راج کپور نے اداکار کی حیثیت سے اتنی کامیابی اور شہرت حاصل نہیں کی جتنی کہ فلم ساز اور ہدایت کار کے طور پر اس کے حصے میں آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تخیلات کی دنیا میں رہنے والا فنکار تھا۔ رومان اس کا مخصوص موضوع تھا۔ ہدایت کاری کے معاملے میں وہ ہندوستان کے چند بڑے ہدایت کاروں کی صف میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ خواب دیکھنے والا اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والا انسان تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے بہت سے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس نے دولت، شہرت، مقبولیت سبھی کچھ حاصل کیا مگر اس کی لگن اور شوق کی تسکین نہ ہوسکی۔ اس کی صحت نے جواب دے دیا تھا مگر وہ آخر وقت تک فلمیں بنانے کے منصوبے بناتا رہا۔ موسیقی، رومانس اور کامیڈی اس کی فلموں کا لازمی حصہ تھے۔ وہ مزاح کے ساتھ طنز بھی شامل کرلیا کرتا تھا۔ وہ ایک خوبرو اور خوش اطوار آدمی

تھا۔ باتیں بھی اچھی کرتا تھا۔ شہرت اور دولت بھی حاصل تھی۔

اس کی پرستار لڑکیوں کی کمی نہیں تھی مگر اس کی توجہ کا محور ہیروئنیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اوّل و آخر ایک فلم ساز اور ہدایت کار تھا۔ اپنے کام کی دھن میں وہ خود غرض بھی تھا۔ ہر وہ چیز جو اس کی فلم کو بہتر بنا سکتی تھی وہ اس کے پیچھے دوڑتا تھا اور ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لتا منگیشکر، نرگس، وجنتی مالا، وغیرہ سے فلرٹ کرنے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ ان کی مدد اور محبت حاصل کرکے اچھی فلم بنانا چاہتا تھا۔ موسیقی میں اسے بہت زیادہ معلومات تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ اداکار اور ہدایت کار نہ ہوتا تو کامیاب موسیقار ہوتا۔ لتا کے بغیر اچھی موسیقی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے اس نے لتا سے عشق شروع کردیا تھا۔ کافی عرصے تک وہ لتا کو فریب دیتا رہا مگر پھر جب اس پر حقیقت کھلی تو اس نے بھی راج کپور کو خوب تنگ کیا۔ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ راج کپور جیسا عظیم اور نامور فلم ساز و ہدایت کار گانے کی صدابندی کے لیے لتا کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہے مگر وہ معذرت کرکے کار میں بیٹھی اور چلی گئی۔ انتقام کے معاملے میں عورت ناگن بن جاتی ہے۔

نرگس کو بھی راج کپور نے پیار کا جھانسا دے کر دس سال تک خوب استعمال کیا۔ نرگس سے اس نے ہر طرح کے فائدے اُٹھائے۔ نرگس نے اس کی خاطر ہر طرح کی ذلت، رسوائی اور نقصانات برداشت کیے مگر جب اس کو یقین ہوگیا کہ وہ اس کو فریب دیتا رہا ہے تو اس نے منہ پھیر لیا اور پھر راج کپور سے ہر طرح کا رشتہ توڑ لیا۔ مگر درحقیقت وہ نقصان میں رہی۔ فلم ساز، ہدایت کار کی نسبت راج کپور کی پہلی فلم ''آگ'' تھی۔ اس فلم کے لیے اس نے تین ہیروئنوں سے محبت کا ڈراما کرکے مفت میں کام کرالیا تھا۔ یہ فلم تو زیادہ کامیاب نہ ہوسکی مگر ہدایت کار کی حیثیت سے راج کپور کو لوگوں نے تسلیم کرلیا۔

یہ اس کی صلاحیتوں کا ابتدائی نمونہ تھا۔ اس نے 1948ء میں آر کے فلمز کمپنی قائم کی اور نرگس کو اس کے بینر کا ایک حصہ بنالیا۔ نرگس کو اس نے کمپنی میں حصہ دار بنانے کا بھی یقین دلایا تھا اور محبت کے دعوے تو ہزاروں کیے تھے۔ کچھ بھی ہو راج کپور نے بھارتی فلموں میں حسن اور دلکشی کا اضافہ کیا تھا۔ وہ آخر دم تک فلمیں بناتا رہا مگر صحت نے جواب دے دیا تھا۔ اس لیے فلم ''پریم گرنتھ'' کا ہدایت کار اس کا چھوٹا بیٹا راجیو کپور تھا مگر کہانی، موسیقی ہر چیز میں راج کپور کا دخل رہا ہے۔

جونی واکر۔ گرودت

راج کپور نے بھارتی فلمی صنعت میں بہت بڑا نام اور مقام پیدا کرلیا تھا۔ اس کی بعض فلمیں بھی یادگار اور کلاسیکی سمجھی جاتی ہیں۔ برسات، آوارہ، بوٹ پالش، شری چار سو بیس، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، بوبی، پریم روگ، سنگم، رام تیری گنگا میلی، ایسی فلمیں ہیں جو اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

راج کپور خوابوں کا سوداگر تھا۔ وہ خواب دیکھتا تھا، خواب بُنتا تھا اور خواب ہی تعمیر کرتا تھا۔ فلم اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ باقی رہ گئیں ہیروئنیں وغیرہ تو یہ محض کاروباری ضرورتیں تھیں۔ اس نے بہت بڑے پیمانے پر بڑی لاگت سے فلمیں بنانے کا رواج ڈالا۔ اگرچہ اس کا آغاز محبوب خاں نے کیا تھا اور وہ ان سے بہت متاثر تھا۔ اس نے فلموں سے لاکھوں کروڑوں کمائے اور فلموں ہی میں لاکھوں کروڑوں گنوادیے۔ ''بوبی'' سے پہلے اس کی کئی بڑی فلمیں فلاپ ہوگئی تھیں۔ اس کا بال بال قرض میں بندھا ہوا تھا۔ اسٹوڈیو بھی گروی تھا۔ پھر اس نے بوبی بنائی جس میں ہیرو اور ہیروئن بالکل نئے تھے اور یہ ہلکی پھلکی رومانٹک فلم تھی۔ اس فلم نے اس کے سارے قرضے اُتار دیے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک خوابوں کی دنیا کا مسافر تھا۔ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کے باوجود وہ بھارتی فلمی تاریخ میں ایک لافانی نام رہے گا۔ اس کو مرنے کے بعد اعلیٰ ترین ایوارڈ ''بھارت رتن'' دیا گیا تھا۔ اب راج کپور نہیں ہے مگر اس کی فلمیں اور باتیں ہمیشہ رہیں گی۔ اس کی فلم ''آوارہ'' کے ایک گیت کے بول کس قدر حسب حال ہیں۔

ہم نہ رہیں گے
تم نہ رہو گے
پھر بھی رہیں گی نشانیاں۔

ہندوستانی فلمی صنعت جب تک باقی رہے گی اس وقت تک دلیپ کمار کو عظیم ترین اداکار کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ تعصب، عدم رواداری، نظر اندازی خود دلیپ کمار کی کاہلی کے باوجود وہ ایک غیر فانی اداکار ہے۔ ایسا اداکار جسے آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میڈم نور جہاں

کی نسلیں بھی عظیم ترین قرار دیتی ہیں۔

دلیپ کمار اپنی ہی دنیا میں گم رہنے والا انسان ہے۔ اس نے صرف اور صرف اداکاری کو اپنی منزل بنایا اور ایسے نقوش چھوڑے جن کو مٹانا ممکن نہیں..... وہ ایک بے مثال اداکار ہے۔ جس کے نزدیک بھی کوئی دوسرا اداکار نہیں پہنچ سکا ہے۔

وہ بے حد حساس، خوددار اور بے نیاز انسان ہے۔ دولت کی طمع اسے کبھی نہیں رہی۔ ایک زمانہ تھا جب بمبئی کی بڑی بڑی ہیروئنوں سمیت بلا مبالغہ سارے بھارت کی لڑکیاں اس کا دم بھرتی تھیں مگر اس نے خود کو بہت محدود رکھا۔ بے شمار فلم ساز، ہدایت کار، ہیروئنیں اور اداکار اس کے ساتھ کام کرنے کی حسرت لے کر چلے گئے۔ وہ ایسا اداکار تھا جس کی فلم بے شک فلاپ ہو جائے مگر دلیپ کمار کبھی فلاپ نہیں ہوا۔ اس کی ہر پرفارمنس ناقابل فراموش رہی ہے۔

دلیپ کمار صرف ایف اے پاس ہے مگر اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ ہر موضوع پر بلاتکان بول سکتا ہے اور سننے والا مرعوب اور مسحور اس کی شکل دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ہمیشہ ایک طلسمی کشش رہی ہے۔ آج 80 سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ ایک خوبصورت اور جاذب نظر شخصیت ہے۔ اس نے دولت کا بھی لالچ نہیں کیا۔ اسی لیے ایک پُرسکون اور آسودہ زندگی گزارتا ہے۔ وہ کسی سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ وہ اصولوں پر ڈٹ جانے والا پٹھان ہے۔ آج بھی اس کی عظمت کو سب تسلیم کرتے ہیں اور اس کی ایک نگاہ کے منتظر رہتے ہیں۔

دلیپ کمار ایک شائستہ مگر صاف گو انسان ہے۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں ہے نہ ہی مصلحت کی خاطر کسی سے سمجھوتا کرتا ہے۔

محبوب خاں کی مایہ ناز فلم ''آن'' کو بھلا کون بھول سکتا ہے؟ یہ وہ فلم ہے جس میں محبوب نے ایک نہیں کئی ایسے تجربے کیے تھے جن کے بارے میں بھارتی فلم والوں کا خیال تھا کہ محبوب پاگل ہو گیا ہے۔ ''آن'' ایک مقصدی فلم تھی جس میں محبوب صاحب نے آزادی کے جذبات کی نمائندگی کی تھی اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف عوام کی اُبھرتی ہوئی قوت کو نمایاں کیا تھا۔ اس کی کہانی عجیب و غریب تھی جس میں ماضی، حال اور مستقبل سب کو یکجا کر دیا گیا تھا۔

ایک طرف ایک خودمختار ریاست کا والی تھا، سرسبز کھیت اور زرخیز جنگلات تھے جہاں بیل گاڑیاں چلتی تھیں اور بیلوں کی مدد سے کاشت کی جاتی تھی۔ دوسری طرف اسی فلم میں جدید ترین امریکی ماڈل کی کاریں بھی نظر آتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمرانوں کی ملکیت تھیں۔ آن میں محبوب نے انگریزی دور کی ریاستوں کی ایک جھلک پیش کی تھی۔ اس میں حقیقت بھی تھی اور افسانہ بھی۔ بنیادی طور پر یہ ایک کمرشل فلم تھی۔ ایسی فلم جو ہر طبقے کے لوگوں کو پسند آئے لہٰذا اس میں محبوب نے وہ تمام چیزیں اور خوبیاں یکجا کر دی تھیں جو ایک کمرشل فلم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ یہ قدیم وجدید تہذیبوں کا بہت حسین امتزاج تھی۔ اس کی کہانی میں بہت سی سچائیاں تھیں مگر مبالغہ آرائی بھی تھی۔ مثلاً ایک منظر میں فلم کا ہیرو بندوق کی گولی سے ایک ریاستی سپاہی کی ایک مونچھ اُڑا دیتا ہے۔ دوسری گولی چلتی ہے تو اس کی دوسری مونچھ بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے سوا اس کے چہرے پر ہلکی سی خراش تک نہیں ہوتی۔ دیکھا جائے تو یہ حماقت کی انتہا تھی مگر فلم دیکھنے والے اس منظر کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جاتے تھے۔ دراصل محبوب خاں ایک ایسا ہدایت کار تھا جو فلم بینوں کا مزاج اور نبض پہچانتا تھا۔ ''آن'' میں وہ محض کمرشل انداز پیش کرنا چاہتا تھا اس لیے مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی بھی اس میں نظر آتی ہے اور محبوب خان اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔

''آن'' وہ فلم ہے جس نے نہ صرف ہندوستان بھر میں برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں مقبولیت اور کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس فلم کو دیکھ کر ہالی ووڈ والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ الیگزینڈر کوڈرا، سیسل بی ڈی ملز جیسے عظیم فلم ساز بھی محبوب خاں کے اشتراک میں بین الاقوامی فلم بنانے پر آمادہ

ہو گئے۔ افسوس کہ محبوب خاں مسلمان تھا اس لیے اس کی خدمات اور صلاحیتوں کا بھارتی متعصب حکومت اور پریس نے اعتراف نہیں کیا، ورنہ اس نے ایسے کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ اس کا نام بھارتی فلمی صنعت کی تاریخ میں سب سے پہلے درج کرنا چاہیے۔

اب ذرا ''آن'' کے تکنیکی پہلوؤں پر نظر ڈالیے تو محبوب کی خوداعتمادی اور ہنرمندی پر حیرت ہوتی ہے۔ آج بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ محبوب خاں نے اس پوری فلم کو 16 ایم ایم کے کیمرے سے شوٹنگ کی تھی ورنہ اس زمانے میں سینما اسکرین کے لیے 35 ایم ایم پر فلم کی شوٹنگ کی جاتی تھی۔ 16 ایم ایم کا کیمرا دستاویزی فلموں، شادیوں اور دیگر نجی تقریبات کی فلم بندی کے لیے مخصوص تھا۔

محبوب صاحب نے اتنی بڑی کاسٹ اور لاگت کی مکمل فلم کی 16 ایم ایم کیمرے سے شوٹنگ کی اور پھر اس کو 35 ایم ایم پر ''بلواپ'' کر دیا یعنی اس کو بڑے اسکرین کے لیے انلارج کرایا۔ 16 ایم ایم سے 35 ایم ایم پر منتقل کرنا خاصا مشکل کام تھا اس طرح فلم کی عکاسی اور صدابندی کا معیار بگڑ جاتا تھا۔ محبوب کی ہمت دیکھیے کہ اتنی بڑی رنگین فلم 16 ایم ایم پر بنائی اور پھر اس کو لندن کی بہترین لیبارٹری میں لے جا کر 35 ایم ایم پر منتقل کرایا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ یہ تجربہ اس قدر کامیاب رہے گا کہ دیکھنے والوں کو شبہ تک نہ گزرے گا کہ یہ فلم 16 ایم ایم پر بنا کر 35 ایم ایم پر منتقل کی گئی ہے۔ اس میں کیمرا مین فریدون ایرانی کی ہنرمندی اور مہارت کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ ایڈیٹر نے بھی اپنا کمال دکھایا تھا۔ انتہا تو یہ ہے کہ یورپ اور امریکا کے فلم سازوں کو بھی یہ فلم دیکھ کر یقین نہیں آیا تھا کہ 16 ایم ایم پر اس کی شوٹنگ کی گئی ہے اور بعد میں 35 ایم ایم پر منتقل کیا گیا ہے۔

یہ فلم دلچسپ کہانی، بہترین ہدایت کاری، اعلیٰ درجے کی اداکاری، حسین عکاسی اور ایکشن وموسیقی کا نمونہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو ایک یادگار فلم تسلیم کر لیا گیا ہے۔

جنہوں نے آن دیکھی ہے انہیں فلم کی نئی ہیروئن نادرہ بھی ضرور یاد ہوگی۔ اس فلم میں درحقیقت دو ہیروئنیں تھیں۔ ایک نمی جو کہ گاؤں کی الہڑ دوشیزہ تھی اور بچپن ہی سے ہیرو کے ساتھ کھیل کر جوان ہوئی تھی اور اس سے محبت کرتی تھی۔ ہیرو (دلیپ کمار) بھی اس کو پسند کرتا تھا۔ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور شاید پیار بھی کرتا تھا۔ جب یہ معصوم لڑکی راجا کے ظلم کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گئی تو انتقاماً ہیرو نے راجا کی بہن (راجکماری) کو اغوا کر لیا اور اس کو بتایا کہ اس مغرور، خودسر

میڈم نور جہاں اور اعجاز احمد

اور لاڈلی راجکماری کو وہ ایک گاؤں کی لڑکی بنا کر ہی رہے گا۔ راجکماری اور دلیپ کمار کے وہ مناظر بہت دلچسپ اور خوبصورت ہیں جب راجکماری ہیرو سے نفرت کرتی ہے اور اس کو جان سے مار دینے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ مگر اپنے بھائی کے مظالم اور ناانصافیوں اور گاؤں والوں کے مصائب سے آگاہ ہونے کے بعد وہ رفتہ رفتہ پگھل جاتی ہے اور ہیرو کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

راجکماری کا یہ اہم اور مشکل کردار آن میں نادرہ نے ادا کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک گمنام لڑکی تھی، یہ بھی محبوب خاں کی خوداعتمادی کا ثبوت تھا کہ اتنی بڑی اور مہنگی فلم میں دلیپ کمار جیسے مایہ ناز، مقبول اور عظیم اداکار کے مقابلے میں انہوں نے ایک بالکل نئی اور ناتجربہ کار لڑکی کو ہیروئن بنانے کا خطرہ مول لیا۔ اس فلم کی نمائش سے پہلے بھی محبوب خاں کے اس فیصلے کا مذاق اُڑاتے تھے مگر جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو سب مان گئے کہ محبوب کے ہنرمند ہاتھ پتھر کو ہیرا بنا سکتے ہیں۔ محبوب کی جوہرشناس نگاہوں نے نادرہ کا انتخاب کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ نادرہ کے لیے آن کی مغرور راجکماری کا کردار انگوٹھی میں نگینے کی طرح ثابت ہوا۔ اس کردار کے لیے محبوب پہلے نرگس کو کاسٹ کرنا چاہتے تھے مگر نرگس ان دنوں راج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کپور کی محبت کے جال میں گرفتار تھیں اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ نرگس کی صلاحیتوں سے کوئی دوسرا ہدایت کار بھی فائدہ اُٹھائے۔ خاص طور پر اپنے کاروباری رقیب دلیپ کمار کے سامنے وہ نرگس کو کسی قیمت پر بھی ہیروئن نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

راج کپور اور نرگس کی جوڑی اپنی جگہ بہت کامیاب ہوئی تھی مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی کہ دلیپ کمار کے ساتھ نرگس کی تمام فلمیں ناقابلِ فراموش ثابت ہوئی تھیں۔ وہ ''میلہ'' ہو، انداز ہو، جوگن ہو یا دیدار۔ وہ دونوں جب بھی ایک دوسرے کے مقابل رومانی جوڑی کے طور پر پیش کیے گئے، انہوں نے ایک لافانی فلم کو جنم دیا۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ دلیپ کمار نے کسی فلم میں ''نرگس'' کو حاصل نہیں کیا۔ ''انداز'' میں وہ راج کپور کی ہوگئی۔ دیدار میں اسے اشوک کمار لے اُڑا۔ میلہ میں وہ تقدیر کے فیصلے کا شکار ہوکر دلیپ سے جدا ہوگئی۔ جوگن میں وہ ایک جوگن تھی اس لیے اپنے پریمی اور پجاری کو کس طرح مل سکتی تھی۔ ان دونوں کا تعلق دیوی اور پجاری جیسا ہی رہا۔ اس کے مقابلے میں راج کپور نے تقریباً ہر فلم میں نرگس کو حاصل کیا۔ پھر بھی دلیپ کمار کے ساتھ نرگس نے جن فلموں میں کام کیا وہ امر ہوگئیں۔ اور انڈیا کی فلمی صنعت ان کی مثل دوبارہ پیش نہ کرسکی۔

راج کپور نے نرگس کو پوری طرح شیشے میں اُتار لیا تھا۔ اپنی محبت کا اس کو یقین دلا دیا تھا۔ ادھر خود دلیپ کمار کی محبت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ محبت میں ٹھکرائی ہوئی عورت ناگن سے زیادہ خطرناک اور زہریلی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نرگس کو جب راج کپور جیسے خوبصورت اور کامیاب انسان کا سہارا ملا تو وہ دلیپ کمار سے انتقام لینے پر تل گئی۔ یہاں تک کہ اس نے محبوب کا لحاظ بھی نہ کیا جس نے ایک ہائی اسکول کی نوعمر اور گمنام طالبہ کو اپنی فلم ''تقدیر'' میں متعارف کرا کے اس کی تقدیر بدل دی تھی۔

آن میں محبوب کو یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ نرگس کے بغیر بھی ایک بڑی اور کامیاب فلم بنا سکتے ہیں۔ اور یہ انہوں نے ثابت کر دکھایا۔ ایک نوآموز، معمولی شکل وصورت کی گمنام لڑکی کو انہوں نے ایک یادگار کردار بنا دیا۔ اس طرح ''آن'' میں نرگس کی کمی کسی نے بھی محسوس نہیں کی۔

محبوب صاحب کے بارے میں فلمی دنیا میں یہ بات کوئی عار نہ تھی کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ ہر کردار کے لیے موزوں ترین فن کار کا انتخاب کرتے تھے مگر صنفِ نازک ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔

ایک دو کو چھوڑ کر ان کی کوئی ہیروین ایسی نہ تھی جو ان کی تنہائیوں کی ساتھی نہ بنی ہو۔ نرگس کو وہ بے بی کہتے تھے۔ مینا کماری نے ان کی یہ خواہش ٹھکرا دی تھی اس لیے محبوب اور مینا کماری کبھی کسی فلم میں یکجا نہیں ہوئے۔ مدھوبالا کو انہوں نے مینا کماری کی جگہ ''امر'' میں کاسٹ کیا تھا مگر مدھوبالا کے ساتھ دلیپ کمار کا عشق زوروں پر تھا اس لیے وہ ان کی نظرِ کرم سے محفوظ رہی۔ محبوب صاحب کی یہ کمزوری آخری دنوں میں ان کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوئی۔ ''مدر انڈیا'' کی سائڈ ہیروئن انہیں ایسی پسند آئی کہ ''سن آف انڈیا'' میں اس کو فلم کی ہیروئن بنا لیا۔ یہ فلم بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ ان کا لاڈلا چائلڈ اسٹار ساجد اور فلم کی ہیروئن دونوں ہی ناکام ثابت ہوئے تھے۔

نادرہ کے معاملے میں کوئی پابندی یا مجبوری نہ تھی۔ ایک تو محبوب کی اتنی بڑی فلم میں ہیروئن کا کردار مل رہا تھا پھر دلیپ کمار کی ہیروئن بننے کی سعادت حاصل ہو رہی تھی جو کہ بھارت کی ہر ہیروئن کی آرزو تھی۔ اس کے علاوہ نادرہ نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی اس میں ناموس اور عصمت وآبرو جیسی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے نادرہ نے محبوب کی خواہشات پوری کرنے میں کسی پس وپیش سے کام نہ لیا۔

یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ نادرہ ایک یہودن تھی۔ اس کا تعلق مہاراشٹر کے ایک یہودی گھرانے سے تھا۔ اس کا اصلی نام فرہال ایزیکل (Farhal Ezekil) تھا۔ وہ ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ ابھی وہ چار سال کی تھی کہ اس کے والدین میں علیحدگی اور پھر طلاق ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ اس کی ماں نے کسی اور شخص کی محبت میں گرفتار ہوکر شوہر کو چھوڑ دیا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ ایک بیٹے کی پیدائش کے بعد اس کے دوسرے شوہر نے بھی اسے چھوڑ دیا اور پھر وہ ساری زندگی کٹی پتنگ کی طرح تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی۔ فرہال کو اس کی نانی نے پالا تھا۔ یہاں تک کہ جب دوسرے شوہر نے بچے کی پیدائش کے بعد فرہال کی ماں کو چھوڑ دیا تو وہ یعنی فرہال کا سوتیلا بھائی بھی نانا نانی کے پاس ہی آ گیا۔ اس طرح نادرہ اور اس کے سوتیلے بھائی کو ان کے نانا نانی نے پال پوس کر جوان کیا تھا۔

نادرہ کی ماں نے دوسرے شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد رائل انڈین ائرفورس میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ نانا نانی کے مرنے کے بعد نادرہ اور اس کا سوتیلا بھائی ماں کے پاس چلے گئے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد نادرہ کی

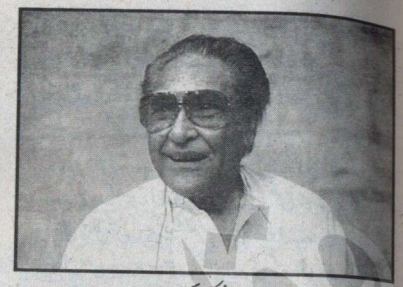

اشوک کمار

ماں کو یہ نوکری چھوڑنی پڑی تو خاندان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی نادرہ کی ماں کسی نہ کسی طرح بیٹے اور بیٹی کی پرورش کرتی رہی۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک آزاد خیال عورت تھی۔ اس ماحول میں نادرہ نے آنکھ کھولی اور جوانی کے آنگن میں قدم رکھا تو اس کو بھی آزادی کی زندگی سے ہی وابستہ کیا تھا۔

ماں نے اس کو سینٹ انتھونی کونوینٹ میں تعلیم دلوائی تھی۔ نادرہ ایک اچھی طالبہ تھی۔ یہودن ہونے کے باوجود کونوینٹ میں پڑھ کر وہ کرسچین خیالات اور ماحول سے متاثر ہوگئی یعنی کریلا اور پھر نیم چڑھا۔

کونوینٹ کے زمانے میں نادرہ نے صرف دو فلمیں دیکھی تھیں۔ مرزا صاحباں اور لیلیٰ مجنوں۔ اس کی ماں اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کرتی تھی۔ نادرہ نے طالب علمی کے زمانے میں کبھی تصویر نہیں بنوائی تھی۔ ماں نے تعلیم کے معاملے میں اپنے بچوں کو کسی طرح کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ نادرہ ایک اچھی طالبہ تھی۔

نادرہ اسکول کی کافی مقبول تھی۔ خاص طور پر لڑکوں کے حلقے میں اسے زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل تھی۔ نوجوانی کی عمر میں داخل ہوتے ہی اس کی لڑکوں سے دوستی شروع ہوگئی تھی جو اس ماحول میں اور خود اس کی ماں کی نظر میں بھی کوئی بُری بات نہ تھی۔ اسکول کے زمانے میں اس نے ایک ڈرامے میں کنواری مریم کا کردار کیا تھا۔ اسے اداکاری کا کوئی شوق نہ تھا لیکن ہوا یہ کہ ڈرامے میں مریم کا کردار کرنے والی لڑکی کسی وجہ سے عین وقت پر نہ آسکی تو مجبوراً قرعۂ فال فرہال یعنی نادرہ کے نام نکلا۔ اس ڈرامے میں اس کی اداکاری واجبی سی تھی یعنی اس تجربے کے بعد بھی اس کا اداکارہ بننے کا واقعی ارادہ نہ تھا۔

اس نے اپنا سینئر کیمبرج کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تو ماں کو اس کی نوکری کی فکر ہوئی۔ کرسچن اور

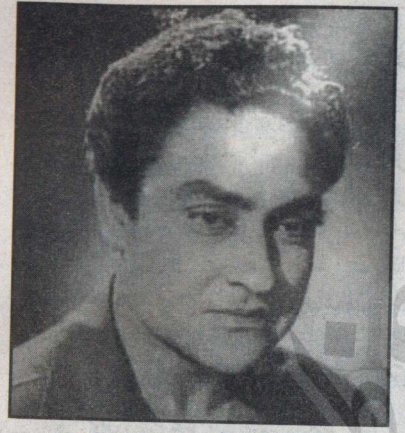

اشوک کمار

یہودی خاندانوں کی لڑکیوں کی اس زمانے میں دفاتر میں بہت مانگ تھی کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ آزاد خیال بھی ہوتی تھیں اور اپنے مالکوں کا دل بہلانے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

بعض اوقات تقدیر بھی لوگوں کے لیے غیر متوقع مواقع پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا ہی ایک موقع فرہال کی زندگی میں بھی آیا جس سے اس نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ ایک روز بارش سے بچنے کے لیے وہ ایک عمارت میں چلی گئی جہاں اس پر محبوب خاں کی بیگم سردار اختر کی نظر پڑ گئی۔ سردار اختر کو یہ پانی میں بھیگی ہوئی متناسب جسم کی لڑکی پسند آ گئی۔ اس کا لباس اور بے باکانہ انداز دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ اسے محبوب خاں سے ملایا جائے جو ان دنوں ''آن'' کے لیے ایک ہیروئن کی تلاش میں تھے۔ نرگس نے وقت نہ ہونے کے عذر پر ان کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بمبئی کی ہر بڑی ہیروئن محبوب خان کی فلم میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کی آرزومند تھی مگر محبوب کو جس قسم کی لڑکی کی تلاش تھی وہ اس کو پانے میں ناکام رہے تھے۔

نادرہ نے تو پچھلے دنوں ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ اسے ہندی فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ اس کی ماں کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی اچھے لڑکے سے اس کی شادی کر دی جائے مگر سردار اختر کی سفارش پر جب محبوب صاحب نے اس کو دیکھا تو اپنے مطلوبہ کردار کے لیے پسند کر لیا۔ نادرہ کے بہ قول اس کی ماں نے بہت معذرت کی اور یہ بھی کہا کہ لڑکی ابھی نوعمر ہے اور اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی ہے مگر محبوب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخران کی بات مانتے ہی بنی۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سردار اختر اس بھیگی ہوئی لڑکی کو اپنے ہمراہ کار میں بٹھا کر گھر لے گئیں اور محبوب سے ملوایا۔ محبوب خاں اس کی بے باکی اور آزاد خیالی کے علاوہ اس کے جسمانی تناسب سے بھی متاثر ہوئے۔ نادرہ نے بھی انہیں رجھانے کے لیے سارے داؤ آزما لیے۔ اس طرح اس کو آن کے لیے سائن کرلیا گیا۔ اس کا فلمی نام نادرہ رکھا گیا۔ معاہدے پر اس کی طرف سے اس کی ماں نے دستخط کیے تھے کیونکہ نادرہ اس وقت تک اٹھارہ سال کی بالغ لڑکی نہیں تھی۔ معاہدے کے مطابق نادرہ کو بارہ سو روپے مہینا تنخواہ ملتی تھی جو اس زمانے کے حساب سے بہت بڑی رقم تھی۔

نادرہ کو فلموں کے قابل بنانے میں مسز محبوب خاں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے نادرہ کو لباس پہننا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور محفلوں میں آنے جانے کے طریقے بتائے اور اس کی تربیت کی۔ بعد میں اسے فلم اداکاری کی تکنیک سے آگاہ کیا گیا۔ شہسواری سکھائی گئی۔ اس فلم میں اس کو رقص کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر ایک راجکماری کی آن بان اور طور طریقے سکھائے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس کو سائن کرنے کے بعد محبوب خاں اس کو تین ماہ تک تنخواہ ادا کرنا ہی بھول گئے۔ تین ماہ بعد بھی جب انہوں نے اس کو اسی پرانے لباس میں دیکھا تو کہا کہ تم اچھا لباس پہنا کرو۔

نادرہ کی ماں نے دبی زبان میں انہیں بتایا کہ اسے تین ماہ سے تنخواہ نہیں ملی ہے۔ محبوب خاں نے فوراً اپنی جیب سے چار ہزار روپے نکال کر اس کو دیے جن سے اس نے لباس، جوتے، کچھ زیورات اور گھر کے لیے فرنیچر خریدا۔ اس روز ان کے گھر میں عید ہوگئی تھی کیونکہ اس گھر کے لوگوں نے کبھی چار ہزار کی رقم ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔

محبوب خاں نے اس کو بتایا کہ اس کو مغرور نظر آنا چاہیے۔ وہ ہر ایک کو گھور کر غصے سے دیکھے اور اپنی بھنوئیں چڑھا کر بات کرے۔ نادرہ نے ان کے مشورے پر پوری طرح عمل کیا۔ اس نے بتایا کہ سارے دن لوگوں کو گھورنے کی وجہ سے میری آنکھوں میں درد ہونے لگتا تھا۔ آج محبوب خاں کی تکنیک بُری لگتی ہے مگر اس زمانے میں اداکاری کا یہی انداز تھا۔

انڈیا کا نمبر ون اسٹار دلیپ کمار اس کے مقابلے میں ہیرو تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل کام تھا مگر دلیپ نے اس کے ساتھ نرمی اور رواداری کا برتاؤ کیا اور مشورے بھی دیے۔ شوٹنگ کے ابتدائی چھ دنوں میں وہ عام طور پر اس کے ساتھ انگریزی میں بات کرتا تھا جو اتنے اونچے درجے کی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دلیپ کمار ویسے بھی عالمانہ باتیں کرنے کا عادی ہے۔

نادرہ کا کہنا ہے کہ وہ مجھ سے صرف ضروری بات ہی کرتا تھا اور بے حد مختصر۔ ابتدائی دنوں میں میں بہت مرعوب اور سہمی سہمی رہتی تھی۔ بہت مختصر باتوں کا جواب دیتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی بہت سی باتیں میری سمجھ ہی میں نہیں آتی تھیں۔ بس میں سر ہلا کر یس سر، یس سر کہتی رہتی تھی۔ وہ بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنے کا عادی تھا جو بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

ساتویں دن وہ مجھ سے مخاطب تھا کہ اچانک انگریزی میں کہنے لگا ”نادرہ، تم انتہائی Despicable لڑکی ہو۔ میں نے ایسی لڑکی پہلے نہیں دیکھی۔“

میں اس لفظ کے مطلب تو نہیں سمجھی مگر مسکرا کر شکریہ ادا کردیا۔ میں سمجھی کہ وہ میری تعریف کررہے ہیں۔ گھر جا کر میں نے ڈکشنری دیکھی تو اس لفظ کے معنی جان کر غصے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ اس فقرے کا مطلب یہ تھا کہ تم انتہائی کمینی لڑکی ہو۔ اتنی گھٹیا اور پست ذہنیت کی لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“

اس فقرے کا مطلب جان کر مجھے بے حد غصہ آیا لیکن اس کے بعد میں نے کبھی بلاضرورت دلیپ صاحب سے بات نہیں کی۔ ان کا یوں بھی بہت رعب تھا۔ بلاضرورت اور بلاوجہ ہرکوئی انہیں مخاطب نہیں کرتا تھا۔ (یہ 50-1949ء کا تذکرہ۔ آج دلیپ کمار کی شخصیت کا جو رعب ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے)

اس کے بعد ہمارا آمنا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔ شوٹنگ کے علاوہ ہمارے مابین کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ آج بھی جب ہمارا کبھی سامنا ہوتا ہے تو وہ مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہیں اور کبھی کوئی مذاق بھی کرتے ہیں مگر میں ان کا وہ فقرہ آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔

آن کی نمائش کے بعد یہ سپرہٹ فلم ثابت ہوئی جس نے سب سے زیادہ فائدہ نادرہ کو پہنچایا۔ وہ اچانک فرش سے عرش پر پہنچ گئی اور ہر طرف اس کا چرچا ہوگیا۔ لوگ کہتے تھے کہ محبوب کی نظرِ کرم ہو تو کوئی لڑکی اسٹار کیسے نہ بنے؟

ایک انگریزی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ آن نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ اس نے یہ بھی تسلیم

کیا کہ وہ محبوب کی دلبستگی کا سامان فراہم کرتی رہی مگر فلم کی نمائش کے بعد اس کے پرستاروں اور مداحوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ دلیپ کمار اور محبوب کے ساتھ اسے دوبارہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا مگر پہلے لمس نے ہی اسے کندن بنا دیا تھا۔ ہر جگہ اس کی آؤ بھگت اور پذیرائی ہوتی تھی۔ بڑے بڑے فلم ساز اور اداکار اس کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ مشہور شاعر نخشب بھی اس پر مرمٹے اور اس کی تعریف میں اشعار لکھے۔ نخشب کی چکنی چپڑی باتوں اور شاعری کے سحر میں وہ ایسی گرفتار ہوئی کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

دراصل نخشب ایک موقع پرست انسان تھا۔ اس نے ایک فلم ”نغمہ“ بنانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اشوک کمار اس میں ہیرو تھے۔ نادرہ کو ہیروئن بنایا گیا۔ اس فلم کی موسیقی ناشاد نے بنائی تھی جو بعد میں پاکستان آکر بہت مشہور اور کامیاب موسیقار بنے۔

نخشب سے شادی پر اس کی ماں سخت ناراض ہوئی کیونکہ نخشب کی باتوں میں آکر اس نے محبوب خاں کے ساتھ تین سالہ معاہدہ ختم کردیا تھا۔ اس نے نخشب کی دو فلموں ”نغمہ“ اور ”رفتار“ میں کام کیا۔ نغمہ تو سپرہٹ ہوئی تھی مگر رفتار زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔

نادرہ نے بتایا کہ شادی کے بعد نخشب نے اس پر بہت پابندیاں عائد کردی تھیں۔ اسے پردہ کرنے اور برقع پہننے پر مجبور کردیا تھا لیکن خود اپنی فلموں میں اس نے نادرہ کو بہت سیکسی انداز میں پیش کیا اور فلم کے پوسٹروں کے لیے اس کے نیم عریاں اور ہیجان خیز پوز بنوائے۔

رفتار فلاپ ہونے کے بعد نادرہ نخشب کے دل سے اُتر گئی یہاں تک کہ اس نے یہ بیان دے دیا کہ میں نے نادرہ سے کبھی شادی نہیں کی تھی۔ ہم دونوں دوستوں کی طرح ساتھ رہتے تھے۔ نادرہ کا بیان ہے کہ جھگڑے اتنے بڑھے کہ ایک دن وہ اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر ایک سوٹ کیس کے ساتھ نخشب کے گھر سے نکل آئی۔

دراصل نخشب کے ساتھ رہنا نادرہ کی مجبوری تھی۔ آن میں اس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی مگر اس کو کریڈٹ نہیں مل سکا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ محبوب خاں کی جادوگری کا کمال تھا۔ نادرہ کی اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ نغمہ کی کامیابی بھی اسے مستند ہیروئن نہ بنا سکی۔ صورت شکل کے اعتبار سے وہ معمولی تھی۔ عام خیال یہی تھا کہ وہ ویمپ کے کرداروں کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس کا چہرہ مہرہ، انداز بھی کچھ ویمپ کی طرح تھے۔

اس زمانے میں بھرے بھرے جسم کی ہیروئنیں پسند کی جاتی تھیں جبکہ نادرہ دبلی پتلی تھی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے لوگوں کے مشورے پر اس نے بیئر پینی شروع کردی اور وزن بڑھانے والی خوراک استعمال کرنے لگی۔

راج کپور نے اس کو شری چار سوبیس میں ایک سائڈ رول کے لیے منتخب کیا۔ یہ ایک ویمپ جیسا کردار تھا۔ اس میں وہ شراب نوشی کرنے والی ایک رقاصہ تھی جس کے ہونٹوں سے ہر وقت سگریٹ لٹکی رہتی تھی جو رقص اور جسم کی کشش کی مدد سے ہیرو کو لبھانے کی کوشش کرتی ہے۔

شری چار سوبیس کی نمائش کے بعد وہ ایک کامیاب ویمپ بن گئی۔ راج کپور کی ہدایت کاری نے اس کو بہت مدد دی تھی۔ اس نے ڈانس بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کا ایک رقص ”مڑمڑ کے نہ دیکھ مڑمڑ کے“ اتنا پسند کیا گیا کہ لوگ اسکرین پر سکے پھینکتے تھے۔

اس فلم کے بعد ویمپ کی حیثیت سے اس کی مانگ ہوگئی اور فلم ساز اس پر ٹوٹ پڑے۔ اسے ہیجان انگیز کردار دیے جانے لگے جن میں وہ جدید ترین انداز کی ساڑھیاں اور مختصر ترین بلاؤز پہنتی تھی تاکہ اس کے جسم کی نمائش ہوسکے۔ اس نے ہیروئن بننے کے شوق میں ویمپ کے کئی کردار مسترد کردیے مگر بعد میں اس رویے پر بہت پشیمان ہونا پڑا۔

اس کی نئی شخصیت کی بدولت دولت مند اس کے گرد منڈلانے لگے۔ بمبئی میں اس کی ملاقات ایک عرب شیخ سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک ریاست کا مالک ہے اور بے حد دولت مند ہے۔

وہ اپنا سب کچھ نادرہ کے قدموں میں لٹانے کے لیے تیار تھا۔ وہ صورت شکل کا بھی اچھا تھا اگرچہ عیاش تھا مگر نادرہ نے سوچا کہ دولت مند تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دولت اور عیش وعشرت کے لالچ میں آکر اس نے اس عرب سے شادی کرلی مگر چند روز بعد ہی اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اس کے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ وہ شخص معمولی حیثیت کا مالک تھا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہفتے بعد ہی طلاق ہوگئی۔ اس سے طلاق حاصل کرنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ بڑی مشکل سے نادرہ اس سے طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اس کے بعد وہ ایک بار پھر ناکامی اور مایوسی کا شکار ہوگئی۔ وہ سب سے الگ تھلگ کمرا بند کرکے روتی رہتی تھی۔ اس نے جس شاندار زندگی کا خواب دیکھا تھا وہ محض خواب ہی تھا۔ کئی بار وہ شوٹنگ کے لیے جاتی تو سوجی ہوئی آنکھوں اور مضمحل چہرے کی وجہ سے شوٹنگ ملتوی کردی جاتی۔ ہر ایک نے اس کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشورہ دیا کہ وہ اپنے شوہر سے صلح کر لے مگر یہ حقیقت اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی کہ وہ ایک کنگال آدمی ہے۔

نادرہ نے کہا ''میں ایک گھریلو گھردار عورت بن کر زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ معاشرے میں میری عزت ہو اور میں سکون کی زندگی بسر کروں، میں ایک بیوی اور ماں کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتی تھی مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔ مجبوراً وہ دوبارہ ویمپ کے کرداروں میں جلوہ گر ہونے لگی۔ آخر کسی طور زندہ تو رہنا ہی تھا۔ وہ بُری، ظالم عورت کے کردار کرنے لگی اور ایسی کئی فلمیں کامیاب بھی ہوئیں۔ وہ ایک آوارہ پتنگ کی طرح فلمی صنعت میں اُڑتی پھری۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ پتنگ لوٹنے کے شوقین تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی زندگی سے سمجھوتا کر لیا۔ فلم ''موتی'' میں اس کا کردار بے حد سراہا گیا اور اسے پندرہ ایوارڈ بھی ملے۔ اب اس کے پاس دولت بھی تھی اور شہرت بھی۔ وہ آرام دہ زندگی بسر کرنے لگی تھی بلکہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔

اب وہ ایک پُرکشش اور بھرپور عورت تھی۔ فلموں کے آوارہ کرداروں نے اس کی مانگ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ شوقین مزاج لوگ اس کے اشارے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ وہ پارٹیوں کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ایسی ہی ایک پارٹی میں اس نے کروڑ پتی صنعت کار جے آر ڈی ٹاٹا سے کہا کہ اس کی مرسیڈیز بینز کار اسے پسند آ گئی ہے تو ٹاٹا نے دوسرے ہی دن ڈرائیور کے ہاتھ اپنی قیمتی کار اس کے فلیٹ پر پہنچا دی۔ یہ سب کچھ تھا مگر وہ حقیقی سکون اور خوشی سے محروم تھی۔ انسان کو دنیا میں سبھی کچھ تو حاصل نہیں ہو جاتا۔

اس اثنا میں اس کے ماں باپ اس کے پاس ہی آ کر رہنے لگے تھے حالانکہ وہ ایک دوسرے کو طلاق دے چکے تھے مگر نادرہ کے لیے تو وہ دونوں ماں باپ ہی تھے۔ وہ بیمار تھے، بوڑھے اور توجہ کے محتاج تھے۔ نادرہ نے انہیں اپنے گھر میں رکھا اور ان کی بہت خدمت کی۔ جب دولت آئی تو رشتے دار بھی آنے لگے۔ ایک زمانے میں اس کے سولہ رشتے دار مستقل طور پر اس کے گھر میں رہتے تھے۔

رفتہ رفتہ عروج اور جوانی کا دور ختم ہو گیا۔ ماں باپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پیسا پاس نہ رہا تو رشتے دار بھی رخصت ہو گئے۔ اب اس کی عمر ستر سال کے قریب ہے، وہ اکیلی اور بے سہارا ہے۔ اس کو سہارے اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے مگر ایسا کون ہے جو اس کے کام آئے؟ وہ بالکل اکیلی رہتی ہے۔ وہ شادیوں اور افیئرز کے باوجود اولاد سے محروم رہی۔

اس کے سوتیلے بھائی اسرائیل میں رہتے ہیں اور خوش حال ہیں مگر وہ نادرہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ وہ کہتی ہے ''میں نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور جوان کیا ہے مگر اب وہ میری خبر تک نہیں لیتے۔''

نادرہ نے ڈھائی سو سے زیادہ فلموں میں کام کیا ہے اور اب وہ پیسا خرچ کرنے کا سلیقہ سیکھ گئی ہے۔ وہ آرام سے رہتی ہے۔ اچھا کھاتی اور پہنتی ہے۔ شاید اسی لیے بہت سے فلم ساز یہ سمجھ کر اسے کاسٹ نہیں کرتے کہ اس کو پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔

جب سے ٹی وی کا دور آیا ہے، نادرہ جیسی فن کاروں کو بھی نئی زندگی مل گئی ہے۔ وہ ٹی وی سیریل میں کام کر کے معقول پیسے کما لیتی ہے۔ اس کی پُرانے دنوں کی چند اداکار سہیلیاں ہیں جن سے وہ ملتی رہتی ہے۔ اسے مطالعے کا بھی شوق ہے۔ وہ انگریزی کے ناول پڑھتی ہے اور سوچتی ہے کہ اگر وہ پہلے انگریزی سے بہ خوبی واقف ہوتی تو دلیپ کمار کے فقرے کا مطلب سمجھنے کے لیے ڈکشنری سے مدد نہ لیتی۔ وہ سابق امریکی صدر نکسن کی پرستار ہے۔ اس کہنا ہے کہ واٹر گیٹ اسکینڈل کے باوجود وہ امریکا کا عظیم ترین صدر تھا۔

ٹی وی کے فلم سازوں کی بدنظمی سے وہ بہت شاکی ہے جو پیشہ ورانہ انداز میں کام نہیں کرتے۔ اس نے اپنے زمانے کے بہترین اور نامور فلم سازوں کے ساتھ کام کیا ہے اس لیے وہ زمانہ آج تک نہیں بھول پائی ہے۔ وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو وہ پسند نہیں کرتی۔

اس نے صحافی سے کہا ''دیکھیے، نو بج گئے مگر میری ملازمہ ابھی تک نہیں آئی۔ ان لوگوں کو کب عقل آئے گی؟''

اسے ٹی وی اسکرپٹ بھی پسند نہیں آتے مگر کام تو کرنا ہے۔ ان کی بدولت اسے معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ محبوب خاں اور مسز محبوب کی وہ آج بھی تعریف کرتی ہے جن کے طفیل اسے نئی زندگی ملی تھی۔

اس سے پوچھا گیا ''اور دلیپ صاحب؟''

وہ ایک لمحہ خاموش رہی پھر زیرِ لب مسکرا کر بولی ''دلیپ صاحب کی کیا بات ہے۔ اس دنیا میں دوسرا دلیپ کہاں سے آئے گا؟''

''مگر ان کا وہ فقرہ.....'' وہ بولی ''ہو سکتا ہے انہوں نے مذاق میں ایسا کہا ہو مگر ان کا یہ کہنا بھی کسی کے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں ہے۔''

جاری ہے

گھنے جنگلوں کے شب و روز کی روداد.....قصۂ بیداد

مختار آزاد

سینگ چور

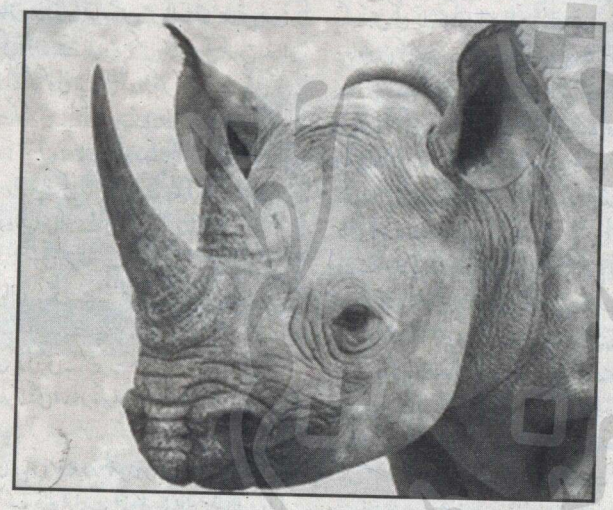

جنگل کی ایک اپنی دنیا ہے۔ جہاں جرائم بھی نرالے انداز کے ہوتے ہیں۔ وہ قانون نافذ کرنے کے لیے جنگل جنگل پھرتے تھے اور سینگ چور اپنا فن آزمانے کی خاطر نت نئے طریقہ آزماتے تھے۔ قانون شکن اور قانون پرستوں کے درمیان رسہ کشی کا دلچسپ احوال قصّہ مآل۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ رینجرز کیمپ میں بیٹھے تھے۔ ڈیمن مینڈر کچھ دیر پہلے ہی سارا دن نئے بھرتی کیے گئے فاریسٹ رینجرز کو تربیت دینے کے بعد واپس پلٹا تھا۔ اُس وقت وہ مشرقی زمبابوے کے نیکا ویلنگو جنگل میں کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ چہار سُو سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اچانک جنگل میں فائر کی زوردار آواز گونجی۔ آواز کی شدت بتا رہی تھی کہ فائر کہیں قریب میں ہی ہوا ہے۔ وہ چونک گیا۔ گولی کی آواز سنتے ہی اس کا ذہن فوراً ہاتھی اور اس کے دو سال کے بچھڑے کی طرف گیا۔ وہ مادہ گینڈا ایک بار پھر بچے کو جنم دینے والی تھی۔

ڈیمن نیکا ویلنگو جنگل کے تمام گینڈوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی اپنے خاندان کے کسی فرد کو جانتا ہے۔ اُس روز دوپہر کو ڈیمن کے ایک رینجر نے بتایا تھا کہ اس نے جھاڑیوں کی طرف کسی اجنبی شخص کے پاؤں کے نشانات دیکھے تھے۔ یہ سنتے ہی اس کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ رینجر نے جن جھاڑیوں کی بات کی تھی وہاں معدومی کے خطرے سے دوچار گینڈے کی مادہ باستا اپنے نئے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بچے کے جنم تک وہ انہی جھاڑیوں میں رہنے والی تھی۔ ویسے بھی اسے بہت تھوڑا وقت ہی جھاڑیوں میں گزارنا تھا۔ جب گینڈے کا کوئی بچہ جنگل کی دنیا میں آتا ہے تو ڈیمن کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ اس جانور کی بقا کو لاحق خطرات سے آگاہ تھا۔ جنگل میں کیمپ کے سامنے جلتے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ڈیمن نے جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گولی کی آواز سنی تو اس کی تشویش کا رخ باستا کی طرف مڑنا قدرتی امر تھا۔ اسے اجنبی انسان کے پاؤں کے نشانات والی بات یاد آ گئی تھی۔

ڈیمن مضبوط ہاتھ پیروں والا لمبا تڑنگا شخص تھا۔ وہ اس ملازمت سے پہلے آسٹریلیا کی اسپیشل فورس کا کمانڈو اور خصوصی نشانہ باز تھا اور عراق میں بھی جنگ لڑ چکا تھا۔ اس کے چوڑے بازو پر ٹیٹو بنا تھا، جس میں لکھا تھا 'تلاش کرو اور مارو'۔ گولی کی آواز سنتے ہی وہ چوکس کمانڈو کی طرح اٹھا اور اندازہ لگانے لگا کہ گولی چلنے کی آواز کس سمت سے آئی تھی۔ جنگل میں رات کو گولی چلے تو اس کے ارتعاش سے فوراً درست سمت کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے مگر وہ سابق فوجی کمانڈو تھا۔ اپنے تجربے اور تربیت کی بنا پر وہ بہت جلد آواز کی سمت کا پتا چلا سکتا تھا اور وہ ایسا ہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وہاں... مشرقی سرحد کے قریب۔'' اس نے چلّا کر کہا۔ ''گولی وہاں... چلی ہے۔'' لمحہ بھر میں وہ درست سمت کا تعین کر چکا تھا۔ ''آواز سے پتا چلتا ہے کہ وہ اعشاریہ ڈبل ٹو تھری رائفل کی گولی تھی۔'' حیرت انگیز طور پر اس نے آواز سے گولی کے کلیبر کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔ ''چلو... جلدی کرو۔'' ڈیمن نے حکم دیا۔

یہ سنتے ہی وہاں موجود رینجر بینز کا ہاتھ اپنی رائفل کی طرف بڑھا۔ ایک نے فرسٹ ایڈ کا سامان سنبھالا۔ واکی ٹاکی اور وائرلیس سیٹ اٹھاتے ہوئے وہ اپنی اپنی لینڈ کروزر کی طرف دوڑ پڑے کہ گینڈے پر حملہ آور شکاری کو پکڑا جا سکے۔ ڈیمن کو یقین تھا کہ حملہ آور کا نشانہ باستا تھی۔

ڈیمن نے ٹیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ دوسری سمت گئے۔ وہ بینز کو ساتھ لے کر باستا والے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ جنگل پر سناٹا طاری تھا۔ اُس کی گاڑی کے شیشے اُترے ہوئے تھے۔ بینز کے کان کسی ممکنہ آواز پر لگے تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ پھر فائر ہو سکتا ہے۔ ڈیمن کی گاڑی چلاتے ہوئے پوری توجہ ممکنہ گولی چلنے کی آواز پر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رات کے سناٹے میں شکاری اپنا کام کر کے اس کے ہاتھ سے بچ نکلے۔ وہ باستا تھی یا کوئی اور گینڈا... ڈیمن نہ شکاری کو چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ ہی گینڈے کو نقصان پہنچے دینا چاہتا تھا۔ ویسے جو کچھ ہوا، وہ ڈیمن کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ جنگل اور گینڈے کے شکاریوں کی عادت جانتا تھا۔ وہ وقت ان کے لیے سازگار تھا۔

چاندنی راتیں نیکا و ینگو سمیت کئی اور جنگلوں میں گینڈے کے شکار کے لیے مناسب وقت سمجھا جاتا ہے۔ وہ شام ویسے بھی خطرناک تھی۔ دو روز سے جنگل میں ہوا بالکل بند تھی۔ ایک پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ بدترین حبس تھا۔ دوپہر کو جب رینجر نے قدموں کے نشانات کی بات کہی تھی، تب سے ڈیمن اس لمحے کے لیے تیار تھا۔ چاندنی راتیں، شدید حبس اور سنسان جنگل... ایسے میں گینڈے کے شکاریوں کے مددگار سرگرم ہو جاتے ہیں۔ وہ دن کے وقت جنگل میں گھوم پھر کر اُس کی پناہ گاہوں کا پتا چلاتے ہیں اور پھر شکاری اپنے معاونوں کی مدد سے رات کی تاریکی میں جدید ترین رائفل سے گینڈے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ حملہ آور شوقیہ شکاری نہیں، ان کا نشانہ گینڈے کے نہایت حساس سینگ ہوتے ہیں۔ ان کی جدید اور رات کے اندھیرے میں درست ترین نشانہ لگانے والی رائفل سے نکلی ایک گولی ہی شکار کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ جانور کے گرتے ہی وہ اس کے سینگ پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ گینڈوں کے بالعموم ایک یا دو سینگ ہوتے ہیں، جو اس کے چہرے پر عین ناک کے اوپر ہوتے ہیں۔ نشانہ باز اس کے سر کو ہی نشانہ بناتے ہیں۔ جسم کے نازک ترین حصے پر لگی گولی منٹوں میں اُسے موت کے منہ میں پہنچا دیتی ہے اور شکاری کا کام بھی فوراً ہو جاتا ہے۔ شکاری اور ان کے مددگار جنگل سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ گولی چلنے کے بعد بہت کم وقت بچتا ہے ورنہ فارسٹ رینجر زسر پہ پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے بہت تھوڑے وقت میں وہ نہایت مشاقی سے کام انجام دے کر بچ نکلتے ہیں۔ اُن کے بچ نکلنے کے بعد جو کچھ بچتا ہے، وہ ہے مردہ گینڈا، جسے وہ گیدڑوں اور گدھوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ گینڈے کا شکار کرنے والوں کا سب سے بڑا ہدف اُس کے سینگ ہوتے ہیں جس کی بہت اچھی قیمت ملتی ہے۔ زیادہ تر صرف سینگ کے لیے اس جانور کا شکار کرتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو سینگ کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھیں بھی نکال کر لے جاتے ہیں۔ جادو ٹونے کی سرزمین افریقا میں گینڈے کی آنکھ نہایت مہنگے عمل میں استعمال ہوتی ہے۔ زمبابوے اور افریقا کے کئی ممالک میں کالے جادو کو 'مٹی' کہا جاتا ہے۔ کالے جادو کے عاملین کے لیے گینڈے کی آنکھیں بہت ہی قیمتی ہیں، جنہیں وہ بھاری قیمت پر خرید لیتے ہیں۔

اُس رات بھی صرف ایک گولی چلی تھی۔ اُس کے بعد مکمل سناٹا طاری تھا۔ وہ چوکنے انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رائفل پر بینز کی گرفت مضبوط تھی۔ بولٹ ہٹے ہوئے تھے اور انگلیاں ٹریگر پر تھیں۔

گینڈے کے سینگوں اور آنکھوں کے شکاری نہایت خطرناک جرائم پیشہ ہیں۔ وہ گروہ کی شکل میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے فارسٹ رینجرز کو بھی نشانہ بنا چکے تھے۔ ڈیمن، نیکا و ینگو جنگل کا انچارج تھا۔ رینجرز کی تربیت کی ذمے داری بھی اُس پر عائد ہوتی تھی۔ جب سے گولی چلی تھی، وہ جنگل میں اس طرح آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے کوئی فوجی کمانڈو اپنی مختصر سی پلٹن کے ساتھ محاذ جس پر اسے کسی بھی لمحے دشمن کا سامنا ہونے کا یقین تھا۔

ڈیمن نے لینڈ کروزر روکی اور دل ہی دل میں تیزی سے حساب کتاب کرنے لگا۔ وہ اُس وقت گھنے جنگل میں تھے جہاں خطرناک درندے موجود تھے۔ اگر وہ پیدل آگے بڑھتے تو شیر، چیتے، بھیڑیے اور دوسرے جانوروں سے بھی بُد بھیڑ کا خطرہ تھا۔ اُن کے پاس دو رائفل اور کُل بارہ گولیاں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شکاریوں کے پاس اُن سے زیادہ اسلحہ اور گولیاں ہوں گی۔ گھنا جنگل، چاندنی رات... وہ اگر لینڈ کروزر سے اتر کر آگے بڑھے تو اسلحے سے حملہ آور کا شاید مقابلہ نہ کر سکیں۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ یہ پتا چلا سکے کہ اس وقت وہ لوگ کہاں ہو سکتے تھے؟ اُن کے کان معمولی سی معمولی آہٹ پر بھی چونک رہے تھے۔

''آگے بڑھنا خطرناک ہے۔ ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔'' ڈیمن نے تشویش بھرے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔

''اُن کے اپنے راستے ہیں، وہ جنگل کو جانتے ہیں۔ اس طرح انہیں پکڑنا ممکن نہیں۔'' پیچھے بیٹھے رینجر بینز نے جواب دیا۔ ''ایک ہی صورت ہے کہ وہ خود ہمارے سامنے آ جائیں، ورنہ ایسے میں پیدل آگے بڑھنا خطرناک ہوگا خود ہمارے اپنے لیے۔'' بینز اس جنگل کا جہاں دیدہ تھا۔ ڈیمن کو اس کی رائے مناسب لگی۔

''مگر باستا...''

''ہو سکتا ہے کہ وہ اور اس کا بچھڑا...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ''ہو سکتا ہے کہ شکاریوں نے کسی اور گینڈے کو نشانہ بنایا ہو۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈیمن باستا کے معاملے میں جذباتی ہے اس لیے اس نے فوراً بات گھما دی۔

''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔'' ڈیمن نے بے چینی سے کہا۔

''ایک گولی چلی اور پھر اُس کے بعد سے خاموشی ہے۔'' بینز نے جواب دیا۔ ''اب جانور کو بچانے کے بجائے یا تو شکاریوں کو پکڑنے کی کوشش کریں یا خود کو بچائیں۔'' یہ کہہ کر بینز لمحہ بھر کے لیے رکا اور بیٹھے بیٹھے نظریں گھما کر اندھیرے

حلوا خور

کچھ لوگ حلوا گھروں میں کھاتے ہیں، کچھ ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھاتے ہیں اور کچھ اسمبلی میں کھاتے ہیں۔ اس طرح دنیا بھر میں لوگ حلوا کھاتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں کھاتے ہیں۔ حلوے کی بھی کئی اقسام ہیں۔ قسم قسم کے حلوے ایجاد ہو گئے ہیں۔ طرح طرح کے نام ہیں۔ کوئی کھانے والا ہے تو کوئی چبانے والا۔ کوئی چیونگم کی طرح کھانے والا تو کوئی توڑ کر کھانے والا، کوئی منہ میں ڈالتے ہی گلے میں اتر جاتا ہے اور کسی کا نوالہ گلے میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔ گلے میں پھنسنے والا حلوا عام طور پر سیاست داں کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض بیوروکریٹ بھی ایسے ہیں جو حلوے کے بڑے شوقین ہیں مگر وہ اسے حلوا نہیں کہتے، اسے رشوت، حصہ، محنتانہ اور فضل ربی کا نام دیتے ہیں۔ نام جو کچھ بھی ہو، مقصد تو حلوا کھانا ہے جو وہ نسل در نسل کھاتے چلے آ رہے ہیں۔ سب حلوہ خور ہیں۔

شمیم شفیق، کھاریاں کی سوغات

میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے کان کھڑے تھے۔ ''لگتا ہے وہ ہمارے نہیں، اپنے راستے سے آئے اور اسی سے واپس جائیں گے۔''

''ہمیں اُسی راستے کا پتا چلانا ہے۔'' ڈیمن نے بات کاٹی۔ ''دوسری پارٹی سے وائرلیس پر رابطہ کرو۔''

بینز نے وائرلیس نکالا اور جنگل کے دوسری سمت روانہ ہونے والی پارٹی سے بات کرنے لگا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ دوسری پارٹی کو بھی اب تک شکاریوں کا کوئی اتا پتا نہیں مل سکا تھا۔

بینز نیکا و ینگو جنگل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ گینڈے کے شکاری اور ان کے زیادہ تر معاون اسی علاقے کے مقامی باشندے تھے۔ یہ جانوروں کے اعضا کی تجارت کرنے والے بڑے بڑے لوگوں کے معمولی سے کارندے تھے۔ وہ اس جنگل کو رینجرز سے زیادہ بہتر انداز میں جانتے تھے۔ انہوں نے شکار کے لیے اپنے محفوظ اور خفیہ راستے بنائے ہوئے تھے۔ بینز گزشتہ ایک سال سے باستا اور اس کے بچھڑے کی نگرانی پر مامور تھا مگر گولی چلنے کے بعد... کیا باستا بھی... وہ سوچ رہا تھا کہ اس بار بھی شکاری ان کی گرفت میں آنے سے صاف بچ نکلیں گے مگر اس نے ڈیمن سے یہ بات نہیں کہی۔ بینز نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ''بہتر ہوگا کہ ان کے سامنے آنے کی دعا کریں۔ آگے تو ٹھیک ورنہ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اُن کا سامنا ہمارے بجائے کسی شیر سے ہو جائے۔"

اُس کے لہجے میں پوشیدہ طنز کو ڈیمن نے صاف محسوس کرلیا تھا۔ اُس نے ناگوار نظروں سے بینز کو دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ایسا پہلی بار تو نہیں ہو رہا تھا۔ کئی بار اُن کا سامنا شکاریوں سے ہوا، گولیاں چلیں اور وہ بچ نکلے۔ ایک دو بار شکاری جنگلی درندوں کے ہتھے بھی چڑھے اور پھر رینجرز کو جنگل میں گشت کے دوران اُن کی بھنبھوڑی ہوئی لاشیں ملیں... شکار، شکاری اور فاریسٹ رینجرز کا کھیل کئی برس سے صرف نیکا وینگو کے جنگل میں ہی نہیں، زمبابوے سمیت جنوبی افریقا کے کئی اور ملکوں کے جنگلوں میں بھی کھیلا جا رہا تھا۔

جنوبی افریقا کے گھنے جنگلوں والے ملک زمبابوے کے بے رحم درندوں کے پُرخطر جنگل میں ڈیمن، بینز اور دیگر کئی رینجرز کی وہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ رات بھر کوششیں جاری رہیں مگر انہیں شکاری نہیں ملے اور پھر اچانک بارش...

ڈیمن سوچ رہا تھا کہ وہ ناکام ہوئے۔ ان کی ناکامی کا صاف مطلب تھا کہ وہ آئے اور کامیاب ہوئے اور چلے گئے۔ رہ گئی باستا اور اس کا بچھڑا... تو صرف دو کا ذکر کیا۔ افریقی جنگلوں کا لاکھوں سال سے باسی یہ جانور پورے جنوبی افریقا میں شکاریوں کے نشانے پر ہے۔ شکار بھی 'شوقِ شکار' کا مرہونِ منت نہیں، گینڈا تو پیشہ ور شکاریوں کے لیے بیش قیمت خزانہ ہے۔

☆☆☆

روایتی ایشیائی ادویات میں گینڈے کے سینگوں کا استعمال ہزاروں سال سے ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدیوں پہلے یہ وافر ملتا تھا مگر اب دنیا میں گینڈے کی نسل معدومی کے خطرے سے دوچار ہے۔ جنگلی حیات کی عالمی تنظیمیں گینڈے کی نسل بچانے کے لیے سرگرم ہیں مگر دوا سازوں کو اس سے کوئی غرض نہیں، کالے جادو کے عاملین کو تو اپنا عمل کرنا ہے۔

گینڈے کو بچانے کے لیے شکار پر سختی ہوئی تو چوری چھپے کام شروع ہوگیا۔ سینگوں اور آنکھوں کے حصول کے لیے گینڈے کے سرگرم شکاریوں اور اس جانور کی حفاظت پر مامور رینجرز کی 'جنگِ گینڈا' جنوبی افریقا کے جنگلوں میں 2006ء سے جاری ہے۔ یہ جنگ کس رفتار سے جاری ہے، اس کا اندازہ سرکاری سطح پر مرتب ان اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 2011ء کے ایک سال کے دوران جنوبی افریقا میں گینڈے کے بائیس شکاری رینجرز سے مڈبھیڑ کے درمیان مارے گئے، دو سو سے زائد گرفتار ہوئے مگر جنگ اب بھی جاری ہے۔ جو شکاری گینڈے کے سینگ اور آنکھوں کے لیے اپنی جان تک کو داؤ پہ لگا رہے ہوں سوچو تو سہی کہ اُس کی کتنی قیمت ہو سکتی ہے۔ شاید اُن شکاریوں کے لیے خود اُن کی جان سے بھی زیادہ۔ ویسے بھی اُس غربت زدہ پسماندہ خطے کے مکینوں کے لیے اپنی جان بے قیمت ہی ہے۔ اس لیے اُن کے لیے معمولی قیمت بھی بہت ہوگی مگر اصل قیمت... یہ تو وہ بڑے کاروباری جانتے ہیں جو اپنے کارندوں سے نہایت کم معاوضے پہ جانوں کا سودا کرتے ہیں، جان جو چاہے گینڈے کی ہو یا انسان کی۔ مالدار کو تو لمبا مال بنانا ہے، سو وہ بنا رہے ہیں۔ رہے جان دینے اور لینے والے تو افریقا کے خطے میں وہ ارزاں اور وافر دستیاب ہیں۔

مشرقِ بعید اور افریقا کے کئی ملکوں میں گینڈے کے سینگوں اور ان کو پیس کر بنائے گئے سفوف کا دھندا ہوتا ہے۔ کئی ملکوں میں اس کی قیمت سونے اور کوکین کے برابر تو کبھی کبھی اس سے زیادہ بھی ہو جاتی ہے۔ ادویات میں استعمال ہونے والی جانوروں کی ہڈیوں اور خشک اعضا کا کاروبار کرنے والے ایک تاجر کا کہنا ہے کہ "ویت نام کی بلیک مارکیٹ میں گینڈے کے سینگ کے سفوف کی قیمت کچھ عرصہ پہلے 33 امریکی ڈالر کے مساوی تھی جو اب بڑھ کر 133 ڈالر فی گرام ہو چکی ہے اور اب یہ قیمت مزید بڑھنے والی ہے۔"

ویت نام میں سونے اور کوکین کی فی گرام قیمت گینڈے کی فی گرام قیمت سے کچھ کم ہی ہے۔ افریقا کے جنگلوں میں جیسے جیسے گینڈے کے شکار پر سختیاں ہو رہی ہیں، ویسے ویسے بلیک مارکیٹ میں اس کے سینگوں کی قیمت بھی بہت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔

دنیا بھر میں اب صرف افریقا میں گینڈا پایا جاتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں: سفید اور اس کا کزن سیاہ مائل گینڈا۔ گزشتہ چند دہائیوں میں گینڈے کی تعداد بہت تیزی سے کم ہوئی ہے اور اب یہ صرف جنوبی افریقا اور کینیا کے ہی جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ اس جانور کی بقا کے لیے کی گئی کوششوں کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ نوّے کی دہائی میں جنوبی افریقا اور کینیا میں صرف 4,230 گینڈے بچے تھے مگر حفاظتی کوششوں کے ذریعے ان کی تعداد میں حوصلہ افزا اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت ان کی مجموعی تعداد بڑھ کر 17,470 تک پہنچ چکی ہے۔ اگرچہ اس کی بقا کو لاحق خطرات میں کچھ اور بھی غیر انسانی اسباب

ہیں مگر سب سے بڑا خطرہ سینگوں کے حصول کے لیے ان کا غیر قانونی شکار ہے، جس کی وجہ سے بقائے جنگلی حیات کے سرگرم رضا کار سخت تشویش میں مبتلا ہیں۔

اگرچہ گینڈوں کی تعداد میں اضافے کے حوالے سے موجودہ اعداد و شمار حوصلہ افزا ضرور ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بے دریغ شکار کے سبب اس کی بعض اقسام صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔

1970ء اور 1980ء کی دہائی میں افریقی ممالک میں گینڈے کا شکار عام تھا۔ بے دریغ شکار کے سبب اس عرصے میں گینڈے کی دو اقسام معدوم ہوئیں، جس کے بعد اس جنگلی جانور کی بقا کے لیے مہم چلائی گئی۔ اس مہم کے نتیجے میں چین نے دیسی دواؤں میں گینڈے کے سینگ کے استعمال کو قانونی طور پر ممنوعہ قرار دے دیا۔ یمن میں خنجر کے دستے میں گینڈے کے سینگ کا استعمال بہت پرانا رواج تھا۔ خنجر آج بھی یمنی عرب مردوں کے روایتی لباس کا ایک لازمی ثقافتی و معاشرتی جزو ہے مگر عالمی کوششوں کے سبب یمن نے بھی خنجر میں گینڈے کے سینگ کے دستے لگانے پر پابندی عائد کردی ہے۔ ان دونوں اقدامات کو بقائے گینڈے کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں میں اہم سنگِ میل قرار دیا گیا ہے مگر یہ مکمل کامیابی نہیں تھی۔

2006ء تک تو اطمینان تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں اس جانور کو معدومی کے کنارے پر پہنچانے والے انسان اس کی بقا کو یقینی بنا سکیں گے مگر 2008ء اس حوالے سے سنگین تشویش کا سال ثابت ہوا۔ اس ایک سال کے دوران جنوبی افریقا میں غیر قانونی شکاریوں نے 83 گینڈوں کو سینگوں کے لیے مار ڈالا۔ 2007ء میں یہ تعداد صرف 13 تھی۔ 2010ء میں یہ تعداد بڑھ کر 333 ہوگئی۔ 2011ء میں 400 سے زائد گینڈوں کو ہلاک کیا گیا۔ صورتِ حال ہر سال مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔ یوں 2007ء سے گینڈے کے تحفظ کے لیے کوششوں میں نیا موڑ آچکا ہے۔

فاریسٹ رینجرز کو اب صرف گینڈوں کی دیکھ بھال نہیں کرنا تھی۔ انہیں شکاریوں سے مسلح جنگ بھی لڑنا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیمن جیسے درجنوں سابق فوجی کمانڈوز کی خدمات حاصل کر کے انہیں تربیت کی ذمے داری سونپی گئی۔ رینجرز کو باقاعدہ لڑائی، جدید اسلحہ کا استعمال، وائرلیس اور فرسٹ ایڈ کا استعمال سکھایا جانے لگا۔ اب گینڈے کی حفاظت پر مامور فاریسٹ رینجرز تربیت میں نیم فوجی دستوں کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر یہ کوششیں ناکام ہو رہی ہیں جس کا بنیادی سبب

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

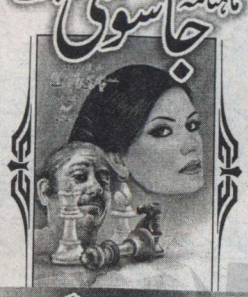

جولائی کی جھلسا دینے والی گرمیاں...
2012 کے شمارے کی سرگرمیاں...

جال در جال
زندگی کی رنگینی کو خیرباد کہہ کے سنگینی کو گلے لگا لینے والے جانبازوں کا ولولہ انگیز سفر....
سلیم فاروقی کا انداز تحریر

گرداب
ملک کے مفادات کو زیر و زبر کردینے والی کوششوں کو ناکام بنا دینے کا عزم اور عمل کی تیز رفتار داستان کے سنسنی خیز مناظر... اسما قادری کے قلم سے

للکار
نت نئے امتحانات سے دوچار تابش اور عمران کے کارنامے طاہر جاوید مغل کا سلسلہ

سرورق کی کہانیاں
ہمارے اردگرد رونما ہونے والے واقعات کا پردرد احوال
احمد اقبال کے ہمراہ سرورق کا پہلا پڑاؤ

تیمور اور شامی کی سنگت میں مسکراہٹ بکھیر دینے والا سلسلہ
کاشف زبیر کے قلم سے ... سرورق کا دوسرا پڑاؤ

اس کے علاوہ

چینی نکتہ چینی میں آپ کی شامل آرا... تبصرے... محبتیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فنڈز میں گئی ہے۔

افریقی جنگلوں کے ان رینجرز کے شب و روز گوریلا جنگ لڑنے والے چھاپا مار فوجیوں کی طرح گزر رہے ہیں۔ ڈیمن جیسے تجربہ کار کمانڈوز کی نگرانی میں فاریسٹ رینجرز کے دستے لڑائی کے لیے ہمیشہ تیار نظر آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ گینڈے کی جان بچانے کے لیے انہیں حملہ آور انسانوں کی جان لینا پڑ سکتی ہے اور خود اُن کی جان بھی جاسکتی ہے۔ کون کس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، رینجرز کو اس کی فکر نہیں البتہ وہ گینڈے کو ہر ممکن قیمت پر زندہ بچانا چاہتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے ڈیمن باستا کی جان بچانے کے لیے سرگرم تھا مگر اس جنگ میں ابھی کوئی بات حتمی نہیں۔ فوجی جان جانے کے خوف سے بے نیاز محاذ پر آتا ہے تو افریقی جنگلوں کے ان 'گینڈا سینگ چوروں' نے بھی سر پر کفن باندھا ہوا ہے۔

وائلڈ لائف ٹریڈ مانیٹرنگ ادارے کے مطابق ''گینڈے کے سینگوں کا سب سے بڑا چور بازار ویت نام میں ہے۔ وہاں اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ہے اور طلب بھی۔'' ادارے کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''مشرقِ بعید کے ملک ویت نام میں کینسر کی شرح زیادہ ہے اور ذرائع کا کہنا ہے کہ بعض اہم اور اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے سرکاری حکام کینسر میں مبتلا ہیں اور وہ کینسر کے علاج کے لیے نہایت مہنگی ایسی روایتی ادویات استعمال کررہے ہیں جن میں گینڈے کے سینگوں کا سفوف بھی شامل ہوتا ہے۔''

طلب میں اضافے کے سبب جنوبی افریقا کے چور بازاروں میں بھی ان سینگوں کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہوچکا ہے جس کی وجہ سے اس کے شکار میں بھی تیزی آگئی ہے۔ اس وقت گینڈوں کی 'سینگ چوری' افریقا میں زیرِ زمین کام کرنے والی بڑی بڑی جرائم پیشہ تنظیموں کی فہرست میں شامل ہے اور وہ اس کے شکار کے لیے پُرکشش معاوضے پر مقامی باشندوں کی خدمات حاصل کرکے بھاری منافع کمارہے ہیں۔

☆☆☆

گدون وین دی وینزے اُن بے شمار شکاریوں میں سے ایک ہے جو گینڈے کے غیر قانونی شکار میں ملوث ہے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ منوں وزنی گینڈے کو کس طرح تین سو گرین کی ایک گولی میں ہی ڈھیر کیا جاسکتا ہے۔

''ویسے کسی ناتجربہ کار شکاری کے لیے گینڈے کو مارنا آسان کام نہیں مگر ہمارے لیے تو یہ بچوں جیسا کھیل ہے۔ بس آپ کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ اُسے کس جگہ گولی مارنی ہے۔''

گدون نے بتانا شروع کیا کہ کس طرح وہ اس جانور کا شکار کرتا ہے۔ ''اُس کی آنکھ سے چھ انچ پیچھے اور کان سے دو انچ اوپر گولی ماری جائے تو وہ سیدھی اس کے دماغ میں جا گھستی ہے اور جانور سینے کے بل زمین پر بیٹھتا چلا جاتا ہے۔'' گدون نے اپنے چہرے پر شہادت کی اُنگلی سے اس مقام کی نشاندہی کی جہاں پر وہ گینڈے کو گولی مارتے ہیں۔ ''بس یہاں ایک گولی مارو۔ یہاں اس کا چھوٹا سا دماغ ہوتا ہے۔ گولی لمحے سے بھی بہت ہی کم وقت میں سیدھی اس کے دماغ میں اور آپ کا کام ختم۔'' یہ کہہ کر وہ خباثت بھرے انداز میں ہنسا اور پھر کہنے لگا۔ ''گینڈے کی نظر بہت کم زور ہوتی ہے۔ وہ کم و بیش اندھا ہی ہوتا ہے۔ تم چاہو تو اُس کے بہت قریب جاکر سامنے سے بھی گولی چلاسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''اس بات سے یہ مت سمجھ لینا کہ تم سیدھے اُس کے سر پہ جاکر کھڑے ہوجاؤ اور گولی چلادو۔ اُس کی قوتِ شامہ بہت زیادہ ہے۔ اس کی سماعت بھی بہت تیز ہے۔ اس لیے جب ہم اس کے قریب جاتے ہیں تو یہ ضرور خیال رکھتے ہیں کہ ہوا یا تو بالکل بند ہو اور اگر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہو تو وہ ہمارے سامنے کے رخ پر ہوتا کہ جانور ہماری بُو محسوس نہ کرسکے۔ دوسری اہم بات یہ کہ آگے بڑھتے ہوئے اُس کے کانوں پر بھی نظر رکھو۔ اگر وہ اپنا کوئی ایک کان تمہاری سمت ہلائے تو سمجھ لو مصیبت آنے والی ہے۔ اُس وقت اپنی جان بچانے کی سوچو۔''

گدون اب تک درجنوں گینڈوں کو مار کر اُن کے سینگ نکال کر بیچ چکا ہے۔ ''یہ بہت ماہرانہ کام ہے۔ پہلے مجھے ذرا مشکل لگتا تھا مگر اب نہیں۔'' اُس نے بتانا شروع کیا کہ مُردہ گینڈے کا سینگ کس طرح نکالا جاتا ہے۔ ''سینگ کو نکالنے کے لیے آری کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اسے بہت صفائی سے، جڑ سے نکال لیتا ہوں۔ بس اس کام کے لیے ایک عام سائز کا چوڑا اور تیز دھار چاقو چاہیے۔ گولی لگتے ہی وہ زمین پر بیٹھتا چلا جاتا ہے۔ آپ اس کی طرف بڑھیے۔ تیز دھار چاقو سے سینگ کے چاروں طرف سے چاقو کو اندر ڈال کر گول گھمائیے۔ ذرا سی محنت لگے گی اور کچھ ہی دیر میں صاف ستھرا سینگ اس طرح باہر نکل آئے گا جیسے بوتل کا کارک۔''

بیالیس سالہ گدون نے اپنے اس غیر قانونی ہُنر کے بارے میں بہت دلچسپ حقائق بیان کیے۔ ''کچھ سال پہلے میں ایک جرم کے سبب کرونستاد جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ یہ جیل جوہانسبرگ سے دو گھنٹے کی دوری پر واقع ہے۔ وہاں میری ملاقات اپنے ہی ہم عمر ڈیون سے ہوئی۔ وہ یہی کام کرتا

تھا اور اسی جرم کی پاداش میں قید تھا۔ اُس نے ہی مجھے یہ ہنر سکھایا۔ اب تو میرے اپنے کئی شاگرد ہیں جو یہ کام سیکھ کر بہت اچھی طرح کام کررہے ہیں۔''

گدون کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اب تک بائیس گینڈوں کو ہلاک کیا ہے تاہم پولیس کا خیال ہے کہ اُن کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اگر گدون کے اعتراف کو ہی درست مان لیا جائے تب بھی گینڈے کے غیر قانونی شکار کے الزام میں اُسے صرف جنوبی افریقا ہی میں نہیں، دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں لمبی سزا کا سامنا ہوسکتا ہے۔ اتنی لمبی سزا کہ یا تو زندہ نہ رہا ہو پائے گا یا اگر آزاد ہو بھی گیا تو پھر بڑھاپے، جھکی کمر اور رعشہ زدہ ہاتھوں کے باعث کبھی بندوق نہیں اٹھا سکے گا۔

اس وقت گدون جیل میں ہے۔ فاریسٹ رینجرز نے اُسے گینڈے کا سینگ نکالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ اب اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔

ڈیون کا والد ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ اُس نے 1950ء کی دہائی میں کینیا میں چلنے والی 'موموبغاوت' میں بھی حصہ لیا تھا مگر اب وہ کینیا چھوڑ کر ساؤتھ افریقا میں آکر بس گیا ہے۔ وہ ٹرانسوال کے علاقے میں رہتا ہے جو بوٹسوانہ کی سرحد کے قریب بیابان اور جنگل کا علاقہ ہے۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور بیوی کے ساتھ وہاں آباد ہے۔ اب وہ بھی شکاری ہے اور اسی پر اس کی گزر بسر ہے مگر یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ آیا وہ بھی گینڈوں کے شکار میں ملوث ہے یا نہیں۔ اب تک وہ جس قسم کے شکار میں ملوث ہے، اسے غیر قانونی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ گدون کے دونوں بھائی بھی شکاری ہیں اور زیادہ وقت جھاڑیوں میں شکار کی تلاش میں گھومتے پھرتے گزار دیتے ہیں۔

''میں اسکول جاتا تھا مگر آٹھ سال کا تھا، جب اسکول چھوڑ دیا۔'' گدون نے کہنا شروع کیا۔ ''تب سے میں جنگل میں رہنے لگا...... مجھے جھاڑیوں میں چھپے جانوروں کی تلاش میں مہارت حاصل ہے۔ میری لگ بھگ پوری زندگی جنگل میں گزری ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور میرے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں جانوروں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ہم انسانوں سے بہت بہتر ہیں۔''

آخر کار گدون ایک بہت بڑا پیشہ ور شکاری بن گیا۔ وہ جنگل میں نہ صرف اپنے شکار کی کمین گاہ کا خود پتا چلاتا تھا بلکہ شکار کرتا اور کرواتا بھی تھا۔ ''میری خصوصیت یہ تھی کہ میں اپنے شکار کو خود تاکتا تھا اور اس کے شکار کی منصوبہ بندی بھی خود کرتا تھا۔'' گدون نے بتایا۔

ایک مرتبہ گدون نے ایک بوڑھے امریکی شکاری کے گائیڈ کا کام بھی سرانجام دیا تھا۔ وہ اسے موزمبیق کے دلدلی علاقوں میں جنگلی بھینسے کا شکار کھلانے لے گیا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا دلدلی جزیرہ ہے جہاں جنگلی بھینسوں کا غول سہ پہر ڈھلے چرنے آتا تھا۔'' گدون نے واقعہ سنانا شروع کیا۔ ''ہم نے خود کو پتوں اور گھاس پھوس کے ذریعے کیموفلاج کیا اور آگے بڑھنے لگے۔ جب ہم نے انہیں نشانہ بنایا تو اُس غول سے صرف تیس میٹر کی دوری پر تھے۔ امریکی شکاری نے اندھا دھند گولی چلائی۔ جنگلی بھینسوں کا وہ ریوڑ چیختا چلاتا بھاگا۔ وہ بوڑھا شکاری فائر پہ فائر کیے جارہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ ''وہ شکار میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ وہ شکار نہیں کررہا تھا بلکہ اُن پر اندھا دھند گولیاں چلارہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''تمہیں معلوم ہے آج کل وہ بوڑھا امریکن اناڑی شکاری نئے ڈھنگ سے شکار کرتا ہے۔'' اس نے اپنی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر گڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ایک پرانا ٹرک خرید لیا ہے۔ اب وہ اس پر بیٹھ کر جنگلی بھینسوں اور ہرن کا شکار کرتا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا اور پھر خود ہی کہنے لگا۔ ''اس لیے کہ جب وہ جنگلی بھینسوں پر گولیاں چلارہا تھا تو ایک بھینسے نے پلٹ کر اسے زوردار ٹکر ماری تھی۔ اب وہ ٹرک میں بیٹھ کر گولی چلاتے ہوئے خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ ''وہ تو قسمت اچھی تھی کہ میں نے جنگلی بھینسے کو بھگایا ورنہ وہ بوڑھا شکاری گیا تھا دنیا سے۔'' اس نے ہنستے ہنستے بتایا۔ میں بھی یہ واقعہ سن کر مسکرانے لگا۔

یہ 2005ء کی بات ہے جب گدون کے بھائی آندرے نے اس سے کہا کہ کیا وہ گینڈے کا شکار کرکے اس کا سینگ لاسکتا ہے؟ اُس وقت آندرے ایک معروف سفاری ٹور کمپنی 'سائی من' میں کام کررہا تھا۔ گدون نے بھائی کی بات سن کر ہامی بھرلی۔ اس سے پہلے گدون نے کبھی کسی گینڈے کا شکار نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنی ساری توجہ اس جانب مبذول کردی کہ وہ کس طرح گینڈے کو شکار کرسکتا ہے۔

''گینڈے کے ٹھکانے کا پتا چلانے کے لیے سب سے پہلے اُس کا گوبر تلاش کرو۔ یہ گوبر تمہیں اس کے ٹھکانے پر لے جائے گا۔'' گدون نے مجھے گینڈے کی تلاش کا بنیادی اصول سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''سیاہ مائل گینڈے کی نسبت سفید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گینڈے صرف اپنے مخصوص علاقے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اگر تم گینڈے کی بُو محسوس کرنے کی صلاحیت حاصل کر لو تو جنگل میں بڑی آسانی سے یہ بات سمجھ سکتے ہو کہ سفید گینڈا کہاں ملے گا اور سیاہ مائل کہاں ہوگا۔ ان کے ٹھکانے کا پتا چل جائے تو پھر انہیں شکار کرنا مشکل نہیں ہوتا۔''

اگرچہ جب گدون کو گینڈوں کے غیر قانونی شکار کے الزام میں گرفتار کیا گیا، اُس وقت وہ جدید رائفل سے ایک گینڈے کو نشانہ بنا چکا تھا لیکن پہلے پہل گینڈا کیسے ہلاک کیا، وہ بھی دلچسپ کہانی ہے۔

''افریقا میں شکار کے لیے روایتی طور پر بھالوں اور تیر کا استعمال ہزاروں سال سے ہوتا چلا آرہا ہے۔'' گدون نے پہلے گینڈے کے شکار کا قصہ سنانا شروع کیا۔ ''اب بھی وہ لوگ جن کے پاس رائفل یا بندوق نہیں ہوتی، وہ بھالوں اور تیر سے ہی شکار کرتے ہیں۔ میں نے بھی پہلے پہل یہی طریقہ اپنایا۔ میں نے ایک وزنی اور تیز دھار انی والا نیزہ تیار کیا اور پھر اسے اعشاریہ 30-60 کی رائفل کی نال میں رکھ کر، اپنے پھیپڑوں کا پورا زور لگا کر نشانے پر پھینکا۔ یہ افریقا کا قدیم طریقۂ شکار ہے۔ میں نے گینڈے کے پھیپڑوں کو نشانہ بنایا تھا۔ نشانہ بالکل ٹھیک لگا اور پھر کچھ دیر بعد گینڈا تڑپ تڑپ کر ہلاک ہوگیا۔ اس طریقے سے میں نے ایک مادہ اور نر کا شکار کیا اور نہایت بھونڈے انداز میں اُن کے سینگ نکال لیے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ ''میرے تجربے کو آزمانا مت۔ ضروری نہیں کہ یہ طریقہ ہر بار کامیاب ہو۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ تیر عین نشانے پر لگا اور اس کی تیز انی موٹی کھال کو چیرتی ہوئی اس کے پھیپھڑے میں اتر گئی، ورنہ تو میں بھی ناکام ہی رہتا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کچھ سوچنے لگا۔ ''شاید اس بھونڈے ہتھیار سے شکار میں کامیابی کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ میں بہت دلیر ہوں اور صرف دو میٹر کی دوری سے میں نے وار کیا تھا، تبھی تیر کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی ورنہ...''

پہلے شکار اور اس کے سینگوں کی فروخت کے بعد تو ان جیسے بھائیوں کے منہ کو گینڈے کا خون لگ گیا۔ آندرے سفاری کمپنی میں ملازم ہونے کی وجہ سے افریقا کے دور دراز علاقوں میں سیاحوں کو جنگلی حیات دکھانے کے لیے لے جاتا تھا۔ وہ ایسے کئی جنگلوں، نیشنل پارکوں اور نجی محفوظ علاقوں سے واقف تھا جہاں بڑی بڑی تنظیموں اور اداروں کے ذریعے گینڈوں کی افزائشِ نسل کا پروگرام کافی عرصے سے جاری تھا۔ جس کی وجہ سے وہاں گینڈوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ افزائشِ نسل میں خاطر خواہ اضافہ اور بہ ظاہر انہیں کسی قسم کے لاحق خطرات کے نہ ہونے کے سبب گینڈوں کی حفاظت کے انتظامات قدرے نرم تھے۔ ان بھائیوں نے اس بات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ آندرے اسے شکار گاہ تک بہ حفاظت پہنچا دیتا اور پھر باقی کام گدون خود کر لیتا تھا۔ اسے بھی گینڈے کے شکار میں منافع نظر آنے لگا تھا۔

''سینگوں سے بہت مال کمایا جاسکتا ہے لیکن یہ بات مجھے بہت بعد میں پتا چلی۔'' گدون نے سینگوں سے ہونے والی آمدنی کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں بتانا شروع کیا۔ ''پہلے تو میں شکار کے بعد سینگ نکالتا اور پھر اُسے لا کر دوسرے مقامی لوگوں کو فروخت کر دیتا تھا۔ وہ لوگ یہی دھندا کرتے تھے مگر یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ جو پیسے مجھے ملتے تھے وہ تو بہت ہی کم تھے۔'' ''میں نے ایک مرتبہ تیرہ پونڈ وزنی دو سینگ لا کر دیے۔ بعد میں پتا چلا کہ اُن کی قیمت گیارہ ہزار ڈالر تھی۔ اس رقم میں سے بڑا حصہ دلال نے ہڑپ کر لیا تھا۔ دوسرا بڑا حصہ میرے بھائی نے دبا لیا۔ اصل کام میرا تھا مگر مجھے بہت تھوڑی رقم ملی۔ میں اس بات سے سخت دل برداشتہ ہوا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ اب یہ کام خود کروں گا۔ میں نے ایک گینڈا مارا اور اس کے سینگ فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ مجھے جیل بھیج دیا گیا اور پھر صحیح معنوں میں، جیل میں، مَیں نے گینڈے کے شکار کا درست طریقہ اور سینگ بیچ کر مال بنانے کا ہُنر سیکھا۔''

پہلی بار تو وہ سزا کاٹ کر رہا ہوگیا مگر وہ جو ہُنر جیل سے سیکھ کر آیا تھا، اُس کے بعد وہ اس کھیل کا مکمل کھلاڑی بن چکا تھا۔ سائی من سفاری ٹور کمپنی کے مالک کا نام گیرات سائی من تھا۔ آندرے بدستور وہیں کام کر رہا تھا۔ کمپنی سے اُس کے رابطے ہوئے۔ اس بار اس نے براہِ راست سائی من کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ اب بیچ میں آندرے اور دلال کا چکر نہیں تھا۔ مال پُرکشش تھا۔ وہ کئی سال تک کامیابی سے گینڈے مارتا اور اُن کے سینگ چُراتا رہا مگر پھر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بیان میں سائی من کا نام لے تاکہ اسے بھی پکڑا جاسکے۔ کیا سائی من یہ کام تنِ تنہا کر رہا ہے، ہرگز نہیں۔

جنوبی افریقا میں گینڈے کے شکار اور سینگوں کی تجارت بین البرِ اعظمی کاروبار ہے جس میں گدون اور سائی من جیسے لوگ تو بہت ہی معمولی کارندے ہیں۔ اس کے اصل کھلاڑیوں کو کوئی نہیں جانتا۔ سینگ چوری کا یہ دھندا چھوٹے پیمانے پر نہیں بلکہ مافیا کی طرز پر ہو رہا ہے۔

ادھر پولیس نے گدون پہ سائی من کو ملوث کرنے کے لیے اعترافی بیان دینے پر زور ڈالنا شروع کیا ہی تھا کہ چند ہی روز میں کسی نامعلوم حملہ آور نے گھر میں گھس کر سائی من کی بیوی کو اُس کے چار بچوں کی آنکھوں کے سامنے حلق پر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ گدون کے لیے بھی پیغام تھا اور خود سائی من کے لیے بھی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کچھ نامعلوم مسلح افراد نے گدون کی سابق بیوی پر مجرمانہ حملہ کیا اور اسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ جس کے بعد اس کی سابق بیوی بچوں کو ساتھ لے کر گواہوں کے تحفظ کے لیے قائم ادارے میں پناہ لینے چلی گئی۔ یہ دونوں واقعات گدون کے لیے پیغام تھے کہ اس کے منہ کھولنے اور پھر سائی من کے پکڑے جانے اور اس کے اعتراف کی صورت میں اور بھی کیا کچھ ہوسکتا ہے۔

گدون اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہے لیکن وہ کسی اور کا نام لینے پر تیار نہیں حتیٰ کہ سائی من کا بھی نہیں۔ وہ سب کچھ اپنے اوپر لے چکا ہے مگر پولیس اور وہ خود جانتا ہے کہ یہ پورا سچ نہیں مگر پورا سچ کہنے کی صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہے۔

''میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔ اگر لے بھی دوں تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔'' گدون نے میرے سامنے ایک پولیس افسر سے کہا۔ جو موقع دیکھتے ہی اسے سائی من کے خلاف بیان دینے پر رضامند کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

''ہم مافیا کی بڑی مچھلیوں کو پکڑنا چاہتے ہیں اور پکڑ بھی سکتے ہیں اگر گدون بیان دے تو... ہم اُس کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے تب۔'' جوہانسبرگ پولیس کے ڈپٹی چیف نے اُس کے سامنے مجھ سے کہا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ گدون کے تانبے جیسی رنگت والے کلین شیو چہرے پر سخت تناؤ تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

پولیس نے گدون کو پیشکش کی ہے کہ اگر وہ ان کی مدد کرے تو اسے چار ماہ کی سزا دے کر بری کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے ایک لاکھ ڈالر مالیت کا نیا ٹرک اور مقامی محکمہ جنگلی حیات میں نوکری بھی دی جائے گی مگر وہ اس پُرکشش پیشکش کے باوجود تعاون پر آمادہ نہیں۔ اسے ڈر ہے کہ مافیا اسے نہیں چھوڑے گی۔ پولیس نے اسے تحفظ دینے کی بھی یقین دہانی کروائی ہے۔ ''وہ ان سے زیادہ طاقت ور اور خطرناک ہیں۔'' گدون نے پولیس کی پیشکش کے بارے میں اپنے دل کی بات مجھ سے کہی۔

کئی مہینوں کی کوششوں کے بعد آخرِ کار گدون پولیس کی مدد کرنے کو تیار ہوگیا لیکن اس کے باوجود اُس کے دل سے ڈر دور نہیں ہوا تھا۔ ''وہ چاہے جیل میں بھی ہو، تب بھی مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔'' تعاون کے فیصلے کے بعد جب میں گدون سے ملا تو اس نے مایوس لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''میں تو پھنس گیا ہوں۔ یہاں پولیس ہے اور وہاں وہ... میں ہر حال میں مروں گا... وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے، مجھے تو مرنا ہی پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز سے بھی خوف جھلک رہا تھا۔

میں کافی دیر تک اُس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ ہم دونوں کے درمیان سلاخیں حائل تھیں۔ میں آزاد دنیا میں تھا اور وہ جیل میں۔ اسے ایک بیان دینے سے آزادی ملنے والی تھی مگر وہ رہائی سے خوش نہیں، خوف زدہ تھا۔

''اے گینڈے... ملاقات کا وقت ختم ہوگیا۔'' ایک پولیس والے نے قریب آکر اُس سے کہا تو وہ کھڑا ہوگیا اور مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جانتے ہو، یہاں جیل میں سب مجھے گینڈا کہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے جیل کے اندرونی احاطے کو جانے والی نیم تاریک راہ داری پر بڑھ گیا۔

☆☆☆

اس سے قطع نظر کہ گدون وین ایک بہت اچھا شکاری اور جنگلی جانوروں کا پیچھا کرنے، اُن کے ٹھکانوں کا پتا چلانے والا ماہر ٹریکر بھی ہے۔ گدون ویت نام کے جنگلوں میں بھی اپنا یہ کام کر سکتا ہے مگر اب یہ اس کے بس کی بھی بات نہیں کہ وہ ویت نام کے جنگلوں میں ایک گینڈا بھی تلاش کر سکے، شکار تو دور کی بات ہے۔

کبھی ویت نام کے گھنے جنگل، دلدلی علاقے، نم میدان، جوہڑ اور جھیلیں جاوا نسل کے گینڈوں کا مسکن تھے۔ اُن کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ کبھی صرف یہ نسل ہی نہیں، بھاری بھرکم گینڈا بھی لاکھوں سال پرانی اپنی سرزمین پر معدوم ہو جائے گا مگر بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ 2010ء میں ویت نام کا آخری گینڈا بھی شکاری کے ہاتھوں مارا گیا۔ اُس کے بعد سے ویت نام کے سرسبز بیابان، میدان، جھاڑیاں اور جنگل گینڈوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی ہوگئے۔

اگرچہ ویت نام گینڈوں سے خالی ہو چکا ہے مگر اس کے باوجود مشرقِ بعید کے اس پسماندہ ملک کے چور بازاروں میں بکنے کے لیے اُن کے سینگوں کی کوئی کمی نہیں۔ جیب میں دام ہوں تو ویت نامی چور بازاروں میں سینگ بے شمار... ایک وقت تھا کہ روایتی طور پر ایشیا کے ممالک چین، تائیوان،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنوبی کوریا، جاپان اور عرب افریقی ملک یمن گینڈے کے بیش قیمت سینگوں کی غیر قانونی تجارت کے اہم مراکز تھے مگر اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ان ملکوں میں گینڈے کے سینگوں کی تجارت غیر قانونی اور قابلِ سزا جرم ہے مگر ویت نام... یہ اب اس تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔محتاط اندازوں کے مطابق گزشتہ ایک سال کے دوران ویت نام کی سینگ منڈی میں ایک ٹن سے زیادہ سینگ لائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی افریقا سے گینڈوں کے سینگ اسمگل کیے جانے میں صرف جرائم پیشہ گروہ ہی ملوث نہیں، جوہانسبرگ میں تعینات کئی ویت نامی سفیر بھی اس غیر قانونی کاروبار میں شریک ہیں۔وہ بعض سفارتی مراعات کا استعمال کرتے ہوئے بہت صفائی سے غیر قانونی طور پر شکار گینڈوں کے سینگوں کو ویت نام اسمگل کر کے لمبا مال کمارہے ہیں۔ان حقائق کے باوجود یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ویت نامی سینگ بازاروں میں سارا مال غیر قانونی طور پر لایا جارہا ہے۔

جنوبی افریقا کا تحفظِ جنگلی حیات کا قانون عالمی طور پر تسلیم شدہ معاہدوں کے مطابق ہے۔ ان میں سے ایک معاہدہ معدومی کے خطرات سے دوچار جنگلی انواع اور اُن کے اعضا کی تجارت سے بھی متعلق ہے۔یہ معاہدہ اقوامِ متحدہ کے تمام رکن ممالک نے تسلیم کیا ہے۔جنوبی افریقا کے قانون میں بھی اسے شامل کیا گیا ہے۔اس قانون کے تحت اجازت حاصل ہے کہ اگر معدومی کے خطرے کا سامنا کرنے والی جنگلی حیات کی کسی نوع کی نگرانی میں افزائش کی جائے اور پھر اُن کی تعداد ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو بطور 'کھیل' اس کے شکار کی اجازت دی جاسکتی ہے۔جس کے لیے فی شکاری فی جانور کے اصول پر بھاری فیس لے کر لائسنس جاری کیا جاسکتا ہے۔یوں حاصل شدہ آمدنی کا بڑا حصہ اُن علاقوں کی ترقی اور فلاح و بہبود پر خرچ کرنا لازم ہے جہاں اُس جانور کی افزائش کی گئی ہو۔شکار، سرکار اور مقامی آبادی کی پنچایت کے نمائندوں کی موجودگی میں کھیلنا لازم ہے۔ بعد از شکار، شکاری جانور کا سر یا اُس کے سینگ بطور ٹرافی اپنے ساتھ ملک سے باہر بھی لے جاسکتا ہے۔

2003ء میں ایک ویت نامی شکاری جوہانسبرگ آیا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کر کے اس قانون کے تحت گینڈے کے شکار کا اجازت نامہ حاصل کیا اور پھر پیشہ ور سفاری گائیڈ کے ذریعے گینڈا شکار کر کے سینگ بطور ٹرافی ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد تو پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔اس کے بعد بہت سارے ویت نامی شکاری آئے۔ بھاری فیسیں ادا کر کے شکار کھیلتے اور سینگ قانونی طور پر اپنے ملک لے جاتے رہے۔ان میں سے ہر شکاری نے فی گینڈا شکار کے لیے حکومت کو سرکاری فیس کے نام پر پچاس ہزار امریکی ڈالر کے مساوی رقم ادا کی تھی۔

جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے سرگرم رضا کار اس قانون کو مانتے ہیں مگر ساتھ ہی وہ اس پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ قانون شوقیہ شکاریوں کو تفریحی شکار کی اجازت دیتا ہے مگر گینڈے کے وہ ویت نامی شکاری شوقیہ نہیں پیشہ ور تھے۔وہ سینگ اپنے ساتھ بطور ٹرافی نہیں بلکہ قیمتی مال کے طور پر لے کر گئے تھے۔ یہ سب اُن سینگ چوروں کی ایک قانونی چال تھی۔وہ سب سینگ مافیا سے تعلق رکھتے تھے۔

ہم واپس ویت نام کی طرف پلٹتے ہیں!

گینڈے کے سینگوں کی ایک جوڑی کا اوسط وزن تیرہ پونڈ یا اُس سے ذرا زیادہ ہوتا ہے۔سینگ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر فی گرام کے حساب سے فروخت کیا جاتا ہے۔سینگوں کے ویت نامی تاجر کہتے ہیں کہ اوسط وزن کے سینگ کی ایک جوڑی کے حصول اور پھر انہیں بازار تک پہنچانے کے دوران... کُل لاگت اور تمام تر اخراجات منہا کرنے کے بعد ان کی فروخت سے حاصل شدہ خالص منافع دو لاکھ امریکی ڈالر کے مساوی ہوتا ہے۔اب خود سوچ لیں قانونی شکار کی فیس پچاس ہزار ڈالر اور خالص منافع دو لاکھ ڈالر... قانون کی آڑ لے کر منافع میں کون رہا، سینگ چور یا حکومتِ افریقا۔

سینگوں کے لیے گینڈوں کے بے دریغ شکار کے پیچھے سب سے بڑی وجہ 'بیماری' ہے۔ یہ سینگ صدیوں سے مشرق کی روایتی دیسی ادویات میں استعمال ہورہے ہیں۔تاریخی جائزوں سے پتا چلتا ہے کہ گینڈے کے سینگ سے علاج کا سلسلہ مشرقِ بعید اور افریقی ممالک میں گزشتہ دو ہزار برس سے جاری ہے۔ عام تصور ہے کہ قدیم حکیمی نسخوں کے مطابق سینگوں کا استعمال آج بھی امراض میں شفایابی کا ذریعہ ہے۔

افریقا اور مشرقِ بعید کا خطہ بخار اور ملیریا کے حوالے سے بدنام ہے۔ افریقا میں اب بھی بخار اور ملیریا عام مرض ہے۔ تاریخی تذکروں کے مطابق قدیم حکما بخار اور امراض سے شفایابی کے لیے گینڈے کے سینگ کو پانی میں گھس کر سیال مادہ مریض کو پلاتے تھے، جس سے مرض کی شدت میں کمی ہوجاتی اور مریض کو افاقہ ہوتا تھا۔ یہ روایتی علاج آج بھی کئی افریقی ممالک میں مستعمل ہے۔

روایتی ایشیائی علاج میں ان سینگوں کے استعمال اور شفا

کے پیچھے مبینہ طور پر کارفرما سینگ کے کیمیائی خواص کا کردار جاننے کے لیے محققین نے گزشتہ تین عشروں کے دوران اس جانب قابلِ ذکر توجہ دی ہے۔اب تک کئی سائنسی تحقیقات کی جاچکی ہیں۔اگرچہ تحقیقات پر مشتمل یہ رپورٹیں بڑی حد تک سینگ کے دیسی طریقۂ علاج کے حق میں ہیں تاہم اب تک انہیں ٹھوس سائنسی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جاسکا مگر اس کے باوجود سینگوں کے طبی استعمال کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ویت نام کے دیہی علاج میں استعمال کی گئی روایتی ادویات کی تفصیلات پر مشتمل مؤقر طبی جریدے کے 2006ء کے ایڈیشن میں دو صفحات صرف گینڈے کے سینگ کے طبی خواص کے بیان پر مشتمل تھے۔

ان سینگوں سے بخار اور ملیریا کے علاج کو تو چھوڑیے، حال ہی میں اس حوالے سے چونکا دینے والا انکشاف سامنے آیا ہے۔جدید طبی محققین اب تک کینسر کے شافی علاج کی دوا دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں مگر ویت نامی حکیموں نے دعویٰ کیا ہے کہ گینڈے کے سینگوں میں کینسر سے شفا کی خاصیت موجود ہے۔ تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ویت نام میں مختلف وجوہات کی بنا پر کینسر کے پھیلاؤ کی شرح میں خطرناک حد تک اضافہ ہوچکا ہے۔

معروف طبی محقق کا اس دعوے کے جواب میں کہنا تھا کہ ”فی الحال یہ دعویٰ بے بنیاد ہے۔ اب تک ایسی کوئی سائنسی تحقیق شائع نہیں ہوئی جو اس بات کو درست ثابت کرتی ہو۔“ میری ہارڈی کا کہنا تھا کہ ”اگرچہ اب تک اس بارے میں کوئی ٹھوس سائنسی تحقیق سامنے نہیں آسکی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سینگ یکسر خواص سے عاری ہیں۔ سینگ کیمیائی اجزا رکھتے ہیں اور جب وہ جسم میں شامل ہوں تو اُن کیمیائی عناصر کے انسان پر اثرات مرتب ہونا سادہ سی بات ہے۔ایسا ہوسکتا ہے۔“ میری ہارڈی امریکا سے تعلق رکھتی ہیں اور انسانی خلیوں پر تحقیق ان کا موضوع ہے۔وہ طبی تحقیق کے ایک امریکی ادارے کی ڈائریکٹر بھی ہیں۔انہیں مشرق کی دیسی طبی ادویات کے خواص پر بھی مستند ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔

میری ہارڈی کا کہنا ہے ”کینسر خلیوں میں جنم لینے والا جاں لیوا مرض ہے۔ جسے یہ لاحق ہوجائے وہ اس مرض کے خوف سے ہی مرنے لگتا ہے۔ مریض مرض کے باعث شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار بھی ہوجاتا ہے۔ اگر ایسے میں مریض کوئی دوا اس یقین سے کھائے کہ اسے شفا مل جائے گی یا مرض کی شدت میں کمی ہوگی تو ایسا ہوتا بھی ہے۔اس میں دوا سے زیادہ یقین اور عقیدے کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔اگر مریض گینڈے کے سینگ کا محلول یا سفوف اس عقیدے اور یقین کے ساتھ استعمال کریں کہ وہ شفایاب ہوں گے یا اُن کی تکلیف کم ہوجائے گی، تو ایسے میں انہیں افاقہ محسوس ہوگا۔ طبیعت میں بہتری کی وجہ سینگ کے کیمیائی خواص، یقین کے باعث ذہن میں ہونے والی ہارمونز کی تبدیلیاں اور نفسیاتی اثر... سب برابر کے شریک ہیں۔سینگ کے کیمیائی خواص یقینی ہیں مگر صرف وہ خواص ہی سب کچھ نہیں اور بھی بہت کچھ ہے، جو موجود تو ہے مگر سائنسی بنیادوں پر اسے ثابت کرنا ممکن نہیں۔“

ویت نام میں گینڈوں کے سینگوں کے استعمال کے بڑھتے رجحان کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے میں نے ملک کے کئی حصوں کا تفصیلی دورہ کیا۔میرے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں جنہیں میں تھائین پکارتا تھا۔کینسر کی تشخیص کے ابتدائی تجزیوں سے ثابت ہوا ہے کہ اُن کی دائیں چھاتی پر ایک سفید دھبا ہے اور اس کے علاوہ بھی ان کے رحم کے زیریں حصے میں کینسر کی ابتدائی علامات پائی گئی تھیں۔ خوبصورت اور بے پروائی کی حد تک غیر ذمے دار باون سالہ یہ خاتون کینسر کی تشخیص کے بعد سخت خوف میں مبتلا تھیں۔وہ جدید مغربی طریقوں سے اپنے اس مرض کا علاج کروا رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حکیموں سے بھی مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ گینڈے کے سینگ اس مرض سے شفا دلا سکتے ہیں؟“ ایک روز میں نے اُن سے سوال کیا۔

”میں نہیں جانتی۔“ تھائین نے کندھے اُچکا کر جواب دیا۔ ”لیکن جب تمہیں یہ علم ہوجائے کہ بس اب مرنے والے ہو تو پھر سینگ ہو یا کچھ اور...... تمہیں کسی بھی شے کے استعمال سے کوئی نہیں روک سکتا۔مرنے والا ہر وہ شے بطور دوا استعمال کرنے کو تیار ہوجاتا ہے، جس کے بارے میں اسے یقین دلایا جائے کہ اس کا استعمال تمہیں موت کے منہ میں جانے سے بچا سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف بغور دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”یہی میرا مسئلہ ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ اس کے استعمال سے میں بچ سکتی ہوں۔ مجھے کہا گیا ہے کہ اس سے کینسر کا علاج ہوسکتا ہے اور بس!“

میرے ویت نامی میزبان مجھے ہنوئی اور ہوچی منہ کے کینسر اسپتال سے لے کر جڑی بوٹیوں کی دُکانیں، بوتیک، کھال بازار اور مضافات کے چھوٹے چھوٹے علاقوں کے تنگ و تاریک مکانات کے اندر تک لے کر گئے۔ میں جہاں بھی گیا، مجھے ہر جگہ گینڈے کے سینگ نظر آئے۔

ویت نام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔اب وہاں مڈل کلاس میں اضافہ ہورہا ہے۔ لوگ مغربی طرزِ زندگی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنا رہے ہیں۔ غربت زدہ لوگوں کے ہاتھ پیسہ آیا تو وہ خود کو جدید ترقی سے ہم آہنگ کرنے میں جُت گئے ہیں مگر روایت سے اب بھی ان کا مضبوط تعلق برقرار ہے۔ انہی روایات میں گینڈے کے سینگ بھی ہیں۔ ترقی، جدّت اور مالی خوشحالی کے باوجود وہ اس قدیم نظریے پر کاربند ہیں کہ ان سینگوں سے جسمانی بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ اب تک تو بخار، ملیریا اور کینسر کا سینگ سے رشتہ تھا مگر یہ دیکھ کر مجھ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ ویت نام کے ہر گھر میں یہ سینگ تمام امراض کا شافی اور مکمل علاج سمجھا جاتا ہے۔

گینڈے کے سینگ' ویت نام کی سماجی زندگی میں وہ قدرِ مشترک ہے، جس میں تمام طبقے یکساں ہیں۔ سینگ اور مساوات کی یہ مثال میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ویت نام میں ہی دیکھی تھی۔ اکثر کمزور مالی حیثیت والے خاندان مل جل کر پیسے اکٹھے کرتے ہیں اور پھر بیش قیمت سینگ کا چھوٹا سا ٹکڑا خرید کر اسے شراکت میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض صاحبِ حیثیت لوگ اپنے ایسے ملنے جُلنے والوں یا قریبی دوست احباب کو سینگ بطور تحفہ دیتے ہیں جو اس مہنگی ترین شے کو حاصل کر کے اپنی بیماریوں کا علاج کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ مائیں اپنے بچوں کو چیچک سے بچانے کے لیے انہیں سینگ کا استعمال کرواتی ہیں۔ بوڑھے لوگ ماشہ سے بھی بہت ہی کم مقدار میں اس کا سفوف استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح اُن کے جسم میں خون کی روانی بہتر ہوتی ہے اور وہ دل کے دورے سے بچ سکتے ہیں۔ کئی پڑھے لکھے ویت نامیوں کا خیال ہے کہ گینڈے کا سینگ اپنے اندر کئی اہم اور طاقتور وٹامنز کا بیش قیمت ذخیرہ رکھتے ہیں۔ یوں ان کا استعمال انسان کے اندر کیمیائی عدم توازن کو درست کر کے انہیں صحت مند بنا دیتا ہے۔

میں ویت نام کے کئی معروف ڈاکٹروں سے ملا اور سینگ کے طبّی خواص اور استعمال سے شفا کے بارے میں پائے جانے والے عمومی تصور کے حوالے سے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ کچھ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کینسر کو تو چھوڑیے، اس کے استعمال سے کسی بیماری کا بھی شافی علاج نہیں ہوسکتا۔ بعض نہایت قابلِ احترام معالجین کی رائے تھی کہ سینگ کے استعمال سے کینسر جیسے موذی مرض کے علاج میں گینڈے کا سینگ مکمل علاج نہیں بلکہ علاج کی صرف ایک دوا ہے، جس کے ساتھ دوسری دوائیں بھی استعمال کی جائیں، تب افاقہ ممکن ہے۔ کچھ ایسے معالجین بھی ہیں جو اپنے نسخوں میں جہاں مریض کے لیے کیموتھراپی اور ریڈی ایشن کی تجویز دیتے ہیں، وہیں سینگ کا استعمال بھی نسخے میں بطور دوا تجویز کرتے ہیں۔ ایسے معالجین کا کہنا ہے کینسر کے مغربی طریقۂ علاج کے ساتھ ساتھ سینگ کا استعمال مریض کے درد کی شدت کو کم کرنے میں مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

ویت نام کی وزارتِ صحت اپنے قانون میں دیسی طریقوں سے علاج کی اجازت دیتی ہے۔ ٹران قوک دیسی طریقوں سے علاج کرنے والے نیشنل اسپتال کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گینڈے کے سینگوں میں ایسے کیمیائی مادے موجود ہیں جو انسان کے جسم میں داخل ہو کر نہ صرف تباہ شدہ خلیوں کی مرمت کرتے ہیں بلکہ کینسر کے غدود کے پھیلاؤ کو بھی روکتے ہیں اور جسم میں ان کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرتے ہیں۔

''سب سے پہلے ہم مغربی طریقوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ہیں سرجری، کیموتھراپی اور ریڈی ایشن مگر اس کے بعد...'' ٹران قوک کچھ کہنے کے بجائے رک کر مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ ''مشاہدے میں آیا ہے کہ ان سب کے باوجود اکثر مریض کے جسم میں کینسر کے سیلز بدستور موجود رہتے ہیں۔ اس لیے ہم مریض کو دیسی دواؤں کا استعمال کرواتے ہیں تاکہ جدید علاج کے بعد، جسم میں کینسر کے جو سیلز باقی رہ جاتے ہیں، انہیں ختم کیا جاسکے۔''

ٹران قوک کا کہنا ہے کہ گینڈے کے سینگ کا سفوف، جن سینگ اور اسی طرح کی چند دوسری روایتی جڑی بوٹیوں کو ملا کر ایک دوا تیار کی جاتی ہے، جسے مریض کو استعمال کروایا جاتا ہے جو کہ حقیقت میں جسم میں موجود کینسر کے خلیوں کے پھیلاؤ کا راستہ روک کر انہیں ختم کرنا شروع کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے ٹران قوک نے یہ دعویٰ نہایت ٹھوس لہجے میں کیا مگر اب تک انہوں نے مغربی اور دیسی طریقۂ علاج کے بارے میں تقابلی تجزیے پر مشتمل کوئی طبّی مقالہ نہیں لکھا ہے، جس سے ان کے دعووں کی تصدیق ہوتی ہو۔

ہنوئی میں قیام کے دوران ایک شام میں اور تھائین جھیل کنارے بنے ریستوران میں گئے۔ یہاں ہم ڈنر کرنے نہیں بلکہ ایک خاص وجہ سے آئے تھے۔ اس ریستوران میں جانے کا مشورہ تھائین کو اُس کے ایک جاننے والے نے دیا تھا۔ وہ اسے لاحق کینسر کے عارضے سے واقف تھا۔ اندر پہنچ کر تھائین ریستوران کے مالک سے ملی اور اسے اپنی بیماری کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ تھائین کا احوال سننے کے بعد وہ ایک کمرے کے اندر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سینگ کا ایک ٹکڑا اور چینی مٹی سے بنا پلیٹ نما پیالہ

جس کی کھردری تہ پر گینڈے کی ڈرائنگ بنی تھی۔ اس نے پیالے میں کئی اونس پانی ڈالا اور سینگ کے ٹکڑے کو اس پر دائرے کے انداز میں ایسے رگڑنے لگا جیسے کھرل میں دستے سے کوئی شے نہایت آرام سے رگڑی جاتی ہے۔ کچھ ہی دیر میں سینگ کے اجزا پیالے کی کھردری تہ کی رگڑ سے گھس گھس کر پانی میں شامل ہونے لگے۔ پانی کا رنگ آہستہ آہستہ دودھیا ہوتا جارہا تھا۔ وہ ہماری میز پر بیٹھا پوری توجہ سے رگڑائی میں مصروف تھا اور میں غور سے اس کی کارروائی کا مشاہدہ کررہا تھا۔ اس وقت ریستوران میں کئی لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ہمارے قریب بھی لوگ بیٹھے تھے مگر حیرت انگیز طور پر کسی شخص نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے..... اُن کے لیے یہ معمول کی بات تھی یا پھر اس میں اُن گاہکوں کے لیے حیرت کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

''میں اور میرے ایک دوست نے حصہ ڈال کر 180 گرام وزنی سینگ کا یہ ٹکڑا اٹھارہ ہزار امریکی ڈالر کے مساوی رقم میں خریدا تھا۔'' رگڑائی کے دوران مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ریستوران مالک نے بتایا۔ ''میں سینگ کے مشروب کو عام طور پر سر درد اور جسمانی قوت کے لیے بطور سپلیمنٹ استعمال کرتا اور کرواتا ہوں۔'' جھیل کنارے واقع یہ عام سا ریستوران ہے مگر اس کے مالک 'ھو' کے لیے سینگ کا مشروب کمائی کا اہم ذریعہ ہے۔ ''میں نے سینگ کی خریداری پر جو رقم صرف کی تھی، وہ تو نکل آئی۔ اب جو کچھ ملتا ہے وہ میرا خالص منافع ہے۔'' اس نے ایک سوال کے جواب میں بڑی رازداری سے میرے کان کے قریب اپنا منہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ ریستوران سینگ کے درد کشا اور طاقتور مشروب کے لیے تیزی سے مشہور ہورہا ہے۔ یہاں اکثر لوگ صرف اسے ہی پینے کے لیے آتے ہیں۔ اس کے مستقل گاہکوں میں اعلیٰ سرکاری افسران بھی شامل ہیں۔

''ایک سابق سیکریٹری تو اس مشروب کا دیوانہ ہے۔ وہ ہر روز صرف اسے پینے کے لیے ہی میرے ریستوران میں آتا ہے۔'' 'ھو' نے بڑے فخر سے مجھے بتایا۔ میں نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔ ابھی وہ مشروب تیار کررہا تھا کہ ایک ویٹر نے آکر اسے بتایا کہ دو اور گاہک پہنچ چکے ہیں۔ ''اِن دونوں کے بعد اُن کا نمبر آئے گا۔'' اس نے رگڑائی کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر ویٹر سے کہا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے سینگی مشروب کا دھندا واقعی بہت پھل پھول رہا ہے۔

تقریباً بیس منٹ تک رگڑائی کے بعد سادہ پانی دودھ جیسے گاڑھے مشروب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے چائے کے چمچ سے ذرا سا مشروب نکال کر چکھا۔ ''اب یہ تیار ہو چکا۔'' اس نے سینگ کا ٹکڑا خالی پلیٹ میں رکھا اور دو چھوٹے گلاسوں میں مشروب ڈال کر ایک مجھے اور دوسرا تھائین کو پیش کیا۔ مجھے پینے میں کچھ پس وپیش تھا مگر تھائین نے گلاس تھاما، آنکھیں بند کیں اور سیکنڈوں میں اسے حلق سے معدے میں اُنڈیل لیا۔ ''مجھے امید ہے یہ کام کرے گا۔'' اس نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے بھی بڑی ہمت کر کے گلاس تھاما اور 'مجبوری کا نام شکریہ' کہتے ہوئے اس گاڑھے، دودھیا مائل سیال کو پی گیا۔ وہ بالکل بے ذائقہ تھا۔ مجھے ذرّہ بھر بھی احساس نہیں ہوا کہ میں کیا پی گیا ہوں۔

☆☆☆

جان ہیوے کا کہنا ہے کہ ویت نام میں گینڈے کے سینگوں کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ گینڈے کو مار کر ہی انہیں حاصل کیا جائے۔ گینڈے کو مارے بنا بھی سینگ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

انہتر سالہ جان ہیوے چھوٹے پیمانے پر کئی کاروبار کرنے کے بعد ان دنوں شکار کے لیے جنگلی جانوروں کی فارمنگ کا کاروبار کررہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ہوٹل کھول چکے ہیں اور ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی کر چکے ہیں۔ اس وقت جنوبی افریقا میں اُن کے دو نجی فارم ہیں جہاں پر گینڈوں کی افزائش کررہے ہیں۔ ان کے فارم پر سفید اور سیاہ مائل گینڈوں کی تعداد سات سو سے تجاوز کر چکی ہے، جس میں وہ مزید اضافے کے لیے کوشاں ہیں۔

''ہم بھیڑوں کو مارے بغیر اُن سے اون حاصل کرسکتے ہیں تو پھر گینڈے کو مارے بغیر اُن کے سینگ کیوں نہیں لے سکتے؟'' میں نے اُن کی رائے جاننے کے لیے سوال کیا تھا مگر انہوں نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا مجھ سے سوال کیا۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟'' مجھے اُن کی بات سن کر حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی۔ اُس سہ پہر میں جان کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا جو ان کے ایک فارم کی حدود میں ہی بنا ہوا ہے۔

''بالکل ممکن ہے۔'' جان نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر سینگ کو جڑ سے تین انچ اوپر سے کاٹا جائے تو قدرتی طور پر وہ دو سال کے اندر اندر وہ واپس اپنے اصل حجم کے برابر بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے سینگ خود بخود بڑھنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ کئی سینگ دار جانوروں میں یہ قدرتی صلاحیت شاید موجود نہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے چند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر کہنے لگے۔ ''اگر ہم ذرا عقل سے کام لیں تو نہ صرف جانور زندہ رہ سکتا بلکہ اس کے سینگ بھی۔ ہم جانور کو بے ہوش کر کے یہ کام کر سکتے ہیں اور تم جانتے ہی ہو گے کہ اب تو شیر جیسے خطرناک جانور کو بھی بے ہوش کر کے پکڑ کر علاج کر دیا جاتا ہے۔ جب ذرا سی عقل استعمال کر کے سب کچھ کیا جا سکتا ہے تو بے چارے جانور کا خون کیوں بہایا جائے؟''

اس ملاقات کے دو ہفتوں..... بعد میری آنکھوں کے سامنے جان نے اپنے فارم پر ایک بالغ گینڈے کو جنگلی حیات کے ایک ماہر کے ذریعے تیر سے نیند کا انجکشن دے کر بے ہوش کیا اور پھر بجلی سے چلنے والی آری سے اس کے سینگ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا کاٹ لیا۔ ''اب دو سال بعد یہ سینگ پھر اس جیسا ہو جائے گا۔'' جان نے اپنے ہاتھ میں موجود سینگ مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

سینگ کاٹنے کے بعد اس کا منیجر عملے کے ساتھ مل کر بے ہوش گینڈے کو واپس فارم میں منتقل کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ''یہ آدھا گھنٹے بعد نیند سے بیدار ہو جائے گا۔'' نیند کا انجکشن لگانے والے اہلکار نے منیجر سے کہا۔ ''اب اسے جتنا جلد ہو سکے، فارم پر منتقل کر دو۔''

''دیکھو، اسے کہتے ہیں عقل کا استعمال۔'' جان نے ایک بار پھر مجھ سے گفتگو شروع کر دی۔ ''فیکٹری بھی سلامت ہے اور تیار مال بھی مل گیا۔''

بیس منٹ کے اندر اندر ساری کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ جانور فارم پر بھیجا گیا اور سینگ بینک کے لاکر میں۔

میں نے جان سے پوچھا کہ 2002ء میں گینڈا فارمنگ شروع کرنے کے بعد سے اب تک وہ کتنے سینگ حاصل کر چکے ہیں؟ مگر انہوں نے جواب دینے سے گریز کیا۔ شاید وہ یہ بات اس لیے بتانے سے گریزاں تھے کہ میں سینگوں کی تعداد سے کہیں ان کی دولت کا اندازہ نہ لگا لوں۔ خیر مجھے ان کی دولت سے کوئی غرض نہیں تھی پھر بھی میرے ذرائع کے محتاط اندازوں کے مطابق اب تک وہ سینگوں سے لاکھوں کما چکے ہیں۔

جان ہیوے کاروباری آدمی ہے۔ ان کا کاروبار بیک وقت منافع بخش کاروبار اور جنگلی حیات کے تحفظ اور پائیدار استعمال کی عمدہ مثال ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جنگلی حیات کی بقا کے ساتھ اُن سے بڑے پیمانے پر معاشی فوائد حاصل کیے جا سکتے مگر افریقا میں جان ہیوے کا یہ خیال بالکل ہی نیا یا انوکھا نہیں۔

1961ء میں یہ تصور جنوبی افریقا میں پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔ جس کے تحت نتال صوبہ کی انتظامیہ نے گینڈوں کی افزائش کے لیے کافی بڑی تعداد میں انہیں نجی ملکیت کے فارم پر منتقل کر دیا تھا۔ جس کا مقصد ایک طرف تو ان کی افزائش تھی تو دوسری طرف نجی فارموں کے مالکان کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ ایک خاص حد سے تجاوز کرنے کے بعد وہ ان کے سینگوں کے حصول کے لیے انہیں شکار کر سکتے ہیں۔

1981ء میں نتال کے جنگلوں کا انتظام چلانے والے بورڈ نے اس بات کی اجازت دی تھی کہ خاص تعداد سے تجاوز کرنے والے گینڈوں کو اُن کے سینگوں کی کھلی مارکیٹ میں لگنے والی قیمت کے مطابق نیلام کر دیا جائے۔ اس نیلامی سے سرکار کو لاکھوں ڈالر ملے۔ جس سے جنوبی افریقا میں جنگلی حیات کی بقا اور تحفظ کے لیے کی جانے والی کوششوں پر اٹھنے والے اخراجات با آسانی مہیا ہو گئے تھے۔ اس نیلامی سے پہلی بار جنوبی افریقا میں گینڈے اور اس کی قدر میں اضافہ ہوا۔ لوگ سمجھ گئے کہ بے ڈھب سے اس جانور میں کتنی دولت پوشیدہ ہے۔

''میرے خیال میں ہمیں لوگوں کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے سنجیدہ کوششیں کرنی چاہئیں کہ گینڈے کے تحفظ میں اُن کی خوشحالی پوشیدہ ہے۔'' جب میں جان ہیوے کے فارم سے رخصت ہو رہا تھا، تب انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''ہمیں گینڈے کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اسے مارے بغیر سینگ کے حصول کی طرف آنا چاہیے۔ ایسا نہ کیا تو پھر ایک وقت آئے گا جب نہ تو گینڈا بچے گا اور نہ ہی اُس کے سینگ مگر پیسے کی بھوک پھر بھی موجود رہے گی تو پھر کیوں ہم سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کر کے بعد میں روتے پھریں۔''

جان ہیوے کا مشورہ بہت قیمتی اور نہایت مناسب تھا۔ افریقی پسماندگی کا علاج پائیدار ذرائع معاش میں مضمر ہے۔ ان لوگوں کے لیے جان ہیوے ایک مثال ہے اگر وہ اس کی پیروی کرنا چاہیں تو...

''ایسا ہو سکتا ہے مگر اس میں ایک بڑی رکاوٹ جنوبی افریقا کا قانون ہے۔'' ایک معروف قانون داں کو جب میں نے جان ہیوے کی تجویز سنائی تو اس نے کہا۔ ''یہ بہت مناسب ہے کہ ایک ویت نامی شکاری آئے۔ گولی کے بجائے دوا والا تیر چلائے۔ گینڈا جونہی بے ہوش ہو، اس کا سینگ کاٹے اور اسے لے کر خوشی خوشی چل دے مگر جنوبی افریقا کے قانون پر چلو تو ٹرافی ہنٹنگ اجازت نامے کی تحریر کے مطابق شکاری پر لازم ہے کہ وہ شکار کو جان سے

مار دے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''جان ہیوے کی تجویز بہت مناسب ہے۔ ہمیں اس کے لیے قوانین میں بھی منطقی طور پر ترمیم کرنا ہوگی اور ایسے الفاظ کو نکالنا ہوگا، جس سے شکار کو جان سے مارنا لازم ٹھہرتا ہو۔''

جان ہیوے کی تجویز بہت درست ہے لیکن کچھ بے خبر اس کے ناقد بھی ہیں۔ وہ گینڈے کے سینگ اور ہاتھی دانت کے حصول کو ترازو کے ایک ہی پلڑے میں ڈالتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ ہاتھی دانت اگر ایک دفعہ نکال لیے جائیں تو وہ پھر کبھی نہیں نکلتے مگر گینڈے کے سینگ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں۔ سینگ کیراٹن مادے کا بنا ہوتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جس سے ناخن بنتے ہیں اور کاٹنے کے باوجود مسلسل بڑھتے رہتے یا پھر گھوڑے کے سم جو کہ مستقل بڑھتے رہیں۔ اس طرح اگر سینگوں کو بار بار بھی کاٹا جائے تو وہ تب تک بڑھتے رہیں گے جب تک گینڈا زندہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہاتھی کو تیر کے ذریعے نیند آور دوا دینا بہت مشکل ہے۔ اُس کی جان جا سکتی ہے مگر تجربے سے ثابت ہوا کہ گینڈے کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ وہ بے ہوشی کے تیر کے بعد آدھا گھنٹے کے اندر اندر دوبارہ بیدار ہو کر نارمل ہو جاتا ہے۔

جنوبی افریقا میں چند روایت اور رجعت پسند افریقی گروہ بھی جان ہیوے کے مخالف ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ سینگ کے حصول کے لیے گینڈے کو مارنا ضروری ہے۔ اس مخالفت کا ایک پس منظر بھی ہے۔ ویت نامی تاجروں یا سینگ مافیا کو صرف سینگ سے غرض ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ سینگ، گینڈے کو مارے بغیر حاصل کیے جائیں یا مار کر۔ جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کے بعض مقامی اہلکاروں کا کہنا ہے کہ مقامی افریقی شکاریوں نے خود ویت نامیوں کو یقین دلایا ہے کہ سینگ کے لیے لازم ہے کہ گینڈے کو مارا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے افریقی روایت ہے کہ اگر گینڈے کے سر کو کاٹ کر گھر میں بطور آرائش کے رکھا جائے تو اس کی وجہ سے اُس گھر میں بسنے والا خاندان تمام ماورائی قوتوں اور نحوستوں سے نہ صرف پاک اور محفوظ رہتا ہے بلکہ گھر میں خوشحالی آتی ہے اور انہیں کبھی خوراک کے لیے جانوروں کی کمی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ سینگ کے ساتھ ساتھ موقع ملنے پر شکاری گینڈے کا سر بھی کاٹ لیتے ہیں اور اسے بھی بیچ ڈالتے ہیں۔ کچھ اس لیے بھی گینڈے کی ہلاکت پر اصرار کرتے ہیں کہ اُس کی آنکھ نکال کر کالے جادو کے عاملوں کو فروخت کر سکیں۔ جس کے عوض غیر قانونی شکاریوں کو اچھی خاصی رقم بونس میں مل جاتی ہے۔ اس تناظر میں جنگلی حیات کی بقا کے لیے سرگرم اداروں کو تشویش ہے کہ جان ہیوے کی تجویز تو اچھی ہے مگر گینڈے کے ساتھ جڑی غلط افریقی روایات کے باعث یہ بہت مشکل ہے کہ گینڈوں کے غیر قانونی شکار کو مکمل طور پر روکا جا سکے۔ تجارت اور دولت تو گینڈے کی جاں بخشی کے لیے تیار ہے مگر یہ قدیم روایات... صدیوں پرانی روایت کو بدلنے کے لیے شاید اگلی کئی صدیاں درکار ہوں گی۔ بس یہی بات افریقا میں گینڈے کی بقا پر سب سے بڑا سوالیہ نشان بھی ہے۔

☆☆☆

رات کافی ہو چکی تھی۔ ڈیمن مینڈر نہایت احتیاط سے جنگل میں بستا اور اس کے بچھڑے کی تلاش اور گولی چلانے والے شکاریوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر تاریکی، درندوں کا ڈر، وسیع جنگل اور پھر اچانک بارش... تیز بارش میں اس کے لیے واپس پلٹنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا، وہ بینز کو لے کر واپس کیمپ میں آ گیا۔

دوسرے دن ڈیمن پھر بستا کی تلاش میں نکلا۔ بارش نے ممکنہ طور پر گزشتہ رات غیر قانونی شکار ہونے والے گینڈے کے خون کے نشانات اور شکاریوں کے قدموں کے نشانات مٹا دیے تھے۔ کیچڑ کے باعث اس کا آگے بڑھنا ممکن نہ تھا، وہ ناکام پلٹ آیا۔ بستا اور اس کا بچھڑا بدستور لاپتا تھے۔

ڈیمن نے امریکا' عراق جنگ کے دوران خدمات انجام دی تھیں۔ اس نے ملازمت کے دوران اپنی ساری تنخواہ بچا کر اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی۔ عراق سے واپسی کے بعد اس نے فوج کی ملازمت چھوڑی اور جب وہ زمبابوے آیا تو اسے بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ اگر گینڈے کے تحفظ کے لیے موثر عملی کوششیں نہ کی گئیں تو غیر قانونی شکار اسے ناپید کر دے گا۔ اسی احساس کی بنیاد پر اس نے پہل کی۔ ڈیمن نے ملازمت کے دوران پس انداز رقم سے Anti Poaching Foundation قائم کی۔ اس نے جدید ترین فوجی تربیت کے اصول پر رینجرز کو منظم کیا اور فاؤنڈیشن کے پیسوں سے اُن کے لیے جدید آلات اور اسلحہ خریدا۔ اس نے فاؤنڈیشن کے تحت مقامی آبادیوں میں سے رینجرز بھرتی کیے۔ وہ چاہتا ہے کہ 'پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ' کے اصول پر گینڈوں کے تحفظ کے لیے مقامی سطح پر اقدامات کرے۔ اب تک وہ اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ وہ مقامی لوگوں میں آگاہی بیدار کرنے کی بھی کوشش کر رہا ہے۔ ڈیمن مقامی باشندوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باور کروارہا ہے کہ زندہ جانور مردہ جانور سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ بھی جان ہیوم کے خیال سے متفق ہیں مگر مقامی آبادیوں کی فرسودہ ثقافتی روایتوں سے بھی آگاہ ہے۔ اس لیے وہ ان کے فرسودہ تصورات اور رسموں کو تبدیل کرنے کے لیے بھی مؤثر کوششوں میں مصروف ہے۔

''لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔'' اُس روز کیمپ میں آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہم باتیں کررہے تھے، تب ڈیمن نے کہا۔ ''لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ عراق میں امن ممکن نہیں، امریکی فوجیں واپس نہیں جائیں گی۔ جب وہاں یہ سب کچھ ہوسکتا ہے تو یہاں گینڈے کا غیر قانونی شکار کیوں نہیں روکا جاسکتا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ بہت پُراعتماد نظر آرہا تھا۔ ''بس! یہی وہ امید ہے جو مجھے یہ سب کچھ کرنے کا حوصلہ دے رہی ہے۔''

☆☆☆

گدون سے میری آخری ملاقات کے چار ماہ بعد وہ جیل سے رہا ہوگیا۔ اس نے پولیس کو صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے متعلق کوئی بیان نہیں دے گا۔ البتہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کے لیے وہ خود شکار نہیں کرے گا بلکہ غیر قانونی شکاریوں کی گرفتاری اور گینڈے کے تحفظ کی کوششوں میں سرکار کی مدد کرے گا۔ اسی بنا پر عدالت نے اسے معمولی سزا دے کر رہا کردیا۔ پولیس کو بھی غیر قانونی شکار کی مؤثر روک تھام کے لیے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ گدون کے انکار کے بعد گیرات سائی من کے خلاف بھی تفتیش ختم کردی گئی۔ اس نے بھی سکھ کا سانس لیا اور اس دھندے سے تائب ہوگیا۔ وہ جان چکا تھا کہ اب پولیس کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے لیے یہ دھندا کرنا ناممکن ہوچکا تھا۔

جان ہیوم بدستور گینڈے کی افزائش میں مصروف ہے۔ وہ گینڈے کے غیر قانونی شکار کے لیے بھی سرگرم ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ میرے جنوبی افریقا سے روانگی سے کچھ روز پہلے کچھ شکاریوں نے اس کے چار گینڈے چوری چھپے مار ڈالے اور سینگ لے کر فرار ہوگئے۔

تھائین کے ڈاکٹروں نے اسے بتایا ہے کہ تازہ ترین ٹیسٹ کے بعد پتا چلا ہے کہ کینسر کے غدود کے پھیلنے کی رفتار بہت سست پڑ چکی ہے۔ تھائین کا خیال ہے کہ یہ سینگی مشروب کی بدولت ہوا۔ اس کے مرنے کا خوف قدرے کم ہوچکا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مشروب کے ساتھ ساتھ مشرق کی دیسی اور مغرب کی جدید دوائیں بھی استعمال کررہی تھی۔ اب یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ افاقہ کس دوا سے ہورہا ہے۔

☆☆☆

میرا ریسرچ پراجیکٹ مکمل ہوا تو زمبابوے سے روانگی سے پہلے میں ڈیمن سے ملنے گیا۔ وہ اور بینز مجھے جنگل میں لے گئے۔ وہ دونوں مجھے گھنی جھاڑیوں کے اندر سے چلاتے ہوئے ایک جگہ پہنچے جہاں باستا آرام کررہی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک نوزائیدہ بچھڑا بھی نظر آرہا تھا۔ اس سے چند قدم دور ایک اور بڑا بچھڑا تھا۔ وہ بھی باستا کا تھا۔

''اُس روز خوش قسمتی سے باستا اور اس کا بچھڑا تو شکار ہونے سے بچ گئے مگر افسوس کہ ایک دوسرا گینڈا مارا گیا تھا۔'' ڈیمن نے مجھے اُس دن پیش آنے والے واقعے کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ بیک وقت خوش اور افسردہ تھا۔

''کتنا پیارا بچہ ہے۔'' ڈیمن نے نومولود کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

'ذرا سوچو، گینڈے کی نسل زمین پر چالیس ملین سال سے موجود ہے مگر ہم ایک چھوٹے سے سینگ کے لیے اس قدیم ترین جانور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں جو ہم سے بھی ہزارہا سال پہلے سے اس زمین کا مالک ہے۔''

ایک فوجی کے منہ سے بقا اور مفاہمت کا یہ فلسفہ سن کر میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میری نظر اس کے بازو پر پڑی۔ اس پر ایک اور ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ ''شکار کرو مگر بچاؤ بھی۔'' ٹیٹو کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ ''یہ کیا...'' میں نے ٹیٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

''تلاش کرو اور مار دو سے یہ زیادہ بہتر ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے دوسرا بازو میرے سامنے کردیا۔ اُس کے دوسرے بازو پر مزید کچھ نقش بنا کر وہ الفاظ مٹا دیے گئے تھے جو اس نے عراق جنگ سے پہلے بازو پر کھدوائے تھے۔ ''تلاش کرو اور مار دو۔''

جنگل نے ڈیمن کو زندگی کا وہ فلسفہ سمجھا دیا تھا جو اسے انسانوں کی دنیا میں سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''زندہ رہو اور جینے دو۔'' میں نے زیرِ لب کہا اور واپسی کے لیے مڑا۔ میں گرمیوں کی اُس سہ پہر میں زمبابوے کے جنگل سے جارہا تھا اس دعا کے ساتھ کہ جیسے ڈیمن کا نظریہ بدلا، سارے افریقیوں کی گینڈے سے جُڑی ہر روایت بھی اسی طرح بدل جائے راتوں رات۔

شہریوں کا شہر

ایس جی یزدانی

دوسرا اور آخری حصّہ

سفر وسیلہ ظفر ہی نہیں وسیلۂ معلومات بھی ہے۔ اس شہر کا سفر کرکے معلومات کا خزانہ ہاتھ آیا۔ لوگ کس طرح قانون کا احترام کرتے ہیں اور احترام قوانین کیسے زندگی کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اس کا ادراک ہوا۔ وہ ملک جہاں پانی ضائع کرنا قابل دست اندازی پولیس ہے۔ جہاں اگر بجلی چلی جائے تو حکومت ہرجانہ ادا کرتی ہے۔ جہاں پہنچ کر مسلمانوں نے عظیم الشان مساجد کی تعمیر کی، جہاں کا نظام قابلِ تعریف ہے مگر اس دیس میں وہاں کے اصل باشندوں کو ہی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

اس ملک میں جنگلی درندے ناپید ہیں حتیٰ کہ بندر تک ناپید ہیں۔ پرندوں کے معاملے میں بھی یہ ملک خصوصی اہمیت کا حامل ہے دنیا کے کسی ملک میں اتنے اقسام کے چھوٹے بڑے اور رنگ برنگ پرندے، جن کی تعداد کا اندازہ مشکل ہے، یہاں پائے جاتے ہیں۔ ملبورن سے نزدیک ایک اوپن زو میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن جا کر مایوسی ہوئی۔ ڈھنگ کا کوئی جانور نہیں ملا۔ میں یہاں کے نیشنل زو میں نہیں گیا۔ ہوسکتا ہے یہاں شیر، ہاتھی قسم کے جانور بھی ہوں۔ زو سے واپسی میں ہم لوگ ایک سرسبز پارک میں ٹھہر گئے۔ ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ واش روم سے وضو بنا کر ہم لوگوں نے میدان میں نماز عصر ادا کی۔ یہاں وہاں ٹیبل اور بینچ بچھی ہوئی تھیں انہی میں سے ایک پر ہم بیٹھ گئے۔ بہت سارے خوبصورت طوطے درختوں سے اتر کر ہمارے قریب اُچھل کود کرنے لگے۔ ہم بسکٹ کھا رہے تھے، ان کی طرف ٹکڑوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں پھینکا تو آگئے اور چن کر کھانے لگے۔

ایک پہاڑی پر چھوٹی لائن بچھی ہوئی ہے۔ اس پر تفریحی ٹرین Billy Puffing چلتی ہے۔ یہ ٹرین 1900ء سے چل رہی ہے۔ شروع میں یہ ٹرین مال برداری اور عمدہ لکڑیوں کو ملبورن لانے کے لیے بنائی گئی تھی۔ Dandenong پہاڑی کو 1987ء میں نیشنل پارک بنادیا گیا۔ اسی کی ترائی میں Belgreve واقع ہے وہاں سے یہ ٹرین Gembrook تک جاتی ہے۔ نیشنل پارک بن جانے سے لکڑیوں کے کاٹنے کا کام بند ہوگیا۔ Belgreve ملبورن سے مشرق میں صرف چالیس کلومیٹر دور ہے۔ اسی اسٹیشن سے ہم لوگ ٹکٹ لے کر چھوٹی چھوٹی بوگیوں میں سے ایک میں بیٹھ گئے۔ بوگیوں کی چوڑائی پانچ چھ فٹ اور لمبائی دس بارہ فٹ تھی، گدے دار بوگیاں بہت آرام دہ تھیں۔ کھڑکیوں سے پہاڑی کا سرسبز نظارہ کرتے ہوئے ہم سفر کرتے رہے۔ دور و نزدیک کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں آخری اسٹیشن Gembrook پہنچ گئے۔ اس جگہ ویٹنگ روم اور ایک ریسٹورنٹ بھی تھا۔ ہم لوگ اُتر کر جھیل کی طرف نکل گئے۔ جھیل میں سیر کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دو سیٹر پیڈل کشتیاں کرائے پر مل جاتی ہیں۔ بیٹا اور بہو نے کشتی رانی کی اور ہم لوگ جھیل کنارے سبزے پر بیٹھ کر ہلکا ناشتا کرتے رہے اور چائے پیتے رہے۔ دو گھنٹے بعد ہی ٹرین نے سیٹی بجائی جو واپس جانے کے لیے اطلاع تھی۔ ہم بھی واپسی کے لیے ٹرین میں سوار ہوگئے۔

آسٹریلیا عیسائیوں کا ملک ہے لہٰذا ملبورن میں سیکڑوں کی تعداد میں گرجے ہیں لیکن یہ گرجا گھر ہمیشہ ویران رہتے ہیں۔ اتوار کو چند بوڑھے بوڑھیاں سروس کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ دین سے بیزار ہے۔ خدا کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے لیکن سمجھتے ہیں کہ تمام ترقیاں، کامیابیاں اور خوشحالی ان کی عقل و شعور اور صرف ان کی محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ جنت خود بنائی ہے۔ البتہ ہماری ترقی اور طرزِ رہائش کو دیکھ کر مسلمانانِ عالم جلتے ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملبورن میں اخباری رپورٹوں سے یہاں کی صحیح صورتِ حال کا پتا چلتا ہے۔ اخبار Fair Fax کی 16 اگست کی اشاعت میں جرائم کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اخبار کے مطابق گزشتہ سال کی نسبت سال رواں میں عورتوں کے ساتھ زیادتی اور اغوا کی وارداتوں میں اضافہ ہوا۔ یہ رپورٹ ملبورن کی مورلینڈ سٹی کونسل کے علاقے کی ہے۔ جرائم میں اگرچہ کمی ہوئی ہے لیکن زیادتی کے 726 اور اغوا کے 24 کیس ریکارڈ کیے گئے۔ زنا 9.8 فیصد بڑھ گئے جو 493 افراد کے ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ 237 افراد ڈرگ کے استعمال میں پکڑے گئے جو 33.9 فیصد بڑھا ہوا تھا۔ چوریاں گزشتہ سال کی نسبت کم ہوئیں۔ غرض کہ مورلینڈ کونسل کے علاقے میں کل 10,309 کیس ریکارڈ ہوئے جبکہ گزشتہ سال یہ اعداد 11,024 تھے۔

14 نومبر کو ملبورن میں انڈسٹریل ورکرز کی ہڑتال منائی گئی۔ اس دن چھٹی تھی۔ اخبار کے مطابق 4 لاکھ سے زیادہ ورکرز کی ہڑتال میں شرکت کی اُمید تھی لیکن ڈیڑھ لاکھ کے قریب لوگ ملبورن سٹی کے علاقے میں جمع ہوئے اور اسی علاقے میں گھومتے پھرتے رہے۔ انہوں نے پلے کارڈز اور بینرز اُٹھا رکھے تھے۔ کسی قسم کی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔ کوئی ہلڑ بازی نہیں ہوئی، نہ کہیں جلاؤ گھیراؤ ہوا، نہ ٹائر جلائے گئے اور نہ گاڑیاں۔ عمارتوں کے شیشے بھی محفوظ رہے۔ یہ ایک پُرامن مظاہرہ تھا جہاں پولیس کی نفری بھی کم تھی۔ اس دن بس، ریل اور ٹرام فری تھے۔

انہی دنوں ملبورن ہارس ریس کپ کی دوڑ ہوئی۔ یہاں اسے بڑھ چڑھ کر اور خاصی گہما گہمی سے مناتے ہیں۔ لگتا تھا کہ پورا شہر دوڑ دیکھنے کو نکل کھڑا ہوا ہے۔ اس دن ملبورن میں عام تعطیل ہوتی ہے۔

حکومت غیر ممالک سے ہنر مند افرادی قوت درآمد کرتی ہے۔ اس حوالے سے Kelvin Thomson جو فیڈرل ممبر ہیں، ان کی ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا ''ہنر مند افرادی قوت درآمد کرنا مسئلے کا حل نہیں..... آسٹریلینز کو ہنر مند بنائیں'' رپورٹ میں بتایا گیا کہ غیر ممالک سے آنے والوں کی تعداد پچھلے سال کی نسبت چار گنا بڑھ گئی ہے۔ یہ تعداد 24,100 سے بڑھ کر 97,500 تک ہوگئی۔ یہ اتنا بڑا جمپ ہے کہ تمام Migration لیول کی تعداد ہاورڈ (وزیراعظم) کی حکومت کے پہلے سال (1996) میں 73,900 سے بڑھ کر 146,500 تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں کی یونیورسٹیوں میں دوسرے ممالک سے آنے والے طلبہ کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔

1996ء میں 20 ہزار طلبا آئے تھے جبکہ 2003ء تک طلبہ کی تعداد 36 ہزار ہوگئی یعنی 125 فیصد اضافہ ہوا۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ حکومت غیر ممالک کے طلبا

کو اس لیے بھی خوش آمدید کہتی ہے کہ یہ لوگ پوری فیس پہلے ہی جمع کرا دیتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں بالخصوص جوانوں میں بے روزگاری کی شرح بڑھ جانے کی وجہ سے بے چینی پائی جانے لگی ہے۔

شہری اور بلدیاتی انتظامی امور کے تحت ملبورن شہر کئی سٹی کونسلز اور روورل کونسلز میں منقسم ہے۔ ملبورن سٹی سے مراد ملبورن کا تجارتی سینٹر اور مرکز ہے جہاں رہائشی علاقہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کوبرگ کا علاقہ جہاں ہماری رہائش تھی، سٹی سے چھ یا سات کلومیٹر دور ہے۔ یہ علاقہ مورلینڈ سٹی کونسلز کے زیرِ انتظام ہے۔ ہر سال کونسل ایک کمیونٹی ڈائرکٹری شائع کرتی ہے اور اپنے علاقے کے ہر گھر میں مفت بانٹتی ہے۔ اس ڈائرکٹری میں علاقے کے بارے میں تفصیلی رپورٹ ہوتی ہے۔

مورلینڈ سٹی کونسل کے دائرہ اختیار میں وہ تمام اہم امور شامل ہیں جن کا تعلق براہِ راست علاقے کے مکینوں سے ہے۔ شہریوں کو صاف ستھرا ماحول مہیا کرنا، سڑکوں اور فٹ پاتھوں کی نگہداشت کرنا، پارک اور باغوں کا خیال رکھنا، ٹریفک اور گاڑیوں کی پارکنگ پر کنٹرول رکھنا، ہیلتھ سروسز کے تحت تمام مراکز کی دیکھ بھال کرنا، اسپورٹس کے مواقع فراہم کرنا، مختلف نوعیتوں کے کمیونٹی مراکز اور بزرگ شہریوں کے مراکز کا انتظام کرنا، تعلیم کے شعبے کو دیکھنا اور طلبہ کو سہولتیں بہم پہنچانا۔ پالتو جانوروں کے دواخانے اور گم شدہ پالتو جانوروں کے مراکز سنبھالنا۔ اس کے علاوہ مذہبی، ثقافتی انجمنیں جو علاقے میں قائم ہیں اور جو کونسل سے منسلک ہیں، انہیں سہولتیں اور امداد دینا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ بچے اور بے سہارا خاندانوں کی نگہداشت کرنا، معذور اور بزرگ شہریوں کے مراکز کی دیکھ بھال کرنا۔ آرٹ اور کلچرل پروگرامز منعقد کرانا۔ بچوں کو تفریحی سہولتیں مہیا کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ لائبریری، کمیونی کیشن اور ٹرانسپورٹ کے معاملات کو ٹھیک رکھنا۔ تفریحات کھیلوں اور نوجوانوں کی دلچسپیوں اور مسائل حل کرنا، وغیرہ وغیرہ، کونسل کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ شہروں میں صفائی کا ہوتا ہے۔ اس شہر میں کہیں بھی گندگی، پلاسٹک کی تھیلیاں اور کوڑا کرکٹ نظر نہیں آتا۔ نہ کہیں کوئی ٹوٹی پھوٹی سڑک ہوتی ہے، نہ مٹی، نہ گرد و غبار، نہ کبھی کوئی گٹر اُبلتا ہے اور نہ بارش کا پانی کسی سڑک پر کھڑا ہوتا ہے۔ تمام باتوں کی پیش بندی کر کے پلاننگ کی گئی ہے جس کی وجہ سے شہریوں کو کسی قسم کی پریشانی یا کوفت نہیں ہوتی۔

من وسلویٰ جسے ''ترنجبین'' بھی کہتے ہیں

ایک قسم کی میٹھی شبنمی گوند تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بھٹکنے والے اسرائیلیوں کے لیے غذا کے طور پر نازل کیا تھا۔ یہ گوند درختوں کے پتوں پر جمع ہوجاتی اور بنی اسرائیل اسے اکٹھا کر کے کھاتے بعض مفسرین کے مطابق یہ کوئی غیر طبعی چیز نہ تھی بلکہ پودوں سے حاصل کردہ قدرتی غذا تھی جو بہت شیریں اور لذیذ تھی (مگر عام درختوں مثلاً کیکر وغیرہ کی گوند کی طرح نہ تھی جو ذائقے میں پھیکی ہوتی ہے، بلکہ شیریں تھی) اس پر بڑی تفصیل کی ضرورت ہے مگر اختصار کے ساتھ صرف یہ سمجھ لیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''من'' کا لفظ کئی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا تھا مثلاً کھمبی (ایک قسم کی مفید نباتات جو اکثر برسات میں ازخود پیدا ہوجاتی ہے اور اسے تل کر یا سالن وغیرہ بنا کر کھاتے ہیں۔ انگریزی میں اسے مشروم کہتے ہیں) جو قدرتی طور پر زمین میں اُگتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق وہ من کو سکھا کر پیس کر روٹی کی طرح بنا لیتے تھے۔ الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو مٹھائی اور بٹیر کے گوشت سے نوازا گیا جو ہر اعتبار سے ایک مکمل غذا تھی۔ صحرائے سینا اور اس کے آس پاس کا علاقہ بٹیروں کی مانند پرندوں کے لیے مشہور تھا مگر بنی اسرائیل کی قوم نے خدا کی عطا کردہ اس نعمت کی قدر نہ کی اور جلد ہی اناج اور ترکاریوں کا مطالبہ شروع کردیا۔ یاد رہے کہ من وسلویٰ کا نزول بھی معجزانہ حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس
تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

ہر گھر میں گھر کے نمبر کے ساتھ 3 فٹ اونچے ڈھکنوں والے مضبوط پلاسٹک کے کوڑے دان مہیا کیے جاتے ہیں۔ ساتھ میں تین عدد بڑے پلاسٹک کے کین دیے جاتے ہیں۔ ہر گھر میں اپنے کوڑے دان ہوتے ہیں، گھر کے کوڑے دان کے اندر کالے رنگ کے پلاسٹک بیگ فٹ کیے جاتے ہیں۔ اس میں گھر کا کچرا ڈالا جاتا ہے۔ جب پلاسٹک کی تھیلی بھرنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب ہوتی ہے تو اس کو اچھی طرح سے گرہ لگا کر باہر کے کوڑے دان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شیشیاں، بوتلیں، ڈبے، کاغذ و اخبار، گتے وغیرہ ان تین عدد پلاسٹک کین میں الگ الگ رکھ دیے جاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن مقرر ہے۔ لوگ رات ہی کو کوڑا دان اور پلاسٹک کین فٹ پاتھ کے ساتھ گرین بیلٹ پر رکھ چھوڑتے ہیں۔ گاڑی آتی ہے اور کچرا اُٹھا لیتی ہے۔ اس انتظام کی وجہ سے کوئی کچرا، پلاسٹک کی تھیلیاں، گتے، اخبار اور کاغذ کے ٹکڑے کہیں بھی نظر نہیں آتے، نہ گھر کے اندر، نہ گھر کے باہر۔ گھر اور باہر کی گھاس کاٹی جاتی ہے تو کٹی ہوئی گھاس کے لیے الگ پلاسٹک بن ہوتے ہیں جس میں صرف گرین ویسٹ ہی ڈالا جاتا ہے۔ اسے لینے دوسری گاڑی آتی ہے اور اُٹھا لے جاتی ہے۔ سوکھے پودے، لکڑیاں یا بارش اور ہواؤں میں گری ہوئی شاخیں بھی گرین ویسٹ کا عملہ لے جاتا ہے۔ جلتا ہوا سگریٹ یا جلتی تیلی کہیں بھی پھینکنا منع ہے۔

بزرگ شہریوں کا زبردست خیال کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی شہری 60 سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ وکٹورین سینئر سٹیزن کارڈ حاصل کر لیتا ہے۔ صرف اس کونسل کے زیرِ نگرانی ایک سو سے زیادہ بزرگ شہریوں کے مراکز قائم ہیں جہاں انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔ خواہ پنشن کی صورت میں ہو یا مسئلہ خوراک، لباس اور رہائش کا ہو، علاج معالجے کا ہو، ٹرانسپورٹ کا ہو یا تفریح کا ہو غرض کہ ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش اور دل بستگی کی تمام سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ مختلف کمیونٹی کے لوگوں نے بھی اس طرح کے مراکز قائم کیے ہیں جو امداد سے یا پھر کونسل کے تحت چلائے جاتے ہیں انہیں بھی وہ تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں جن کے کوائف کونسل کی ڈائریکٹری میں درج ہوتے ہیں۔

پالتو جانوروں کتے اور بلیاں سرِفہرست ہیں۔ لوگوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے پالتو جانوروں کی عمر 3 ماہ ہونے سے قبل کونسل میں رجسٹر کرائیں اور گلے کا پٹہ حاصل کر لیں۔ جانوروں کے بیمار ہونے کی صورت میں یا گم ہونے کی صورت میں حاصل شدہ پٹے کا نمبر حوالہ کے طور پر کام آتا ہے۔ گم شدہ جانوروں کے لیے بھی مراکز ہیں جہاں سے گم شدہ جانور واپس مل سکتے ہیں۔ جانوروں کی ٹریننگ کے سلسلے میں بھی کونسل مدد کرتی ہے۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ جس تعداد میں پالتو جانور ہیں اس حساب سے ہر سال تعداد دگنی تگنی ہونا لازمی ہے لیکن، ان کی بھی خاندانی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ نر جانوروں کو بھی کر دیا جاتا ہے۔

مورلینڈ سٹی کونسل کے زیرِ انتظام آرٹ اور کرافٹ کی بہت ساری گیلریز اور کلب موجود ہیں۔ لوگ آرٹ کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بہت سارے ڈانس اور میوزک سینٹر اور پیرا کی کے پول ہیں، کئی تھیٹرز اور ڈراموں کے لیے اسٹیج... موجود ہیں۔

شہر کی منصوبہ بندی بہت سوچ سمجھ کر کی گئی ہے۔ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ مین سڑکیں فاصلے سے ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں، ان دو مین سڑکوں کو اسٹریٹ ملاتی ہیں۔ یہ اسٹریٹ بھی سیدھی اور برابر برابر فاصلے پر ہوتی ہیں، ان کے درمیان میں زمین ہوتی ہے ان پر تعمیر شدہ عمارتیں سیدھ میں ترتیب سے نظر آتی ہیں۔ مکانات کشادہ ہوتے ہیں۔ ہر بلاک میں پارک ہوتے ہیں جن کی بہت اچھے انداز میں نگہداشت کی جاتی ہے۔

سڑکوں پر ٹریفک کی رفتار یکساں ہوتی ہے۔ سڑکوں کے کنارے ہر تھوڑی دور بعد کار کی اسپیڈ لکھی ہوتی ہے۔ اسپیڈ کی یکسانیت کی وجہ سے کاروں کی نہ ریسنگ ہوتی ہے، نہ کوئی عجلت سے کام لیتا ہے۔ گاڑیاں اپنے اپنے ٹریک پر رواں دواں ہوتی ہیں۔ ٹرام اور بسیں بھی انہی سڑکوں پر چلتی ہیں۔ ان کی رفتار بھی وہی ہوتی ہے جو ان کے آگے پیچھے کاروں کی ہوتی ہے۔ میں نے چھ ماہ یہاں گزارے لیکن ایک دن بھی کسی گاڑی کا ہارن نہیں سنائی دیا..... نہ دھواں چھوڑتی گاڑیاں دیکھیں، نہ ٹریفک جام۔ رش آور ہے تو کاروں کی قطاریں لمبی ہو جاتی ہیں۔ نہ بسوں اور ٹراموں میں دھکم پیل دیکھی، نہ اسٹاپ کے بغیر کہیں گاڑی ٹھہرتے دیکھی۔ بس اور ٹرام میں کوئی کنڈکٹر نہیں ہوتا، اکیلا ڈرائیور سنبھالتا ہے۔ ٹکٹ کی مشین اس کے قریب ہوتی ہے۔ گاڑی کی روانگی سے قبل لوگ لائن لگا کر سوار ہوتے ہیں اور ڈسپلن کے ساتھ باری باری ٹکٹ لیتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ بس یا ٹرام کے گیٹ لاک ہو جاتے ہیں اور اگلے اسٹاپ تک کسی شور ہنگامے کے بغیر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ بس اسٹاپ پر روٹ میپ آویزاں ہوتا ہے۔ پسنجر چاہے تو اپنے سفر سے پہلے میپ دیکھ لے تاکہ مطلوبہ جگہ پر اُترنے میں آسانی ہو، ورنہ ہو سکتا ہے غلط روٹ کی بس پر چڑھ جائے۔ قانون کی پاسداری لوگوں میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ٹریفک پولیس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

یہاں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کو سیفٹی بیلٹ لگانا ضروری ہے۔ بچوں کے لیے بھی چھوٹی سیٹ لگا دی جاتی ہے۔ بچہ گود میں سفر نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی

پولیس ڈرائیو کرنے والے کی شراب کی مقدار بھی ٹیسٹ کرتی ہے۔ مقدار سے زیادہ پی کر ڈرائیو کرنا منع ہے۔

ایسے بچے اور ماں اگر باپ اور شوہر کے بغیر ہیں تو ان کی خبر گیری کی جاتی ہے۔ انہیں حکومت الاؤنس اور سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ کونسل ڈے کیئر کی نگہداشت کرتی ہے۔

دوسرے ملکوں سے یہاں آ کر آباد ہونے والے لوگوں کی اپنی اپنی انجمنیں ہیں جو کمیونٹی سینٹر کہلاتی ہیں اور کونسل سے منسلک ہوتی ہیں۔ مورلینڈ سٹی کونسل ایسی انجمنوں کو بہت طرح کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یورپی، روس، ترکی، لبنانی، عرب، افغانی، چینی، یہودی، صومالین، بوسنیائی، نیپالی، سری لنکن، انڈیا، ویت نام اور بیسیوں دوسری قوموں کے اپنے اپنے کمیونٹی سینٹرز ہیں جہاں لوگ اپنی اپنی کمیونٹی کی پرابلمز، ثقافت، کھیل و تفریح کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ خاص خاص دنوں کے حوالے سے پروگرام مرتب کرتے ہیں۔ کمیونٹی کے لوگ نئے آنے والے ہم قوم کی رہنمائی کرتے ہیں اور ضرورت مندوں کی کسی حد تک امداد کرتے ہیں۔ پاکستان کی بھی ایک ایسوسی ایشن ہے لیکن کھیل اور کرکٹ کی حد تک ہے۔ کچھ کمیونٹی سینٹرز میں انگلش بات چیت اور مادری زبان سکھائی جاتی ہے۔

یہاں سوشل ورکر کی بہت قدر ہے۔ ان کے کاموں کو سراہتے بھی ہیں اور ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ بچوں بچیوں کی تعلیم انٹرنک مفت ہے۔ جگہ جگہ اسکول اور کالج قائم ہیں۔ کونسل ان کی نگہداشت کرتی ہے۔ طلبا کی کتابیں، یونیفارم اور لنچ فری ہیں۔ پرائیویٹ اسکول بھی ہیں جہاں فیس لی جاتی ہے۔ عربی اسکول اور کالج بھی قائم ہیں جہاں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مروجہ کورس پڑھایا جاتا ہے۔ کنگ خالد پرائمری اینڈ سیکنڈری اسکول، کنگ خالد اسلامک کالج، دارالعلوم، پرسٹن اسلامک کالج، علمی کالج، مینارٹ کالج اور ویری بی اسلامک کالج مشہور درس گاہیں ہیں جہاں دوسرے ممالک کے مسلمان طلبا و طالبات بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

صحت کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا ہے۔ علاج معالجہ مفت ہے۔ جو لوگ کسی ضعیف اور معذور کی تیمارداری میں مصروف ہیں انہیں بھی الاؤنس دیا جاتا ہے۔ ایک فیملی امداد کا محکمہ بھی ہے جس کی جانب سے فیملی ٹیکس بینفٹ، چائلڈ کیئر بینفٹ اور میٹرنٹی الاؤنس دیا جاتا ہے۔ ہر شہری کے پاس میڈیکل کارڈ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا علاج مفت

سی ایم نعیم کو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں میں اونچا مقام حاصل ہے۔ تخلیقی ادب میں قرۃ العین حیدر کے دو ناولٹ ''سیتا ہرن'' ہاؤسنگ سوسائٹی'' اور افسانے ''پت جھڑ کی آواز'' کے تراجم پر مشتمل ان کی کتاب A Season of Betrayals چھپ چکی ہے۔ ہندی ادیب وبھوتی نرائن رائے کے ناول ''شہر میں کرفیو'' اور ہری شنکر پرسائی کی طنزیہ کہانیوں پر مبنی کتاب کا "InspectorMatadeen on the Moon" کے عنوان سے ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔ اردو میں طنز نگاری کی کمی انہیں محسوس ہوتی ہے، ہندی میں وہ سمجھتے ہیں، اس ضمن میں بہت بہتر کام ہو رہا ہے۔ ہندی کے طنزیہ ناولوں میں شری لال شکل کے ''راگ درباری'' اور وبھوتی نرائن رائے کے ''تبادلہ'' کا نام خاص طور پر لیتے ہیں۔ انگریزی ترجمے اور تدوین متن میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''ذکر میر'' ہے۔ بتاتے ہیں ''میر صاحب کی بہت اہمیت ہے۔ میر صاحب نے آپ بیتی فارس میں لکھی جس کا اردو میں نہایت عمدہ ترجمہ نثار احمد فاروقی نے کیا۔ میں نے بھی اصل فارسی سے ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ تعارف میر کی زندگی اور اس سماج کے بارے میں لکھا۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے اور آپ بیتیوں سے بھی۔ اور میر جیسا آدمی آپ بیتی لکھے گا تو ظاہر ہے ہمارے لیے اہم ہے۔ اٹھارہویں صدی میں میری بڑی دلچسپی ہے۔ اس صدی کی دلی کے بارے میں اس میں بہت سی معلومات ہیں۔ میر اپنے بارے میں بہت کم بتاتے ہیں لیکن تاریخی واقعات کا بہت ذکر کرتے ہیں، جادو ناتھ سرکار نے بھی اپنی کتاب میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ کتاب موجود تھی لیکن اس کی اہمیت مورخین کے لیے کوئی زیادہ نہیں تھی، دلی کی اٹھارہویں صدی کی کوئی تاریخ لکھنے بیٹھے تو تب اس کے لیے ذکر میر کی اہمیت ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا ہے۔ نوزائیدہ بچوں کو شروع کے دنوں میں اسپتال کا عملہ گھر آ کر چیک کرتا ہے اور مکمل رپورٹ کی فائل والدین کے حوالے کی جاتی ہے۔

مورلینڈ کونسل کے تحت 5 لائبریریاں ہیں۔ یہاں انگلش کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی کتابیں دستیاب ہیں۔ اطالوی، یونانی، چینی، عربی اور ترکی زبانوں میں بھی کتابیں ملتی ہیں۔ لائبریری میں کمپیوٹر بھی ہوتے ہیں اور سی ڈی وغیرہ بھی ایشو ہوتی ہیں۔

قبرستانوں کی نگہداشت کونسل کرتی ہے۔ قبرستان صاف ستھرے ہوتے ہیں اور ترتیب سے تدفین ہوتی ہے، ہر قبر کا نمبر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے قبرستانوں کا انتظام مختلف مسلم تنظیمیں کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں عرب اور ترک مسلمانوں کی ہیں۔ کفن دفن کے تمام کام یہ تنظیمیں انجام دیتی ہیں۔

ہر مذہب کے لوگوں کو مذہبی معاملات میں آزادی اور تحفظ حاصل ہے۔ عیسائیوں کے انجلیکن چرچ، بپٹسٹ چرچ کیتھولک اور گریک چرچ کونسل سے رجسٹرڈ ہیں۔ اسی طرح بدھسٹ سینٹر، ہندوؤں کا ونڈانتا سوسائٹی اور مسلمانوں کے دس مراکز اس کونسل میں رجسٹرڈ ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد میں کرسچن ہیں اس کے بعد مسلمان اور پھر بدھ مذاہب کے ماننے والے ہیں۔"

مسلمان آسٹریلیا میں سب سے پہلے کب وارد ہوئے، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آسٹریلین فارن افیئرز اینڈ ٹریڈ کے محکمہ کی ایک نوٹیفکیشن کے مطابق یورپی باشندوں کی آسٹریلیا میں آمد سے بہت پہلے مشرقی انڈونیشیا کے جزائر کے مسلمان یہاں آئے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سولہویں صدی ہی سے جزیرہ Macassar کے مسلمان جو ماہی گیر تھے، آسٹریلیا کے شمال میں آتے جاتے رہے تھے۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ کچھ عرب تاجر مشرق بعید آتے جاتے آسٹریلیا کے شمالیہ ساحلوں پر اترے بھی تھے جو غیر آباد تھے اور جو آباد لوگ تھے تو وہ بھی جنگلی، ننگ دھڑنگ جن کی ذات سے کسی تجارتی لین دین کی توقع فضول سمجھ کر وہ واپس چلے گئے تھے۔

بہر حال نیم مستقل رہائشی مسلمان وہ افغان یا پٹھان تھے جو اونٹوں کے ساتھ انیسویں صدی کے نصف میں اس سرزمین پر قدم رکھا۔ پٹھان اپنے ساتھ عورتوں کو لے کر نہیں آئے تھے۔ مجبوری کے تحت ان میں سے کچھ نے ایب اوریجن کنبے کی عورتوں کو مسلمان کر کے نکاح پڑھوا لیا تھا، اس طرح انہوں نے گھر بسا تو لیا تھا اور اولادیں بھی ہوئیں لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی تمام شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی آل اولاد ایک ایک کر کے اتنی بڑی سرزمین میں گم ہوگئی گمنام ہوگئی۔ ان کی نسل کی شناخت ناممکن ہو چکی ہے۔ کہتے ہیں آسٹریلین کرکٹ کا مشہور کپتان Steve Waugh انہی کی نسل سے ہے لیکن یہ بات غیر تصدیق شدہ ہے۔ ایک پاکستانی جوان جو کراچی کے ہیں اور ایک اچھی جگہ کمپیوٹر کی ملازمت کر رہے ہیں، آسٹریلیا انجینئرنگ کی ڈگری کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آئے تو شروع میں گزر اوقات کی خاطر ٹیکسی چلانا شروع کیا تھا۔ بیشتر پاکستانی جوانوں کو جو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یہاں آتے ہیں، شروع میں گزر اوقات کے لیے ٹیکسی چلانی پڑتی ہے۔ یہاں ٹیکسی چلانا بڑا صاف ستھرا کام ہے اور کم وقت میں آزادی کے ساتھ اچھی آمدنی کا ذریعہ بھی۔ اس نوجوان نے مجھ سے ایک بار ذکر کیا کہ ان کی ٹیکسی میں ایب اوریجن خاتون نے سفر کے دوران انکشاف کیا کہ اس کے جد امجد مسلمان تھے۔ اس کی پردادی تک مسلمانوں کی خو بو ان کے خاندان میں باقی تھی لیکن آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی۔ بقول اس خاتون کے جو ملبورن میں ڈینشن سینٹر کے کسی افسر کی اہلیہ تھیں (ڈینشن سینٹر ایک بڑے سے احاطے میں کھلے ہوئے جیل کی طرح ہے جہاں غیر ملکی عارضی طور پر انتظار کی گھڑیاں گنتے رہتے ہیں، جن کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ ہونا باقی ہو۔ یہ لوگ اس احاطے کے اندر آزاد ہوتے ہیں، صرف باہر نہیں نکل سکتے، خاتون کے بقول ابھی بھی شمالی شہر ڈارون کے پاس ایسے دو سو افراد ملیں گے جو مسلمانوں کی نسل سے ہیں، جن کے جد امجد افغان یا پٹھان تھے لیکن اسلام سے نابلد ہیں۔ اس نے مزید انکشاف کیا کہ کچھ کھانے افغانی طرز پر بنائے جاتے تھے لیکن ترکیب اب صرف چند بڑی بوڑھیوں تک ہی محدود ہے۔

حکومت ان پٹھانوں کی خدمات کو بہت سراہتی ہے۔ انہوں نے ایک کٹھن وقت میں سامان رسد اور بار برداری اور سواری کے مسائل کو حل کیا جسکا کوئی متبادل ذریعہ نہیں تھا۔

ان ہی لوگوں کے دم سے ریگزاروں میں گزرگاہیں بنیں۔ انجینئرز، محقق، سائنس داں، سروے کرنے والے اور ٹیلگراف کی لائن اور آلات لے جانے والے یہی لوگ تھے۔ ان ہی کے دم سے جنوبی آسٹریلیا، مغربی آسٹریلیا، شمالی علاقہ اور دوسری بڑی ریاستوں کے مغربی حصے جو خشک اور پتھریلے ہیں، ایک دوسرے سے مربوط ہوئے بغیر ان علاقوں میں قائم

کالونیوں اور سونے کی دریافت کے بعد عارضی کیمپوں تک ضروری اشیا پہنچانا ممکن ہو سکا تھا۔ بعد میں ان راستوں پر جو، ان کے آنے جانے سے بنے تھے، ریلوے کی پٹری بچھا دی گئی اور ٹرین کا نام غان (خان) ٹرین رکھا گیا تھا۔ یہ نام ان کی خدمات کے صلے میں حکومت نے تجویز کیا تھا۔ کچھ لوگ جو واپس نہیں گئے تھے یہیں موت کی آغوش میں چلے گئے اور اب وہ اپنی اپنی قبروں میں آسٹریلیا کے پہلے مسلمان کا نشان بن کر نئے آنے والے مسلمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ افسوس ان کی ویران قبروں پر نہ کوئی دیا جلانے والا ہے، نہ ہی کوئی ہاتھ مغفرت کے لیے اٹھتا ہے۔ برمزار ما غریباں، نے گل نے چراغ۔

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں پرل انڈسٹری والوں نے سمندر سے موتی اور قیمتی پتھر نکالنے کے لیے غوطہ خور مسلمانوں کو پرتگیزی اور برطانوی کالونیوں سے یہاں بلایا تھا۔ ان کی نسل کے لوگ آسٹریلیا کے شمالی شہر ڈارون میں موجود ہیں۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی آمد جنگِ عظیم دوم کے وقت ہوئی اور اس کے بعد 1947ء اور 1971ء کے درمیان کم تعداد میں مسلمانوں کا یہاں آنا ہوا۔ اس سے قبل مسلمانوں کی آبادی کل دو ہزار سات سو چار تھی جو بڑھ کر بائیس ہزار تین سو گیارہ ہوگئی۔ ان میں قبرصی ترکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ 1975ء میں لبنان کی خانہ جنگی کے دوران لبنانیوں نے ہجرت کی اور آسٹریلیا میں بس گئے۔ یہاں کے مسلمانوں میں لبنانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

2001ء کی مردم شماری کے مطابق آسٹریلیا میں مسلمانوں کی کل تعداد 2 لاکھ 81 ہزار 5 سو 76 تھی۔ سب سے زیادہ مسلمان نیو ساؤتھ ویلز میں قریب ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں ہیں جو زیادہ تر لبنان، مصر اور دوسرے ممالک کے لوگ ہیں۔ اس کے بعد ریاست وکٹوریہ میں ایک لاکھ کے قریب ہیں، ان میں لبنانی عرب اور ترکی کے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مغربی آسٹریلیا میں 20 ہزار کوئنز لینڈ میں 15 ہزار اور 35 ہزار کے لگ بھگ دوسری ریاستوں، شمالی علاقہ جات اور دارالحکومت میں رہائش پذیر ہیں۔ ملبورن میں تقریباً 90 ہزار مسلمان ہیں جو زیادہ تر لبنانی، ترکی، مصر، انڈونیشیا، ملائیشیا، بوسنیا وغیرہ کے لوگ ہیں۔

پاکستانی مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر جو پہلے سے آئے ہیں، ان کی فیملی بھی

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگاں آہو پشت خار اپنا

وزن: مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعی ل ن
بحر: ہزج مثمن سالم

غالب نے اس وزن میں بہت کم شعر کہے ہیں۔ اس وزن میں ان کی مشہور ترین غزل "نفاں کیوں ہو، زباں کیوں ہو" ہے۔ یہ شعر لفاظی پر مبنی ہے جس میں چند در چند رعایات لفظی و معنوی نے نئی شان پیدا کر دی ہے۔ طباطبائی نے "اسد" اور "آہو" کی لطیف رعایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "سر پنجہ" مژگاں، جنوں جولاں، پشتِ خار، گدا، بے سروپا وغیرہ رعایتیں بھی قابل لحاظ ہیں لیکن "بے سروپا" اور "سر پنجہ" میں ایک دہری رعایت بھی ہے اور اسد شعر میں غالب کا محبوب فن، قول محال ((Paradox)) بھی اپنی پوری کیفیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ شعر کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ میں وہ گدائے بے سروساماں ہوں کہ میرے پاس پشتِ خار بھی نہیں ہے اور وحشت کا یہ عالم ہے کہ آہو سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔ لہٰذا آہو کی مژگاں کا سر پنجہ میرے لیے پشتِ خار کا کام کرتا ہے۔ اس بے کیف مضمون میں قول محال یوں پیدا ہو گیا ہے کہ ایک طرف اپنی جنوں جولانی میں یہ تیزی دکھائی ہے کہ آہو سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور دوسری طرف بے سامانی کا یہ رنگ ہے کہ "سروپا" بھی نہیں رکھتے۔ قول محال یہ ہے کہ سر اور پاؤں نہ ہونے کے باوجود گرمی رفتار اس قدر ہے کہ باید و شاید۔ ظاہر ہے کہ سروپا نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وجود ہی باقی نہیں ہے اور جب وجود ہی نہیں تو رفتار بھی نہیں۔ پھر میں بے سروپا ہوں لیکن مژگاں آہو کا سر پنجہ میرے کام آتا ہے۔ لفظ "پنجہ" ہی کافی تھا "سر پنجہ" کہہ کر بے سروپائی کو ایک انوکھا لطف بخش دیا ہے کہ اپنا سر نہ سہی، لیکن مژگاں آہو کا "سر پنجہ" تو موجود ہے۔ اسی "سر" پنجہ کی مناسبت سے "پشت" خمار کا لفظ بھی قابل لحاظ ہے۔

اقتباس: تفہیم غالب از شمس الرحمن فاروقی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔جوانوں میں ایسے لوگ ہیں جو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یہاں آئے اور دو سال گزرنے کے بعد یہاں کی سٹیزن شپ کے حقدار بن گئے ہیں۔ مجموعی طور پر پاکستانیوں کی تعداد ملبورن میں پانچ سو سے بھی کم ہوگی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ہوٹل اور ریسٹورنٹ چلاتے ہیں۔

یہ تعداد گزشتہ پانچ سال قبل کی تعداد سے چالیس... فیصد زیادہ ہے۔ جبکہ آسٹریلیا کی کل آبادی انہی وقتوں کے اعتبار سے صرف پانچ اعشاریہ سات فیصد زیادہ تھی۔ یہ ایک محتاط تخمینہ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد 3 لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ اس تعداد کی ایک تہائی اسی سرزمین میں پیدا ہوئی ہے، یہ دوسری اور تیسری نسل آسٹریلیا میں گراں قدر رول ادا کر رہی ہے۔ ان کی موجودگی میں اس سرزمین پر نئے مسلمانوں کو اجنبیت کا احساس کم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کی وجہ سے ایک اکائی کی طرح سوچتے ہیں گو کہ زبان، تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے وہ الگ الگ ہیں۔ آسٹریلیا میں انہیں آسٹریلین قومیت کا ایک فرد سمجھتے ہوئے ایک جز سمجھتے ہیں۔

مسلم جماعت کے علاقائی اور قومی احاطے کے اندر مختلف ادارے خوش اسلوبی کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ ان کے اپنے اسلامک اسکول، کالج، اسلامی مراکز اور مساجد ہیں۔ ان کے مختلف نوعیت کے معاشرتی، تہذیبی، معاشی، ثقافتی اور تعلیمی ادارے کمیونٹی سینٹرز کی صورت میں موجود ہیں۔ اسلامی اور کرسچن اداروں کے مابین یک جہتی اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے آسٹریلیا انڈونیشیا انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔

آسٹریلیا کے مختلف کمیونٹی ادارے ایک سو سے اوپر ہیں جو مقامی اور علاقائی سطح پر مسلم اُمہ کی مفاد کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم کمیونٹی پر مشتمل اسلامک کونسل آسٹریلیا تمام ریاستوں میں قائم ہے۔ ایسی تمام کونسل حکومتی سطح پر قائم آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسلز کے زیرِ اثر کام کرتی ہیں۔

آسٹریلیا میں دس اسلامی پرائمری اسکول، گیارہ پرائمری اور سیکنڈری اسکول قائم ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن یونیورسٹی اور کالج لیول پر مسلم طلبا کو تعلیمی سرگرمیوں سے آگاہ کرتی ہے اور تعلیمی میدان میں مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔

ملبورن میں علاقائی بنیاد پر قائم مسلمانوں کی مختلف نوعیت کے کمیونٹی سینٹرز ہیں ان میں تعلیمی، سماجی، ثقافتی اور صحت کے مراکز ہیں۔ کھیل و تفریح کے حوالے سے کمیونٹی کے اپنے اپنے مشاغل ہیں۔ قریب قریب ہر کمیونٹی کے لوگ ان کے سابقہ وطن سے آئے ہوئے لوگوں کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں، ان کی رہنمائی اور ضرورت مندوں کی مالی امداد بھی شامل کرتے ہیں۔ پاکستانیوں کا بھی ایک سینٹر ہے جو کھیل بالخصوص کرکٹ سے منسوب ہے۔

آسٹریلیا میں ٹیلنٹ اور سوشل ورکر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ ایک ایرانی لڑکی جس کی پیدائش یہیں کی ہے جو سوشل ورک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے اسے حکومت نے حکومتی اعزاز سے نوازا ہے۔ آئندہ وہ انتخاب میں حصہ لے گی اور پُرامید ہے کہ اسمبلی میں منتخب ہو جائے گی۔ ایک پاکستانی نازیہ واصف جس نے گو کہ باضابطہ آرٹ ڈیزائن کی تعلیم حاصل نہیں کی ہے، اس نے مورلینڈ سٹی کونسل کے آرٹ مقابلے میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اُسے Mayer نے انعام اور سند سے نوازا اور اُس کے بنائے ہوئے ڈیزائن کو کونسل کے کیلنڈر اور سالانہ رپورٹ کے سرِورق پر آراستہ کیا۔

مسلمان زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ ملبورن میں ان کا کاروبار زیادہ تر سڈنی روڈ پر ہے جہاں ان کی ریڈی میڈ کپڑوں، جوتوں، مٹھائیوں، پھلوں اور گوشت کی دکانیں ہیں۔

اٹلہ کے نام سے MCCA مسلم کمیونٹی لمیٹڈ ہر سال ڈائریکٹری نکالتی ہے۔ یہ ڈائریکٹری ملبورن میں مسلم کاروباری حلقوں اور تجارت پیشہ لوگوں کی اشیا کے اشتہارات کی ڈائریکٹری ہے۔ چنانچہ آٹو موبائل سے لے کر ہارڈ ویئر، الیکٹرونکس، قالین، کپڑے، جوتے، جیولری، بوتیک، فرنیچر اور باتھ روم کے سامان، کچن کے سامان، کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں۔ بیکری، کیک، مٹھائیوں، پنیر کی دکانوں کے نام اور پتے۔ ہوٹل، ریسٹورنٹ، نیز حلال کیے ہوئے جانوروں کے گوشت کی دکانوں کی تفصیل ہوتی ہے۔ پھل اور سبزیوں کے ٹھکانوں سے لے کر پرچون کی دکانیں اور چھوٹے اسکیل پر قائم ڈپارٹمنٹل اسٹورز کے نام اور پتے درج ہوتے ہیں۔ ان سبھوں کے علاوہ ایسے اداروں کے بارے میں بھی اشتہارات ہوتے ہیں جو پیشہ کے اعتبار سے وکالت، انکم ٹیکس، اکاؤنٹس، آرکیٹکس، بلڈنگ ڈیزائننگ سے وابستہ ہیں۔ بک شاپ، اسپورٹس کے سامان، ٹرانسپورٹ، ٹریولنگ، ایکسپورٹ امپورٹ اور کلیرنگ فارورڈنگ کی تفصیلات بھی درج ہوتی ہیں۔ یہاں مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی دکانوں میں کام کرتی ہیں۔ بوتیک اور ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانوں میں تو صرف خواتین ہی ہوتی ہیں۔ ایک شام بعد عصر میں واک کرتا ہوا فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ میرے آگے حجاب میں ایک خاتون بچے کو پرام

میں لٹائے ہر گھر پر ٹھہر کر سٹی کونسل کا مفت کا اخبار اور اشتہارات... کے بنڈل ڈالتی جا رہی تھی۔ میں گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا پھر انگلش میں پوچھا ''مسلم؟'' میں نے جواب میں کہا ''الحمدللہ!'' تو اُس نے جھٹ سے کہا ''السلام وعلیکم!'' میں نے پوچھا ''ترکی...'' جواب میں اُس نے ہاں کہا۔ میں نے پھر پوچھا ''کتنے گھروں میں ڈالتی ہو؟'' تو جواب میں کہا کہ ایک سو کے... قریب۔ تو یہ ایک گھریلو مسلم خاتون کا پارٹ ٹائم کام تھا۔

اس ڈائریکٹری میں پرائیویٹ کلینک کے نام اور پتے اور مسلم لیڈی اور مرد ڈاکٹروں کے نام پتے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں پاکستانی ڈاکٹر کے نام نظر آتے ہیں۔ کمیونٹی بنیاد پر قائم اسلامی معلومات اور خدمات بہم پہنچانے والے ادارے بھی درج ہوتے ہیں۔ دعوت اسلامی کے مراکز، کفن دفن کے انتظامات اور قبرستانوں کے پتے، مساجد اور مدرسے اسلامی اسکول اور کالجوں کی تفصیل بھی اس ڈائریکٹری میں درج ہیں۔ پورے سال کے لیے اوقات نماز بھی اس میں دیے گئے ہیں۔

ابھی شادیاں مسلمانوں کی مختلف کمیونٹی کے درمیان آپس میں نہیں ہوتی ہے۔ اِکا دُکا واقعات مستثنیٰ ہیں۔ میرے ایک عزیز نے ترکی گھرانے میں شادی کی ہے۔ وہاں ایک واقعہ مسئلہ بنتے بنتے رہ گیا۔ لبنانی اور ترکی لڑکے لڑکی کا آپس میں پسند کی شادی کا مسئلہ آ گیا تھا۔ بہرحال دونوں طرف کے معتبر لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا اور شادی بہرحال ہو گئی۔

☆☆☆

شہر سے نزدیک گرین ویل نامی پکنک پوائنٹ پر ہم لوگ گئے ہوئے تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ پارک میں ہر طرف لبنانی اور ترکی... پکنک منانے آئے تھے۔ تمام خواتین حجاب اور اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔ ایک الگ دنیا نظر آ رہی تھی۔ بچے آزادی سے کھیل کود رہے تھے۔ بڑے کوئلے کا چولہا جلا کر کباب سینکنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے اور عورتیں حلقہ بنا کر بیٹھی گپیں لڑا رہی تھیں۔ نماز کے وقت اذان ہوئی اور ایک بڑی جماعت کھڑی ہو گئی۔ عورتیں اپنی جگہوں پر نماز ادا کرنے لگیں۔ یہاں کے پکنک پارکوں میں جگہ جگہ ٹیوب ویل لگے ہوتے ہیں۔ طہارت خانے اور گیس کے چولہے بھی نصب ہوتے ہیں۔

ملبورن شہر اور اس کے مضافات میں اکتالیس مساجد اور نماز کی عارضی جگہیں ہیں۔ یہ عارضی جگہیں ملبورن ائرپورٹ اور چھ یونیورسٹیوں اور اسلامی اسکولوں میں ہیں۔ میں ایک بار ایک صاحب کے ہاں شہر سے ذرا دور دعوت میں گیا۔ نماز کے وقت ہم لوگ ایک عمارت کے بڑے سے کمرے میں پہنچے جو مسجد تو نہیں تھی لیکن مسجد کا ماحول تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عارضی جگہ نماز کے لیے مخصوص ہے جسے لوگوں نے باہم مل کر قائم کیا ہے۔ یہ سب نمازی بوسنیا کے مسلمان ہیں۔ ایک اور مضافات میں جس کا نام سن شائن ہے، وہاں مسجد میں نماز ادا کرنے کا موقع ملا۔ گنبد اور مینار کے ساتھ ایک بڑی اور خوبصورت مسجد ہے جو بوسنیا کے مسلمانوں نے تعمیر کرائی ہے۔ جن جن علاقوں میں کسی ایک کمیونٹی کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ وہاں ان کے اپنے اسلامک سینٹر اور مسجدیں ہیں۔ چنانچہ یہاں لبنان، مصر، ترکی، بوسنیا اور پاکستانیوں نے مسجدیں تعمیر کی ہیں۔ لبنانی اور ترکی مساجد کی تعداد زیادہ ہے۔ پاکستانیوں کی بڑی دو مسجدیں ہیں۔ ایک Fawkner میں مسجد دارالعلوم ہے اور دوسری Doncaster کی مسجد۔ دونوں مسجدوں کا انتظام پاکستانیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ فوکنر کی مسجد کے قائم کرنے میں کراچی کے ڈاکٹر امجد صاحب کا بڑا تعاون۔ فوکنر کی مسجد کا احاطہ کئی ایکڑ زمین پر ہے۔ جہاں مسجد، مدرسہ اور دارالعلوم کالج قائم ہیں۔ مدرسہ کے معلموں میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی معلم ہیں۔ یہ چوکور مسجد ہے اور بیچ میں ایک گنبد ہے۔ شہر میں اسلامک سوسائٹی آف وکٹوریہ کے نام سے ادارہ ہے جس کے زیرِ انتظام Preston کی مسجد حضرت عمر فاروقؓ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ عربی مسجد ہے۔ اس مسجد پر ایک بہت بڑا گنبد ہے جو شیشے کا ہے۔ نہایت شاندار اور خوبصورت مسجد ہے۔ ساتھ میں ایک مینار بھی ہے۔ ایک ترکی مسجد میں نماز پڑھنے کو گئے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ امام صاحب کلین شیو تھے۔ میں جمعہ کی نماز ہمیشہ اپنے گھر سے بیس منٹ کے پیدل فاصلے پر ترکی کی مسجد الفتح میں پڑھتا رہا کیونکہ یہی مسجد میری رہائش سے نزدیک تھی۔ یہاں جمعہ کے خطبے سے قبل کسی کسی جمعہ کو ایک عالم نظر آئے جو ترکی زبان میں واعظ کر رہے تھے۔ جمعہ کا خطبہ اولیٰ ذرا لمبا ہوتا ہے۔ اس خطبے میں خطیب کسی ایک معاشرتی مسئلہ کو زیرِ بحث لاتے ہوئے پہلے اس سے متعلق قرآن کریم کی آیتیں پڑھتے پھر کوئی حدیث سناتے پھر پہلے ترکی زبان میں وضاحت کرتے پھر جو کچھ بیان کیا اس کا پہلے سے لکھا ہوا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سناتے۔ دوسرا خطبہ بہت مختصر ہوتا۔ حمد و ثناء کے بعد درود اور اکابرین اسلام پر سلام کے بعد ہاتھ اُٹھا کر مسلمانانِ عالم کے حق میں دعائے خیر کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔خطبہ اولیٰ کے بعد خطیب کسی بھی طرح کی اپیل کرسکتا ہے خواہ مسجد کی اعانت ہو یا کوئی اور بات۔ایک خطبے میں خطیب نے اپنے مدرسہ میں بچوں کو حفظ کی تعلیم کے بارے میں بتایا کہ مدرسہ میں صرف تین ڈالر کی ماہانہ فیس لی جاتی ہے۔آپ اپنے بچوں کو حافظ قرآن بنائیں۔انہوں نے مزید کہا کہ ترکی میں لوگوں کا رُجحان مذہب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ترکی میں ان کے مدرسے میں ایک سو ساٹھ لڑکوں نے اور پچاس لڑکیوں نے حفظ کیا ہے اور اب ان میں سے بیشتر شام اور فلسطین میں مدرسوں اور مسجدوں میں تعلیم وتدریس سے وابستہ ہیں۔ترکی اور عربی مساجد میں جمعہ کی اور عیدین کی نمازوں میں ایک بڑی تعداد خواتین کی بھی ہوتی ہے جہاں مسجد کے پیچھے انہی کی خاطر الگ انتظام کیا گیا ہے۔یہاں مسجدوں میں، میں نے دیکھا کہ صف بندی جو ہم ایڑیوں کو صف کی لائن پر رکھ کر صف بندی کرتے ہیں لیکن وہاں انگوٹھے اور پنجوں کو لائن پر رکھتے ہیں۔

میرے قیام کے دوران رمضان کا مہینا بھی آ گیا تھا۔میں نے تراویح فو کنر کی مسجد میں پڑھی۔تراویح میں اس مسجد میں پانچ سو کے لگ بھگ لوگ جمع ہوتے ہیں۔تین اماموں کے پیچھے تراویح پڑھتے رہے، ان میں ایک عربی، ایک ترکی اور ایک افریقی امام تھے۔افریقی امام کی قرأت اتنی میٹھی آواز میں ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ بس سنتے ہی رہیں۔

رمضان کے مہینے میں دیارِ غیر میں غریب الوطنی کا قطعی احساس نہیں ہوا۔رمضان کی پہلی افطاری اور کھانے کی دعوت شہر سے ایک سو تیس کلومیٹر دور Ballarat کے شہر میں ایک کرم فرما محمد علی صاحب کے یہاں ہوئی۔یہ صاحب پندرہ بیس سالوں سے یہاں ہیں۔بڑے پُرخلوص اور مہمان نواز ہیں۔اپنے برخوردار کے دوستوں میں کاشان، فواد، جنید، عاطف، آصف، واصف عمران اور دیگر جن کے نام ذہن سے اُتر گئے ہیں ان کے یہاں افطار کی دعوتوں میں گئے جہاں رمضان شریف کے روایتی کھانوں سے دسترخوان سجے ہوتے تھے۔یہ سارے جوان شادی شدہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، دیندار اور نیک فطرت ہیں۔ان کے درمیان رمضان اور رمضان کے بعد بھی مجھے غیریت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ان کی ٹولی میں میرا کئی بار سیر وتفریح اور پکنک پر جانا ہوا۔خدا ان کو اپنے حفظ وامان میں خوش اور صحت مند رکھے، آمین۔

عید کی نماز بھی یہیں پڑھی۔اس دن مسجد کے باہر تک نمازی تھے قریب ہزار بارہ سو لوگ ہوں گے۔لطف آ گیا اور ذرا سا بھی اجنبی ملک میں بے وطنی احساس نہیں ہوا۔فطرہ اور زکوٰۃ کے لیے لوگ باہر کھڑے تھے اور لوگ اپنا فطرہ اور زکوٰۃ ادا کر رہے تھے۔یہاں بھی چاند کے معاملے میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔روزے اور عید ایک دو دن آگے پیچھے ہو ہی جاتے ہیں۔

عید اور عید کے دوسرے دن یہاں کئی جگہوں پر تقریبات ہوتی ہیں۔عرب اور ترک تقریبات الگ الگ کھلے میدان میں منعقد کرتے ہیں۔اسٹیج بنایا جاتا ہے جسے رنگین کاغذوں اور روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔اپنی اپنی روایتی پوشاکوں میں بچے بچیاں اپنی اپنی زبان میں طربیہ نغمے گاتے ہیں۔کھانے پینے کا انتظام ہوتا ہے۔کھلونوں اور ٹافیوں کے اسٹال لگائے جاتے ہیں۔

بقرعید میں قربانی گھروں یا کھلی جگہوں پر نہیں کی جاتی ہیں۔شہر سے دور سلاٹر ہاؤس میں قربانی کی جاتی ہے۔مسلمان گوشت کی دکانوں میں قربانی بک کرائی جاتی ہے جس کی اطلاع مسجدوں میں بھی کی جاتی ہے، قربانی کا گوشت سالم بھیڑ یا بکرے کی صورت میں لے سکتے ہیں۔کچھ حصہ نہیں مل سکتا ہے کیونکہ قربانی کا گوشت سالم حالتوں میں مسلم ممالک کے غریب علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

یہاں پچیس تیس پاکستانی جوانوں کی آپس میں خوب میل محبت ہے، ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا اور دعوتیں کرنا اور مل جل کر سیر وتفریح اور پکنک پر جانا اکثر ہوتا رہتا ہے۔یہ سب میرے بیٹے کے دوست احباب ہیں اس لیے ان کے یہاں جانا اور ان کا ہمارے گھر آنا لگا رہا۔ان میں چند کی فیملی بھی ہے۔یہ سارے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ سارے جذبہ ایمان سے سرشار ہیں۔نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔اگر فو کنر کی مسجد یا ڈان کاسٹر کی مسجد میں تبلیغی جماعت آتی ہے تو یہ ایک دوسرے کو خبر کرتے ہیں اور وقت نکال کر بیان سننے جاتے ہیں۔میرے قیام کے دوران چار پانچ بار پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کی جماعت آئی۔دو بار کراچی سے خواتین کی بھی جماعت یہاں آئی تھی۔

یہاں دور ہی سے مسلم خاتون کی پہچان ہوتی ہے۔مختلف ملکوں سے آئی ہوئی مسلم خواتین حجاب اور اسکارف میں ہوتی ہیں۔عرب اور ترکی کی خواتین میں تفریق کرنا مشکل ہے۔دونوں ایک ہی طرح کی لگتی ہیں۔لڑکیاں

جینز کے اوپر حجاب ڈال لیتی ہیں اور اسکارف باندھ لیتی ہیں۔اسکول اور کالج میں اسکارف پر کوئی پابندی نہیں۔کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔اسی دوران انڈونیشیا کے جزیرہ بالی کی ساحلی تفریح گاہ کا حادثہ رونما ہوا۔لازماً اس بات کا اثر ہوا اور مسلم معاشرے کی مخالفت کرنے والوں کو زہر اُگلنے کا موقع مل گیا۔اسکارف کے سلسلے میں اسمبلی کے ایک دوارا کین جو بقول حکومت کے بینک منیجر تھے، مخالفت پر زور دیتے ہوئے پابندی لگانے کے بارے میں کہا۔حکومت کی طرف سے اس بات پر سخت نوٹس لیا گیا۔حتیٰ کے پرائم منسٹر ہاورڈ نے ٹیلی وژن پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آسٹریلیا کی مذہبی آزادی کی پالیسی کے تحت کسی بھی فرقہ یا جماعت پر ایسی کسی بات پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی جو اُن کے مذہب ثقافت اور روایت کی آئینہ دار ہے۔

ایک ہفتہ وار اخبار نے اپنے سترہ اکتوبر 2005ء کے پہلے ورق پر ایک دیوار کی تصویر دکھائی ہے جس پر چھوٹے حروف سے لکھا گیا ہے۔"Kill Muslims" پاس ہی ایک مسلم خاتون حجاب میں گزر رہی ہے۔اخبار نے "شرم کا مقام ہے" کے تحت لکھا ہے کہ مسلمان خواتین مورلینڈ کی سڑکوں پر مذہب اور فرقہ واریت کا نشانہ بن رہی ہیں۔مسلمانوں کو جان سے مار دو، لکھا ہوا ہے اور حجاب اور اسکارف میں گزرتی خواتین چند شرپسندوں کی دھمکیوں اور گالیوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔اخبار ہذا کے مطابق مقامی مسلمانوں نے بتایا کہ راستے سے گزرتی مسلمان عورتوں پر ایک شخص نے آواز کسی۔سڈنی روڈ پر تین بچوں کے ساتھ گزرتی ایک خاتون پر دودھ کی بوتل اُچھال کر کپڑے گندے کیے۔ایک گلی سے گزرتی مسلم لڑکیوں پر کار سے گزرتے ہوئے نوجوانوں نے تھوکا۔یہاں کی مسلم آبادی نے ان سب حرکات کا سخت نوٹس لیا۔کوبر کے رہائشی کونسلر عمر مہری نے اس مسئلہ کو مورلینڈ کونسل کی میٹنگ میں اُٹھایا اور کونسلروں سے کہا کہ وہ حالات کو قابو کریں اور خوش اسلوبی سے اس مسئلہ کو نمٹانے کی کوشش کریں۔انہوں نے کہا کہ میں بہت دنوں سے اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نوٹ کر رہا ہوں۔کہیں یہ کسی بڑے فتنے کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔انہوں نے مزید کہا کہ یہ امر تشویش ناک اس لیے بھی ہے کہ سب کچھ رمضان کے متبرک ماہ میں ہوا ہے۔رمضان کے مہینے میں مسلمان لڑائی جھگڑوں سے اور بُرائیوں سے دور رہتے ہیں اور صبر سے کام لیتے ہیں۔اخبار میں اسی علاقہ کو بر کی ایک مسلم لڑکی زینب، جو ریڈیو پر نوجوانوں کے لیے عربی پروگرام کرتی ہے، نے کہا کہ لوگوں کو حجاب کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ہیں۔یہ اس لیے نہیں پہنا جاتا ہے کہ مرد ہمیں چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ہم خود اسے پہننا اور اپنی عزت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

کونسلروں کی میٹنگ میں اُٹھائے گئے عمر مہر کے بیانات پر فوراً مثبت انداز میں میئر نے بیان دیا۔میئر نے سخت الفاظ میں کہا کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔انہوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اسلام ایک امن پسند اور رواداری کا مذہب ہے۔یہاں کے مسلمانوں کا بھی اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے فرقوں کا ہے، مسلم خواتین کے ساتھ نیک سلوک کو روا رکھا جائے جس طرح دوسری کمیونٹی کی عورتوں کے ساتھ ہے۔یہ صرف رمضان کے مہینے کی بات نہیں بلکہ ہمیشہ حسن سلوک سے ان کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ویلس پریئر نامی ایک خاتون کا بیان بھی شائع ہوا کہ وہ خود چشم دید گواہ ہے کہ کس طرح ایک ٹرام ڈرائیور نے ایک مسلم لڑکی کو صرف اس بنا پر کہ وہ اسکارف باندھے ہوئے تھی، زبردستی ٹرام سے اُتار دیا۔دی یونائیٹڈ صومالی ویمنس آرگنائزیشن سے منسوب ایک خاتون نے کہا کہ مسلم خواتین پر دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آتا ہے، یہاں ان پر مذہبی لیبل لگا کر لعن طعن کیا جاتا ہے۔

رمضان کے مہینے سے پہلے بھی اخبارات میں اسکارف کے حوالے سے خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔29 اگست کے ایک اخبار میں اسکارف کے حوالے سے خبر چھپی تھی کہ ایک دو اسمبلی میں بیک بنچر اراکین نے پبلک اسکولوں میں مسلم بچیوں کے اسکارف باندھنے کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ان کا اعتراض یہ بھی تھا کہ مسلم خواتین شناخت کے لیے اپنے چہروں کو چھپاتی ہیں۔حکومت نے بروقت اس بات کا نوٹس لیا اور وضاحتی بیان دیا کہ اسکارف کی مخالفت میں آواز اُٹھانے والوں کو مسلم تہذیب کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔یہ چیز دراصل تہذیبی اور مذہبی چادر ہے۔اعتراض کرنے والوں کو شاید یہ پتا نہیں کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مختلف تہذیبوں اور مذہب کے لوگ ساتھ رہتے ہیں تو کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔وزیر اعلیٰ کا بھی بیان تھا کہ یہ طلبا کا حق ہے جو اپنے سر کو ڈھک لیتی ہیں اور یہ یونیفارم کا حصہ ہے۔30 اگست کے ایک اخبار نے "دوستی اچھے جذبات اور سمجھ کے ساتھ" کے موضوع پر کنگ خالد کی طالبات نے دعوت فکر میں دوسرے کالجوں کی طالبات کو اپنے یہاں مدعو کیا۔یہ مختلف مذاہب کی بچیوں کا گروپ تھا۔دعوت فکر میں خیالات کا تبادلہ ہوا کہ کس طرح زندگی کے گراں قدر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوصاف کو ہم آپس میں شیئر کریں تاکہ اسکولوں، کالجوں اور مختلف طبقوں کے درمیان خوشگوار ماحول میسر آئے۔

مدعوین کو کالج کی مسجد میں بھی لے جایا گیا جہاں انہیں اسلامی تعلیم اور اصولوں کے بارے میں مختصراً بتایا گیا۔ وفاقی تعلیم سے وابستہ خاتون کے علاوہ مسلم خاتون رندہ عبدالفتاح جو مسلم اسکالر ہیں، انہوں نے بھی مختصر سی تقریر کی۔

5 ستمبر 2005ء کے ایک اخبار میں ایک مسلم لڑکی شفین حجاب کے بارے میں لکھتی ہیں کہ میں آسٹریلین ہوں، یہیں پیدا ہوئی اور اب 16 سال کی ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان حجاب کو مسئلہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ حجاب کا بنیاد پرستی اور دہشت گردی سے کیا تعلق۔ یہ اس لیے پہنا جاتا ہے کہ اس سے پہننے والی کی غیرت اور انکساری ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کوئی بغاوت کی نشانی نہیں اور نہ تشدد کی اور نہ ظلم و زیادتی کی یہ پہچان ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ لوگ مجھے کن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا ایک بنیاد پرست، تشدد پسند یا پھر ایک ایسی لڑکی جس کے ساتھ گھر والوں نے حجاب ڈال کر زیادتی کی ہے۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں لیکن لوگ میرے بارے میں یا میری طرح دوسری لڑکیوں کے بارے میں اسی طرح کا احساس رکھتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔ میں اسکارف اس لیے پہنتی ہوں کہ اس سے میرا سر، گردن..... چھپا رہتا ہے۔ میں اسے اس لیے باندھتی ہوں کہ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں جس کا ایمان ہے کہ اس کا جسم اس کی امانت ہے اور اس... کی حفاظت ضروری ہے۔

ایک مقامی اخبار میں مورخہ 14 نومبر میں خبر شائع ہوئی کہ ملبورن سے آٹھ افراد دہشت گردی میں ملوث پائے گئے ہیں۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ملبورن کیمیکل کمپنی سے بم بنانے کے لوازمات کی خریداری کی ہے۔ کیس سڈنی سینٹرل کے لوکل کورٹ میں داخل کیا گیا۔ اس بات کا فوری اثر لوگوں پر ہوا اور لوگ مسلمانوں سے اُلجھ پڑے۔ ایک اور اخبار میں ''مسلمانوں کو ریڈ کے بعد تنگ کیا گیا'' کے زیرِ عنوان تفصیل شائع ہوئی جس کے مطابق اس خبر کے چھپتے ہی ملبورن میں کچھ مسجدوں پر سنگ باری کی گئی۔ سب سے زیادہ نقصان آسٹریلین اسلامک سوشل ایسوسی ایشن کی مسجد کو ہوا۔ مسجد میں فون پر گالیاں اور دھمکیاں دی گئیں۔ ایسوسی ایشن کے صدر جلال وارثان نے اپنے بیان میں کہا کہ دھمکیوں کے فون آتے رہے۔ مسجد کو نقصان پہنچایا گیا۔ اس طرح کی پندرہ وارداتیں ہو چکی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان وارداتوں کا صورتِ حال سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایک اور یونائیٹڈ کلچرل سینٹر آف آسٹریلیا کے سیکریٹری کے بیان کے مطابق ان کی مسجد میں بھی فون دھمکیاں موصول ہوئیں۔ مسٹر وارثان نے وضاحتی بیان میں کہا کہ صورتِ حال کا تعلق آسٹریلیا میں مقیم مسلم اُمّہ کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ ہم لوگ یہاں کی سوسائٹی کا ایک حصہ ہیں۔ یہاں کے شہری ہیں۔ ہمارا بیک گراؤنڈ امن و آشتی کا ہے مذہب اسلام کے پیروکار ہیں جو اخوت اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے جس کے معنی ہیں کہ ہم سب کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے حقوق کی بھی پاسداری کی جائے۔

تفرقہ بازی اور منافرت کو ختم کرنے کے لیے حکومت نے جو اقدام اُٹھائے ہیں ان میں پولیس کی اسپیشل ملٹی کلچرل پولیس کی یونٹ بنائی گئی ہے۔ ریاست وکٹوریہ میں مختلف مذاہب کی کمیونٹی کے حوالے سے پولیس ان کی ضرورت کے وقت مدد کو پہنچے گی۔ حکومت نے ملٹی فیتھ کونسل بھی قائم کی ہے جو حکومت کو مذہبی نوعیت کے معاملات کی نشان دہی کرے گی۔ پولیس میں مسلم خواتین کو بھی جگہ دی گئی ہے اور ان کے یونیفارم میں حجاب کو شامل کیا گیا ہے۔

مورخہ 30 اگست کے اخبار Fair Fax میں 11 ستمبر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلم کمیونٹی اس بات کی کوشش کرے گی کہ مسجدوں کو 11 ستمبر کو غیر مسلموں کے لیے کھلا رکھیں تاکہ غیر مسلم مسجدوں کے امام اور علما سے مذہب، دہشت گردی اور مختلف الجماعت کے لوگوں کے درمیان بھائی چارگی کے حوالے سے بات چیت کر سکیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ مسلم آبادی کو نفرت اور حقارت کی نظروں سے محفوظ رکھا جائے جو محض چند بے اصول دہشت گردوں کی کارروائیوں سے بڑھتا جا رہا ہے..... بے شک ان روّیوں نے ہم سب کو پریشان کیا ہے اور مسلمانوں پر صورتِ حال مزید بدتر ہو رہی ہے۔ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر مسلمانوں پر تنگ نظری کا لیبل لگایا جاتا ہے۔ اس دن Angelic Interfaith نامی ادارے کی رہنمائی میں لوگ ڈھائی بجے دوپہر ایک منٹ کی خاموشی اختیار کریں گے اور مساجد کا دورہ کریں گے جہاں لوگ اسلام کے بارے میں بات چیت کریں گے۔

اپنے اس ٹور سے لوٹ کر جب پاکستان پہنچا تو ایک سوچ کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ایک وہ لوگ ہیں اور ایک ہم ہیں.....!

رسوا

محمد ایاز راہی

اردو ادب میں ناول نویسی کی ابتدا کرنے والے مصنفین میں سے ایک مصنف کا مختصر سا تذکرہ جس کے ایک ناول نے برصغیر میں ہلچل مچادی تھی۔ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی اس ناول کی پسندیدگی میں کمی نہیں آئی ہے، وہ روز اوّل کی طرح آج بھی پسند کیا جارہا ہے۔ جس ناول پر ایک دو نہیں، کئی فلمیں بھارت و پاکستان میں بن چکی ہیں اور ہر فلم نے ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کی۔

اردو کے ایک معروف مصنف کا ذکرِ خاص

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی جو بنیادی طور پر حکمت (Scinece) تحقیق و تجربے کی دنیا کے آدمی تھے مگر انہیں دائمی شہرت کا زریں تاج اردو ادب نے پہنایا اور تاریخ اردو ادب میں امر کردیا۔ بالکل عمر خیام کی طرح، جو تھے تو بہت بڑے حکیم اور دانائے علم و تحقیق مگر انہیں دنیا بھر میں پہچان اور نام وری فارسی ادب نے عطا کی۔ ان کی اعلیٰ وارفع رباعیوں پر ہی ہر خاص و عام نے داد و تحسین کے پھول برسائے اور کلمات صد آفریں سے انہیں نوازا۔

مرزا محمد ہادی بیگ رسوا نے اردو کا پہلا واحد متکلم ناول ''امراؤ جان ادا'' تخلیق کیا تو مرکزی کردار نے زندگی پالی، پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ''امراؤ جان ادا'' نے مکمل آداب اور ناز و نیاز سے اپنا حنائی ہاتھ پیشانی پر رکھا، کھنکتے لہجے اور سریلی آواز میں ''کنیز، آداب عرض کرتی ہے'' کہا ہے۔ گویا اس ایک ناول نے مرزا رسوا کو اردو ادب میں نمایاں ترین نشست پر بٹھادیا۔

مرزا رسوا کی قلمی تصویر کھینچنا، زندگی کو احاطۂ تحریر میں لانا اور ان کے فکر و فن کا جائزہ لینا تو یقیناً اہلِ علم کا کام ہے، ان سطور میں صرف اجمالی تعارف ہی مقصود ہے۔ مرزا رسوا کے آباواجداد ایران کے صوبے ماژندران سے ہجرت کرکے برصغیر آئے تھے اور دہلی کو انہوں نے اپنا وطن بنایا تھا لیکن دہلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

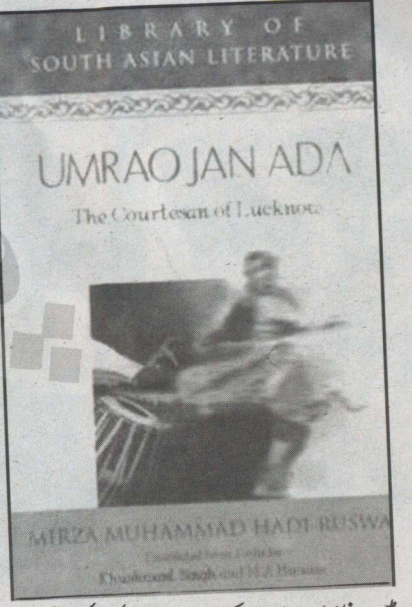

میں یہ خاندان زیادہ دیر تک نہ رہ سکا اور ترکِ سکونت کر کے ریاست اودھ میں ڈیرا جمایا۔ مرزا رسوا کے والد کا نام آغا محمد تقی تھا۔ صوبہ اودھ ہی کا شہر بے مثال لکھنو مرزا رسوا کی جائے پیدائش بنا۔ یہیں وہ پلے بڑھے اور زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔

اودھ کا نام آتے ہی ایک خاص قسم کی تہذیب کا تصور ذہن میں در آتا ہے جس میں عیش پسندی، فقر و فاقہ، دین و مذہب، کفر و الحاد، صوم و صنم، نماز اور رقص کے متضاد عناصر کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ اک عجوبۂ روزگار پرستانی تہذیب معرضِ وجود میں آ گئی تھی۔ شام اودھ میں اگر ایک طرف بندگانِ خدا قیام شب کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے تھے تو دوسری طرف کوٹھوں پر حوا کی بیٹی انگڑائی لے کر رقص کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ صد اور صنم کی یہ جلوہ گری اس تہذیب کا حصہ بن چکی تھی۔ سو اسی لیے اودھ کی شام مشہور ہے۔ دیارِ لکھنو گنگا جمنی تہذیب کا سچا آئینہ دار ہے۔

لکھنو کا محلّہ کوچہ آفرین علی خان جو باگ ٹولہ کے نام سے مشہور ہے یہیں مرزا رسوا نے 1857ء عیسوی میں آنکھیں کھولیں، یہ پُر آشوب سال اگر انگریزوں کے نزدیک عام الغدر (شورش و فساد کا سال) تھا تو اہلِ ہند اسے آزادی ہند کی طرف پہلا قدم قرار دیتے ہیں۔ مرزا رسوا ابھی نوعمر ہی تھے کہ ماں کی گود اور باپ کا سایہ ان سے چھن گیا، یوں یتیمی کی چلچلاتی دھوپ اور لکھنوی عیش و عشرت کی رنگین

چھاؤں میں ہوش و خرد کا آغاز ہوا۔ جیون بگیا میں پھول اور کانٹے دونوں نمو پانے لگے۔ مرزا کے ایک رشتے دار غالباً ماموں نے پرورش کی ذمے داری اپنے اوپر لی لیکن یہ ماموں جان بڑے لالچی واقع ہوئے۔ مرزا رسوا کو اپنے والدین کی طرف سے جو جائداد ترکے میں ملی تھی ماموں صاحب نے اس پر قبضہ جما لیا۔ مرزا رسوا بچپن ہی سے ہندو اہلِ علم کے بہ قول سرسوتی دیوی (علم و فن کی دیوی) کو بھا گئے تھے لہٰذا پڑھنے لکھنے سے فطری رغبت تھی۔ سو علم و عمل کی منزلیں بڑی تیزی اور کامیابی سے طے کیں۔ انہیں خصوصاً علم نجوم اور ریاضی سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان علوم میں ان کے جوہر خوب خوب کھلتے۔ فکر و خیال کو جلا ملتی۔ انہوں نے عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی اچھا خاصا عبور حاصل کر لیا۔ رڑکی میں نگران یا ناظم (Over-seer) کا امتحان دیا۔ کامیاب ہوئے اور کوئٹہ (بلوچستان) میں ریلوے کے ملازم ہو گئے۔ اتفاق سے ایک عربی رسالہ ان کے ہاتھ آ گیا جس میں کیمیا (Chemistry) پر ایک مضمون تھا، بس اس کا پڑھنا تھا کہ رسوا کی کایا ہی پلٹ گئی۔ نوکری سے استعفیٰ دیا اپنی کوٹھی مع سامان نیلام کروا دی۔ علم و تحقیق کے لیے لندن سے آلات حکمت منگوائے اور لکھنو آ کر تجربات شروع کر دیے۔ گزر اوقات کے لیے فارسی کے مدرس کا پیشہ اختیار کیا۔ گھر پر ہی انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اس کے بعد گھر بیٹھے بیٹھے ہی امریکا اور پنسلوانیا یونیورسٹی سے P.H.D کی ڈگری لی۔ مرزا رسوا علم ہیئت، کیمیا اور فلسفہ کے بھی جید عالم تھے۔ عبرانی، یونانی، ہندی اور سنسکرت پر مکمل دسترس تھی۔ اردو تو گھر کی باندی تھی ہی۔ ٹکسالی اردو کے سکہ بند شاعر اور نثر نگار تھے (بحوالہ: شہر نگاراں از سبط حسن) ان کا خلاق ذہن علم و ادب اور حکمت (Science) سبھی کا دامن تخلیق کے پھولوں سے بھر رہا تھا۔ ان کے علم و عمل سے متاثر ہو کر ایک دوست نے ان سے سوال کیا کہ ''تم یہ اتنا کچھ کیسے کر لیتے ہو؟''

مرزا نے بڑی سادگی سے جامع جواب دیا ''میاں، تم لوگ محنت نہیں کرتے۔ محنت کی عادت ڈالو بھائی!''

علم اور کتاب کا نشہ ان کے رگ و پے میں اُترا ہوا تھا۔ چنانچہ کتاب دوستی سے متعلق ان کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے، جو یہاں قند مکرر کے طور پر نذرِ قارئین ہے۔ ایک بار مرزا رسوا کو تنخواہ ملی تو ان تمام پیسوں کی انہوں نے پرانی کتابیں خرید ڈالیں اور ایک بیل گاڑی پر ساری کتابیں رکھوا کر گھر لے آئے۔ ان کی بیوی نے یہ سارا ماجرا دیکھا، سنا تو حیرت آمیز غصے سے چلا اٹھیں ''اجی، مہینا بھر اب کھائیں گے کیا؟''

مرزا رسوا نے بڑے رسان سے جواب دیا ''بیگم! فکر نہ کرو، کتابوں کے اوپر بھنے ہوئے چنوں کی بوری بھی لا در کھی ہے۔''

ماضی قریب کا یہ سچا واقعہ کوئی من گھڑت قصہ یا افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور اسی کا نام عشق ہے، وہی سچا عشق جس میں اپنی ذات کی نفی اور محبوب کی مدح سرائی عمل کے قالب میں ڈھلتی ہے۔ جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا، مرزا رسوا نے اردو ادب کا پہلا واحد متکلم ناول تخلیق کیا جس کا مرکزی کردار لکھنو کی ایک طوائف امراؤ جان ادا ہے جو خود اپنی زبانی اپنی کہانی مرزا کو سناتی ہے۔ عورت اور پھر خصوصاً طوائف کی اپنی ایک نفسیات اور ذہن ہوتا ہے۔ ایک مغربی مفکر کا کہنا ہے کہ صدیوں کی غلامی سے عورتوں میں یہ احساس پختہ ہو گیا ہے کہ انہیں اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالے کرنے کا معاوضہ ملنا چاہیے۔ چاہے وہ شوہر عمر بھر کے لیے ادا کرے یا تماش بین ایک ساعت کے لیے۔ جب وہ دیکھتی ہیں کہ کوئی عورت یا لڑکی محض پیار کی خاطر اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کر دیتی ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ اس نے ساری ملتِ نسواں سے غداری یا دھوکا کیا ہے کہ اس طرح وہ تمام عورتوں کی قدر و قیمت گھٹا دیتا چاہتی ہے لہٰذا قابلِ سزا ہے۔ اس تجزیے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہر طوائف کا فطری رجحان یہی ہوتا ہے کہ اسے بہر حال معاوضہ ملنا چاہیے۔ چاہے وہ غمزہ و شیوہ و ادا کے بدلے میں ملے یا رقص و سرود کی محفل سجا کر۔ حتیٰ کہ یہی مخصوص ذہنیت بالآخر اسے جسم فروشی پر بھی آمادہ کر دیتی ہے۔ سو مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا بہ قول سبط حسن کے گو کہ ادھیڑ عمر میں تائب ہو جاتی ہے مگر پھر بھی وہ بالہ خانے کی اتنی خوگر ہو جاتی ہے کہ رہتی چوک ہی میں ہے۔ حالانکہ امراؤ جان ادا پڑھی لکھی، مہذب اور باذوق طوائف ہے۔ شاعرہ بھی ہے اور ادا تخلص کرتی ہے۔ خود بھی اچھے شعر کہتی ہے۔ دوسروں کے اشعار پر داد بھی دیتی ہے۔

طوائف کا موضوع اردو ادب میں بالکل نیا نہیں تھا۔ مرزا رسوا سے پہلے منشی سجاد حسین کسمنڈوی (وفات 1912ء) اسی موضوع پر ناول ''نشتر'' لکھ چکے تھے۔ یہ ناول 1894ء میں لکھنو سے ہی طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا جس میں اٹھارہویں صدی کے درمیانی عہد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جب ہندوستانی خصوصاً لکھنوی تہذیب اس قدر پُر اثر اور بھرپور تھی کہ انگریز حاکم بھی اس کے رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ انگریز بڑے شوق سے ہندوستانیوں کی ضیافتوں، ناچ گانے کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ ہندی لباس پہنتے، حقہ پیتے اور پان بھی کھاتے۔ یہ ناول (نشتر۔ مطبوعہ 1894ء

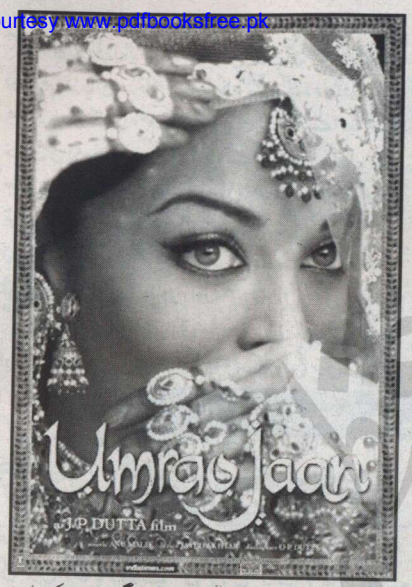

از لکھنو) لکھنوی تہذیب کے بجائے انگریزوں کی طرزِ معاشرت کا دلچسپ مرقع ہے اور طویل افسانہ بھی لیکن مرزا رسوا کا ناول ایک طوائف کی صرف آپ بیتی ہی نہیں بلکہ لکھنو کے زوال آمادہ تہذیب کی عبرت ناک فلمی تصویر بھی ہے۔

بہ قول سبط حسن مرحوم، مرزا محمد ہادی بیگ رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا شمار اردو کے روایتی ادب میں ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اس ناول کی عمر کم و بیش ایک صدی کے برابر ہے مگر ابھی تک اس کے بدن کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا ہے وجہ یہ ہے کہ مرزا رسوا نے اپنے اس شاہکار میں انیسویں صدی کے وسط کی شہری (لکھنوی) زندگی کے ایک ایک پہلو کا نقشہ بڑی سچائی، سادگی اور پرکاری سے کھینچا ہے۔ لکھنو کے بول چال کی میٹھی زبان، چھوٹے چھوٹے فقرے نیز واقعہ نگاری اتنی کامیاب اور پُر اثر ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ سچ مچ کی آپ بیتی ہے جبکہ امراؤ جان ادا مکمل طور پر ذہنی کاوش اور تخلیق ہی ہے۔ دراصل اس سے پہلے تقریباً دو سو برس کے عرصے پر محیط اردو داستانوں کی تاریخ سراسر من گھڑت اور خیالی مفروضات پر ہی مبنی تھی (جن، دیو، پریاں، جادوگر وغیرہ) جہاں فکر و فن کا کوئی گزر نہیں تھا اور نہ ہی معاشرتی اور زمینی حقائق کا پرتو دکھائی دیتا تھا، اُن دیکھی دنیا کی سیر ہوتی تھی۔ بالآخر اس کا ردِعمل ہوا۔ نشتر اور امراؤ جان ادا جیسے ناول نے جنم لے کر اردو قصہ گوئی کو تصوریت اور خیالی دنیا سے باہر نکالا۔ معاشرے کی درست عکاسی کی، راہ دکھائی۔ مرزا رسوا نے افشائے راز کے ایک کردار، سید محمد ذکی، سے

کردار نگاری کی ابتدا کی اور فن کی معراج پر پہنچ کر امراؤ جان ادا، بسم اللہ جان اور خانم جیسے شاہکار تخلیق کیے۔ وہ ناول میں بھرپور خاکہ نگاری، ٹھوس مواد، جان دار مکالمے اور نظریۂ حیات کی اہمیت سے بہ خوبی آگاہ تھے جس چیز پر انہوں نے جیسا چاہا تصرف کیا۔ مرزا نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مطالعے کی یہ گہرائی ہمیں ان کے ہر ناول خصوصاً امراؤ جان ادا میں بہ خوبی نظر آتی ہے۔ حقیقت سے قریب تر طرزِ نگارش پر اکثر پڑھنے والوں اور بعض نقادوں کو بھی یہ گمان گزرا کہ امراؤ جان ادا، واقعی کوئی مہذب، تعلیم یافتہ، سخن گو اور سخن فہم طوائف تھی اور یہ ناول اسی کے سوانح پر مبنی ہے، جو اس نے مرزا رسوا کو خود سنائے۔ اس سلسلے میں فریبِ نظر، پیدا کرنے کے لیے مرزا نے خود بھی بڑی کوشش کی جبکہ امراؤ جان ادا مرزا رسوا کی ذہنی تخلیق ہی ہے اور اس زندۂ جاوید تخلیق کو یہ جاننے کے بعد بھی کہ اس کا وجود تاریخی اور حقیقی نہ تھا اس کا جیتا جاگتا ہنستا بولتا کردار ذہن میں ایک وجود تاریخی کی طرح جگمگاتا رہتا ہے جس پر مکمل حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ یہی فن کی معراج ہے۔ ایک معروف نقاد، کے کے کھلر کے بہ قول یہ مرزا رسوا کی فن کاری کا کمال ہی تو ہے کہ اس نے پائل کی جھنکار اور محرم کی سوز خوانیوں کو شیر و شکر کر دیا ہے۔ جھنکار کوٹھوں سے اُبھرتی ہے اور سوز معاشرت سے۔ ساز اور سوز (سُر) کی یہی ہم آہنگی ناول امراؤ جان ادا کے ڈھانچے میں شروع سے آخر تک رنگینی نظر آتی ہے۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں ایک طوائف کا زاویۂ نظر پیش کیا ہے۔ اردو ادب میں یہ پہلا ناول ہے جس کا مرکز کردار ہے یعنی کہانی کا سارا بوجھ فردِ واحد پر ہی ہے۔ اردو ادب میں یہ ناول اس لحاظ سے بھی پہلا ہے کہ خاکے (پلاٹ) کی تعمیر پختہ ہے نیز ادب میں سوانحی سطح پر بھی یہ پہلی پیش کش ہے۔ مختصراً اردو زبان کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جب باہر سے حملہ آور ہندوستان میں آئے۔ دوسرا دور جب مسلمان فاتحین نے شمالی اور جنوبی ہند میں اپنی حکومتیں مستحکم کیں اور تیسرا دور جب اسلامی سلطنت کو زوال آیا اور اردو کا قافلہ بے سروسامانی کے عالم میں دلی سے نکل کر بہ چشم تر دبستان لکھنو کی طرف روانہ ہوا۔ سچ پوچھیے تو اردو کی فکر و فن سے مملو نثر نگاری لکھنو سے ہی شروع ہوئی، لکھنوی معاشرت نے ہی آگے چل کر اردو کو پہلا ادبی اور واحد متکلم ناول امراؤ جان ادا کے نام سے دیا۔ مرزا محمد ہادی بیگ کے بارے میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ رسوا ان کا قلمی نام یا تخلص نہ تھا۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں مرزا تخلص برتا ہے لیکن اس دور کی تہذیب اور دستور و اخلاق کے لحاظ سے امراؤ جان ادا ناول لکھتے ہوئے اسے انہوں نے اپنے نام سے منسوب کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک فرضی نام مرزا رسوا اختیار کیا مگر یہ بات بہت جلد معلوم ہو گئی کہ یہ ناول مرزا محمد ہادی بیگ کی تصنیف ہے اور پھر اس کے بعد وہ مرزا رسوا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اصل نام پس پردہ رہ گیا۔ بہ قول سبط حسن مرحوم، مرزا رسوا ناصح یا واعظ نہیں ہیں، نہ ان کے پیشِ نظر معاشرے کی اصلاح ہے، ان کو اس سے غرض نہیں کہ طوائفوں کا پیشہ اخلاقی اعتبار سے اچھا ہے یا بُرا۔ ان کے نزدیک ناول نویس یا قلم کار کا مقصد حقائق سے پردہ اُٹھانا ہے۔ ان کی نظر میں طوائفوں کی زندگی کوئی المیہ نہیں جس کا ماتم کیا جائے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس دور کی تہذیب کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے اس میں طوائف کا پیشہ چنداں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ طوائف معاشرے کی ایک مانی ہوئی سچائی تھی۔ اردو ادب میں مرزا محمد ہادی بیگ رسوا کی انہی کاوشوں نے اردو ناول کے اندر وہ لچک پیدا کر دی کہ عباس حسین ہوش، مہدی تسکین، محمد سعید، منشی پریم چند، عصمت چغتائی اور کرشن چندر جیسے ناول نگاروں کے جنم لینے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منشی سجاد حسین کسمنڈوی، مرزا محمد ہادی بیگ رسوا (بعد میں قاضی عبدالغفار، لیلیٰ کے خطوط) تینوں بزرگ مصنفین وادی گنگ و جمن کے رہنے والے تھے لیکن تینوں نثر نگاروں کا گہرا تعلق مدتوں حیدرآباد دکن (بھارت) سے رہا۔ عمر کا بیشتر حصہ دکن میں ہی گزرا۔ مرزا رسوا اگرچہ شاعر بھی تھے مگر انہیں شہرت دوام اپنے شاہکار ناول امراؤ جان ادا کی وجہ سے ہی ملی گو کہ اس ناول میں اپنے تخلیق کردہ مرکزی کردار کی زبانی مرزا رسوا نے اپنے شعری ذوق و تخلیق کا بھی پورا پورا اظہار کیا ہے۔ الغرض مرزا رسوا کا یہ ناول ان کے عہد کے لکھنو کی مکمل معاشرت کو آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انہوں نے کسی بھی جگہ خیالی کردار یا مصنوعی شہر پیش نہیں کیا، ہر مقام پر حقیقت سے قریب تر ہو کر لکھا، وہ اپنے ہر ناول کا مواد اور کردار روزمرہ زندگی سے ہی لیتے ہیں۔ مرزا رسوا کے اکثر ناولوں کی معاشرت لکھنوی ہی ہے۔ حکیم اور منفرد ادیب مرزا محمد ہادی بیگ رسوا۔ حیدرآباد دکن میں 1901ء کو ملازم ہو کر گئے پھر تا دمِ مرگ عثمانیہ یونیورسٹی (اردو) کے دارالترجمہ سے منسلک رہے۔ انہوں نے بدھ 21 اکتوبر 1931ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ باغ راجا مرلی دھر، ترپ بازار، حیدرآباد میں دفن ہیں۔

اُڑان

شکیل صدیقی

ہر پائلٹ کی زندگی خطروں سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ موت وحیات کے درمیان پرواز کرتا ہے کیونکہ بڑے سے بڑے طیارے کو ایک ننھی سی چڑیا تباہ کرسکتی ہے۔ اس کے طیارے سے تو ایک بڑی سی کونج ٹکرائی تھی جس نے اُڑتے ہوئے طیارے کی ونڈ شیلڈ تباہ کردی تھی۔ پائلٹ زخموں کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا تھا۔ ایسے وقت میں اس کی دیرینہ خواہش خود بہ خود پوری ہوگئی۔

ایک نیوی گیٹر کی روداد، قصۂ بیداد

وہ اپریل 1985ء کی ایک شام تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ فینگو 45 معمول کے مطابق محوِ پرواز تھا۔ وہ ایک فائٹر طیارہ تھا اور یہ اس کی تربیتی پرواز تھی۔ فینگو 45، ایئر نیشنل گارڈز کے تحت پرواز کرتا تھا اور دورانِ پرواز اسے جو بھی احکام دیے جاتے تھے ان پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ اس کا پائلٹ پینتیس سالہ گریگ انگلبرائٹ تھا۔ وہ اس سے پیشتر مارکیٹنگ انجینئر تھا۔ وہ اس وقت اپنے کاک پٹ میں بیٹھا تھا اور اس کا بتیس سالہ معاون فریڈولسن جو نیویگیٹر کے طور پر کام کرتا تھا اس کی پشت پر بیٹھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فریڈ کے سپرد طیارے کی ساری ذمے داریاں تھیں۔ وہ طیارے کے فیول تک کا حساب کتاب رکھتا تھا اور اسے یہ معلوم رہتا تھا کہ طیارہ کس وقت کہاں پرواز کر رہا ہوگا اور ہمیں اپنے فضائی دشمنوں سے کیسے بچنا ہے؟ وہ دشمن حقیقی نہیں تھے بلکہ ان ہی کی طرح سے پرواز کرتے تھے اور ایک دوسرے پر مصنوعی فائرنگ کرتے تھے۔ پیراشوٹ سے فضا میں چھلانگ لگانے کا بھی تجربہ انہیں پرواز کے دوران حاصل ہوتا تھا۔

فریڈ ایک دانا و بینا نیویگیٹر تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سے تنہا طیارے کو اُڑائے لیکن عمر کی قید اس کے آڑے آتی تھی۔ وہ پینتیس برس کا ہونے پر ہی پائلٹ کی سیٹ سنبھال سکتا تھا۔

تاہم وہ پائلٹ کے پیچھے والی نشست پر بیٹھ کر پینل پر نگاہ رکھتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کب اور کس وقت کون سا پرزہ کس مقصد کے تحت استعمال ہوتا ہے۔ گریگ اس وقت تھروٹل کو آگے کر رہا تھا جس سے طیارے کی نوک اُٹھ رہی تھی اور وہ اٹھارہ سو گولڈن فیلڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے گریگ کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بھاری تن و توش کا آدمی تھا جس کا دماغ چست اور اعصاب مستعد تھے۔ وہ ناگہانی حالات میں گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کنگ ماؤنٹین کے اوپر آ گئے۔ طیارہ اس وقت نچلی پرواز کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی رفتار آواز کی رفتار سے قدرے کم تھی۔ پہاڑ کے اوپر ایک راج ہنس محو پرواز تھا اور قائیں قائیں کر رہا تھا۔ مگر وہ دونوں اس کے وجود سے لاعلم تھے۔ وہ پرندہ سینتیس ملی میٹر کی توپ کے گولے کی رفتار سے طیارے کے ونڈ شیلڈ سے ٹکرا گیا۔ ایک دھماکا ہوا اور شیشے کی لاتعداد کرچیں ہوا کے زور سے اندر آئیں اور پائلٹ کو لگیں۔ ان میں سے کئی کرچیں اس کے چہرے اور جسم کے کھلے حصوں میں پیوست ہو گئیں۔ ہوا کے دباؤ سے پائلٹ گریگ بے ہوش ہو گیا۔ اس کا جسم کرچوں سے بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

طیارے کی آواز تبدیل ہوئی اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ پہاڑ کی کسی اُبھری ہوئی چٹان سے نہ ٹکرا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو تباہی لازمی تھی اور پھر طیارے کو کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اسے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔

نیویگیٹر فریڈ کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی، اس لیے کہ پائلٹ کی نشست کافی اونچی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پوری طرح محفوظ تھا۔ دراصل طیارے کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ اس کے بیٹھنے کی جگہ پائلٹ کے پینل سے جدا تھی۔ ابتدا میں جب ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا تھا تو اس کے ہیلمٹ پر پرندے کے خون کے چھینٹے آ کر لگے تھے۔ اس نے ان کی پروا نہ کرتے ہوئے، تھروٹل کو پیچھے کی طرف کھینچا تو طیارے کی نوک اوپر کو اُٹھ گئی۔ جس سے وہ کسی یقینی تصادم سے بچ گیا۔ فریڈ کا خواب اس کے سامنے تھا۔ اب وہ پائلٹ کی جگہ اس طیارے کو کنٹرول کر سکتا تھا لیکن اس کے خوابوں کی تعبیر کتنی ہولناک تھی۔ اس کے بارے میں اس نے سوچا تک نہیں تھا۔

صورتِ حال ایسی تھی کہ طیارہ موت کے منہ میں جا رہا تھا اور اسے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے اسے تباہی سے بچانا تھا۔ اس نے ٹرانسمیٹر آن کر کے ایویشن ٹاور کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ ایک بڑے پرندے کے اسکرین سے ٹکرا جانے کی وجہ سے کاک پٹ میں تباہی پھیل گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہم اس وقت گولڈن فیلڈ سے دو سو پینسٹھ درجے پر ہیں۔

ونڈ شیلڈ ٹوٹ جانے کے سبب تیز ہوا کے تھپیڑے اندر آ رہے تھے جن سے گونج دار آواز پیدا ہو رہی تھی۔ فریڈ کو اپنی آواز خود سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ہوا کے زور پر کاک پٹ میں موجود چیزیں بھنور کی شکل میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ اس لیے صحیح طور پر دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

فریڈ کو طیارہ کنٹرول کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی، اس لیے کہ وہ سارے آلات جو پائلٹ کے پاس تھے، ان کے ڈپلی کیٹ اس کے چھوٹے سے پینل پر بھی موجود تھے۔ وہ نہایت سہولت سے ہنگامی لینڈنگ کر سکتا تھا۔ ہر چند کہ یہ اس کا پہلا موقع تھا اور اس سے پیشتر اس نے طیارہ بھی کنٹرول نہیں کیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر تھروٹل کو مزید پیچھے کھینچے گا تو طیارہ اگلے حصے سے اُٹھ جائے گا اور اس کی رفتار میں کمی آ جائے گی۔ اس نے تھروٹل کو کھینچا تو طیارہ کو جھٹکے لگنے لگے۔ اس نے ٹرانسمیٹر پر پھر مدد مانگی۔ طیارہ جب کچھ اور اوپر گیا تو جھٹکے لگنا بند ہو گئے اور ہوا کے دباؤ میں بھی کمی واقع ہو گئی۔

پھر اس کے ہیڈ سیٹ میں سے آوازیں آنے لگیں۔ اس نے سیٹ کو آن کیا اور مائک پر بولا۔ ”گریگ۔ کیا تمہیں ہوش آ چکا ہے؟ مجھ سے بات کرو۔“

مگر ایک ہلکی سی کراہ کے سوا کوئی آواز نہ آئی۔ ممکن ہے وہ ہوش میں آ چکا ہو لیکن ابھی بولنے کی سکت نہ ہو۔ اس کی توانائی ختم ہو چکی ہو۔

فینگو 45 تاریکی میں چنگھاڑتا ہوا مغرب کی سمت جا رہا تھا، جہاں گولڈن فیلڈ انٹرنیشنل ایئرپورٹ واقع تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے ڈائل چمک رہے تھے۔ اس نے بلندی بتانے والے آلے الٹی میٹر کی طرف دیکھا۔ طیارہ اس وقت پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس کی بلندی ہموار کرنے کے لیے اس نے تھروٹل کو آگے دھکیلا تو اس کی بلندی کم ہو گئی اور وہ ہموار سطح پر پرواز کرنے لگا۔

اس وقت طیارے کی رفتار دو سو نوے میل فی گھنٹے تھی۔ اگر طیارے کی رفتار یہی رہتی تو اس کا فیول تقریباً ڈیڑھ گھنٹے مزید چل سکتا تھا۔ مگر پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ گریگ کی کرسی جس پردہ بیٹھا تھا، ایک بٹن دبانے سے اُچھل کر فضا میں جا سکتی تھی اور اس میں لگا ہوا پیراشوٹ کھل کر اسے بہ حفاظت نیچے اُتار سکتا تھا۔ گریگ کس حالت میں تھا، یہ اندازہ لگانا دشوار تھا۔ اگر وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو اپنی سیٹ کو فضا میں نہیں لے جا سکتا تھا، اس لیے کہ اس کے پیراشوٹ کی ڈوریاں خراب ہو چکی تھیں۔ وہ چاروں طرف بکھری پڑی تھیں۔ اس لیے کہ ہوا کے دباؤ نے انہیں منتشر کر دیا تھا۔

بہر حال کچھ بھی ہو، فریڈ اس طیارے اور اس کے پائلٹ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ معاون تھا اور اس کی معاونت میں طیارے سے وفاداری بھی شامل تھی۔ وہ زندگی کے آخری لمحات تک طیارے کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔

وہ چونکہ مذہبی رجحانات رکھتا تھا، اس لیے اپنے اور اپنے خاندان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔ اپنی دعاؤں میں اس نے گریگ کو بھی شامل کر لیا۔ وہ اپنے اور گریگ کے بچوں کو یاد کر کے خدا کو ان کا واسطہ دینے لگا۔

اے خدا! ہماری مدد فرما۔ ہمارے حال پر رحم فرما۔ ہمیں زندگی عطا کر۔

اس کے بعد وہ انٹرکام پر بار بار گریگ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا، مگر اس کے باوجود بہت دور۔ وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر اسے مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ طیارہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی تھوڑی سی عدم توجہی کی بنا پر کچھ سے کچھ ہو سکتا تھا۔

1950 کی ایک نظم

حضور! آپ سے اک راز عرض کرنا ہے
حضور! آپ کو بھی قبر میں اترنا ہے
وہاں جہاں پہ یہ جاہ و حشم نہیں ہوں گے
وہاں جہاں پہ یہ صدہا خدم نہیں ہوں گے
وہاں جہاں پہ یہ طبل و علم نہیں ہوں گے
وہاں جہاں پہ یہ تیغ و قلم نہیں ہوں گے
وہاں جہاں پہ یہ خاکی صنم نہیں ہوں گے
حضور کے یہ ستم اور کرم نہیں ہوں گے
وہاں جہاں پہ نہ ہوگا قصیدہ خواں کوئی
نہ چوبدار، نہ حاجب، نہ پاسباں کوئی
نہ ساز باز، نہ ہمدم، نہ راز داں کوئی
چھپا سکے نہ حقیقت کو ترجماں کوئی
سفارشی وہاں آئے نہ درمیاں کوئی
زباں کو کام نہ دے حکمت بیاں کوئی
ملے گا واں پہ نہ تسکین دل کو جام شراب
وہاں پہ غم کو غلط کر سکیں نہ چنگ و رباب
گنہ کی راتوں میں بہکے گا واں نہ عہد شباب
وہاں پہ آنکھوں میں ہوں گے نہ عشرتوں کے یہ خواب
وہاں طبیعت نازک رہے گی سخت خراب
وہاں کمر پہ یہ شمشیر بھی نہیں ہوگی
وہاں سیاست و تدبیر بھی نہیں ہوگی
وہاں یہ لذت تقریر بھی نہیں ہوگی
یہ کلک حکم کی تحریر بھی نہیں ہوگی
حریف کے لیے زنجیر بھی نہیں ہوگی
درون پردہ کی تزویر بھی نہیں ہوگی
حضور! آپ کو بھی قبر میں اترنا ہے۔

نعیم صدیقی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فریڈ کے پینل پر مددگار آلات لگے تھے۔مگران میں لینڈنگ گیئر، یا پہیوں کو روکنے والے ہک نہیں تھے۔اس لیے فینگو 45 لینڈنگ کے وقت کیسے رکے گا، وہ اس سے واقف نہیں تھا۔کوئی معجزہ اس کا ساتھ دے تب ہی وہ اور فینگو 45 محفوظ رہ سکتا تھا۔

دفعتاً اگلی سیٹ میں حرکت ہوئی۔اس نے اس طرف نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ گریگ اپنی سیٹ سے اُٹھنے کی کوشش کررہا ہے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ہوش آچکا ہے۔

''گریگ......گریگ......گریگ......!'' وہ اپنے ہیڈ سیٹ میں چیخنے لگا۔''پہیوں کو باہر نکالو، ورنہ ہم فینگو 45 کو لینڈ نہیں کرسکیں گے۔''

اسے امید تھی کہ گریگ جب ہوش میں آگیا ہے تو پھر اس کی ہدایت پر عمل بھی کر ڈالے گا اور ان کے بچنے کی امید ہوجائے گی،لیکن جب اس نے گریگ کو دوبارہ اپنی سیٹ پر گرتے دیکھا تو اس کا دل ڈوب گیا۔گریگ پوری طرح سے ہوش میں آچکا تھا،لہٰذا اس نے اپنی توانائی کو مجتمع کیا اور ایک بار پھر کھڑا ہوگیا۔فریڈ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ پھر دعائیں مانگنے لگا۔اس نے تھروٹل کو ہمواری سے تھام رکھا تھا،تاکہ طیارے کی پرواز یکساں اور توازن میں رہے۔وہ اب نہ تو اُٹھ رہا تھا اور نہ اس کی نوک کا رُخ زمین کی طرف تھا۔

دس منٹ مزید گزر گئے۔یہ دس منٹ اسے دس صدیاں لگ رہی تھیں۔وہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔اس لیے کہ گریگ اپنی نشست سے اُٹھ رہا اور گر رہا تھا۔وہ اُٹھتا تھا تو لہرا کر گر پڑتا تھا۔اس کی جسمانی توانائی ابھی نہیں لوٹی تھی۔

ہلکی سی آواز آئی اور پینل پر لگا ہوا اسکرین روشن ہوگیا۔اس پر لکھا ہوا تھا۔''لینڈ گیئر (پہیے) باہر نکل چکے ہیں، دونوں پَر سمٹ گئے ہیں اور فینگو 45 کی رفتار گھٹ کر دو سو تیس میل فی گھنٹا ہوچکی ہے۔''

''شکر ہے خدایا!'' اس نے خلوص دل سے کہا۔''گریگ، تم نے کام کر دکھایا۔تمہیں واقعی ہوش آگیا ہے۔تمہارے حواس جاگ گئے ہیں۔اب ہم حفاظت سے لینڈ کرلیں گے۔تم پریشان نہ ہو، میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

مگر گریگ کچھ نہیں سن رہا تھا۔وہ بے ہوش ہوکر دوبارہ اپنی نشست پر گر چکا تھا۔اس نے ہوش میں آنے پر اپنا کام کر دیا تھا،لیکن اس کے حواس ساتھ نہ دے سکے تھے۔فریڈ نے اندازہ لگایا کہ اسے اندرونی طور پر کوئی گہری چوٹ لگی ہے۔اس لیے کہ وہ خود پر قابو نہیں رکھ پا رہا ہے۔

اس کے ہیڈ سیٹ میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور پھر ائر ٹریفک کنٹرولر کے کسی افسر نے کہا۔''فینگو 45 ہم نے تمہیں اپنے اسکرین پر دیکھ لیا ہے۔تم کس مسئلے سے دوچار ہو؟''

ائر ٹریفک کنٹرولر کے خاموش ہوتے ہی فریڈ بولا۔''فینگو 45۔ایک بڑے پرندے کے طیارے سے ٹکرا جانے کی وجہ سے ونڈ اسکرین ٹوٹ گیا اور پائلٹ بے ہوش ہوگیا ہے۔''

چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی اس کے بعد دوسری طرف سے کہا گیا۔''فضا میں چکر کاٹتے رہو۔ہم ایک طیارہ تمہاری مدد کے لیے روانہ کررہے ہیں۔''

وہ سر ہلا کر رہ گیا۔کافی دیر انتظار کے بعد ہیڈ سیٹ میں ایک آواز آئی۔''ہیلو! فینگو 45۔میں فینگو 44 سے بول رہا ہوں۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔''

وہ 4C طیارہ تھا جسے میجر بل ملر چلا رہا تھا،جس کے ساتھ نیویگیٹر مائیکل میگرے بھی تھا۔ بل بولا۔''فریڈ! تمہارے طیارے کی ظاہری حالت تو درست معلوم ہوتی ہے۔پہیے نکلے ہوئے ہیں اور پَر بھی سمٹ چکے ہیں۔''

ونڈ شیلڈ میں بنے ہوئے سوراخ سے فریڈ نے دیکھا کہ ایک فینٹم طیارہ پچاس فٹ کے فاصلے پر اس کے طیارے کے ساتھ اُڑ رہا ہے۔''فینگو 45۔اگر تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ تو میں تمہیں ماؤنٹین ہوم لے جانا چاہتا ہوں جہاں تم حفاظت کے ساتھ لینڈ کرسکو گے۔''

فریڈ جانتا تھا کہ وہ ائر فورس کے ایک ہوائی اڈے کا نام لے رہا ہے جس کا رن وے بہت لمبا ہے اور وہاں حفاظتی اقدامات کی فراوانی ہے۔وہ گولڈن فیلڈ سے پچاس میل جنوب میں تھا۔

''ٹھیک ہے روجر 44۔میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اپنی بلندی مزید کم کردینا چاہیے۔'' فریڈ نے جواب دیا۔

اور پھر وہ ٹوٹا پھوٹا ہے۔ پائلٹ کا طیارہ فینگو 44 کی نگرانی میں بہ حفاظت رن وے پر اُتر گیا۔ابتدائی امداد دینے والوں نے گریگ کو بے ہوشی کی حالت میں اُتارا اور اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ڈاکٹروں کی اَن تھک کوشش کے باوجود اسے بچایا نہ جاسکا کیونکہ دماغ میں بہت زیادہ خون بھرتا چلا گیا تھا۔آج بھی جب فریڈ پائلٹ سیٹ پر بیٹھتا ہے تو اس دن کے مناظر نظروں میں گھوم جاتے ہیں جب موت نزدیک آکر پلٹ گئی تھی۔

نگینے

زین مہدی

چھوٹے چھوٹے رنگین پتھر جو زمین کی تہ سے برآمد ہوتے ہیں، یہ پتھر اسرار بھرے ہوتے ہیں۔ ان میں کس قدر پراسراریت ہے۔ زندگی کو یکسر بدل دینے کی خوبی ان میں کیوں آجاتی ہے، ستاروں کی شعاعیں جسم تک پہنچاکر یہ صحت یابی کی طرف کیسے لے جاتے ہیں اس کا مختصر سا ذکر۔

عام استعمال کے جواہرات کی افادیت کا تذکرہ

قدیم زمانے میں انسان بیمار ہوتا تو سمجھا جاتا تھا کہ اس کے جسم میں بُری ارواح حلول کرگئی ہے' اس لیے جسمانی علاج کے لیے روحانی طریقۂ کار کام میں لایا جاتا تھا۔ان کے پاس امراض کے متعلق بہت کم معلومات تھیں' لہٰذا اس دور کے طبی مسائل کی وضاحت بھی مشکل ہے' ان لوگوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ موسیقی اور خاص طور پر مذہبی منتر انسانی ذہن کو تسکین پہنچاتے ہیں' اس سے سنجیدہ نوعیت کی بیماریاں جلد دور ہوجاتی ہیں' اسی وجہ سے بیمار کے سامنے مذہبی منتر پڑھے جاتے تھے۔

خوشبودار جڑی بوٹیاں اور خوشبوئیات کا استعمال ہوتا تھا' قیمتی پتھروں کو اہمیت دی جاتی تھی کیونکہ پتھر سورج کی شعاعوں میں سے افادیت بھری شعاع اپنے اندر جذب کرکے جسم میں پہنچادیتا ہے اور ان شعاعوں کی وجہ سے جسم کے خلیے متحرک ہوکر اس بیماری کو دور کردیتے ہیں۔یہی وجہ تھی کہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہیرا ذہنی سکون کا باعث ہے جبکہ لعل طاعون سے محفوظ رکھتا ہے' لیکن قرونِ وسطیٰ کے معالج کیمیا کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے' چنانچہ اس سے پتھروں کی اہمیت میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔جڑی بوٹیوں سے کیمیا حاصل کیا جانے لگا اور پتھروں کی جو خاصیت ہے اس پر تحقیق بند کردی گئی۔لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دور میں بھی کچھ لوگ پتھروں کے خواص پر کام کرتے رہے اور اس کے جادو اثر سے فوائد حاصل کرتے رہے۔

وہ علما اور ماہرین جو قیمتی پتھروں کی قوت وطاقت سے آگاہ ہوچکے تھے اپنے تجربات جادو کے ذیل میں لکھتے رہے تھے۔سترہویں صدی میں ایک تجربہ کرنے والے حکیم نواسس نے پتھروں کے خفیہ رازوں سے آگہی کے لیے اور خود اپنے اوپر ان کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے لعل' موتی و زمرد کو پیس کر ان کا پاؤڈر بنایا تاکہ ان کے خفیہ اثرات کا نچوڑ حاصل کرسکے، اس نے اپنے روزنامچہ میں لکھا کہ اس کا پورا کمرا بنفشے کی خوشبو سے بھر گیا جو کئی دن باقی رہی۔

پہلے زمانے کے لوگ زیورات کو جادوئی علامت کے

نقطہ نگاہ سے استعمال کرتے تھے' مثال کے طور پر کہا جاتا تھا کہ بعض پتھر رنگ بدل لیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کا پہننے والا جلد دنیا سے جانے والا ہے' سولہویں صدی میں زار روس نے ایک انگریز سے اپنے خزانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مونگوں نے اپنا رنگ تبدیل کر دیا' جس کا مطلب یہ ہے کہ میں جلد مرنے والا ہوں۔

ایسا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ پتھر اپنے رنگ کیوں بدلتے ہیں؟ اس پر ہم آیندہ بحث کریں گے۔ پہلے میں ان پتھروں کے خواص پر کم سے کم لفظوں میں روشنی ڈال دوں۔

محافظ پتھر: یہ قیمتی پتھر اپنے مافوق الفطرت اثرات کے ذریعے تقریباً ہر قسم کے ممکنہ خطرے سے بچا سکتے ہیں۔ انہی معجزانہ قوتوں کی وجہ سے جواہر عموماً بُری ارواح اور بدقسمتی کو دور کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ عقیق یا سنگ سلیمانی چھوٹے سانپ' بچھو' مکڑی اور بعض زہر و بدقسمتی کے بداثر سے بچنے کے لیے پہنا جاتا تھا' مونگا جو آج بھی مقبول یورپی طلسم ہے' وہ بھی بُرے اثرات اور بُری ارواح سے بچانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ ہیرا پہننے کا مشورہ ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جن کو مہم جوئی کی خاطر جنگل میں جانا ہوتا تھا دراصل ہیرا جنگلی جانوروں کو بھگاتا ہے اور ڈراؤنے خوابوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ عقیق سلیمانی سانپوں کو گھر سے دُور رکھتا ہے۔

پتھر اور عاشقی: پُرانے دور میں جواہرات کو طلسم کے طور پر محبت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ چارلس میگنے جو کہ ایک قدیم فرانسیسی بادشاہ تھا' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سونے کی انگوٹھی میں جڑے ہوئے پتھر کی وجہ سے محبت میں گرفتار ہوا تھا' آج کے زمانے کی منگنی کی انگوٹھی بھی دراصل قدیم زمانے کی اسی روایت کی شکل ہے۔

قدیم زمانے سے ہی لعل' ہیرے' نیلم اور زمرد وغیرہ کو خوش بختی لانے والا پتھر خیال کیا جاتا ہے' تاہم یہ یاد رکھنا بہتر رہے گا کہ معاملات میں وہی پتھر خوش بختی لاتے ہیں جو آپ کے پیدائشی پتھر ہیں۔ آج کل عموماً فیروزے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ گھر میں ابتری اور پریشانی لاتا ہے' اس طرح اوپل بھی شادی شدہ زندگی کی مضبوطی کے لیے ایک خطرہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ سچے موتی کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ یہ شادی شدہ زندگی میں ناخوشی لاتے ہیں' اس بات سے تو سب ہی واقف ہوں گے کہ آنسوؤں کو موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن محض اس وہم کی وجہ سے موتیوں سے پرہیز نہ کریں' کیونکہ موتی تو خوش قسمتی کی علامت ہیں۔ یہ عیسائیوں کے نزدیک نجات کی علامت اور بدھ مذہب میں اسے مہاتما بدھ

کی تیسری آنکھ کہا جاتا ہے۔

ابتدائی دور کے عیسائیوں نے ان پتھروں کے جادوئی نظریات کو نظر انداز کر دیا تھا مگر یہ ضرور مانتے تھے کہ پتھر مافوق الفطرت خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں' دراصل یہ پتھر پہننے والوں کے جذبات اور نقطہ نگاہ پر بے حد اثر انداز ہوتے ہیں' چنانچہ مختلف پتھر پہننے والوں پر جو اثرات ڈالتے ہیں' وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

عقیق سلیمانی: ملنساری' خوش مزاجی پیدا کرتا ہے۔

ایے تھسٹ: ہوشیاری' متانت' مضبوطی' استحکام پیدا کرتا ہے۔

پکھراج: ذہنی نزاکت' زود حسی پیدا کرتا ہے۔

زبرجد: نفاست' خلوص' پاکیزگی پیدا کرتا ہے۔

ہر دور کے مفکروں اور فلسفیوں نے پتھروں کی خاصیت پر بحث کی ہے۔ کسی نے بھی قیمتی پتھروں کے اثرات سے انکار نہیں کیا اور انہیں محض تخیل یا وہم قرار نہیں دیا۔ محققین نے یہ تک کہا کہ اگر ان پتھروں کا اثر دیکھنا ہے تو اسے ستاروں کی چال کو مدِنظر رکھ کر پہنیں پھر اس کے اثرات ملاحظہ کریں۔ جس ساعت میں، ستارے جس رخ پر تھے اس کو مدنظر رکھ کر اسی حساب سے پتھر پہنیں گے تو ستاروں سے آنے والی شعاعیں آپ کی قسمت صحت اور دیگر مصروفیت پر اثر انداز ہوں گی۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوا اور اس وقت کواکب کی راہیں کیا تھیں اسے مدِنظر رکھ کر ماہرین جن پتھروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے ہی برتھ اسٹون کہتے ہیں۔

برتھ اسٹون: پتھروں کی کواکبی اہمیت اور پتھروں کی جادوئی قوتوں پر بے اندازہ تحقیقات کی جارہی ہیں' پتھروں کی درجہ بندی جو زیادہ مقبول ہے' وہ مندرجہ ذیل ہے۔

پتھر	ماہِ پیدائش
فیروزہ	دسمبر
پکھراج	نومبر
اوپل	اکتوبر
نیلم	ستمبر
عقیق سلیمانی	اگست
لعل	جولائی
موتی	جون
زمرد	مئی
ہیرا	اپریل
نیلگوں بلور	مارچ
ایے تھسٹ	فروری
گارنٹ	جنوری

خوبصورتی اور سچائی کے شائقین کے لیے یہ درجہ بندی بہت کم اہمیت رکھتی ہے کیونکہ بعض اوقات کسی ایک پتھر کو حاصل کرنے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ اسے کسی طرح دبایا نہیں جا سکتا اور لوگ اسے حاصل کر لیتے ہیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ پتھر نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ ہر کام من جانب اللہ ہے مگر ملے روزی بہانے موت۔ کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ بن جاتا ہے جو ذہن کو پرگندا کر دیتا ہے۔

اوپر دیے گئے جدول کے علاوہ قدیم جدول بھی مروج ہے۔ قدیمی بروجی نظام کے مطابق بروج کے متعلقہ پتھر یہ ہیں۔

عقیق یا سنگ سلیمانی	برج جوزا
لعل	برج جدی
نیلگوں بلور	برج عقرب
یاقوت	برج دلو
سنگ سلیمانی	برج اسد
ایے تھسٹ	برج حوت
نیلم	برج ثور
زمرد	برج سرطان
بلڈاسٹون یا حجر الدم	برج حمل
پکھراج	برج قوس
زبرجد	برج میزان
کارنیلن	برج سنبلہ

جدید تحقیقات: یہ بات قابلِ فہم ہے کہ قدرت نے اس کائنات میں کوئی چیز بلاجواز پیدا نہیں کی، اس پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے' اب بات صرف اتنی ہے کہ کون کس شعبے میں زیادہ محنت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کس نعمت سے کتنا فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ جدید سائنس نے جواہرات میں موجود اثرات کی تصدیق کر دی ہے۔ قدیم ماہرین علمِ نجوم کی طرح جدید منجم ضرورت کے مطابق جواہرات پہننے کا مشورہ دیتے ہیں۔ سائنسی بنیادوں پر کام کرنے والے جدید منجم بھی زیادہ زور شور سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جواہرات کے درست

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استعمال سے زندگی میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے' بہت سے لوگوں کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ انہوں نے یا ان کے واقف کار نے کوئی خاص پتھر پہنا اور اس سے ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ یا ان کا کوئی خاص مسئلہ حل ہو گیا یا کوئی غلط پتھر پہننے سے تکلیف لاحق ہو گئی۔ یہ روزمرہ مشاہدے کی باتیں ہیں۔ ان کے لیے کسی خاص تحقیق کی ضرورت نہیں۔ جس ہستی نے یہ جواہرات پیدا کیے ہیں' اسی نے ان میں پُراسرار اثرات بھی رکھے ہیں' اصل ضرورت یہ سمجھنا ہے کہ کونسا پتھر کس کے جسم سے مس ہونے کی صورت میں ہم آہنگ ثابت ہوگا اور کونسا پتھر اس کے لیے مضر ثابت ہوگا۔

تاثیراتِ سنگ: پتھروں سے انسان کا رشتہ اس وقت ہی استوار ہو گیا تھا' جب اس نے کرہِ ارض پر قدم رکھا تھا' پتھر انسان کے لیے ہتھیار کا کام دیتے تھے' وہ اس سے اوزار بناتا تھا اور آگ روشن کرتا تھا' پتھروں سے بنے غار میں اسے موسم کے گرم و سرد سے پناہ ملتی تھی۔ پھر اس نے مرحلہ وار تہذیب کی منزلیں طے کیں اور پتھروں سے اس کا تعلق گہرا ہوتا چلا گیا۔

ہزاروں برس پہلے فنا ہو جانے والی تہذیبوں کے مفکرین بھی پتھروں کو استعمال کیا کرتے تھے' یہ محض اسے زیب و زینت کے لیے ہی استعمال نہیں کرتے تھے' بلکہ انہیں علم تھا کہ ان پتھروں کے جسم سے مس ہونے کے نتیجے میں انہیں مختلف مسائل سے نجات مل سکتی ہے' مصری تہذیب جو انتہائی ترقی کے مراحل طے کرنے کے بعد تباہ ہوئی اس کے ارکان پتھروں کو جس طرح استعمال کرتے تھے' اس کا ثبوت اہرامِ مصر سے برآمد ہونے والی فراعنہ کی لاشوں سے لگایا جا سکتا ہے' ان لاشوں کے ساتھ بادشاہوں کے زیرِ استعمال رہنے والے جواہرات دستیاب ہوئے ہیں۔

عام آدمی کے لیے بھی جواہرات کا استعمال ناگزیر تھا' وہ اپنی استطاعت کے مطابق کم قیمت جواہرات کو استعمال کرتے تھے' تاہم امیر و غریب سب کو جواہرات کے پُراسرار اور شِفا بخش اثرات کا علم تھا' وہ مختلف مسائل سے نمٹنے کے لیے مختلف پتھر استعمال کرتے تھے' اور انہیں اس طرح پہنتے کہ جسم سے مس ہوتے رہیں۔ قدیم یونانی' عرب اور رومن تہذیبوں کا بھی یہی حال تھا' ان تہذیبوں کے افراد جواہرات کو اپنے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے' یہ عجیب بات ہے کہ تاریخ کے کسی بھی حصے میں جواہرات کا استعمال متروک نہیں ہوا' ازل سے آج تک جواہرات یکساں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہی تو وہ ٹھٹھہ تھا جہاں عرب آئے' سومرا خاندان آیا' سمہ خاندان آیا اور جام نظام الدین جیسا حاکم آیا' ارغون آئے' ترخان آئے اور اسے برصغیر کی کلاہ میں ہیرے کی طرح جڑ دیا۔

اس شہر کو زیادہ شہرت سمہ خاندان کے حکمران جام نظام الدین کے زمانے میں ہوئی۔ اس کے دور میں شہر ٹھٹھہ اپنے عروج پر تھا' یہاں پر عمارتیں بھی بنیں' خود یہ شہر تجارتی مرکز بنا اور اس کی علمی حیثیت اسی زمانے میں قائم ہوئی اور اس کا مشہور وزیر تھا دریا خان۔ ٹھٹھہ کے مشرق کی جانب اس کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دریا خان نے اس گاؤں کو سرسبز و شاداب کرنے کے لیے ایک نہر نکالی تھی جو علی جاہ نہر کہلاتی ہے۔ یہ کلری نہر بھی اسی کی نکالی ہوئی ہے۔ اس طرح کی نہریں نکالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھٹھہ شہر کے گرد بہت سے باغات ہو گئے اور سارا علاقہ سرسبز ہو گیا۔ تو ٹھٹھہ شہر کا عروج 14ویں صدی میں سمہ خاندان کے زمانے میں ہوتا ہے۔

اور پھر یہ ہوا کہ ایشیا بھر کے اہل علم' اہل ہنر کھنچے کھنچے ٹھٹھہ آ گئے۔ بحر عرب سے ملا ہوا' دریائے سندھ سے جڑا ہوا یہ شہر باکمال لوگوں کے ہاتھوں نکھرنے لگا۔ سنورنے لگا۔ ٹھٹھہ کے بارے میں مشہور تھا کہ دولت اس میں بھری پڑی ہے۔ اس کی اس دولت کی خبر ہر ایک کو تھی' کالوں کو بھی گوروں کو بھی۔

عیسیٰ خان ترخان کے زمانے کا جو ایک اہم واقعہ ہے وہ یہ کہ ٹھٹھہ میں پہلی مرتبہ پرتگالی آئے۔ ہوا یہ کہ یہاں باہمی خانہ جنگی چل رہی تھی اور عیسیٰ خان کو مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے گجرات میں پہلے سے موجود پرتگالیوں کو لکھا کہ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پرتگالی اس کی مدد کے لیے ٹھٹھہ پہنچے تو عیسیٰ خان شہر کے اندر بھی نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پرتگالی یہاں آئے تھے' اب وہ اپنا معاوضہ لینا چاہتے تھے۔ جب ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملا تو انہوں نے ٹھٹھہ شہر کو لوٹا اور بڑا قتل عام کیا۔ جامع مسجد کو آگ لگائی' شہر کو مسمار کیا اور لوٹا ہوا مال اپنے ساتھ لے گئے۔ تو یہ سمجھیے کہ یورپین اقوام سے سندھ کا پہلا تعارف اس انداز میں ہوا۔

ٹھٹھہ شہر کے اندر مختلف محلے آباد تھے' ان محلوں کے جو نام ہیں کچھ تو شخصیات کے ناموں پر ہیں کہ جنہوں نے ان محلوں کو بسایا اور کچھ نام ایسے ہیں جو پیشوں کے اعتبار سے ہیں مثلاً محلہ سنگ تراشاں' یا محلہ مسواک کشاں یا محلہ قصاباں' یہ تو پیشوں کے اعتبار تھے۔ کچھ محلے برادریوں کے نام پر تھے مثلاً محلہ ساداتِ رضویہ' مغل واڑہ' جہاں غالباً مغل آ کر آباد ہوئے ہوں گے یا پھر شخصیتوں کے ناموں پر ہیں مثلاً محلہ محمد علی' یہی حال بازاروں کا ہے۔ یہ بازار بھی شخصیتوں کے ناموں پر ہیں یا کچھ خاص بازار تھے۔ پھر دوسری چیز جو ہے وہ اس زمانے کی مسجدیں ہیں۔ مثلاً شاہ جہاں کے زمانے کی مسجد اب تک موجود ہے۔ یہ اس کے ایک امیر نے بنوائی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری مساجد بھی ملتی ہیں مثلاً مسجد امیر خانی ہے' مسجد دادگیر ہے اور قسم کی مسجدیں ہیں' مسجد رحمت خانی ہے' ان کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں۔

اس کے بعد ٹھٹھہ کی تقدیر بدلی' سمندر دور چلا گیا۔ دریا نے ساتھ چھوڑ دیا۔ نئے حکمرانوں نے اپنے دارالخلافے بنانے کے لیے دوسرے مقامات ڈھونڈنے شروع کر دیے اور جس ٹھٹھہ کا مقابلہ پیرس سے کیا جاتا تھا وہ وقت کے پیروں میں روندا گیا۔

ٹھٹھہ کی اہمیت اس وجہ سے بھی گھٹنی شروع ہوئی کہ لاری بندر میں ریت بھر گئی اور یہ بندرگاہ ختم ہوئی' اس کی جگہ شاہ بندر دوسری بندرگاہ بنی۔ یہ مغلوں کے زمانے کی بات ہے' سمندر پیچھے ہٹنے لگا' بندرگاہیں بند ہونے لگیں تو علاقے کی تجارتی اہمیت ختم ہونے لگی۔ پھر کلہوڑوں اور تالپوروں نے اس کو اپنا مرکز نہیں بنایا چنانچہ اس کی سیاسی اہمیت ختم ہوئی اور اس کے بعد اس کی ثقافتی اہمیت یوں ختم ہوئی کہ جب یہ حکومت کا مرکز نہیں رہا۔ پھر یہ ہوا کہ سندھ کے موسم نے عمارتوں کو نقصان پہنچانا شروع کیا اور قدیم عمارتوں کے نام و نشان مٹنے لگے۔

افتباس: شیر دریا از رضا علی عابدی۔ تلاش: اظہر جمیل صدیقی

اہمیت اور دلچسپی کے ساتھ مسلسل استعمال ہو رہے ہیں۔

جواہرات پہننے کے علاوہ بطور کیمیا بھی استعمال ہوتا ہے جس کے موجد یونانی کہلاتے ہیں لیکن چین جیسی قدیم تہذیب جو یونانیوں سے واقف بھی نہ تھی ان کی قدیم کتابوں میں بھی جواہراتی کیمیا کا ذکر ملتا ہے۔ یونانی حکما میں رائج جواہرات سے بننے والی دواؤں میں خمیرہ مروارید' (سچے موتیوں کا خمیرہ) سب سے زیادہ مقبول ہے' اس کے استعمال سے جسم کا درجہ حرارت نارمل رہتا ہے' یہ قلب و دماغ کو قوت بخشتا ہے۔

خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا خاص' یہ دوا خاص طور پر عنبر موتیوں اور دیگر جواہر کی مدد سے تیار کی جاتی ہے' یہ خصوصی دوا قلب و ذہن کو تقویت تو پہنچاتی ہی ہے ساتھ ساتھ یادداشت' قوتِ سماعت اور سونگھنے کی حس کو بھی تیز کرتی ہے' جواہرات سے بنا ہوا سرمہ آنکھوں کے لیے ایک نعمت ہے' یہ بصارت کو تیز کرتا ہے' موتیا پن سے بچاتا ہے اور آنکھوں کی دیگر بیماریوں کے لیے بھی مفید ہے' سونے اور سچے موتیوں کو باہم ملا کر تیار کی جانے والی دوا جگر اور دماغ کو تقویت فراہم کرتی ہے' جبکہ عنبر سے کشید کیا جانے والا عرق جس میں دیگر جواہر بھی شامل کیے جاتے ہیں' نہ صرف جسم کو توانائی فراہم کرتا ہے بلکہ بہتے ہوئے خون کو روکتا ہے' کھوئی ہوئی قوت کو بحال کرنے کا اضافہ بھی کرتا ہے' اس کے علاوہ قدیم ہندوستانی سسٹم آف میڈیسین آیورویدا میں بھی جواہرات کا خوب خوب استعمال ہوتا ہے۔ چینی اور جاپانی سسٹم آف میڈیسین میں بھی متعدد دوائیں ہیں جن کا جز جواہرات ہیں۔ ان کے زود اثر اور شفا بخش اثرات کا علم ہزاروں برس پہلے تو تھا ہی آج سائنسی طور پر بھی صحیح ثابت ہوا ہے۔

حسن و صحت پر جواہرات کے اثرات: جواہرات اپنے حسن میں پُراسرار اثرات اور شفا بخش خوبیوں کی وجہ سے قدیم ترین تہذیبوں سے لے کر آج تک انسانی توجہ کا مرکز بنے' جواہرات کے شفا بخش اثرات پر توجہ دی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی دور اور آیورویدک طبی نظاموں میں خاص الخاص ادویہ جواہرات کی مدد سے بنائی جاتی تھیں۔ دراصل انتہائی Radioactiale کرسٹلز ہوتے ہیں' ان میں کیمیائی مادے شامل ہوتے ہیں' جن کے مختلف خواص ہوتے ہیں اور یہ خواص انسانی جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں' یہ مختلف ستاروں کی شعاعیں جذب کر کے انسانی جسم میں داخل کرتے ہیں جو انسانی جسم پر اثر انداز ہوتی ہیں' یہ کہنا غلط ہوگا کہ جواہرات آدمی کو پلک جھپکتے میں امیر یا غریب بنا سکتے ہیں' اصل صورت یوں ہے کہ ان کے اثرات انسان کی ذہنی' جسمانی' روحانی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں' یہ اثرات اگر مثبت ہوں یعنی اپنے جسم سے ہم آہنگ ہونے والا پتھر پہنا ہو تو ذہنی' جسمانی اور روحانی صحت بہتر ہوتی ہے' شعور میں قوت پیدا ہوتی ہے' درست فیصلے کرنے کی صلاحیت آتی ہے' قدم صحیح سمت میں اٹھتے ہیں' صلاحیتیں نکھرتی ہیں جس سے کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور شخصیت پر نکھار آتا ہے' اس کے نتیجے میں ایسے افراد کو دوسروں کی مدد اور تعاون بھی حاصل ہوتا ہے جس سے ایسا مرد کامیاب ہوتا ہے' اگر مناسب پتھر نہ پہنا گیا ہو یا کوئی غلط پتھر پہن لیا گیا ہو تو اس کے مضر اثرات بھی رونما ہو سکتے ہیں' ذہنی سکون غارت ہو جاتا ہے' دماغی صحت خراب ہو سکتی ہے اور ناکامیاں مقدر بن جاتی ہیں' اس لیے درست سائز' رنگ اور وزن کا پتھر پہننا ضروری ہے جس کے لیے کسی ماہر کی رائے لینا ضروری ہے۔ یوں تو یہ سبجیکٹ بہت گنجلک ہے۔ پورا دفتر درکار ہے لیکن چند عام اور زیادہ استعمال ہونے والے پتھروں کے بارے میں بتاتا چلوں۔

عقیق:

جواہرات میں درجہ دوئم کا پتھر ہے' یہ بے شمار رنگوں اور اقسام میں پایا جاتا ہے اور تمام مذاہب و اقوام میں متبرک مانا جاتا ہے' یہ وہ پتھر ہے جو سورج سے آنے والی الٹرا وائلٹ شعاعوں کو جذب کر کے جسم میں داخل کرتا ہے جس کی وجہ سے تمام بیماریوں کے خلاف مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہایت معقول قیمت میں ہر جگہ دستیاب ہیں۔

یہ پتھر کئی قسم و کئی رنگ کے ہوتے ہیں' سرخ' زرد' سفید' سیاہ' ابلق' شجری۔ علاوہ ازیں کم رنگ و خوش رنگ و جزع سلیمانی بھی اس کی اقسام ہیں لیکن سب سے بہتر سرخ رنگ و شفاف قسم کا عقیق جس کو یمنی کہتے ہیں' ہوتا ہے اس کے بعد دوسرا درجہ زرد کو حاصل ہے اور پھر دوسری اقسام کو' مزاج اس کا سرد خشک اور فوائد بے شمار ہیں۔

عقیق کا معدن شہر یمن ہے' یہ دریائے روم کے کنارے بھی ملتا ہے مگر بہتر قسم اس کی عقیق یمنی ہے' جو صاف اور شفاف ہو۔ عقیق یمنی سخت ہوتا ہے' بخلاف غیر یمنی کے جو کئی رنگ کا ہوتا ہے۔ سرخ' زرد' سفید اور سیاہ اور ہر ایک رنگین' نیم رنگین' سرخ' جگری اور صاف و شفاف اور ناصاف و غیر شفاف اور ابلق و شجری اور زرد طبقات میں ہوتا ہے عقیق جب کان سے نکلتا ہے تو کم رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کے صاف و شفاف ٹکڑوں کو چھانٹ کر پکاتے ہیں تو یہ رنگین ہو جاتا ہے۔ اس کے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک بڑی دیگ لے کر پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نصف دیگ تک پانی بھرتے، پھر پانی کے اوپر گلے تک لکڑیاں رکھتے ہیں اور عقیق کے ٹکڑوں کو ان لکڑیوں سے باندھ دیتے ہیں پھر دیگ کے منہ کو مضبوطی سے بند کر کے ہلکی اور نرم آنچ پر رکھتے ہیں، اس طرح گرم بخارات ان ٹکڑوں پر پہنچتے ہیں اور ان کو رنگین کر دیتے ہیں، جو ٹکڑے ان سب میں بہتر، رنگین، صاف، شفاف، براق اور یک رنگ ہوتے ہیں، وہ بہت عمدہ ہیں اور یہی دواؤں اور انگوٹھیوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

قسم اوّل اس میں بہت سرخ، شفاف اور براق ہے، اس کے بعد زرد۔ جن ٹکڑوں کے جرم میں کوئی شکل، شبیہہ، بشاش، پہاڑیاں، درخت وغیرہ کی ہوتی ہے اس کو شجری کہتے ہیں۔ جو ٹکڑہ دو طبقات کا ہوتا ہے یعنی ہر طبقہ کا رنگ مختلف، اس کو جرع کہتے ہیں مگر سنگ تراش اکثر نگینہ اس طرح تراشتے ہیں کہ اس کے رنگین طبقے اوپر تلے رہتے ہیں تا کہ خوشنما ہو۔ جس جرع کو عرض سے کاٹتے ہیں، اس کے نگین سطح پر مدور یا غیر مدور ہوں، اس کو سنگ سلیمانی کہتے ہیں۔ فارسی میں اس کو باباغوری کہتے ہیں، یہ نوع اکثر سخت تر ہوتی ہے اور اکثر سنگ مہرہ اسی نوع کا بناتے ہیں، طبیعت اس کی دوسرے درجے میں سرد اور خشک ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے جس کے ہاتھ میں عقیق کی انگشتری ہو اس کے پہننے والے کو غم لاحق نہیں ہوگا، اس کی کوئی حاجت نہیں اٹکتی، شر دشمن اور زود پریشانی سے محفوظ رہتا ہے، روزی فراخ ہوتی ہے، سزائے قید و تازیانہ، شر حاکم ظالم سے امن میں رہتا ہے جس ہاتھ میں عقیق ہو وہ درہم و دینار سے خالی نہیں رہتا۔ جن لوگوں کا ستارہ شمس یا مریخ ہے، ان کے لیے عقیق بہت ضروری ہے، اس کی تاثیر نحوسات کو اکب سے امن میں رکھتی ہے۔ اگر سرخ نگینہ عقیق پر ب، ث، ل، ط، خ، س، ل، ک، ی، خ، حروف کندہ کرائے جائیں اور اس کو اپنے پاس رکھا جائے تو ہر قسم کے دموی امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔

اس کے خواص بہت ہیں۔ شربت سیب کے ساتھ اس کا جوہر پینا تقویت دل کے اور رفع خفقان کے لیے مفید ہے خصوصاً حیض جو کسی طرح بند نہ ہوتا ہو مناسب دواؤں کے ساتھ دیں بہت مفید ہے۔ سرمہ اس کا تقویت بصر ہے، منجن اس کے جلے ہوئے کا اکیلا یا ساتھ موتی اور مونگے کے دانتوں کو مضبوط کرتا ہے اور مسوڑھوں کو تقویت پہنچاتا ہے اور خون بند کرنے، دانتوں کی جڑوں کا اور دانتوں کا میل جلانے کے لیے نافع ہے۔

سحری خواص: مذہب، شرافت، انسانیت اور پاکیزگی کی طرف راغب کرتا ہے، گناہوں کی طرف سے دل اُچاٹ کرتا ہے۔ غصہ، اشتعال انگیزی، غم، زود حسی، تنگ روی، چڑچڑا پن اور ڈپریشن کو دُور کر کے تر و تازہ کرتا ہے۔ مستقل مزاجی اور استحکام پیدا کرتا ہے، کام کرنے کی لگن جاگتی ہے، مستقل کام نہ کرنے والوں کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ بے خوابی، پست ہمتی، کمزوری اور ڈر کو دُور کرتا ہے۔ اچھے بڑے سائز کے عقیق پہننا دشمن کے دل میں رعب و خوف کا باعث بنتا ہے۔ طبیعت میں کینہ، نفاق، کدورتوں، جھگڑالو پن میں نمایاں کمی لاتا ہے۔ زہریلے کیڑوں اور جانوروں سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ کم قیمت مگر متبرک پتھر ہر شخص کی قوت خرید کے اندر ہے، دھوپ میں کام کرنے والے افراد اور ریڈیشن کے قریب (چاہے ٹی وی اسکرین کی ریڈیشن ہی کیوں نہ ہو) کمپیوٹر آپریٹرز کو ضرور پہننا چاہیے تا کہ عقیق اس کا توڑ کرتا رہے۔

طبی افعال: پاگل پن، جنونی کیفیات، دماغی و ذہنی امراض نکسیر، کثرت حیض، دل اور معدے سے بننے والے خون نیز تمام طرح کے اندرونی اور بیرونی خون کے بہنے سے روکتا ہے، یہ انجماد خون نہیں ہونے دیتا، اس لیے امراض قلب اور اختلاج قلب دونوں میں نہایت مفید اور مفرح پایا گیا ہے۔ اختلاج قلب والوں کو بڑا پتھر لاکٹ میں بنوا کر پہننا بے حد مفید ہے، ہر قسم کی پتھری اور تلی کے امراض میں بھی نفع بخش اثرات پیدا کرتا ہے۔ اس کا سرمہ آنکھوں کے تمام امراض کے لیے مفید مانا جاتا ہے۔ اس کے پاؤڈر کو کسی بھی منجن کے ساتھ دانتوں پر ملنے سے بہت جلد پائریا اور دانتوں کے دیگر امراض سے نجات ملتی ہے، مکڑی، مچھو اور زہریلے کیڑوں کے کاٹنے کی صورت میں اس کا پاؤڈر ملنا زہر کو پھیلنے سے روک دیتا ہے۔

فیروزہ:

یہ بنیادی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے، اوسط درجہ کا پتھر ہے، یہ اپنی برکات اور خواص کی وجہ سے امیر اور غریب میں مقبول ہے، درجہ دوئم کے چھوٹے سائز میں بھی پتھر موجود ہیں۔

سحری خواص: فیروزہ پہننے سے دل کو راحت، سکون اور تسکین حاصل ہوتی ہے، عجیب سا احساس تحفظ پیدا ہوتا ہے، کراچی کے موجودہ حالات سے ذہنی طور پر پریشان ہونے والے افراد کے لیے بے حد نفع بخش ثابت ہوگا، یہ خوف ڈر کو دُور کرتا ہے، راضی بہ رضا رہنے کی عادت پختہ کرتا ہے، دشمنوں پر فتح یاب کرتا ہے، حادثات، ڈوبنے اور آسمانی بجلی سے بچاتا

ہے، زہریلے جانوروں اور کیڑوں کو قریب آنے نہیں دیتا، نظر بد سے محفوظ رکھتا ہے، طالب علموں کے لیے خاص طور پر مفید ہے، انہیں فیروزہ، ایمیتھسٹ اور لاجورد کو امتحان کے وقت خاص طور پر پہننا چاہیے کیونکہ یہ علم و ہنر سیکھنے میں بے حد معاون ہے، روحانی علوم کے مبتدیوں کے لیے خاص طور پر مفید ہے، یہ ان کے لیے حصولِ علم میں حد درجہ معاون ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ نیا چاند دیکھ کر مسنون دعائیں پڑھ کر فیروزہ پر نظر کرنے سے زرِ کثیر ہاتھ آتا ہے۔ یہ آفاقی اور ذاتی محبت اور علوم و فنون میں بے حد ترقی دیتا ہے، حاملہ خواتین کو جملہ خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے علاوہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی فرد پر قضائے ناگہانی آنے والی ہو تو فیروزہ چیخ جاتا ہے یا بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اسے جتنی جلدی ہو سکے، دریا یا سمندر میں پھینک دیں، صدقات، خیرات اور استغفار کی کثرت رکھیں، کم از کم مدت 40 دن تک ضرور استغفار اور خیرات کریں، چاہے سوا روپیا یا چند پیسے ہی کیوں نہ ہوں، اگر انگوٹھی سے فیروزہ کا نگ نکل کر گر جائے تو بھی یہی عمل کرنا چاہیے اور اس کو سمندر برد دریا برد کر دینا چاہیے، جن لوگوں کے کام ہوتے ہوتے رُک جائیں، ان کو بڑے سائز کا فیروزہ پہننا چاہیے، یہ ان اسباب کو رد کر دیتا ہے۔

بدھ مذہب میں یہ نہایت متبرک پتھر ہے، ان کے یہاں روایت ہے کہ اگر نا معلوم اسباب کی وجہ سے بیماری اور پریشانیاں ہوں تو اس پتھر کو پہننے سے کلی شفا، کامیابی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔

طبی افعال: امراضِ سر اور امراضِ معدہ میں نہایت مفید مانا جاتا ہے، اس کا سرمہ آنکھوں کے لیے کئی امراض کا شافی علاج ہے، خاص طور پر رات کو زائل ہونے والی بصارت کو واپس لانے، نیز تلی کے سفید ہونے کا شافی علاج مانا جاتا ہے۔ طحال، فتق، ورم، درد، گیس، جنون، ناسور، تلی، صرع وغیرہ میں فائدہ کرتا ہے، خاص طور پر فیروزہ کا سفوف شہد کے ساتھ استعمال کرنا مندرجہ بالا امراض میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے، اکثر حکماء کے مجربات میں سے ہے، گردہ اور مثانہ کی پتھری کا علاج بھی فیروزہ سے ہوتا ہے، سانپ اور بچھو کے زہر کو زائل کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

نیلم:

یہ نہایت ہی عمدہ نیلگوں جواہر ہے، اس کی چمک دمک اور آسمانی نیلگوں رنگت دل کو بہت بھاتی ہے، اہلِ ہنود و یہود کی پرانی کتابوں میں اس کا ذکر آتا ہے، اس جواہر کے برابر کسی اور جواہر کے خواص سحری نہیں مانے جاتے، یونانی لوگ اسے اپنے عظیم دیوتا اور دیویوں کی نذر کیا کرتے تھے۔

سنسکرت میں اسے سوریارتن کہا جاتا ہے۔ عربی میں یاقوت اور ارزق کہتے ہیں۔ فارسی میں اسے یاقوت کسرو کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے سفائر Sapphire کا نام دیا گیا ہے۔ جبکہ ہندی اور اُردو میں اسے نیلم کے نام سے جانا جاتا ہے۔

رنگوں کے لحاظ سے نیلم کی چار قسمیں ہیں، اگرچہ نیلم کا رنگ اصل نیلا ہے مگر کئی اور رنگوں کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔

مشور یعنی سیاہی مائل سیاہ۔
ویش یعنی زردی مائل نیلا۔
چھتری یعنی سرخی مائل نیلا۔
برہمن نیلم یعنی سفیدی مائل بہ نیلا۔

اس کی پیدائش کے متعلق مختلف بیانوں میں حکماء کہتے ہیں کہ جس طرح چاروں عناصر نے مل کر انسان کی تربیت کی ہے، اسی طرح زمین کے اندر چاروں عناصر کے عمل سے نیلم بنتا ہے۔ نیلم کے چاروں مادوں میں سے کسی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے نیلم کے رنگ ڈھنگ پر اثر پڑتا ہے، اس لحاظ سے یہاں اس کی چاروں اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

جس نیلم میں آبی مادہ زیادہ ہو وہ سفیدی مائل نیلا اور شفاف ہوتا ہے۔

جس نیلم میں خاکی مادہ زیادہ ہو وہ زردی مائل نیلا ہوتا ہے۔

آتشی مادہ زیادہ ہونے سے نیلم سرخی مائل ہو جاتا ہے۔

جس عنصر میں بادی مادہ ہو وہ سفیدی مائل نیلا اور ہلکے رنگ کا ہوتا ہے۔ اگر نیلم کی کان بہت مدت تک بند رہے تو نیلم میں ہر قسم کی چمک نمودار ہوگی اور اس کا رنگ لاجواب ہی ہوگا۔

اقسام:

1- رنج کیتو: جس کو برتن میں رکھنے سے اس کی چمک کے باعث برتن نیلا دکھائی دے، اس کو پہننے سے اولاد کی ترقی ہوتی ہے۔

2- پارشورت: جس سے سنہری، روپہلی اور بلوری کرنیں نکلیں اس کے پہننے سے ناموری حاصل ہوتی ہے۔

3- وزناڈوی: جس کو سورج کے سامنے رکھنے سے نیلے رنگ کی کرنیں نکلیں، اس کے پہننے سے مال اور اجناس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاصل ہوتے ہیں۔

4- سنگرت: جو ہمیشہ چمکتا ہے' اس کے پہننے سے دولت اور محبت بڑھتی ہے۔

5- گورتو: جو مقدار میں چھوٹا اور تول میں بھاری ہو' اس کے پہننے سے دلی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ ایک مہانیل نامی نیلم بھی ہوتا ہے جسے اس سے 100 حصے زیادہ دودھ میں ڈالیں' تو اس کی چمک سے دودھ نیلا دکھائی دیتا ہے۔ ایک اندر نیل نامی نیلم ہوتا ہے' آج کل جوہری اس کی دو قسمیں بتاتے ہیں' اوّل پرانا' دوم نیا' ہر ایک کی تین قسمیں بتاتے ہیں۔

1- خوب نیلا' یعنی گہرا نیلا
2- سرخی مائل نیلا
3- سنہری مائل نیلا' یا نیلا مائل بہ سنہری

اہلِ فارس نیلم کی ایک ہی قسم بیان کرتے ہیں' وہ اسے یاقوت ازرق کہتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ یاقوت سے علیحدہ جواہر ہے۔

برقی قوت: اس کے کیمیاوی مرکبات اور طاقت انعکاس و دیگر خواص یاقوت سے ملتے ہیں' نیلم اور یاقوت میں رنگ ہی کا فرق ہے' نیلم کا رنگ آسمانی نیلگوں اور یاقوت کا رنگ سرخ ہوتا ہے' نیلم کا رنگ مادہ کروم کی ترکیب کے باعث ہوتا ہے' گرمی کی تاب میں سفید اور زردی مائل نیلم سفید ہو جاتے ہیں۔ لیکن مشرقی نیلم کا رنگ گیس کی روشنی کے آگے ویسا ہی رہتا ہے' ہاں کم درجہ حرارت کا رنگ اینٹ کے رنگ کی طرح تاریک ہو جاتا ہے' اس کا اصل مقامِ پیدائش آہن کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔

صلاحیت (سختی): اس سے سخت جوہر کا کٹنا بہت مشکل سمجھتے ہیں' اس لیے یہ زیورات میں مستعمل تھا' یہ صرف الماس سے کاٹا جا سکتا ہے' 9 درجہ کی سختی رکھتا ہے۔

نیلم کے عیب: نیلم کی شناخت کرنے سے پہلے اس کے عیب دیکھنے چاہئیں' اس کے عیب یہ ہیں۔

1- ریشم جیسے دھبے۔ 2- رنگ کا ایک جگہ منجمد ہو جانا۔ 3- سفید شیشہ سی دھاریاں۔ 4- دودھیا رنگ کا داغ۔ 5- چھائیاں۔ 6- جس نیلم کا رنگ ارغوانی ہو اس میں ضرور ریشمی عیب ہوگا' اگر اس کا رنگ سنہری مائل ہوگا تو اس میں دودھیا رنگ کی رنگت ضرور دکھائی دے گی' اس قسم کا کوئی بھی نیلم ہو تو اسے قطعی نہ خریدیں۔ نیلم ان عیبوں سے پاک ہونا چاہیے' عیبوں کی شناخت کے لیے نیلم کے رنگ کی پہچان کرنی چاہیے کہ آیا شوخ ہے یا ہلکا۔

اس کے علاوہ کتب سنسکرت میں کئی عیب نحس نیلم کے لکھے گئے ہیں' جس کے پہننے سے کئی ضرر اور نقصان مقصود ہوتے ہیں' وہ چھ ہیں۔

1- روکھی: جن میں سفید چینی کی طرح داغ ہو' اس کے پہننے سے جلاوطنی کا ڈر ہوتا ہے۔

2- اسٹم گریہ: جس میں پتھر کا سا ٹکڑا موجود ہو' اس کے پہننے سے موت کا ڈر ہوتا ہے۔

3- مرتیہ گریہ: جس کا میلا سا رنگ ہوتا ہے' اس کے پہننے سے بھی موت کا ڈر ہوتا ہے۔

4- چترک: جو مندرجہ بالا رنگوں سے کسی قدر مختلف ہو' اس کے پہننے سے قوم کی بربادی ہوتی ہے۔

5- تراش: جس میں ٹوٹے پن کا نشان ہو' اس سے ریچھ جیسے جانوروں سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

6- ابراق: جس کے اوپر کے حصے میں بادل جیسی چمک ہو اس سے عمر و دولت برباد ہوتی ہے۔

شناخت کا طریقہ: نیلم خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ خالص ہو کیونکہ اکثر لوگ بلور (کانچ) کے نیلم بنا کر فروخت کرتے ہیں اور ایسی کاریگری سے رنگ بھرتے ہیں کہ ایک ناواقف تمیز ہی نہیں کر سکتا' اور بعض جعلساز بلور کے دو ٹکڑے لے کر ان میں رنگ بھر دیتے ہیں یا بلور کے ٹکڑے پر اصلی نیلم کے چھوٹے چھوٹے باریک طبقے لگا دیتے ہیں اور اصلی نیلم کی جگہ فروخت کرتے ہیں۔

بعض ماہرین اس کی شناخت کا یہ طریقہ بیان کرتے ہیں کہ نیلم کو صاف شفاف پانی میں موچنے سے پکڑ لیں تو پانی میں نیلم کے رنگ دار اور بے رنگ حصے صاف صاف دکھائی دیں گے' جس نیلم کا رنگ یکساں ہوگا' اس کا پانی بھی ویسا ہی دکھائی دے گا' مصنوعی نیلم کی شناخت یہ ہے کہ ان کے رنگ اور میانہ کو خوب غور سے دیکھنا چاہیے کہ اگر نیلم کا پردہ کسی قدر پتھر کا ہوگا تو ظاہر ہو جائے گا' یکساں رنگ کا نیلم پانی میں بھی ویسا ہی دکھائی دے گا۔

طبی افعال: نیلم مفرح ہے' دل و دماغ کو تازگی اور قوت دیتا ہے۔ ایک گرام حل کر کے پلانا' صرع خفقان' طاعون اور نزف الدم کو فائدہ کرتا ہے' دافع زہر' خون کو صاف کرتا ہے۔ اس کا سرمہ قوی بصر ہے' بخار کے مریض کے سینے پر رکھیں تو بخار کم ہو جاتا ہے۔ جسے نکسیر جاری ہو اس کی پیشانی پر رکھیں تو خون کے بہاؤ میں کمی ہوتی ہے۔ اگر کسی کی آنکھ میں گرد یا کوئی چھوٹا کیڑا ہو اور نہ نکلے تو اس کو پیس کر اور گولی بنا کر آنکھ کے پپوٹے پر رکھیں' گرد یا کیڑا نکل جائے گا۔

آنکھوں کا ورم اور سفید چپچپ دُور ہو جائے گا۔ اگر اسے پیس کر دودھ کے ساتھ کھائیں تو زہر کا اثر' بخار اور وبائی امراض دور ہو جاتے ہیں۔ ہندو شاستروں میں نیلم کے پہننے کے لیے خاص ایام مقرر ہیں۔

اس کے پہننے سے دشمنوں کا غصہ دُور ہوتا ہے' جادو کا اثر نہیں ہوتا' قید سے رہائی ملتی ہے۔ جس گھر میں نیلم ہو' وہ گھر آگ سے محفوظ رہتا ہے' یہ شہوت انگیز خیالات کو کم کرتا ہے' اس لیے پارسا لوگ اسے پاس رکھتے ہیں۔ یہ سچائی اور وفاداری کی علامت ہے' کہا جاتا ہے کہ یہ تکلیف رفع کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو امراضِ چشم میں مبتلا ہوں' نہایت مفید ہے' اس سے ہر قسم کے رنج و الم دُور ہو جاتے ہیں' نوجوان لڑکی کے لیے خوش قسمتی لاتا ہے' یہ زہرہ سے متعلق ہے' اس کے پہننے سے ملبوسات اور دولت ملتی ہے' شادی کے موقع پر یا منگنی کے موقع پر تحفے کے طور پر لڑکی کو دیں تو خوش بختی اور دولت مندی کا باعث ہے۔ پارٹیوں اور مجلسوں میں کوئی شخص پہن کر جائے تو عزت دیتا ہے اور شخصیت کو پُرکشش بناتا ہے۔

خاصیت: نیلم اور اوپل کی خاصیت تقریباً ایک جیسی ہے' یہ پتھر اگر کسی کو راس نہ آئے تو اسے کسی بھی صورت میں نہیں پہننا چاہیے کیونکہ راس نہ آنے کی صورت میں اس پتھر کے پاس سوائے بربادی اور تباہی کے کچھ نہیں' یہ پتھر دنوں میں شاہ سے گدا بنا دیتا ہے' یہاں تک کہ تختہ دار تک پہنچا دیتا ہے۔ کوئی بھی عیب دار نگینہ پہننے سے گریز کرنا چاہیے' جوہر شناسوں کے تجربہ اور نظر میں یہ ایک بدشگونی کی علامت ہے' اسی طرح عیب دار نیلم پہننے سے مندرجہ ذیل حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

1- مٹیالے رنگ کا نیلم دائمی امراض پیدا کرتا ہے۔
2- ریشہ یا دھبے والا نیلم باعث ذلت و خواری ہے۔
3- نیلم میں کسی جگہ نیلے رنگ کی زیادتی یا دودھیا پن کاروبار میں نقصان کی علامت ہے۔
4- ایک سے زیادہ رنگوں والا نیلم پہننے سے انسان غصیلا اور جھگڑالو ہو جاتا ہے۔
5- جس نیلم کے اوپر والے حصے میں بادل کی سی چمک ہو' وہ دولت اور عمر کا دشمن ہوتا ہے۔
6- وہ نیلم جس کا رنگ ایک جگہ سے بالکل شیشے کی مانند سفید اور دوسری جگہ کوئی گہرا رنگ ہو تو باعث مقدمہ بازی ہوتا ہے۔
7- چھائیوں والا اور چٹخا ہوا نیلم پہننے والا' حادثوں اور درندوں کی خوراک بن سکتا ہے۔
8- جس نیلم کے اندر علیحدہ پتھر کا ٹکڑا نظر آئے' وہ کسی حادثے میں موت کا سبب بن سکتا ہے۔
9- سفید داغ والا نیلم جلاوطنی کا موجب بن سکتا ہے۔

فوائد: حکیم افلاطون نے لکھا ہے کہ نیلگوں نیلم استعمال کرنے سے دوستوں کی نگاہ میں انسان عزیز رہتا ہے' یہ ہمت و حوصلہ بڑھاتا ہے' آسمانی رنگ کا نیلم کسی فن میں کامل کرتا ہے' نیلم پہننے سے ہر مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی ہے' عزت' شہرت اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے' آئیڈیل محبوب کے حصول میں ممد و معاون ہے' یہ نگینہ پہننے والے کے علاوہ اس کی اولاد پر بھی اثر ڈالتا ہے اور ان کی قدر و منزلت بڑھاتا ہے' تحمل' سکون' بُردباری' ثابت قدمی اور بلند حوصلگی پیدا کرتا ہے' شخصیت کو پُرکشش بناتا ہے' عام طور پر تین رتی سے زیادہ وزن کا نگینہ زود اثر ہوتا ہے' اس نگینے کی انگوٹھی پہننے والے کے مزاج میں سختی پیدا ہو جاتی ہے' کمزور آدمی خود میں قوت اور طاقت محسوس کرتا ہے' جفاکشی اور کام کی طرف طبیعت راغب ہوتی ہے' صاحب انگشتری کو اپنی شہرت بہت عزیز رہتی ہے' یہ پتھر صحت و تندرستی قائم رکھنے میں بڑا معاون خیال کیا جاتا ہے' دلی تمناؤں کو پورا کرتا ہے اور محبت بڑھاتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا ایک تخت نیلم کا تھا۔

حضرت موسیٰؑ پر جو دس احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے تھے' وہ نیلم کی سلوں پر کندہ کیے گئے تھے۔

پتھروں کی تاثیرات معلوم کرنے کے لیے عمل:

جب کوئی شخص کوئی نگ' یاقوت' زمرد' فیروزہ' عقیق اور الماس وغیرہ بازار سے خرید کر لائے تو چونکہ پتھر کے حجم اور رنگ کے لحاظ سے وزن' قوت' کشش' قوت انعکاسی اور قوت برقی میں اضافہ ہوگا اس لیے اس کی سحری قوتوں میں بھی فرق ہو سکتا ہے' ان خامیوں کا نہ تو فروخت کرنے والوں کو علم ہوتا ہے' نہ خریدنے والوں کو کچھ پتا ہوتا ہے کہ یہ پتھر کس قسم کی صفات اور برکات کا حامل ہے یا یہ پتھر پہننے والے کو کیا فائدہ دے گا تو اس کے لیے حاضرات الحجر کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی ماہر جواہرات یا عامل سے معلوم کر سکتے ہیں۔

مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر کام صرف اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ علمِ نجوم سے استفادہ کرنا جہالت ہے۔ یہ مضمون صرف علم میں اضافہ کی خاطر لکھا گیا ہے۔ نماز سے بڑھ کر کوئی اور عمل ایسا نہیں جو قسمت کو' حالات کو بدل دے۔ صرف اور صرف اللہ ہی قسمت بدلنے والا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط 63

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں، ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ

اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ میری بھانجی شمی اپنے ددھیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر زخمی ہوگیا۔ میں زرین کو لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ جب اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُراسرار وادی تک پہنچادو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا وسادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کرلیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کرکے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کرلایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرکے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکادی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کررہی تھی، میں نے اس عورت کو مدد لانے کے لیے فرار کرادیا۔ تب فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کرکے ایمن کو بلوالیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ..... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اُٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی ہیں۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اُتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر پیغام پہنچادیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہوگیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کرکے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہورہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہوگئی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"کیا مطلب؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ میرے آس پاس ٹریفک کا شور تھا لیکن یک لخت مجھے لگا جیسے میں اس کائنات میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ آس پاس ہر طرف خاموشی چھا گئی ہے۔ "سویرا کیوں نہیں پہنچی؟"

وسیم کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ "ہم نے پلان پر کامیابی سے عمل کیا تھا۔ عبداللہ کے آدمی اور ہم سب آس پاس کی گلیوں میں موجود تھے۔ دور ونزدیک کوئی مشکوک فرد بھی نہیں تھا۔ جس گاڑی میں خواتین کو لے جانا تھا وہ کچھ دور پارک کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کے آس پاس بھی ہمارے آدمی موجود تھے۔ یہ تینوں برقع پہن کر باہر نکلیں اس وقت گلی سے بے شمار لڑکیاں اسی طرح برقع پوش گزر رہی تھیں۔ وہ ان میں گھل مل گئیں اور یقین کریں ہم بھی نہیں جان سکے تھے کہ ان میں وہ کہاں تھیں؟ سعدی اور مونا پانچ منٹ بعد گاڑی میں پہنچ گئی تھیں لیکن....."

"سویرا کیوں نہیں آئی؟" میں بے اختیار چیخ اُٹھا تھا۔ وسیم خاموش رہا اور میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے بدلے لہجے میں کہا۔ "سوری یار، میں جذباتی ہوگیا تھا، یہ واقعہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"آدھا گھنٹا ہوچکا ہے۔ ہم سب آس پاس سویرا کو تلاش کررہے ہیں۔ میں خود گلیوں میں چکر لگا رہا ہوں۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" میں نے بے خیالی سے کہا میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ سویرا کے ساتھ پھر کوئی حادثہ پیش آچکا ہے۔ اس کا گاڑی تک نہ پہنچنا اتفاق نہیں تھا اور نہ وہ راستہ بھٹکی تھی۔ "مونا اور سعدیہ کہاں ہیں؟"

"انہیں واپس کوٹھی پہنچادیا گیا ہے۔ عبداللہ نے منتقلی کا پلان ملتوی کردیا ہے۔"

"اس نے ٹھیک کیا ہے، تم لوگ کوٹھی کی حفاظت پر بھی توجہ دو اسے خالی مت چھوڑو دشمن نہ جانے کہاں اور کس چکر میں ہے؟"

"جی میں نے عبداللہ کو کچھ آدمیوں سمیت کوٹھی واپس بھیج دیا ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "سویرا کے پاس موبائل ہوگا۔"

"وہ..... بند جارہا ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں آپ مت آئیں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تلاش ہم کررہے ہیں، لیکن آپ کی تاک میں شاید دشمن ہوں۔"

"میں بائیک پر ہوں اور ہیلمٹ پہنا ہوا ہے اس لیے کسی کی نظر میں نہیں آؤں گا اور تم لوگوں سے نہیں ملوں گا صرف موبائل پر رابطہ کروں گا۔ میرے ساتھ ایاز ہے۔ وہ بھی بائیک اور ہیلمٹ کے ساتھ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

ایاز میرے پاس ہی رکا ہوا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ سویرا کے نہ پہنچنے کا سن کر وہ پریشان ہوگیا۔ "اس کا مطلب ہے دشمن کی چال کامیاب رہی اور اس وقت ہمارے پیچھے مرشد ہے۔"

میں اس بارے میں سوچتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ سویرا مرشد یا نادر جیسے دشمنوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ وہ صرف جان کے ہی نہیں عزت کے بھی دشمن تھے ان کے قبضے میں زندہ رہنے سے بہتر تھا کہ سویرا زندہ ہی نہ رہتی۔ لیکن حالات بتارہے تھے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ مرشد نے اس کوٹھی کا پتا چلالیا تھا اور اسے یقیناً علم ہوگا کہ یہاں عورتیں ہیں اور وہ جانتا تھا کہ ان سے بڑھ کر ہماری کوئی کمزوری نہیں تھی۔ میں نے ہینڈ فری استعمال کرتے ہوئے عبداللہ سے رابطہ کیا۔ میری آواز سن کر اسے چپ لگ گئی پھر اس نے بہ مشکل کہا۔

"شہباز صاحب آئی ایم رئیلی....."

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ بتاؤ کہ مدرسے سے نکلنے والی لڑکیاں کن طریقوں سے علاقے سے نکلی تھیں۔"

اس نے مستعد ہوکر رپورٹ دینی شروع کی۔ "زیادہ تر تو آس پاس متوسط آبادیوں میں رہتی ہیں۔ کچھ دور جاتی ہیں تو وہ بس اسٹاپ سے ویگن یا بس میں بیٹھ جاتی ہیں۔ شاید کچھ ٹیکسی کرکے بھی جاتی ہوں گی۔ رکشا یہاں نہیں ہوتا ہے۔"

"بس، ٹیکسی اور ویگن میں جانے والیوں کو چیک کیا ہے؟"

"یہ ممکن نہیں ہے جناب، ان کی تعداد کم سے کم بھی سو سے زائد ہوتی ہے اور کسی کو براہِ راست چیک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ امن وامان کا مسئلہ بن جاتا آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات.....؟"

"میں سمجھ رہا ہوں پھر بھی وہاں کوئی آدمی تھا؟"

"جی پھر بھی میرے دو آدمی وہاں تھے اتفاق سے وہ اس وقت میرے ساتھ ہی ہیں۔"

"ان سے بات کراؤ۔" میں نے کہا۔ لیکن ان سے بات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ کوشش کے باوجود بس اسٹاپ سے نکلنے والی لڑکیوں میں سویرا یا کسی بھی مشکوک ہستی کو تلاش نہیں کرسکے تھے۔ عبداللہ کے مطابق اس دوران.... وہاں سے جو چند گاڑیاں نکلی تھیں اس کے آدمیوں نے کسی نہ کسی بہانے روک کر ان کو بھی دیکھ لیا تھا۔ سویرا ان میں بھی نہیں تھی۔ عبداللہ یقین سے کہہ رہا تھا کہ سویرا کو کسی گاڑی میں نہیں لے جایا گیا ہے۔ اب دو ہی طریقے تھے۔ ایک سویرا کو علاقے کی کسی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا یا پھر اسے پیدل ہی لے گئے تھے۔ دشمن نے اپنی گاڑی کہیں آگے کھڑی کی تھی جہاں تک عبداللہ اور اس کے آدمی نہیں پہنچ سکے تھے۔ مگر اس میں شبہ تھا کیونکہ اتنی دور پیدل جاتے ہوئے وہ لازمی طور پر عبداللہ اور اس کے آدمیوں کی نظر میں آسکتے تھے۔ جو گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر تھے اور پیدل آدمی کی نسبت کہیں تیزی سے حرکت کرسکتے تھے۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

"علاقے سے نکلنے والے تمام راستوں کی نگرانی کرو ممکن ہے سویرا کو کسی کوٹھی میں رکھا گیا ہو۔"

"وسیم صاحب نے یہی کہا تھا اور اب وہ تمام راستوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی نگرانی کررہے ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران' میں اور ایاز اس علاقے میں داخل ہوگئے تھے۔ ایک سڑک پر آتے ہی مجھے عبداللہ کا ایک آدمی موٹر سائیکل سمیت دکھائی دیا۔ وہ اس سڑک کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے اسے مخصوص اشارہ دیا تو وہ سمجھ گیا اور میں اس کے پاس رکا۔ انداز ایسا تھا جیسے میں اس سے کوئی پتا پوچھ رہا ہوں۔ "کوئی پروگریس ہوئی ہے؟"

"نہیں جناب۔" اس نے کہا۔ "اس سڑک سے ابھی تک کوئی گاڑی نہیں گزری۔"

"نگرانی کرتے رہو۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ ایاز میرے پیچھے آنے کے بجائے دوسری سڑک پر مڑ گیا تھا۔ ابتدائی جذباتی ردِعمل کے بعد میں نے خود پر قابو پا لیا تھا اور میرا ذہن مستعدی سے امکان پر غور کر رہا تھا۔ اس کا امکان ففٹی ففٹی تھا کہ سویرا کو علاقے سے باہر لے جایا گیا ہے۔ لیکن اگر وہ یہیں تھی تب بھی سینکڑوں ہزاروں مکانات میں یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ سویرا کہاں رکھی گئی ہے؟ اس سے آگے امکانات یہ تھے کہ سویرا کو مرشد نے اغوا کرایا ہے اور اب وہ مجھ سے سودے بازی کرے گا۔ لیکن میرے پاس اسے دینے کو کیا تھا سوائے جان کے۔ اگر وہ سویرا کے بدلے میری زندگی مانگتا تو میں بلا تامل دے دیتا۔ لیکن اگر سویرا کی گم شدگی میں مرشد ملوث نہیں تھا تو یہ کام فتح خان ہی کر سکتا تھا۔ وہ پہلے بھی یہ کام کر چکا تھا لیکن اب اسے مجھ سے ایسی کوئی غرض نہیں تھی۔ شاید وہ میری جان کا گاہک بن گیا تھا۔ شہلا کی مدد سے مجھے مروانے کی کوشش بھی اس نے کی تھی۔ میری قسمت تھی جو بریف کیس میں موجود بم نے میری جان نہیں لی تھی۔ شاید اسے بھی یقین نہیں تھا کہ اس کا حربہ مجھے مارنے کے لیے کافی ہوگا اس لیے اس نے دوسرا وار یہاں کیا تھا۔

وسیم آگے میرا منتظر تھا اس نے ہیلمٹ میں ہونے کے باوجود مجھے پہچان لیا۔ اس نے مجھے کال کیا۔ وہ ایک کمرشل پلاٹ میں دکانوں کے ساتھ بک اسٹال پر کھڑا تھا۔ شام کا اندھیرا چھا رہا تھا اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی۔ وسیم نے براہِ راست میری طرف آنے کے بجائے کال کی۔ اتفاق سے اس نے بھی وہی بات کی جو میرے ذہن میں تھی۔ "شہباز صاحب' میرا خیال ہے وہ سویرا کو اسی علاقے کی کسی کوٹھی میں لے گئے ہیں تاکہ حالات دیکھ کر یہاں سے نکال لے جائیں۔"

"اگر ایسا بھی ہے تب بھی سویرا کا سراغ ملنا بہت مشکل ہے وہ لامحدود وقت تک انتظار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے تلاش کر سکتے ہیں۔"

"ابھی عبداللہ نے کال کی ہے اس کے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ مونا کے کتے براؤن نے آپ کو تلاش کر لیا تھا اگر اسی طرح سویرا کو تلاش کیا جائے۔"

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ "ہاں' یہ ہو سکتا ہے لیکن کیا سویرا کا کوئی تبدیل شدہ لباس موجود ہے۔"

"مونا اور سعدیہ یہی دیکھ رہی ہیں۔ عورتیں اس قسم کے کاموں میں ماہر ہوتی ہیں انہیں یاد ہوگا کہ سویرا نے آخری بار کون سا لباس تبدیل کیا تھا۔"

"میں عبداللہ سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور عبداللہ کو کال کی۔

"تم براؤن کی مدد سے سویرا کو تلاش کر رہے ہو؟"

"جی جناب' مونا بی بی نے ان کا ایک لباس بھی تلاش کر لیا اور اب براؤن کو سونگھا کر اسے سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ اس بو کو تلاش کرے۔"

"مونا کتوں کی ماہر نہیں ہے۔"

"جی لیکن ہم ان ہی پر انحصار کر سکتے ہیں، آپ کو تلاش کرنے کے لیے بھی مونا بی بی نے کتے کو سمجھایا تھا۔ آپ کہاں ہیں؟"

"میں اسی علاقے میں گھوم رہا ہوں۔"

"آپ کوٹھی آنے کی کوشش مت کریے گا۔ سویرا بی بی کو جس طرح سے غائب کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ کوٹھی پوری طرح دشمنوں کی نظر میں ہے اور وہ بہت منظم بھی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' میں دور ہوں۔" میں نے بائیک سست رفتاری سے گلیوں میں چلاتے ہوئے کہا۔ "کتے کے ساتھ زیادہ بھیڑ بھاڑ مت کرنا' ورنہ لوگ چوکنا ہو سکتے ہیں بلکہ بہتر ہوگا کوٹھی کے کسی ملازم کے ساتھ کتے کو روانہ کرو اور اپنے آدمیوں کے ساتھ دور سے نگرانی کرو۔ بہ ظاہر ایسا لگے کہ ملازم کتے کو ٹہلانے نکلا ہوا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔"

"جب براؤن باہر نکلنے لگے تو مجھے بھی اطلاع کرنا میں کوٹھی کے پاس ہی موجود رہوں گا۔"

عبداللہ نے آدھے گھنٹے بعد مجھے اطلاع دی۔ "کتا کوٹھی سے نکل گیا ہے۔"

میں نے بائیک عبداللہ کی کوٹھی کی گلی کی طرف موڑ دی لیکن ... گلی میں داخل ہونے کے بجائے میں باہر ہی رک گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے وسیم اور عبداللہ سے مدد

سے نکلنے والی لڑکیوں کا روٹ پوچھا نہیں تھا کہ وہاں کہاں سے گزرتی تھیں۔ میں نے عبداللہ کے بجائے وسیم سے رابطہ کیا۔

"لڑکیاں کن گلیوں سے گزرتی ہیں؟"

وسیم نے مجھے سمجھایا کہ لڑکیاں کہاں سے گزرتی تھیں۔ براؤن کو بھی ان ہی گلیوں میں گھمانے کا ارادہ تھا۔ یہ تو طے تھا اگر سویرا اسی علاقے میں تھی تو ان ہی گلیوں میں کہیں تھی جہاں سے لڑکیاں گزرتی تھیں۔ یہ کل چار گلیاں تھیں ان کے علاوہ باقی گلیاں بند تھیں یا راستے میں نہیں آتی تھیں۔ میں دوسری گلی میں آیا تو مجھے دور سے براؤن نظر آ گیا جو عبداللہ کے ایک ملازمت کے ساتھ فٹ پاتھ سونگھتا ہوا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے سویرا کی بو مل رہی ہو۔ اچانک اس نے ملازم کو زنجیر سمیت کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے براؤن کو بو مل رہی ہے۔"

"میں باہر ہوں گلیوں میں نہیں آ سکتا آپ مجھے باخبر رکھیے گا جیسے ہی کوئی پروگریس ہو' میں اپنے آدمیوں سمیت آ جاؤں گا۔"

میری نظر براؤن پر تھی۔ وہ فٹ پاتھ سونگھتا ہوا تیزی سے آگے جا رہا تھا۔ عبداللہ اور اس کے آدمی باہر آ گئے تھے اور ایک مخصوص فاصلے سے کتے کی نگرانی کر رہے تھے۔ وسیم نے کہا۔ "مجھے خیال نہیں آیا اس پریشانی میں، آپ نے شہلا سے بریف کیس حاصل کر لیا؟"

"حاصل کر لیا اور ضائع بھی ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے مختصراً اسے خود پر گزرنے والی سنائی وسیم بولا۔ "جناب' یہ فتح خان کی حرکت لگ رہی ہے خود شہلا میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

"ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ فتح خان کی حرکت ہے لیکن بریف کیس مجھے شہلا نے دیا ہے اور جس انداز سے دیا اس سے صاف لگ رہا تھا کہ اسے معلوم تھا بریف کیس میں بم ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بے خبر ہو؟"

وسیم قائل ہو گیا۔ "جی ..... اور بم کا ٹائمر بھی اسی نے چلایا ہوگا ورنہ پہلے سے ٹائمر آن کر کے لانا ممکن نہیں ہے۔"

"بالکل یہی ہوا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ فتح خان اس کے پیچھے ہے تب بھی وہ اس کے ساتھ ہے اور اگر میں مارا جاتا تو وہ قتل میں برابر کی شریک ہوتی۔"

"شہباز صاحب' میرے خیال میں ان لوگوں کو بہت رعایت دے دی گئی ہے۔" وسیم سنجیدگی سے بولا۔ "اب اگر یہ ہاتھ آئیں تو....."

"اس کی بعد میں دیکھی جائے گی' پہلا مسئلہ تو سویرا کی بازیابی ہے۔"

اس دوران .... براؤن گلیوں سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گیا تھا۔ اس سے ذرا آگے کمرشل ایریا تھا جہاں وسیم موجود تھا اور اس سے آگے بس اسٹاپ تھا۔ براؤن کا رُخ اسی طرف تھا۔ مجھے ایک خدشہ ہوا سویرا یہاں نہیں تھی دشمن اسے کسی طریقے سے نکال کر لے گئے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بس اسٹاپ والا راستہ اختیار کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ سیکڑوں برقع پوش طالبات میں کسی ایک عورت کا سراغ لگانا ناممکن تھا۔ اگر سویرا کو لے جانے والی کوئی عورت ہو اور اس نے اسے گن پوائنٹ پر رکھا ہو تو برابر میں چلنے والی کو بھی اصل صورتِ حال کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک یا دو مسلح عورتیں نہایت آسانی سے سویرا کو نکال کر لے گئی ہوں گی۔ براؤن جیسے جیسے بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا میرے اس خدشے کی تصدیق ہوتی جا رہی تھی۔ براؤن کا اندازہ جارحانہ تھا جیسے اسے سویرا کی بو مل رہی ہو۔ کمرشل ایریا میں موجود وسیم نے براؤن اور اس کے آگے پیچھے چلنے والی پارٹی کو دیکھ لیا تھا اس نے مجھ سے کہا۔

"یہ تو بس اسٹاپ کی طرف جا رہا ہے۔"

"کچھ دیر پہلے مجھے خیال آیا کہ اگر ایک یا دو مسلح عورتیں برقع پوش ہو کر سویرا کو گن پوائنٹ پر لے جائیں تو اس جگہ سے نکلنے کا سب سے آسان راستہ یہی بس اسٹاپ ہو سکتا ہے۔ بیک وقت سو سے زیادہ لڑکیاں یہاں موجود ہوں گی اور ان میں سویرا کو تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہوگا۔ اغوا کرنے والیاں اسے کسی ویگن یا بس میں بٹھا کر نکل گئی ہوں گی اور آگے اُتار کر کسی گاڑی میں بٹھا لیا ہوگا۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے سویرا کو شناخت کیسے کیا۔ کیا وہ صرف سویرا کے لیے آئے تھے یا جو ہاتھ لگے اسے لے جانا تھا؟"

"میرا خیال ہے وہ کسی کو بھی لے جانے کے لیے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اتفاق سے سویرا ان کے ہاتھ آ گئی۔"

"آپ کی بات درست لگ رہی ہے۔" وسیم بولا براؤن بس اسٹاپ تک پہنچ گیا تھا اور وہاں یوں کھڑا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اب کہاں جائے؟ شاید بو کا سلسلہ یہاں پہنچ کر رک گیا۔ ظاہر ہے اس سے آگے سویرا کسی بس یا ویگن میں گئی ہوگی اور بو غائب ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد عبداللہ براؤن تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ملازم سے بات کرنے لگا۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بائیک گرین بیلٹ کے ساتھ روک دی تھی۔ رات ہوتے ہی یہاں سناٹا چھا گیا تھا اور کافی دیر بعد کوئی گاڑی گزرتی تھی۔ ہاں مین روڈ سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ پھر براؤن اور اس کے ساتھ کی پارٹی واپس آنے لگی۔ میں نے وسیم کی کال کاٹ کر عبداللہ کو کال کی۔

"کیا ہوا ہے؟"

"براؤن کو بو نہیں مل رہی ہے۔"

"یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے؟"

"جی کوٹھی کا یہ ملازم اتفاق سے کتوں کا بھی ماہر ہے اور اسے کتے سنبھالنا آتے ہیں اس لیے میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہوں۔ اس کا کہنا ہے کہ کتے کو یقینی طور پر بو ملی تھی اور سویرا بی بی کو اس بس اسٹاپ تک لایا گیا تھا اس سے آگے وہ کسی گاڑی میں بٹھا کر لے جائی گئی ہیں اس لیے آگے بو نہیں مل رہی ہے۔"

"اگر براؤن کو اسی طرح گھمایا جائے جیسے مجھے تلاش کرنے کے لیے گھمایا جارہا تھا۔"

"میں یہی کرنے جا رہا ہوں میں نے گاڑی تیار کرنے کو کہہ دیا ہے یہ ملازم ساتھ جائے گا اور چار مسلح افراد ہوں گے ایک بیک اپ گاڑی تیار رہے گی۔" عبداللہ نے تفصیل سے بتایا۔

"ٹھیک ہے ایک دو آدمیوں کو چھوڑ کر باقی کو واپس بلا لو۔ میں اور ایاز واپس جا رہے ہیں۔ وسیم کو یہیں رہنا چاہیے۔"

"شہباز صاحب، میں سویرا بی بی کو واپس لانے کی پوری کوشش کروں گا۔" عبداللہ کے لہجے میں ندامت تھی۔

"اس میں تمہارا یا کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تم نے اپنے طور پر بہترین انتظامات کیے تھے۔ یہ سب ہمارے نصیب میں ہے۔"

"جناب اگر یہ کام مرشد کا ہے تو وہ لازمی آپ سے رابطہ کرے گا۔"

اس وقت میں نے دل سے دعا کی کہ کاش یہ کام مرشد کا نہ ہو۔ ورنہ سویرا کی عزت و آبرو کے ساتھ واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ "میں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "شہلا والا معاملہ بھی گڑبڑ نکلا۔"

"جی مجھے وسیم صاحب نے بتایا ہے میرا آدمی اس کی کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"اس کے معمولات پر کڑی نظر رکھو اس سے بعد میں نمٹیں گے۔"

ایاز نے یہیں رکنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اس ٹیم کے ساتھ جانا چاہتا تھا جو براؤن کی مدد سے سویرا کا سراغ لگاتی۔ ورنہ بیک اپ ٹیم میں شامل ہوتا۔ مجھے خیال آیا میں نے وسیم کو کال کی۔ "نادر والی کوٹھی کی نگرانی بڑھا دو اور وہاں کوئی سرگرمی ہو تو مجھے بتانا۔"

"میں ابھی وہاں موجود اپنے آدمی سے بات کرتا ہوں۔"

فارم ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر یہ کام مرشد کا ہے تو اسے اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ سویرا کا معمولی سا نقصان بھی اس کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کی وجہ بن جائے گا۔ فارم ہاؤس پر سفیر میرا منتظر تھا اس نے خاموشی سے مجھے گلے لگا لیا اور پھر اندر لے آیا۔ "چل کھانا کھالے بھوکا ہوگا۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا لیکن سفیر اندر چلا گیا تھا کچھ دیر بعد وہ کچن سے ٹرے اٹھائے نمودار ہوا جس میں پنیر اور انڈوں سے بنے سینڈوچز کے ساتھ کافی تھی۔ اس بار میں نے انکار نہیں کیا اور خاموشی سے کھانے لگا۔ مانی بھی آگیا تھا اور خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے کھانا ختم کیا تو سفیر نے کہا۔ "اب تو سوجا۔"

"یار مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"آجائے گی ابھی میں جاگ رہا ہوں اور یہ مانی تو ہے ہی الو...."

"سفیر بھائی۔" اس نے احتجاج کیا۔

"میرا مطلب تھا رات بھر جاگتا ہے۔" سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "الو بھی رات کو جاگتا ہے۔"

"وہ تو میاں بیوی بھی جاگتے ہیں تو کیا وہ الو ہوتے ہیں۔" مانی نے سوچے بغیر کہا اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے تو وہ بوکھلا کر وہاں سے بھاگ گیا سفیر نے خفت سے کہا۔

"گدھا کہیں کا۔"

اس چھوٹے سے مزاحیہ ایکٹ سے میرے ذہن پر طاری اداسی کا بوجھ اترا نہیں تھا لیکن کسی قدر کم ضرور ہو گیا تھا۔ سفیر نے مجھے زبردستی باتھ روم میں دھکیل دیا کہ میں گرم پانی سے غسل کروں اور جب میں غسل کر کے آیا تو اس نے زبردستی ہی مجھے ایک گلاس گرم دودھ دیا۔ میں سچ مچ سکون والی کیفیت میں آگیا تھا اور جب لیٹا تو کچھ دیر بعد نیند میرے ذہن پر غلبہ پا چکی تھی۔ پھر سویرا نے مجھے اٹھایا۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔ "سویرا تم یہاں ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟"

"میں یہاں ہوں، آپ کے پاس۔" وہ بولی تو میں نے یقین کرنے کے لیے اس کے ریشم جیسے نرم وجود کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ مجھے لگا جیسے رنگوں اور خوشبوؤں سے سجا وجود مجھ میں سما گیا ہو۔ وہ شرما کر گنگنائی۔

"اب آپ کو یقین آگیا۔"

"ہاں لیکن تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میں کہیں نہیں گئی تھی یہیں تھی آپ کے پاس۔"

"اب کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"کہیں نہیں۔" اس نے یقین دلایا۔ "کبھی بھی نہیں۔"

میں سویرا کو تھامے رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ خود میری بانہوں سے نکلنے لگی۔ میں نے روکنے کی کوشش کی اور ناکامی پر سویرا سے کہا۔ "تم مجھ سے دور ہو رہی ہو۔"

"میں کیا کروں۔" وہ بے بسی سے بولی۔ "میں خود سے نہیں ہو رہی ہوں کوئی اور طاقت ہے۔"

میں نے سویرا کا رنگین آنچل پکڑنا چاہا لیکن وہ اس کے وجود جیسا ریشمی نکلا اور میری انگلیوں سے پھسلتا چلا گیا تھا۔ سویرا نہ جانے کہاں چلی گئی میں اسے پکارتا رہ گیا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا اور گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا میں نے برابر میں رکھا پانی کا جگ اٹھایا اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ خنک پانی نے میری جسمانی حدت کو کم کر دیا اور رفتہ رفتہ میں پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ صبح کا وقت ہو گیا تھا اور دور کہیں موذن اللہ کی کبریائی بیان کر رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر اللہ کے حضور کھڑا ہو گیا۔ وہ تمام کائنات کا خالق و مالک ہے سب اس کے اختیار میں ہے۔ انسانوں کی زندگی و موت اس کے اختیار میں ہے۔ نماز پڑھ کر میں نے اس سے سویرا کے لیے زندگی اور عزت مانگی۔ دعا مانگ کر مجھے ہمیشہ کی طرح سکون ملا تھا۔ اندر سے ایک یقین سا آگیا تھا کہ اللہ نے میری سن لی ہے۔ میں نیچے آیا تو خلافِ توقع سفیر کو جاگتے پایا۔ البتہ مانی سو رہا تھا۔ "تو جاگ رہا ہے۔"

"آج تو سب ہی جاگ رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"کوئی رپورٹ آئی ہے؟"

"نہیں.... اس وقت بھی عبداللہ کے آدمی براؤن کو لے کر گھوم رہے تھے لیکن براؤن تھک گیا تھا اور اس کا کام کا موڈ نہیں تھا اس لیے واپس کوٹھی آگئے ہیں۔"

"مرشد یا کسی اور نے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے؟"

"نہیں البتہ عبداللہ کا جو آدمی شہلا کی کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے اس نے رپورٹ دی ہے کہ واپس نہیں آئی ہے۔"

"فی الحال وہ واپس بھی نہیں آئے گی۔"

"ویسے میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ تجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"شاید فتح خان اور شہلا سمجھ رہے ہیں کہ سویرا کو اغوا کر کے انہوں نے مجھے اپنا جانی دشمن بنا لیا ہے اس لیے اس سے پہلے میں ان پر وار کرتا انہوں نے مجھ پر وار کر دیا۔ خاص طور سے فتح خان جیسے لوگ دشمن نہیں پالتے.... وہ ان سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔"

"ممکن ہے۔" سفیر نے کہا۔ "ہاں ایک کال اور آئی تھی ایمن کی طرف سے اس نے کہا ہے کہ تم اس سے رابطہ کر لو۔"

"عبداللہ کی کوٹھی پر آئی تھی کال؟"

"جی اس نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ کس نمبر پر رابطہ کرنا ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر ایمن نے کال کی تھی تو یقیناً کوئی خاص بات ہو گی۔ "یار کافی بنا دے تقدیر کی طرح سیاہ اور روزگارِ ایام کی طرح تلخ۔"

"رات سے جاگ رہا ہوں۔" اس نے فریاد کی۔

"بیٹے مانی کی بات بھول گیا۔" میں نے اوپر جاتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ اوپر آکر میں نے نوٹ بک آن کی اور ویب سائٹ پر جا کر ایمن کا نمبر ملایا۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے لیکن مجھے امید تھی کہ ایمن عام انگریزوں کی طرح سحر خیز ہو گی۔ میرا اندازہ درست نکلا جب اس نے دوسری بیل پر کال ریسیو کر لی۔

"شہباز یہ تم ہو۔" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ایمن کیسی ہو تم؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔ "بم بلاسٹ ہونے میں چار دن کا وقت رہ گیا ہے۔"

"یعنی ماہرین جیکٹ کھولنے یا بم کو ناکارہ بنانے میں ناکام رہے ہیں؟" میں پریشان ہو گیا۔

"ہاں۔" وہ سکون سے بولی۔ "برطانیہ سے آنے والے ماہرین نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا ہے کہ جیکٹ کو ناکارہ بنانے کی کوشش کرنا نہایت رسکی ہے اور نوے فیصد امکان ناکامی کا ہے۔"

"تب برٹش حکومت نے تاوان دینے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا لیکن مجھے میرے وکیل سے پتا چلا ہے کہ ڈیوڈ شا اس معاملے میں ملوث ہو چکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے اور وہ تاوان دینے کی مخالفت کر رہا ہے۔"

"اس نے تو ایسا کرنا ہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ برٹش حکومت اپنی ایک شہری کی جان بچانے کے لیے کیا کر رہی ہے؟"

"شہباز' مجھے لگ رہا ہے یہ لوگ نہیں مانیں گے' ورنہ اب تک کم سے کم فتح خان سے بات چیت تو شروع کر سکتے تھے۔"

مجھے یاد آیا کہ فتح خان نے تاوان کی ادائیگی کا معاملہ طے کرنے کے لیے رابطے کا طریقہ کار نہیں بتایا تھا۔ "فرض کرو اگر حکومت تاوان دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو فتح خان سے رابطہ کس طرح کیا جائے گا؟"

"اس نے ایک خط سفارت خانے بھیجا ہے اس میں کہا ہے اگر برطانوی حکومت تاوان دینے پر آمادہ ہے تو وہ مقامی ٹی وی چینلز پر برٹش سفارت خانے میں اتوار کو ہونے والے ڈنر کی منسوخی کی خبر چلوا دے۔ لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ اس کی نوبت آئے گی۔"

"ایمن اگر برٹش حکومت تیار نہ ہوئی تو میں فتح خان سے بات کروں گا۔"

"تم کیا بات کرو گے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ابھی سوچا نہیں ہے لیکن میں تمہیں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"سچ۔" وہ خوش ہو گئی۔ "تمہارے دل میں میرے لیے جگہ ہے؟"

"ایمن میں نے تم کو ہمیشہ اپنی اچھی دوست سمجھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں تم مجھے پسند کرتی ہو لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں تمہارے جذبات کا جواب اس طرح نہیں دے سکتا۔"

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوئی تھی پھر اس نے کہا۔ "ہاں' میں سمجھتی ہوں میرے لیے یہ بھی بہت ہے کہ تم میرے لیے فکرمند ہو اور مجھے مرتا نہیں دیکھ سکتے۔"

"میں فتح خان سے بات کرتا ہوں کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔"

"پلیز مجھ سے کچھ دیر بات کرو میرا دل گھبرا رہا ہے۔" اس نے التجا کی۔ "شاید میرا وقت پورا ہونے والا ہے اور اس دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جس سے میں آخری وقت میں بات کرنا چاہوں گی۔"

"تمہاری ماں ہے؟"

"ہے لیکن آخری بار میں نے بارہ سال کی عمر میں اسے دیکھا تھا۔" ایمن کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اس نے پاپا سے طلاق لے لی تھی اور پھر امریکا چلی گئی۔ اس کے بعد اس نے ہم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔"

میرا دل بوجھل ہو گیا یہ مغرب کا المیہ تھا وہاں رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ میں ماں باپ کے رشتے بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں اب بھی یہ تصور محال ہے کہ کوئی ماں اپنی اولاد سے لاپروا ہو جائے اور اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آنے لگی۔ میں نے موبائل دیکھا اور اچھل پڑا تھا کیونکہ کال سویرا کی تھی۔ میں ایمن کو بھول گیا اور بے تابی سے کال ریسیو کی۔ "سویرا تم کہاں ہو؟... تم ٹھیک تو ہو؟...."

"سویرا۔" ایمن نے حیرت سے کہا۔ "یہ تم اس سے بات کر رہے ہو۔"

ایمن سے میں ہینڈ فری سے بات کر رہا تھا۔ مگر میں نے اس کی بات سنی نہیں تھی۔ میں موبائل کی طرف متوجہ تھا۔ "سویرا تم بول کیوں نہیں رہی ہو.... پلیز کچھ تو بولو.... تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں سویرا نہیں ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا تو میرا خون کھنچ کر سر میں آ گیا تھا لمحوں میں' میں جیسے آگ میں جلنے لگا تھا۔

"فتح خان۔" میں نے کہا تو مجھے اپنی آواز خود اجنبی لگی تھی۔ "سویرا کہاں ہے؟"

"اس کا فکر مت کرو وہ اپنی جگہ پر ہے آرام اور عزت کے ساتھ۔"

"بکواس مت کرو.... اس کا فون تمہارے پاس ہے تو وہ کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟"

"شہباز خانا اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہے وہ بالکل آرام اور سکون سے حویلی میں ہے۔"

"میری حویلی میں....؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں' میں اسے وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ ادھر سے سیدھا حویلی لے گیا تھا رات میں کبھی وہیں رہا جب صبح میرا ساتھی آیا تو میں وہاں سے نکل آیا۔"

مجھے لگا جیسے میری عقل خبط ہو کر رہ جائے گی۔ فتح خان نے سویرا کو اغوا کیا اور وہ اسے فوراً ہی حویلی بھی چھوڑ آیا لیکن اس نے ایسا کیوں کیا یہ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے حویلی کال کر کے تصدیق کر لوں۔ "فتح خان میں حویلی کال کر کے تم سے بات کرتا ہوں۔"

میں نے کال کاٹی اور ایمن سے کہا۔ "تم نے سن لیا ہو گا

یہاں ایک مسئلہ ہے' سویرا کل سے غائب تھی۔ اسے فتح خان لے گیا تھا اور اس نے اسے میری حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں اس کے بیان کی تصدیق کرنے جا رہا ہوں تم ذرا ہولڈ رکھو۔"

"نہیں تم اطمینان سے یہ کام کرو مجھ سے بعد میں بات کرنا تم نے بتایا نہیں تھا کہ تم اتنے پریشان ہو۔ او کے بائے۔"

میں نے حویلی کا نمبر ملایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ بیل جانے کی آواز سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد بابا نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"بابا میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "سویرا ٹھیک ہے نا؟"

"اللہ کا شکر ہے۔" بابا بولے تو میرے رویں رویں نے یہی الفاظ کہے تھے۔

"بابا اس سے بات ہو سکتی ہے؟"

"ہاں' رکو میں بلاتا ہوں۔" وہ بولے اور شاید ملازمہ سے کہا پھر بولے۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

"جی بابا بس مسکے سمٹنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔"

"بیٹے تم خود نہیں سمیٹ رہے ہو۔ چاہو تو ملک سے باہر چلے جاؤ ان مسئلوں سے جان چھڑا لو۔"

"نہیں بابا میں میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "پھر دشمن آپ سب کے اور میرے ساتھیوں کے پیچھے بھی ہے وہ سب تو نہیں جا سکتے اور میں بھی آپ کو اور ان سب کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میں سمجھتا ہوں پتر۔" بابا نے گہری سانس لی۔ "لے سویرا آ گئی ہے اس سے بات کر۔"

بابا شاید اسے ریسیور دے کر وہاں سے چلے گئے تھے۔ اس کی بھرائی آواز آئی۔ "آپ.... آپ ٹھیک ہیں نا....؟"

"تمہاری آواز سن کر پھر سے جی اٹھا ہوں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "سویرا کیا ہوا تھا؟"

"وہ جو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں کوٹھی سے نکل کر جاتی لڑکیوں میں شامل ہوئی تھی۔ ہم تینوں کو الگ رہنا تھا۔ فتح خان نے اسی کا فائدہ اٹھایا۔ وہ خود بھی برقع میں تھا۔"

"فتح خان....؟" میں دنگ رہ گیا۔ "برقع میں اس نے اپنی جسامت کیسے چھپائی؟"

"ہاں میں بھی حیران رہ گئی تھی جب اس نے پاس آ کر پستول میری کمر سے لگایا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں نے ذرا بھی آواز نکالی تو بلا تامل مجھے شوٹ کر دے گا۔ میں جانتی ہوں وہ ایسا ہی کرتا اس لیے میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ برقع میں وہ بس ذرا ایک موٹی لڑکی لگ رہا تھا۔"

"تم نے ٹھیک کیا وہ واقعی تمہیں شوٹ کر دیتا۔"

"لیکن میں نے صرف اس وجہ سے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ شہباز میں عورت ہوں اور میری نسوانی حس نے مجھے بتایا کہ فتح خان ذاتی طور پر کیسے ہی کردار کا مالک صحیح لیکن مجھے اس سے خطرہ نہیں ہے۔ ورنہ شاید میں اس کے ساتھ جانے کے بجائے مرنے کو ترجیح دیتی۔"

"وہ تمہیں بس اسٹاپ کی طرف لے گیا تھا؟"

"ہاں اس نے چالاکی سے کام لیا۔ زیادہ لڑکیاں اسی طرف جا رہی تھیں وہ بھی مجھے لے کر وہیں پہنچ گیا لیکن بس یا ویگن میں سوار نہیں کیا تھا وہاں ایک ٹیکسی پہلے سے موجود تھی ہم اس میں بیٹھے اور وہ روانہ ہو گئی۔ کچھ دور جا کر فتح خان نے ٹیکسی رکوائی اور مجھے لے کر اتر گیا وہاں ایک گاڑی کھڑی تھی اس نے مجھے اس میں بٹھایا اور خود ڈرائیو کرنے لگا۔ اس نے برقع اتار دیا تھا۔"

"وہ تمہیں حویلی لے گیا؟"

"ہاں' سیدھا حویلی کی طرف لے گیا تھا۔ مسلسل چار گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم حویلی پہنچ گئے تھے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ فتح خان نے حویلی کے پاس پہنچ کر پھر سے برقع پہن لیا اور اس نے کہا کہ میں حویلی کے گارڈ سے بات کروں وہ بولتا تو اس کا راز کھل جاتا۔"

"فتح خان نے تمہیں بتا دیا تھا وہ تمہیں حویلی لے جا رہا ہے؟"

"ہاں' اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی بتا دیا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے اس کے الفاظ پر اسی وقت یقین بھی آ گیا تھا۔ حویلی پہنچ کر میں نے گارڈز سے بات کی اور پھر انٹر کام پر اندر بابا سے بات کی تو انہوں نے گارڈز سے کہہ دیا کہ ہمیں اندر آنے دیا جائے۔ اندر پہنچ کر فتح خان سامنے آ گیا۔ اندر صرف بابا' ماں جی اور ایک ملازمہ تھی۔ بابا نے اسے فتح خان کے کہنے پر چھٹی دے دی۔ فتح خان نے اندر پہنچتے ہی پستول نکال لیا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ اندر کیوں آیا وہ چاہتا تو مجھے باہر سے چھوڑ کر چلا جاتا۔"

"اس نے سب کو یرغمال بنا لیا تھا؟"

"ہاں ساری رات اس نے ہمیں ایک کمرے میں بند رکھا تھا۔ میرا مطلب ہے مجھے اور ماں جی کو ایک کمرے میں بند رکھا تھا اور خود بابا کے ساتھ بیٹھک میں رہا۔ صبح وہ چلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔"

"بابا نے اسے کیسے جانے دیا؟"

"یہ میں نہیں جانتی، صبح بابا نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہمیں بتایا کہ وہ جا چکا ہے۔"

"تمہارا موبائل اس کے پاس ہے۔"

"صرف سم ہے، موبائل اس نے ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے مجھ سے لے کر آف کر دیا تھا اور بعد میں سم نکال کر مجھے واپس کر دیا۔"

فتح خان شروع سے مجھے حیران کرتا آیا تھا اور ہر بار جب وہ کوئی غیر متوقع کام کر جاتا تو میں سوچتا کہ اب وہ مجھے حیران نہیں کر سکے گا لیکن اگلی بار وہ پھر حیران کر دیتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نے اتنی زحمت کس خوشی میں کی کہ پلاننگ کر کے سویرا کو لے گیا اور پھر اسے حویلی پہنچا دیا۔ کیا ہیروں سے ہمیشہ کے لیے محرومی نے پاگل کر دیا تھا۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا کہ اس نے ہماری پلاننگ جاننے کے بعد اس کا توڑ نکالا اور پھر نہایت کامیابی سے سویرا کو لے کر نکل بھی گیا۔ اس سے سویرا کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "سویرا اب اس واقعے کا کسی سے ذکر نہیں کرنا ہے کہ یہ کام فتح خان نے کیا ہے۔"

"آپ کے ساتھیوں سے بھی نہیں؟"

"ان سے میں کوئی بات نہیں چھپاتا ہوں، میری بابا سے بات کراؤ۔"

"شہباز میں.... آپ سے پھر دور ہو گئی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "یہ دوری عارضی ہے، بس کچھ عرصے کی، اللہ نے چاہا تو ہم جلد ایک دوسرے کے پاس ہوں گے۔"

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اللہ حافظ.... میں بابا کو بھیجتی ہوں۔"

"اللہ حافظ۔" میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد بابا لائن پر تھے۔

"بابا، سویرا کے غائب ہونے اور واپس آنے کے بارے میں کتنے لوگوں کو پتا ہے۔"

"مجھے اور تمہاری ماں کو۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "بس یہ بات آپ تک ہی محدود رہے۔"

"تم فکر مت کرو برخوردار۔" وہ نرمی سے بولے۔ "حویلی کے معاملات دیکھنا میرا کام ہے۔ میں نے اب تک صغراں اور شمی کو روکا ہوا تھا کل ہی انہیں حویلی بلوا لیتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا سویرا نے مشکل وقت دیکھا ہے اس کا دل بہلانے کی ضرورت بھی ہے۔ فتح خان کب تک رہا تھا؟"

"وہ فجر کے بعد نکلا تھا موبائل پر اس کی کال آئی اس کے ساتھی آ گئے تھے اور وہ مجھے خبردار کر کے نکلا کہ اگر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی تو یہاں بہت خون خرابہ ہو گا۔ میں نے اسے جانے دیا۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔"

"میں نے حویلی کے پیچھے کا میدان صاف کرا دیا ہے اور وہاں زمین سیدھی کرا رہا ہوں دشمن دونوں بار اسی طرف سے حویلی میں داخل ہوا ہے۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔ بلکہ اس پر کاشت بھی شروع کرا دیں تو زیادہ اچھا ہو گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کچھ لوگ پہلے بھی زمین مانگتے رہے ہیں آباد کرنے کے لیے...."

میں نے ماں جی سے بھی بات کی، وہ سویرا کی باعزت اور بہ حفاظت واپسی پر خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔ "پتر شہباز، اب یہ ہمارے پاس تیری امانت ہے۔"

"نہیں ماں جی، یہ آپ کی ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کی دعائیں ہی اسے واپس لائی ہیں۔"

ماں جی سے بات کرتے ہوئے میرا فون بند کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ابھی فتح خان سے بات بھی کرنی تھی اس لیے دل پر جبر کر کے میں نے کال ختم کی۔ میرے پاس بیلنس کم رہ گیا تھا اس لیے میں نے انٹرنیٹ اکاؤنٹ سے فتح خان کو کال کی سویرا والے نمبر پر لیکن اس نے ریسیو نہیں کی۔ پھر میں نے اپنے نمبر سے کال کی۔ اس نے ریسیو کر لی۔

"فتح خان بغیر نمبر کے میں کال کر رہا ہوں، ریسیو کرو۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

میں نے انٹرنیٹ سے کال کی تو فتح خان نے ریسیو کر لی۔ "تمہارا تسلی ہو گیا؟"

"ہاں، سویرا خیریت سے ہے اور اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ لیکن فتح خان میں سمجھنے سے قاصر ہوں تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس کا دو وجہ ہے جو اصل میں ایک ہے۔" اس نے کہا۔ "پہلا وجہ یہ کہ سویرا کو حویلی سے میں لایا تھا اس لیے میرا ذمے واری تھا اس کو واپس اُدھر چھوڑ کر آئے۔ دوسرا مرشد بھی اس چکر میں تھا اور اگر وہ کامیاب ہو جاتا تب بھی تم

میرے پر شک کرتا اس لیے میں نے سوچا سویرا کو حویلی پہنچا دے تاکہ میں بری الذمہ ہو جائے۔"

"اور اس کا مقصد؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "تم کوئی کام صرف اللہ واسطے۔ یا اخلاقی ذمے داری سمجھ کر یا بلا مقصد نہیں کر سکتے۔"

"تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔" وہ بولا۔ "شہباز خانا اب تم میرے لیے کام کرے گا مجھے ایمن کا تاوان دلوائے گا۔"

"تم بھول رہے ہو، برٹش حکومت میں میرا کوئی چاچے یا ماما کے پتر شامل نہیں ہے۔ وہ میری بات کیوں ماننے لگے؟"

"تم میری طرف سے ان سے بات کرے گا اور ان کو قائل کرے گا کہ وہ تاوان دے دئے ورنہ اس کا شہری مر جائے گا۔"

"اس معاملے کو تقریباً تین دن گزر چکے ہیں۔ ابھی تک برٹش حکومت کی طرف سے ایسا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا ہے کہ وہ تمہیں تاوان ادا کرنے کا سوچ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تب ایمن نہیں بچے گا۔"

میں نے اسے یاد دلایا۔ "فتح خان تم بھول رہے ہو ایمن میری دوست بھی ہے اور میں اس کی موت کو آسانی سے برداشت نہیں کروں گا۔"

"مت کرو۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "تم ابھی کوشش کرو اپنا موبائل نمبر آن رکھنا میں سویرا والے نمبر سے تم کو کال کرے گا۔" اس نے کال کاٹ دی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔ میں نے کوشش ترک کر دی اور وسیم کا نمبر ملایا۔

"شہباز صاحب، آپ مصروف تھے میں خاصی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔"

"ہاں فتح خان اور سویرا سے بات ہو رہی تھی۔"

"فتح خان اور سویرا۔" وہ شاید اُچھل پڑا تھا۔ "یہ کام فتح خان کا ہے؟.... سویرا کیسی ہے؟"

میں نے وسیم کو تفصیل سے بتایا اس نے سویرا کے حویلی پہنچنے کا سن کر سکون کا سانس لیا تھا۔ "یہ اچھا ہو گیا جناب۔"

"فتح خان نے اس کی ایک وضاحت تو کی ہے اور وہ دل کو لگنے والی بھی ہے لیکن میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"یعنی آپ کے خیال میں فتح خان کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔"

"ایسا سمجھنے کی معقول وجوہات ہیں فتح خان کچھ عرصے سے ایسی گھمانے والی چالیں چل رہا ہے جن کا مقصد بہت دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔"

"دیکھیے اس کا بنیادی مقصد تو کسی طرح بھی ہیروں یا ان کے مساوی دولت حاصل کرنا ہے۔ باقی چالیں اس مقصد کے آس پاس ہی گھومتی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اس نے ایمن کو ٹریپ سے نجات دلانے کے عوض تاوان کی بات کرنے کی ذمے داری بھی مجھے دے دی ہے۔"

"شہباز صاحب، آپ کے لیے ویسے ہی خاصی مشکلات ہیں میرا نہیں خیال کہ.... آپ کو ایسی ذمے داری .... قبول کرنا چاہیے جس سے آپ حکومتوں کی نظر میں آ جائیں۔"

وسیم ٹھیک کہہ رہا تھا اگر میں فتح خان کی طرف سے برٹش حکومت سے بات کرتا تو لازمی بات ہے ان کی نظروں میں بھی فتح خان کا شریک قرار پاتا اور بعد میں اس کے ساتھ میرے خلاف کارروائی بھی ہوتی۔ لیکن دوسری طرف میں ایمن کو بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھی جب فتح خان نے اسے بارودی جیکٹ پہنائی تھی۔ اس طرح میری ذمے داری بنتی تھی۔ میں وسیم سے اس معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں بات گول کر گیا اور اس سے کہا۔ "تم خواتین اور عبداللہ کو بتا دو۔ ہاں میں نے تم سے نادر والی کوٹھی کی نگرانی کرنے کو کہا تھا۔"

"دو آدمی وہاں ہیں۔ اب تک جو معلومات جمع کی ہیں ان کے مطابق اندر محافظوں سمیت کوئی ایک درجن افراد ہیں۔ ان میں تین چار ملازم بھی ہیں یعنی کم سے کم آٹھ مسلح گارڈز ہیں اور ان کے پاس جدید ترین خودکار اسلحہ صاف نظر آتا ہے میرا اندازہ ہے اندر ان کے پاس مزید بھاری ہتھیار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"روزانہ کی آمد و رفت کیا ہے؟"

"دو ملازمائیں آتی ہیں کاموں کے لیے، وہ نزدیکی بستی میں رہتی ہیں۔ نادر کو فزیوتھراپی کرانے کے لیے ایک شخص صبح شام آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر دوسرے دن ایک یا دو کال گرل بھی آتی ہیں۔"

"مختلف آتی ہیں یا کوئی بار بار بھی آتی ہے۔"

"صرف ایک ہے جو اب تک چار بار آ چکی ہے۔ میرے آدمیوں نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا ہے آبپارہ کی ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتی ہے۔ ذرا اسٹینڈرڈ کی کال گرل ہے اور ہفتے میں تین چار دن ہی کام پر نکلتی ہے۔"

"میرا خیال ہے سچ مچ کی کال گرل ہے، کال پر اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام چلتا ہوگا۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ خود اور اکیلی جاتی ہے۔ نادر کی کوٹھی پر بھی اکیلی آتی ہے۔"

"ایسا کرو اس کے گھر کو کسی طرح بگ کر دو اس کی مصروفیات پر نظر رکھو۔"

"آپ کا کچھ کر گزرنے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں اب ہمیں بھی ذرا حرکت میں آنا چاہیے۔ دشمن شاید ہمیں کمزور سمجھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم ایک آدمی مستقل اس کال گرل پر لگا دو اس کا نام کیا ہے؟"

"ثمینہ۔" وسیم نے کہا۔ "دیکھنے میں کسی قدر ہالی ووڈ کی اداکارہ سینڈرا بلوک کی شباہت آتی ہے۔ رکھ رکھاؤ اور لہجے سے تعلیم یافتہ لگتی ہے۔"

"اس کے الگ سے وصول کرتی ہوگی۔"

"بالکل، لیکن ہے یہ بھی کوٹھے کی پیداوار، میں نے اس کے بیک گراؤنڈ کی تحقیق بھی کرائی ہے۔"

"وسیم یہی ہمیں نادر کی کوٹھی تک لے کر جائے گی۔ تم ایک طرف اس پر کام کرو اور دوسری طرف نادر کی کوٹھی کے اندر کی سیکورٹی کے بارے میں معلوم کرو۔"

"میں آج ہی اس پر کام شروع کر دیتا ہوں۔"

وسیم سے بات کر کے میں نے عبداللہ کو کال کی اور اسے بھی سویرا کے بارے بتایا۔ "عبداللہ اگر کسی موبائل کے استعمال کی لوکیشن کے بارے میں معلوم کرنا ہو تو.....؟"

"ایک صاحب پی ٹی اے میں اعلیٰ افسر ہیں۔ راجا صاحب کے دوستوں میں سے ہوتے ہیں وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"تمہیں سویرا کا نمبر معلوم ہے نا، اس کے استعمال کی لوکیشن کا معلوم کرنا ہے، آج کے دن سے۔"

"میں ان سے بات کرتا ہوں ویسے امید ہے کہ یہ کام ہو جائے گا۔" عبداللہ نے کہا سویرا کے بارے میں سن کر وہ بھی خوش تھا۔ اس نے بیتو کے بارے میں بتایا۔ "اس کی طبیعت تقریباً ٹھیک ہوگئی ہے اور وہ آپ کے پاس جانے کی ضد کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے اسے فارم ہاؤس بھجوا دو۔" میں نے کہا اور موبائل بند کیا تھا کہ سفیر تیزی سے کمرے میں آیا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

"شہباز تجھے معلوم ہوگیا کہ سویرا حویلی پہنچ گئی ہے۔"

"ہاں تو اس میں اتنا چلّانے کی کیا بات ہے؟"

"تو نے مجھے نہیں بتایا۔" سفیر برہمی سے بولا۔

"یار، بات ہی چل رہی تھی۔ پہلے ایمن سے بات ہو رہی تھی اتنے میں سویرا والے نمبر سے فتح خان کی کال آگئی۔ پھر وسیم کو بتایا اور عبداللہ سے کہا کہ وہ سویرا کے نمبر کے استعمال کی لوکیشن تلاش کرے۔ ابھی تجھے بتانے کا سوچ رہا تھا کہ تو خود آ گیا۔"

سفیر کی برہمی کم ہوئی اور اس نے مجھے کافی کا مگ تھمایا۔ "ذرا دیر ہوگئی مانی کے بچے نے کافی کی بوتل کہیں رکھ دی تھی اسے اٹھا کر پوچھنے میں دیر لگی ہے۔"

"سفیر فتح خان نے سویرا کو واپس حویلی پہنچا دیا ہے میری اس سے بات ہوئی ہے۔" میں نے کہا اور اسے تفصیل سے بتایا کہ فتح خان سے کیا بات ہوئی ہے۔ درمیان میں سفیر اسے گالیاں دیتا رہا۔ اس نے مجھے بھی سنائی تھیں کہ میں نے موقع ملنے کے باوجود اس خبیث کی گردن کیوں نہیں مروڑ دی۔ میں نے سرد آہ بھری۔

"تم ہی نہیں، بابا جان بھی نہیں چھوڑیں گے کیونکہ اب بات عزت پر آ گئی ہے۔"

"شہباز سنجیدگی سے اس کا خاتمہ کرنے کا سوچ، ورنہ یہ اسی طرح ہماری مشکلات میں اضافہ کرتا رہے گا۔"

"دیکھ میں نے عبداللہ سے کہا ہے وہ سویرا کے موبائل کی لوکیشن کا پتا چلانے کی کوشش کرے۔"

"صرف فتح خان ہی نہیں ہمیں مرشد اینڈ کمپنی کے خلاف بھی حرکت میں آ جانا چاہیے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہی بات میں نے ابھی وسیم سے کی ہے۔" میں نے اسے کال گرل کے بارے میں بتایا جس کی مدد سے ہم نادر کی کوٹھی میں داخل ہو سکتے تھے۔ سفیر نے غور سے مجھے دیکھا۔

"تو کیا چاہتا ہے نادر کا خاتمہ.....؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نادر کو مارنے سے ایک تو میں قاتل بن سکتا ہوں، میں نے آج تک کسی کو سوچ سمجھ کر نہیں مارا۔ ہمیشہ اپنا دفاع کیا جس کا حق قانون بھی مجھے دیتا ہے۔ دوسرے اسے مارنے سے مرشد طاقتور ہو جائے گا اور دکھاوے کو سہی بدلہ لینے کے لیے ہمارے ساتھ دشمنی برقرار رکھے گا۔"

"تب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"نادر کو اپنی گرفت میں رکھ کر میں مرشد سے سودے بازی کی پوزیشن میں ہوں گا۔ میرے ذہن میں سب سے پہلے اپنے خلاف مقدمات کا خاتمہ ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے عدالت میں کیوں نہ پیش ہونا پڑے۔"

"تو نے ندیم سے بات کی کہ تیرے کیسز کا کیا ہوا ہے؟"

"نہیں بہت دنوں سے اس سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے میں کرتا ہوں اس سے بات۔" میں نے کہا اور انٹرنیٹ سے ندیم کے گھر کا نمبر ملایا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ابھی گھر میں ہوگا۔ فون اس کے بڑی صاحبزادی نے ریسیو کیا اور اطلاع دی۔

"پاپا ماما سے ڈانٹ کھا رہے ہیں۔"

ندیم کی بیوی تیز مزاج کی تھی اور ندیم پر حاوی رہتی تھی لیکن اس میں شک نہیں تھا اس نے ندیم کے گھر کو بہت اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔ ساتھ ہی اسے چھ سال میں چار یا پانچ مرتبہ صاحبِ اولاد بھی بنا دیا تھا۔ ندیم ایک منٹ بعد آیا اور غرا کر بولا۔ "کون ہے صبح سویرے؟"

"جورو کے غلام۔" میں نے آواز بدل کر کہا۔ "ہم سے اکڑ کر بات کرتا ہے۔"

"کون ہو تم؟" ندیم نے اس بار دھیمے لہجے میں کہا۔

"تیری موت۔" میں نے قہقہہ مارا تو وہ پہچان گیا۔

"تو شہباز..... تیری....." اس نے گالیوں سے استقبال کیا۔ "تو سچ مچ میری موت کی وجہ بنے گا۔ کل پھر دھمکیاں ملی ہیں۔"

"مرشد کی طرف سے؟"

"پتا نہیں کوئی حرامی تھا فون پر بک بک کر رہا تھا۔ میں نے کہا اگر تمہیں زیادہ ہی اعتراض ہے تو سامنے آ کر بات کرو، اس پر اس نے بہت نازیبا باتیں کیں جواب میں، میں نے بھی برابر کی گالیاں دیں۔ بیگم بچوں سمیت شاپنگ پر گئی تھی اس لیے مجھے آسانی رہی سنانے میں۔ یہ بتا تو کہاں مر گیا تھا؟"

"بس یار مرتے رہتے ہیں۔ محاورے کے مطابق تو ایک پر ہی مر گئے اور باقی کام دشمن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بتا میرے مقدموں کا کیا بنا؟"

"فقیر کے قتل والا کیس تو ختم ہوگیا۔ راجا صاحب نے معاونت کی تھی اور اس کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں۔ پھر دوبارہ پوسٹ مارٹم سے بھی ثابت ہوگیا کہ اس کا انتقال ہارٹ فیل ہونے سے ہوا تھا۔"

"ہاں یار، وہ اچانک میری گاڑی کے سامنے آ گیا تھا اور شاید اسی چیز نے اس کا دل بند کر دیا۔"

"باقی چھوٹے موٹے کیسز کی اہمیت نہیں ہے اصل کیس نادر پر قاتلانہ حملے کا ہے۔"

"جو سر اسر جھوٹا ہے۔"

"بیٹے عدالت میں جھوٹ سچ نہیں گواہیاں اور ثبوت دیکھے جاتے ہیں اور فی الحال اس معاملے میں حریفوں کا پلہ بھاری ہے۔ انہوں نے ایک بڑا بھاری اور بڑا حرامی قسم کا وکیل کر رکھا ہے۔ کیس تیرے خلاف جا رہا ہے۔ اگر کبھی پولیس کے ہاتھ آیا تو سیدھا جیل جائے گا ضمانت منسوخ ہو چکی ہے تیری۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "یہ بتا کہ مخالف پارٹی پیچھے ہٹ جائے تو کیس میں کتنا دم رہ جائے گا؟"

"تب آسانی ہو جائے گی لیکن پارٹی کیوں پیچھے ہٹے گی؟"

"اسے چھوڑ یہ بتا کہ اس صورت میں میرا عدالت میں آنا ضروری تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں، ایک بار تو آنا پڑے گا تبھی عدالت دوبارہ تیری بیل منظور کرے گی اور تو آزاد ہو سکے گا ورنہ کیس آگے چلے گا۔"

"ٹھیک ہے میں مرشد سے بات کرتا ہوں اس کا وکیل ہلکا پڑ جائے گا۔"

"تیرا اس سے رابطہ ہے؟"

"ہاں اب اس کی گوٹ بھی پھنسنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ناشتے کے لیے بیوی چلّا رہی ہے جیسے ناشتا میرے لیے نہیں..... میں ناشتے کے لیے ہوں..... آتا ہوں میری ہونے والی بیوہ..."

میں نے ہنستے ہوئے کال کاٹ دی۔ سفیر نیچے جا چکا تھا۔ میرے موبائل پر مونا کی کال آئی اس کے بعد سعدیہ سے بھی نمٹنا پڑا۔ وہ سویرا سے بات کرنے کے لیے بے چین تھیں۔ میں نے انہیں حویلی کا نمبر دے دیا۔ "مگر احتیاط رکھنا ممکن ہے حویلی کے نمبر انڈر آبزرویشن ہوں۔"

"تم فکر مت کرو۔" مونا بولی۔ "یہ بیتو سے بات کر لو مرا جا رہا ہے تم سے بات کرنے کے لیے۔"

"شوبی بھائی۔" بیتو نے فون لیتے ہی شکایتوں کے دفتر کھول دیے۔ "یہ لوگ اب ہم سے بالکل اچھا نہیں کرتا ہے۔"

"کیوں.....؟"

"ہم جو بولتا ہے وہ نہیں بناتا ہے، اُلٹا بناتا ہے کھانے کو۔"

"جوڈاکٹر نے کہا ہے وہ بنائیں گے۔" پیچھے سے سعدیہ کی بھنائی ہوئی آواز آئی۔ "تم تو کھا کر مرنا چاہتے ہو۔"

"ایسا کرو تم میرے پاس آ جاؤ۔" میں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیتو خوش ہو گیا، چہک کر بولا۔ ''یہی تو ہم بھی کہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے عبداللہ سے کہو وہ تمہیں بھیج دے گا لیکن بہت خیال رکھنا کوئی پیچھا نہ کر رہا ہو۔''

''ہم خیال رکھ کر آئے گا۔''

میں نیچے آیا تو سفیر ناشتا تیار کر چکا تھا۔ وسیم کی غیر موجودگی میں وہ اکیلا کام کر رہا تھا۔ مانی صرف کھانے کا شیر تھا باقی اسے صرف کافی بنانی آتی تھی۔ ناشتا بننے سے پہلے وہ میز پر براجمان تھا اور چمچ بجا کر وقت گزار رہا تھا۔ سفیر نے اس سے کہا۔ ''یار تم رات کے برتن ہی دھو دو۔''

''سوری میں جس کام کے لیے ملازم ہوں وہ کرتا ہوں باقی ذمّے داری آپ کی ہے۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''تو میں باورچی ہوں۔'' سفیر بھنّا گیا۔

مانی نے چالاکی سے کہا۔ ''نہیں جی آپ مالک ہیں اور مجھے کھانا مہیا کرنا آپ کی ذمّے داری ہے خود بنائیں یا کسی سے پکوائیں۔''

''لاؤ یار میں دھو دیتا ہوں۔'' میں نے آستین اوپر کرتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں شہباز بھائی۔'' مانی تیزی سے سنک کی طرف آیا۔ ''میں کرتا ہوں، سفیر بھائی کو ٹنگ کر رہا تھا۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' سفیر اب بھی ناراض تھا۔ ''اگر شوبی نہ کہتا تو تم نے بیٹھ کر چمچ ہی بجانا تھا۔''

''آپ کے لیے تو ہرگز نہیں دھوتا۔'' مانی نے بھی تمیز بالائے طاق رکھ کر کہا۔ ''آپ مجھے تنگ کرنے میں کون سی کسر چھوڑتے ہیں۔''

وہ دونوں لڑنے لگے اور میں بیٹھ کر چمچ بجانے لگا۔ کچھ دیر میں سفیر نے ناشتا لگا دیا اور ہم تینوں ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے کے دوران مانی اور سفیر کی صلح ہو گئی اور دونوں ہنس ہنس کر بات کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد میں کافی کا مگ لے کر باہر نکل آیا۔ سورج بلند ہو رہا تھا لیکن ہلکی دھند باقی تھی۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ''یار بیتو کو بھیج دو کسی کے ساتھ اور ہاں سویرا کے موبائل کے بارے میں بات ہوئی؟''

''جی میری بات ہو گئی ہے ان کا کہنا ہے کہ کرنٹ لوکیشن نکالنا تو بہت مشکل ہے کیونکہ اس صورت میں نیٹ ورک تمام کام چھوڑ دیتا ہے اور لاکھوں کالز رک جاتی ہیں۔ باقی استعمال کا پتا کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی تین سے چار گھنٹے لگ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی رپورٹ آئے مجھے اطلاع کرنا، شہلا کی کوئی اطلاع ملی ہے؟''

''نہیں، لیکن آپ نے فتح خان سے نہیں پوچھا اس بارے میں....''

''بیکار ہے وہ انکار کر دے گا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی میں انجان بن کر اسے دھوکا دے سکتا ہوں، ایک بار میں نے اس پر الزام لگا دیا تو وہ ہوشیار ہو جائے گا اور میرے چکر میں نہیں آئے گا۔ لیکن شہلا کو تلاش کرنا ضروری ہے۔''

''آپ مانی سے کہیں پہلے بھی اس نے تلاش کیا تھا۔''

میں چونکا۔ ''یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں۔''

عبداللہ سے بات کر کے میں مانی کے پاس آیا۔ ''تمہیں یاد ہے تم نے کریڈٹ کارڈ کی مدد سے ایک خاتون کا سراغ لگایا تھا۔''

''جی بالکل یاد ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اللہ معاف کریں نہایت واہیات خاتون ہیں۔ میں نے نیٹ پر سرچ کیا تو انٹرنیٹ پر ان کی نیوڈز موجود ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے شہلا کی نیٹ پر عریاں تصویریں موجود ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''نیوڈز کا یہی مطلب ہوتا ہے۔''

''مجھے دکھاؤ۔'' میں نے ایک خدشے کے ساتھ کہا۔ مانی نے شرماتے ہوئے اپنے لیپ ٹاپ پر وہ سائٹ نکالی اور منہ دوسری طرف کرتے ہوئے لیپ ٹاپ کا رُخ میری طرف کر دیا۔ اس پر شہلا کی تصویریں موجود تھیں اور یہ سب وہ عریاں تصویریں تھیں جو میں فوٹوز کی صورت میں دیکھ چکا تھا۔ نہ جانے کس نے انہیں نیٹ پر اَپ لوڈ کر دیا تھا۔ شہلا کو شاید اس کی خبر ہی نہیں تھی کہ جن تصویروں کے لیے وہ کئی بار جان کی بازی لگا چکی تھی، وہ کسی کی مہربانی سے یوں انٹرنیٹ پر عام دستیاب تھیں۔ میں نے سائٹ بند کر دی اور لیپ ٹاپ واپس مانی کی طرف کیا۔ ''صرف اسی سائٹ پر ہے یا اور سائٹس پر بھی ہے؟''

''اور پر بھی ہو سکتی ہیں لیکن اصل لنک یہی ہے یعنی اگر کوئی سرچ کرے تو کوئی اور سائٹ جس پر اس کا لنک ہو گا اس سائٹ کو کھول دی گی۔''

میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا نہیں ہوا ہے اگر شہلا اس بات سے واقف ہے تب بھی اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں اس کی تصویریں رکھتا ہوں یا اس کی بدنامی جس سے وہ ڈر رہی تھی ویسے ہی ساری دنیا میں ہو چکی تھی۔ اس صورت میں اس کا سراغ لگانا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے مانی سے

کہا۔ ''تم دوبارہ معلوم کر سکتے ہو کہ یہاں کہاں اپنا کریڈٹ یا ڈیبٹ کارڈ استعمال کر رہی ہے۔''

''جی معلوم کر سکتا ہوں۔'' اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں چلانی شروع کر دیں۔ ''اس کے لیے مجھے دوبارہ اس بینک کے سسٹم میں گھسنا پڑے گا جہاں اس کا اکاؤنٹ موجود ہے۔ وہیں سے معلوم ہوتا ہے۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟''

''ہاں، ای میل ہیک کر کے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''اگر وہ انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے تو کیا اس کی مدد سے اس کی لوکیشن تک پہنچا جا سکتا ہے؟''

''بالکل، پہنچا جا سکتا ہے بہ شرط کہ وہ انٹرنیٹ مسلسل استعمال کرتی رہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن پہلے میں بینک میں انٹرہوتا ہوں۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں۔''

مانی اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ میں نشست گاہ میں آ گیا جہاں سفیر غالباً مونا سے باتیں سن رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے کہا۔ ''دیکھو شوبی آ گیا ہے یہ کیا سوچے گا؟''

''شوبی کچھ نہیں سوچے گا۔'' میں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ''سوائے اس کے کہ مستقبل قریب میں یہ حال میرا بھی ہو گا جو ابھی تیرا ہے۔''

میں نے ٹی وی کھولا۔ ایک نیوز چینل لگایا تو اس پر جی ٹی روڈ پر واقع کسی فیکٹری میں آتشزدگی کی اطلاع تھی۔ کوئی نصف درجن فائر انجن اور درجنوں فائر فائٹر آگ بجھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میں چینل بدلنے جا رہا تھا کہ نیوز کاسٹر نے ایک نام لیا اور میں رک گیا وہ بتا رہا تھا کہ فیکٹری معروف مذہبی اور سیاسی رہنما مرشد علی کی تھی۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق فیکٹری میں صبح چھ بجے آگ بھڑکی اور بد قسمتی سے الارم ناکارہ ہونے کی وجہ سے اس کی بروقت خبر نہ ہو سکی۔ فائر بریگیڈ والے آٹھ بجے آئے تب تک آگ نے پوری فیکٹری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ لکڑی، گتے اور کاغذ کی مختلف مصنوعات بنانے والے فیکٹری تھی جس میں اربوں روپے کی مشینری، تیار اور خام مال موجود تھا اور یہ سب آگ پکڑنے والا سامان تھا۔ ٹی وی پر جو مناظر دکھائے جا رہے تھے ان سے تو لگ رہا تھا کہ فیکٹری میں کچھ نہیں بچا تھا۔

''مرشد کی ایک اور فیکٹری گئی۔'' میں نے سفیر سے کہا جو اب ایس ایم ایس کے ذریعے مونا سے سر کھپا رہا تھا، وہ چونکا۔

''واقعی....؟''

''دیکھ ٹی وی پر دکھا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب پتا نہیں یہ فتح خان کا کام ہے یا کسی اور دشمن کا یا پھر خود آگ لگ گئی، بہت بڑی کاغذ اور گتہ بنانے والی فیکٹری تھی۔''

''کسی کا بھی کام ہو مرشد کے لیے ایک اور جھٹکا ہو گا۔'' سفیر نے کہا۔ ''افسوس صرف ان مزدوروں کا ہو گا جو بے روزگار ہو گئے۔ مگر مرشد جیسے فرعون کو ایک جھٹکا اور لگا۔''

اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی۔ سویرا کا نمبر تھا میں نے کال ریسیو کی۔ ''شہباز خان اگر تم نے ٹی وی نہیں دیکھا ہے تو ابھی لگا کر دیکھو تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔''

''میں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''فتح خان میرا خیال ہے تم بیکار کے کام کر رہے ہو۔''

''بیکار کیسے اس فیکٹری کا مالیت کم سے کم بھی دو ارب روپے تھا۔''

''مرشد یہ نقصان انشورنش سے پورا کر لے گا۔ اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا، ہاں مزدوروں کا ہوا ہے۔ فتح خان، اگر تم نے کچھ کرنا ہے تو اس کے اصل کاروبار پر وار کرو۔''

''اصل کاروبار....؟''

''اس کا پیری مریدی کا دھندہ۔ یہ اس کا اصل کاروبار ہے۔ باقی سارے کاروبار تو اضافی ہیں جن کے تباہ ہونے سے مرشد کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اگر تم نے وار کرنا ہے تو جڑوں پر کرو پتوں اور شاخوں کو کاٹنا اپنی توانائی ضائع کرنے کے برابر ہے۔''

میری بات نے فتح خان کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''شہباز خان تم ٹھیک کہتا ہے۔ اب میں دیکھے گا اس کا پیری مریدی کا دھندہ بھی دیکھے گا۔''

''دوسرے فتح خان مجھے شہلا کا پتا چاہیے۔''

''میں نہیں دے سکتا۔'' اس نے انکار کیا۔

''تب تم نے مجھے احمق سمجھا ہے کہ میں تمہارے کام آؤں۔''

''اگر تم ایمن کو بچانا چاہتا ہے تو میرے کام آنا پڑے گا۔''

''میں ایمن کو بچانا چاہتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہاری ہر بات مان لوں۔ اگر اس کے مقدر میں اس طرح مرنا لکھا ہے تو میں تمام تر کوشش کے باوجود اسے بچا نہیں سکوں گا مگر اس کے بعد فتح خان کیا تم بچ سکو گے؟''

''شہباز خانا تمہیں یقین ہے تم نے تمام تر کوشش کر لیا ہے۔'' فتح خان کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''میرا تو خیال ہے تم نے تمام کوشش نہیں کیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"شہباز خان، جب وادی میں برٹ شامر رہا تھا تو اس کے پاس تم تھا، کیا اس نے تم کو کچھ بتایا نہیں ہوگا؟"

میں اس کی بات پر دنگ رہ گیا تھا۔ فتح خان کے سر میں شاید شیطان کا دماغ فٹ تھا۔ میں نے تردید کی۔ "وہ مجھے کچھ کیوں بتانے لگا؟"

"اپنا بیٹی کا خاطر۔" فتح خان کے پاس جواب تھا۔ "اسے معلوم تھا کہ میں اس کی بیٹی کو نہیں چھوڑے گا جب تک مجھے ہیرا نہیں ملے گا۔ ہیرے کا صرف اسے پتا تھا اس لیے وہ مرنے سے پہلے اس کا بتا کر گیا ہوگا تا کہ اس کا بیٹی بچ جائے۔"

"ایسا نہیں ہے فتح خان اسے موقع نہیں ملا تھا، ورنہ شاید وہ ایسا ہی کرتا۔ وہ باپ ہے اور ایمن اس کی ایک ہی اولاد ہے وہ اسے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتا؟"

"تم کہتا ہے تو ہم مان لیتا ہے۔ شہباز خان، میرا شرافت دیکھو یہ بات ذہن میں ہوتے ہوئے بھی میں نے سویرا کو واپس حویلی پہنچا دیا۔"

"میں اسے شرافت نہیں مان سکتا۔" میں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ "تمہارے ذہن میں یقیناً کوئی بات ہو گی۔ ورنہ تم موقع چھوڑنے کے قائل نہیں ہو۔"

"تب تم بتاؤ میرے ذہن میں کیا ہو سکتا ہے؟"

"ابھی میں اس بارے میں نہیں جانتا۔"

"تب میرا بات مان لو۔ ابھی میں ایمن کی مدد سے رقم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایسا ہو گیا اور اگر تم ہیرے کے بارے میں جانتا ہے تو وہ ہیرا تمہارا ہوگا، اگر فتح خان اس میں سے ایک پیسہ بھی مانگے تو اپنے باپ کا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ایمن کا تاوان نہیں ملا تو اس کا جان بچانے کا دوسرا راستہ وہ ہیرا ہوگا تیسرا راستہ کوئی نہیں۔"

فتح خان اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیل رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے ہیروں کا لالچ بھی رکھ دیا تھا، اسے معلوم نہیں تھا کہ بھارت میں کمار کی وادی میں اس سے کہیں زیادہ مالیت کے ہیرے میں چھوڑ آیا تھا۔ بہر حال، مجھے بھی اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیلنے تھے۔ اگر وہ لالچ دے رہا تھا تو میرا لالچ نہ کرنا اس کے نزدیک غیر فطری ہوتا اس لیے میں نے بے یقینی سے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ وہ پانچ کروڑ ڈالرز مالیت کے ہیرے تم مجھے دے دو گے؟"

"ہاں، اگر مجھے پانچ کروڑ ڈالرز اُدھر سے مل جائے۔"

"لیکن جب میں ان ہیروں کے بارے میں...."

اس نے میری بات کاٹی۔ "شہباز خانا.... یہ بیکار کا بحث ہے میں تم سے جو چاہتا ہے وہ بتا چکا ہے۔ اگر میرے کو رقم مل گیا تو میں جیکٹ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے والا کوڈ بتا دے گا۔"

"فتح خان اوّل تو مجھے یقین نہیں ہے کہ برطانوی حکومت تمہیں تاوان ادا کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ دوسرے اگر اس نے تمہیں رقم دے بھی دی تب بھی وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس کی ایجنسیاں انٹرپول کے ساتھ مل کر تمہیں کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا کریں گی۔"

"بے شک کرتا رہے لیکن پہلے رقم تو دیوے۔" فتح خان ہنسا۔ "اس کے بعد بے شک پیچھے پڑا رہے۔" اس نے آخری لفظ کہتے ہی کال کاٹ دی اور موبائل بھی بند کر دیا۔ سفیر میرے سر سے کان لگائے فتح خان کی گفتگو سن رہا تھا اس نے کہا۔

"شہباز، یہ بہت حرامی شخص ہے۔ تجھے دھمکی دے رہا ہے کہ اگر تاوان کی رقم نہیں ملی تو یہ دوبارہ ہیروں کے حصول کے لیے تجھے استعمال کرے گا کیونکہ اس کے شیطانی دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ ہیرے تیری مدد سے مل سکتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"تب اس کا ایک ہی علاج ہے۔" سفیر نے گلے پر انگلی پھیر کر وہی تجویز دی جو کچھ دیر پہلے وسیم دے چکا تھا۔ "ورنہ یہ مستقل دردِ سر بنا رہے گا۔"

میں نے سرد آہ بھری میرے ساتھی فتح خان کے دشمن ہو رہے تھے۔ جذبات تو میرے بھی مختلف نہیں تھے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وقت آنے پر میں فتح خان پر ہاتھ اٹھا سکوں گا۔ "پہلے یہ ہاتھ تو آ جائے پھر اس کے بارے میں سوچتے ہیں۔"

آج ایمن کو جیکٹ پہنے چوتھا دن تھا اور ساڑھے تین دن کا وقت باقی رہ گیا تھا۔ اگر برٹش حکومت تاوان نہ دینے کا فیصلہ کرتی، ڈیوڈ شا کے ملوث ہونے کے بعد اس کا امکان بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ فتح خان کسی رعایت کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر اسے رقم نہ ملتی تو وہ ایمن کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ دوسری طرف وہ جانتا تھا کہ میں ایمن کو یوں مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور میں اسے بچانے کی پوری کوشش کرتا۔ مکار فتح خان جاننا چاہتا تھا کہ میں اس کی مدد کے لیے کس حد تک جا سکتا تھا۔ اس کی کال کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے غیر محسوس انداز میں مجھے پیغام دے دیا تھا کہ اس نے سویرا کو بہ عزت طور پر حویلی پہنچایا تو یہ اس کی مہربانی ہے اور وہ جب چاہے اسے یا میرے کسی ساتھی کو کہیں سے اُٹھا سکتا ہے۔ اس

لیے مجھے اس کی بات مان لینی چاہیے۔ فتح خان اور میرے درمیان رسہ کشی کا کھیل جاری تھا جس میں دونوں فریق کبھی کبھی کھینچتے تھے اور کبھی ڈھیل دیتے ہیں۔ رسہ نہ ٹوٹتا ہے اور نہ کوئی ایک فریق ہار مانتا ہے۔ کال بیل بجی تو مانی نے جا کر دیکھا۔ وسیم کی گاڑی اندر آئی۔ میں اور سفیر بھی باہر آئے۔ گاڑی رکتے ہی بیتو کود کر باہر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا اس نے والہانہ انداز میں کہا۔ "شوبی میں نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"شکر ہے مسز نہیں کیا۔" سفیر نے کہا۔

"مسز کیسے کر سکتا ہے۔" بیتو نے خفگی سے کہا۔ "ہم کو معلوم ہے مسز مونا دیدی کو کہتا ہے۔"

مانی دلچسپی سے بیتو کو دیکھ رہا تھا۔ بیتو شاید پہلے اس سے نہیں ملا تھا لیکن اس کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس نے مانی سے ہاتھ ملایا۔

"تم مانی ہے۔"

"اور تم بیتو ہو۔"

"مانی، بیتو کو بھی کمپیوٹر کا شوق ہے تم اسے سکھاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں جی، میں اسے سکھاؤں گا۔" مانی بولا اور ہاتھ پکڑ کر بیتو کو اندر لے گیا۔ میں، وسیم اور سفیر نشست گاہ میں آ گئے۔ وسیم بتانے لگا کہ اس نے مزید آدمی نادر کی کوٹھی کے آس پاس لگا دیے تھے اور ثمینہ کی نگرانی بھی کی جا رہی تھی اگر وہ آج رات گھر سے نکلتی تو اس کا گھر بھی بگ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے فتح خان سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ وسیم نے سر ہلایا۔

"آپ دونوں کا خیال ٹھیک لگتا ہے، وہ ہم پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اس سے پہلے وہ کوئی بڑا اقدام اُٹھائے ہمیں اس کا پتا صاف کر دینا چاہیے۔"

"پہلے اس کا پتا چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہی صاف کیا جا سکتا ہے۔"

"شہباز صاحب، وہ زیادہ دن چھپا نہیں رہے گا ہمارے سامنے آنا اس کی مجبوری ہے اور ہم اسی مجبوری کا فائدہ اُٹھائیں گے۔ آپ اس کے لیے اپنے رویّے میں تبدیلی نہ آنے دیں ایک بار وہ جال میں آ جائے تو بچ کر نہیں جائے گا۔"

"عبداللہ اس پر کام کر رہا ہے۔" میں نے موضوع بدل دیا۔ "ابھی پتا چلا ہے کہ شہلا جن تصویروں کے لیے مری جا رہی تھی وہ انٹرنیٹ پر عام دستیاب ہیں۔"

"اس کی وہ بے ہودہ تصویریں؟" وسیم کے ساتھ سفیر بھی دنگ رہ گیا تھا۔ "آپ نے خود دیکھیں؟"

"ہاں یار مانی نے نکالی تھیں، وہ ایسے ہی شہلا کے حوالے سے سرچ کر رہا تھا تو یہ تصویریں سامنے آ گئیں۔"

"وہ ایسے ہی سرچ نہیں کر رہا ہوگا۔" سفیر نے یقین سے کہا۔ "وہ جتنا معصوم لگتا ہے اتنا ہے نہیں۔"

"ظاہر ہے وہ تیسری طرح جوان ہے معصوم کہاں سے ہوگا؟" وسیم بولا۔

"اس کو بھی دیکھو اکیلے اکیلے دیکھ لیں اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔" سفیر نے شکوہ کیا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم شہلا کی تصویریں دیکھنے کے لیے مرے جا رہے ہو، ورنہ وہ تصویریں میرے پاس بھی رہی ہیں۔"

"جناب، اس وقت بھی تڑپ رہے تھے۔" وسیم ہنسا۔ "وہ تو مونا بی بی موجود تھیں ورنہ...."

"بیٹے تم بھی سادی سے کم نہیں ڈرتے ہو۔" سفیر نے جوابی حملہ کیا۔ "ہمت ہے تو اس کے سامنے شہلا کی تصویریں دیکھ کر دکھاؤ۔"

"میں بے ہودہ چیزیں نہیں دیکھتا۔"

"یہ کہو کہ ہمت نہیں ہے۔"

میں نے تنگ آ کر کہا۔ "بحث کرنے کے بجائے تم دونوں مانی کے پاس چلے جاؤ وہ تصویریں دکھا دے گا۔ مگر خدا کے لیے اب یہ موضوع چھوڑ دو۔"

"مجھے تو معاف رکھیں شہباز صاحب۔" وسیم نے بدک کر کہا۔ "مجھے وہ عورت ویسے ہی پسند نہیں ہے۔ عورت کے نام پر دھبّا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" میں نے کہا۔ "اس کے مقابلے میں زرین مرشد جیسے آدمی کی رکھیل تھی۔ اس کے باوجود اس میں عورت کی پاکیزگی موجود تھی۔ شہلا جیسی عورتوں کے نزدیک عزت آبرو کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اسے صرف سوسائٹی میں اپنے نام کی فکر تھی۔"

وسیم ہنسا۔ "اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ جو تصویریں مانی نے دریافت کی ہیں، وہ بہت سارے لوگ بہت پہلے دیکھ چکے ہوں گے۔"

"پتا نہیں وہ کس چکر میں ہے اور مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی؟" میں نے سوچ کر کہا۔ "کیا اسے نہیں معلوم کہ مجھے کچھ ہوا تو میرے ساتھی اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر اس کے پیچھے فتح خان ہے تب بھی شہلا اس کی مکمل شریک ہے کیونکہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ بریف کیس میں بم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے اور اس کا ٹائمر بھی اسی نے آن کیا ہوگا۔" سفیر بولا۔

"شہباز صاحب وہ سوچ سمجھ کر آپ کو قتل کرنے آئی تھی۔" وسیم نے تائید کی۔

"میں نے مانی سے کہا ہے کہ وہ کریڈٹ کارڈ کی مدد سے اس کا سراغ لگائے جیسا کہ اس نے پہلے بھی کیا تھا۔ شہلا کو نہیں معلوم ہوگا کہ تم لوگوں نے اس کا سراغ کیسے لگایا؟"

"وہ اس مکان سے فرار ہوگئی تھی جہاں سویرا کو رکھا تھا۔" سفیر نے کہا۔ "مجھے یقین ہے وہ لاعلم ہے کہ اس کا سراغ کیسے لگایا گیا تھا؟"

"اس صورت میں امکان ہے وہ دوبارہ اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرے گی اور مانی پتا چلا لے کہ وہ کہاں کارڈ استعمال کر رہی ہے؟"

"اس کام میں دیر لگے گی۔" وسیم بولا۔ "پچھلی بار بھی ہمیں مسلسل نگرانی کے بعد کامیابی ملی تھی۔"

"ایک بار معلوم ہو جائے کہ یہ کہاں کریڈٹ کارڈ استعمال کر رہی ہے تو اس جگہ کی مسلسل نگرانی بھی کی جاسکتی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "وسیم یہ بتاؤ ہمارے پاس افرادی قوت کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ہمارے علاوہ پندرہ افراد ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "ان میں سے چار عبداللہ والی کوٹھی کے مستقل گارڈز ہیں ان کے علاوہ گیارہ افراد مل سکتے ہیں۔"

"میں، تم، سفیر، بیتو، ایاز اور عبداللہ یہ ہوئے چھ یعنی کل سترہ افراد ہیں جو کسی مشن کے لیے دستیاب ہو سکتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"یہ بتاؤ اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔ پستول، شاٹ گن، اسالٹ رائفل، مشین گن، ایل ایم جی، منی راکٹ لانچر، ہینڈ گرنیڈ، اسموک گرنیڈ اور فائر گرنیڈ تک ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔" وسیم نے تفصیل سے بتایا۔

"وسیم فرض کرو ہمیں نادر کی کوٹھی پر حملہ کرنا ہے اور اس طرح کرنا ہے کہ ہمارا جانی نقصان نہ ہو تو کیا کرنا ہوگا؟"

"میں سمجھ گیا جناب، سب سے پہلے ہمیں گیٹ پر موجود گارڈز کو قابو کرنا ہوگا کیونکہ وہ دور تک نظر رکھتے ہیں اور کسی پر شک کرتے ہی دور سے گولی چلا سکتے ہیں۔"

"ان کو قابو کرنے کے بعد؟"

"کوٹھی کی چھت پر بھی دو مسلح گارڈز ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں اور ان کو اندر جائے بغیر قابو کرنا مشکل ہے اس لیے سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ انہیں دور سے شوٹ کر دیا جائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کسی انسان کو جان بوجھ کر مارنا میرے لیے ہمیشہ سے ایک مشکل کام رہا ہے اور میں اس چیز سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا ہوں اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے؟"

"نہیں کیونکہ گیٹ پر کسی سرگرمی کی صورت میں یہ لازمی اوپر سے جھانک کر دیکھتے ہیں اور کوئی گڑبڑ ہو تو یہ اوپر سے گولی چلا سکتے ہیں۔"

میں متفکر ہو گیا۔ "یعنی ایک درجن مسلح گارڈز کے جھرمٹ میں نادر محفوظ ہے۔"

"نہیں اگر ہم فیصلہ کرلیں گے کہ سامنے آنے والے ہر شخص کو اُڑا دینا ہے تو یہ مشن بہت آسان بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" میں نے ہاتھ پر مکا مارا۔ "ہم انسانوں کو بے دریغ قتل نہیں کر سکتے، ورنہ اب تک مرشد اور اس کے بھائی کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔"

میرے موبائل نے بیل دی۔ عبداللہ کی کال تھی۔ "جناب ابھی اطلاع آئی ہے فتح خان وہ موبائل اسلام آباد میں ایک جگہ استعمال کر رہا ہے۔"

اس نے لوکیشن بتائی تو میں چونک گیا۔ "نادر کی کوٹھی بھی اسی علاقے میں ہے۔"

"ہاں جناب، ہمارے دو دشمن ایک ہی علاقے میں موجود ہیں۔" عبداللہ نے تصدیق کی۔ "ٹاور جس سے یہ کال آئی ہے نادر کی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

عبداللہ کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ فتح خان نادر کی کوٹھی کے کہیں آس پاس تھا۔ کیا اسے علم تھا کہ نادر یہیں ہے اور ہم اس کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں؟ وہ میرے پیچھے ہے اور اس نے ثابت کیا ہے کہ چالاکی اور وسائل میں وہ کسی طرح مرشد سے کم نہیں تھا۔ "عبداللہ یہ پریشانی کی بات ہے۔ فتح خان کے اس علاقے میں موجود ہونے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"جی جناب.... ہمیں کسی کارروائی کی صورت میں اس کی طرف سے مداخلت کا خطرہ رہے گا۔"

"اس صورت میں فتح خان کا سراغ لگانا نہایت ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "عبداللہ ایسی ڈیوائسز موجود ہیں جو کسی موبائل کی فریکوینسی پکڑ کر اس کی لوکیشن کی نشان دہی کر سکتی ہیں کیا ایسی کوئی مشین مل سکتی ہے۔"

"مل سکتی ہے میرا خیال ہے ایسی کوئی مشین ہمارے

خلاف استعمال کی گئی ہے۔"

"کئی بار۔" میں نے تصدیق کی۔ "ڈیوڈ شا جب یہاں تھا تو اس نے ایسی ہی مشین کی مدد سے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ یہ مشین موبائل کی پن پوائنٹ حد تک نشان کر سکتی ہے۔"

"چاہے موبائل استعمال ہو رہا ہو یا نہ ہو؟"

"ہاں لیکن موبائل آن ہونا چاہیے یہ مخصوص موبائل کی کال بھی پکڑ سکتی ہے اور اسے ریکارڈ بھی کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "عبداللہ ہمیں ایسی مشین کی ضرورت ہے۔"

"میں تلاش کرتا ہوں جناب شاید مقامی مارکیٹ میں میسر ہو ورنہ باہر سے منگوانی پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے جہاں سے جس قیمت پر مل رہی ہو منگوا لو میں اس کی ادائیگی کروں گا۔"

"شہباز صاحب۔" عبداللہ کے لہجے میں شکوہ آگیا۔ "آپ غیریت کی بات کر رہے ہیں۔"

"یار میرے پاس رقم ہے اس لیے کہہ رہا ہوں مشین خاصی مہنگی ہوگی۔"

"آپ فکر نہ کریں اگر مشین موجود ہے تو آجائے گی۔" عبداللہ نے کہا۔ "وسیم اور بیتو آگئے ہیں؟"

"ہاں آگئے ہیں۔"

عبداللہ سے ہونے والی گفتگو وہ دونوں بھی سن رہے تھے اور یک طرفہ گفتگو سے بھی انہوں نے بات سمجھ لی تھی۔ فتح خان کے بارے میں جان کر وہ بھی فکرمند ہو گئے تھے۔ وسیم نے کہا۔ "شہباز صاحب کہیں فتح خان نے نادر علی سے گٹھ جوڑ تو نہیں کر لیا ہے؟"

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور بولا۔ "ہو سکتا ہے لیکن مجھے مشکل لگتا ہے۔ فتح خان نے آج مرشد اینڈ کمپنی کو تیسرا بڑا نقصان پہنچایا ہے نادر کا اپنے بھائی سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن دولت و جائداد سے نہیں۔ تباہ ہونے والی فیکٹریوں میں یقیناً نادر کا حصہ بھی ہوگا۔ وہ ان کی تباہی کسی صورت برداشت نہیں کرے گا۔ ہاں اس کا امکان ہے کہ فتح خان بے خبری میں یا جان بوجھ کر یہیں کہیں ٹھکانہ بنائے ہوئے ہو۔"

"مجھے بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ فتح خان نے نادر علی سے ہاتھ ملا لیا ہو، اس کی بھائی سے دشمنی ہی دولت و کاروبار کے پیچھے ہوئی ہے۔" سفیر بولا۔ مگر وسیم کا خیال مختلف تھا اس نے کہا۔

"اس کے برعکس مجھے لگتا ہے کہ فتح خان ایسا کر سکتا ہے۔ اس نے احمق نادر کو سبز باغ دکھائے ہوں گے کہ وہ مرشد کی جگہ اسے گدی پر بٹھا دے گا۔ اصل چیز تو گدی ہے باقی جائداد و فیکٹریاں تو اس کے طفیل ہیں۔ اس لیے گدی پر قبضہ کرنے کا خیال نادر کو فتح خان سے اتحاد پر مجبور کر سکتا ہے۔ ایک بار گدی اس کے قبضے میں آجائے تو سب اس کا ہو جائے گا۔"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" سفیر بولا۔

"اب تم اس نقطہ نظر سے بھی کوٹھی کی نگرانی کروا گر فتح خان کا نادر سے کوئی تعلق ہے تو وہ لازمی اس کی کوٹھی میں آتا جاتا ہوگا۔ نگرانی کرنے والوں کو فتح خان کا حلیہ بتا دو۔"

میں نے کہا تو وسیم نے اسی وقت کسی کو کال کر کے ہدایت جاری کر دی پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو ایک دو دن میں فتح خان پکڑا جائے گا۔"

"اسے بیوقوف مت سمجھو۔" میں نے کہا۔ "وہ اتنا شاطر ہے کہ اس نے مجھے چکرا دیا ہے، اتنا تو مرشد یا ڈیوڈ شا نے تنگ نہیں کیا.... جتنا یہ تنگ کر رہا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اگر اس کا نادر سے رابطہ بھی ہے تو وہ اس سے ملتا نہیں ہوگا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "امکان یہی ہے فتح خان کسی پر اندھا اعتماد کرنے والا شخص نہیں، خاص طور سے مرشد اور نادر جیسے لوگوں پر۔ اگر اس کا ان سے کوئی رابطہ بھی ہے تو اس نے محفوظ طریقے سے ہی رکھا ہوگا۔"

"سوال یہ ہے کہ نادر جیسا شخص اس پر اعتماد کیوں کرنے لگا؟" سفیر نے نقطہ اُٹھایا۔

"وہ مجبور ہے۔" وسیم نے جواب دیا۔ "معذوری سے زیادہ مرشد سے اختلاف نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ فتح خان سے اتحاد کر لے کیونکہ اس کے آس پاس جو بھی لوگ ہیں ان پر وہ بھروسا نہیں کر سکتا ہے۔ وہ مرشد سے گٹھ جوڑ کر سکتے ہیں اور ممکن ہیں ان کی اصل وفاداریاں مرشد کے ساتھ ہوں اور وقت آنے پر نادر کے سامنے ان کا اصل چہرہ آئے۔ یہ بات نادر بھی سمجھتا ہوگا اس لیے وہ ابھی سے اپنے لیے نئے اتحادی تلاش کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ فتح خان کی مدد سے خود مرشد کا تختہ اُلٹ دے۔ اسے معلوم ہے خاندان والے اس کا ساتھ دیں گے۔ بس اسے قابل اعتماد لوگ درکار ہیں۔"

"فتح خان اس کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتماد ہے؟" سفیر نے اگلا سوال کیا۔

"وہ بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے لیکن فتح خان اس پر مسلط نہیں ہو سکتا..... ایک بار وہ مرشد سے چھٹکارا حاصل کر لے تو پھر اسے باہر کا کوئی آدمی مجبور نہیں کر سکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ لمبی بحث ہے۔" میں نے مداخلت کی۔ "فی الحال ہمیں فتح خان اور نادر کے ممکنہ گٹھ جوڑ کا پتا چلانا ہے۔"

"اس کے لیے کام شروع ہو گیا ہے۔"

"دوسرے میں چاہتا ہوں کہ شہلا کو تلاش کیا جائے تاکہ اس سے بھی ایک بار ہی نمٹا جائے۔"

"شہلا پر عبداللہ کا آدمی لگا ہوا ہے۔" وسیم نے بتایا۔ "لیکن وہ زیادہ تیز نہیں ہے میرا خیال ہے کوٹھی کی نگرانی کے لیے میں دوسرا آدمی لگا دوں۔"

"دیکھتے ہیں مانی نے کیا کیا ہے اب تک۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میں دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ دیکھتا ہوں۔" سفیر بھی کھڑا ہو گیا۔ "باہر سے منگوانا پڑے گا۔"

وسیم مسکرایا۔ "وہاں کوٹھی میں مزے ہیں دونوں خواتین نے ایک مددگار کے ساتھ پورا کچن سنبھالا ہوا ہے اور سب کے لیے کھانا اندر ہی بنتا ہے۔ صرف روٹیاں باہر ایک ہوٹل سے آرڈر پر بنتی ہیں۔"

"یہاں سب باہر سے آتا ہے یا خود بنانا پڑتا ہے۔" سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ میں اسٹڈی میں آیا تو مانی لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی۔۔ پُرجوش لہجے میں کہا۔

"میں آپ کو بلانے والا تھا شہلا کا ڈیبٹ کارڈ استعمال ہوا ہے۔"

"کہاں؟"

مانی نے اسلام آباد کے ایک سپر اسٹور کے بارے میں بتایا۔ "اس نے کل اور آج اس جگہ سے شاپنگ کی ہے اور دس ہزار سے اوپر کا سامان لیا ہے۔"

"یہ کس قسم کا اسٹور ہے۔"

"ایک گروسری سپر اسٹور ہے۔" مانی نے بتایا۔ "کل اس نے رات میں یہاں شاپنگ کی اور آج صبح بھی یہاں اس کا ڈیبٹ کارڈ استعمال ہوا ہے۔"

میں نے پتا نوٹ کیا اور مانی نے گوگل پر اس کا نقشہ بھی نکال کر دکھایا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب وہ ڈیبٹ کارڈ استعمال کر رہی ہو تو تم اسی وقت ٹریس کر سکو۔"

"کیوں نہیں لیکن اس کے لیے مستقل بینک کے سرور میں موجود رہنا پڑے گا۔ خوش قسمتی سے وہ ڈیبٹ کارڈ استعمال کر رہی ہے اگر کریڈٹ کارڈ استعمال کر رہی ہوتی تو اس کی تو رپورٹ ہی کئی گھنٹے بعد بینک میں آتی ہے۔"

میں باہر آیا وسیم ٹی وی دیکھ رہا تھا اسے سپر اسٹور کا

بتایا۔ "شہلا اس جگہ کل اور آج اپنا ڈیبٹ کارڈ استعمال کر چکی ہے۔"

وسیم نے اپنے ان آدمیوں کو کال کی جو شہلا کو دیکھ چکے تھے اور اس نے انہیں فوری اس سپر اسٹور کی نگرانی کا حکم دیا۔ "اسٹور کی مکمل نگرانی کرنی ہے اور جیسے ہی شہلا وہاں دکھائی دے بہت احتیاط سے اس کا تعاقب کر کے اس کے ٹھکانے کا پتا چلانا ہے۔"

وسیم نے فون بند کیا تو میں مسکرایا۔ "میں خود کو بیکار محسوس کرنے لگا ہوں سارے کام تو تم لوگ اور دوسرے کر رہے ہیں۔"

"جب آپ کے حرکت میں آنے کا وقت آئے گا تو آپ حرکت میں آ جائیے گا۔" وسیم نے کہا اور اُٹھ کر کچن کا رُخ کیا اسے چائے یا کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ میں فارغ تھا اس لیے دوبارہ اوپر کا رُخ کیا اور انٹرنیٹ سے ایمن کو کال کی۔ اس نے کال کاٹ دی تھی تاکہ میں فتح خان سے بات کر سکوں۔ وہ بھی میری کال کی منتظر تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"سویرا حویلی پہنچ گئی؟"

"ہاں اللہ کا شکر ہے، وہ خیریت سے ہے، فتح خان اسے وہاں پہنچانے خود گیا تھا۔"

"تھینک گاڈ۔" اس نے کہا۔ "یہ فتح خان آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اس نے میرے بابا کو اتنے عرصے قید رکھا۔ انہیں اذیتیں دیتا رہا حد یہ کہ مجھے اغوا کرا لیا لیکن جب اس کے ایک آدمی نے بابا پر گولی چلائی تو اس نے پاگل ہو کر اپنے آدمی کو شوٹ کر دیا۔ پھر اس نے مجھے جانے دیا لیکن راستے میں مجھے روک کر زبردستی جیکٹ پہنا دی۔"

"سچی بات ہے میں خود ابھی تک اسے صحیح طور سے نہیں سمجھ سکا ہوں۔ وہ ہر بار میرے اندازے کو شکست دے جاتا ہے۔ وہ مجھے ڈھیل دیتا ہے اس چکر میں کہ کبھی میں اس کے کام آؤں گا اور کئی بار قابو میں آنے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

"اس نے میرے بابا کو قید میں رکھا اور ان کی موت کا ذمے دار بھی وہی ہے۔" ایمن کے لہجے میں غصہ تھا۔ "اگر وہ کبھی میرے ہاتھ آیا تو میں اسے معاف نہیں کروں گی۔"

"تم فکر مت کرو اس بار میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

"شہباز اب میرے پاس ستر گھنٹے رہ گئے ہیں۔"

"ایمن میرا فتح خان سے رابطہ ہو گیا ہے۔ لیکن جب وہ چاہے تب ہی رابطہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطالبہ پانچ کروڑ ڈالرز ہیں۔"

"مجھے نہیں لگ رہا ہے۔" وہ مایوسی سے بولی۔ "اب تک حکومت کے کسی نمائندے نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ یہاں کوئی سن نہیں رہا ہے صرف سفیر دن میں ایک دو بار آ کر بات کرتا ہے لیکن اس کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اوپر والے میرے لیے کیا کر رہے ہیں اور کچھ کر بھی رہے ہیں یا نہیں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"تمہارے خیال میں ڈیوڈ شا کا اثر و رسوخ کام کر رہا ہے۔"

"بات ڈیوڈ شا کی نہیں ہے۔" وہ تلخ ہو گئی۔ "اگر میرے بارے میں میڈیا میں آ جائے تو حکومت پر دباؤ آئے گا اور وہ کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔"

"ہاں کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ یہ فیصلہ ایمن کی موت کا بھی ہو سکتا تھا۔ حکومتیں کھلے عام بلیک میل ہونا پسند نہیں کرتی ہیں۔ سوچتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر اس میں ایمن کا ٹی وی چینل ملوث ہو جائے تو حکومت دباؤ میں آ سکتی ہے۔ بے شک ماحولیاتی صحافی صحیح لیکن اس کا تعلق میڈیا سے تو تھا۔ اگر صحافی برادری حکومت پر دباؤ ڈالتی تو ایمن کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایمن سے یہ بات کہی تو اس نے جواب دیا۔

"اس صورت میں معاملہ پبلک ہو جائے گا۔"

"درست ہے لیکن میں بھول گیا تھا کہ تم ایک عام فرد نہیں ہو بلکہ صحافی ہو اور تمام صحافی برادری تمہارے لیے مل کر حکومت پر دباؤ ڈال سکتی ہے۔"

ایمن کے لہجے میں امید آ گئی۔ "ہاں، یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا، مگر میں نے اب تک اپنے چینل والوں سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ درحقیقت میرے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے۔"

"سوائے ڈیوڈ شا کے۔" میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں منع کیا گیا ہے؟"

"ہاں...." وہ ہچکچائی۔ "ان لوگوں نے بتایا ہے کہ میں جو کال کروں گی وہ انڈر آبزرویشن رکھی جائے گی۔"

میں اُچھل پڑا اور چلا کر کہا۔ "ایمن بے وقوف یہ بات تم اب بتا رہی...."

میری بات اُدھوری رہ گئی تھی اسی لمحے دروازہ کھلا اور میں نے کسی کی آواز سنی۔ "سوری مس ایمن تم نے وعدہ خلافی کی ہے۔"

"تم مجھ سے سیل نہیں لے سکتے۔" ایمن چلائی۔ لیکن شاید اس سے سیل چھین لیا گیا اور اگلے ہی لمحے لائن کٹ گئی تھی۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا تھا۔ میں نے ہینڈ فری کان سے نکال کر بستر پر پٹخ دیا۔ مجھے پہلے خیال نہیں آیا تھا کہ وہ سفارت خانے میں تھی اور وہاں اس کی کال کی مانیٹرنگ کی جا رہی ہو گی یعنی میں نے ایمن سے جو باتیں کی تھیں وہ سب ریکارڈ ہو چکی تھیں۔ اگرچہ ان سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا تھا لیکن انہیں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ فتح خان سے میرا رابطہ تھا اور بعد میں مجھے بھی ایمن کے معاملے میں ملوث کیا جا سکتا تھا۔ اب مجھے فوری طور پر اس کی اطلاع ایمن کے ٹی وی چینل اور برطانیہ اور یورپ کی صحافیوں کی انجمنوں کو دینی تھی.... میں نیچے مانی کے پاس آیا۔ وہ برگر کھاتے ہوئے گیم کھیل رہا تھا۔

"برخوردار گیم اور برگر بعد میں پہلے ایک نہایت ضروری کام ہے۔"

اس نے جلدی سے دونوں چیزیں ایک طرف کیں اور مستعد ہو گیا۔ "آپ حکم کریں شوبی بھائی۔"

"تمہیں بھی پتا چل گیا میرا نک نیم۔" میں بولا۔ "خیر.... مجھے ٹی وی چینل کو ای میل کرنی ہے اور یہی ای میل برطانیہ اور یورپ کی صحافیوں کی تنظیموں کو بھی کرنی ہے۔"

"آپ پہلے ای میل بتائیں۔" اس نے کہا اور میں نے اسے ای میل لکھوائی۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر اتنی تیز چل رہی تھیں کہ میرے الفاظ پیچھے رہ جاتے تھے۔ ای میل مکمل کر کے اس نے سب سے پہلے اس ٹی وی چینل کو میل کی اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک ایسا ای میل اکاؤنٹ استعمال کیا جو اس نے کبھی کسی کا ہیک کر لیا تھا اور اب اسی کے استعمال میں تھا۔ پھر اس نے برطانیہ اور یورپ کی صحافی تنظیموں کو یہی ای میل بھیجی۔ آخر میں اس نے ذرا سے ردوبدل کے بعد یہی ای میل دنیا کے دس بڑے نیوز چینلز کو بھیج دی۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

"شاباش یہ کیا ہے تم نے کام...."

"یہ کام تو آج کل بچے بھی کر لیتے ہیں جی۔" اس نے شکوہ کیا۔ "کام تو آپ بتاتے ہی نہیں ہو۔"

"میں نے تمہیں ڈیوڈ شا کا ای میل اکاؤنٹ ہیک کرنے کو کہا تھا۔"

"میں نے کوشش کی تھی جناب لیکن وہ بہت چالاک آدمی ہے اس نے پاس ورڈ کی جگہ اپنی آنکھ کی پتلی لگا رکھی ہے۔ وہ

ویب کیم میں دیکھتا ہے تو اکاؤنٹ سرور اس کی پتلی شناخت کر کے اس کا ای میل اکاؤنٹ کھول دیتا ہے۔''

میں حیران ہوا۔ ''ایسا بھی ہو رہا ہے؟''

''جی جناب.... پہلے فنگر پرنٹ ریڈر کی مدد سے اسے پاس ورڈ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اب یہ چیزیں آ گئی ہیں۔'' اس نے دوبارہ گیم لگا لیا اور برگر اُٹھا لیا۔ سارا کام اس نے مشکل سے پانچ منٹ میں کیا تھا۔ میں باہر آیا جہاں بیتو اور سفیر آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع لنچ تھا جس میں آج خاصی تاخیر ہو گئی تھی اس لیے مانی نے اپنی تسلی کے لیے برگر منگوا لیا تھا۔ بیتو کا اصرار تھا کہ پائے اور بریانی منگوائی جائے جبکہ سفیر بروسٹ اور کٹاکٹ کے حق میں تھا۔ میں نے کہا۔ ''یار کچھ بھی منگوا لو ورنہ میں بھوک سے فوت ہو جاؤں گا اور کٹاکٹ یہاں آتے آتے ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

طے ہوا کہ بریانی منگوائی جائے۔ میں باہر کے کھانے بس ایک حد تک کھاتا ہوں کیونکہ ان میں مرچ مسالے ذرا تیز ہی ہوتے ہیں' ورنہ میں گھر کے سادہ کھانے زیادہ شوق سے کھا لیتا ہوں لیکن یہاں مجبوری تھی۔ بلکہ یہاں کیا کچھ عرصے سے مجبوری ہی تھی۔ باہر کے کھانے صحت کے لیے بہتر نہیں تھے۔ اس سے میری صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اسٹیمنا بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اور سفیر سے کہا۔ ''یار میرے لیے دودھ، انڈے، مکھن اور کارن فلیکس منگوا لے۔''

بیتو نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''شوبی آپ یہ پھیکا کھانا کھائے گا۔''

''ہاں یار' چٹ پٹے کھانے کھا کھا کر پیٹ کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ سادہ غذا کھاؤں اور ایکسرسائز پر توجہ دوں۔''

''بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔'' وسیم اندر آتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ان دنوں یہی روٹین اپنا لی ہے۔ سادہ غذا اور ایکسرسائز، ہمارے لیے جسمانی طور پر فٹ رہنا لازمی ہے۔''

''تم لوگ فٹ رہو۔'' سفیر نے موبائل اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو قورمے بریانی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

''تم لوگ کھاؤ یار تمہیں کون منع کر رہا ہے لیکن میرے لیے یہ چیزیں منگوا لینا۔'' میں نے وسیم کو باہر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ باہر دھوپ تھی اور لان چیئرز پر اس کا مزہ لیا جا سکتا تھا۔ لیکن میں وسیم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے مجموعی صورت حال کا علم تھا میں نے اسے ایمن کے معاملے میں تازہ پیش رفت سے آگاہ کیا۔ ''ایمن کا مسئلہ تو اس کی حکومت حل کر سکتی ہے یا فتح خان ہاتھ آ جائے تو وہ حل کر سکتا ہے۔ ہماری توجہ کا اصل مرکز نادر کی کوٹھی اور شہلا ہونی چاہیے۔''

''میرے آدمی ان دونوں جگہوں پر ہیں۔'' وسیم نے کہا۔

''ان میں شہلا کم قابل توجہ ہے اصل کام نادر کی کوٹھی میں داخل ہو کر اسے اُٹھانا ہے اور یہ کام اس طرح کرنا ہے کہ ہمارا کوئی نشان نظر نہ آئے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''اگر ہم نادر کو وہاں سے نکال لاتے ہیں تو اسے رکھنے کے لیے جگہ چاہیے ہوگی۔''

''ایک جگہ میرے علم میں ہے۔ یہاں کبھی فتح خان نے مجھے قید رکھا تھا اور سویرا کو بھی وہیں لے آیا تھا۔''

''شاید آپ جنگل والے مکان کی بات کر رہے ہیں' اخباری اطلاعات کے مطابق اسے آگ لگا دی گئی تھی۔''

''مجھے معلوم ہے۔ لیکن اس میں ایک تہ خانہ بھی تھا اور میرے خیال میں وہ ٹھیک ٹھاک ہوگا۔ ہم وہاں جا کر دیکھ لیتے ہیں اور اگر اس میں کچھ کمی ہے تو پوری کر سکتے۔ وہ اچھی جگہ ہے آبادی اور ہر کسی کے خیالوں سے دور ہے۔''

''فتح خان اس کے بارے میں جانتا ہے۔'' وسیم نے خبردار کیا۔

''ہاں' لیکن وہ سمجھتا ہے کہ یہ ٹھکانا تباہ ہو چکا ہے اس لیے وہ یہ نہیں سوچے گا کہ ہم اسے اپنے استعمال میں لا رہے ہیں۔ وہ اس جگہ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے میں کھانا کھا کر روانہ ہو جاتا ہوں اور اسے دیکھتا ہوں۔''

''اکیلے مت جانا سفیر اور بیتو کو بھی لے جانا اور پوری طرح مسلح ہو کر جانا کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

سفیر کا شاید فون پر رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ بائیک پر کھانے کے لیے خود روانہ ہوا تھا اس کی واپسی تک میں نے ایکسرسائز کی پھر غسل کیا۔ جب وہ سب تکے اور بریانی سے شوق فرما رہے تھے تو میں دودھ میں کارن فلیکس بھگو کر کھا رہا تھا۔ اس کا ذائقہ بُرا نہیں تھا لیکن اتنے عرصے تک مسالے دار چیزیں کھانے کے بعد اسے حلق سے اُتارنا ذرا مسئلہ ہو رہا تھا۔ بہر حال' اصل مقصد تو پیٹ بھرنا تھا۔ کھانے کے بعد وسیم نے سب کو زبردستی کھینچ کھینچ کر اُٹھانا شروع کر دیا لیکن سفیر اور بیتو پر گہرا خمار طاری تھا اور کسی صورت وسیم کے ساتھ جانے کے لیے راضی نہیں تھے۔ سفیر نے جماہی لے کر کہا۔ ''اوہ بھائی تو ہو آ....''

''چل یار یہ کسی کام کے نہیں رہے ہیں۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

بیتو نے ایک احمقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''شوبی ہم کام کا آدمی ہے پر کھانے کے بعد نہیں۔''

''یعنی تم کسی وقت بھی کام کے آدمی نہیں رہتے ہو۔'' وسیم نے بھنا کر کہا۔ ''بہتر ہوگا تم لوگ کوٹھی چلے جاؤ' وہیں خواتین کے ساتھ پکاتے اور کھاتے رہنا۔''

وسیم کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ دونوں سو گئے تھے یا پوز کر رہے تھے۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور ہم باہر آ گئے۔ مانی کھاتے ہی اسٹڈی کی طرف چلا گیا۔ وسیم سفیر کی جیپ میں آیا تھا اس نے وین وہیں چھوڑ دی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کار اور ایک بائیک تھی۔ ایاز والی بائیک اس کے پاس تھی اور وہ کوٹھی میں تھا۔ وسیم نے جیپ منتخب کی کیونکہ یہ کچے راستوں پر چلنے کے لیے بہترین تھی۔ ہمارے پاس پستول تھے اور سیٹوں کے نیچے دو شاٹ گن اور دو خود کار رائفلیں موجود تھیں۔ یعنی اسلحے کی پوزیشن تسلی بخش تھی۔ ہم روانہ ہوئے اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم فتح خان کے اس ٹھکانے پر تھے لیکن اب وہاں صرف ایک جلا ہوا کھنڈر کھڑا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے جل چکے تھے اور باقی رہ جانے والی چیزیں لوگ نکال کر لے گئے تھے باہر سے شدید قسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نمایاں تھے۔ وسیم نے کہا۔ ''اس کا تو حشر ہو گیا ہے مجھے امید نہیں ہے کہ اس کا تہ خانہ بھی سلامت ہوگا۔''

''چل کر دیکھ لیتے ہیں ویسے یہ بھوت بنگلا اس قسم کے کاموں کے لیے موزوں ہے۔''

ہم جلے ہوئے ملبے اور چیزوں کو پھلانگتے ہوئے اندر آئے۔ وسیم طاقتور ٹارچ لے آیا تھا۔ اس کی روشنی میں اندر سب صاف نظر آ رہا تھا ورنہ دھویں اور آگ نے ہر چیز کو سیاہ کر دیا تھا۔ تہ خانے والی جگہ پر ملبہ بہت زیادہ تھا اور یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ اس کا دروازہ غائب تھا۔ یعنی یہاں کسی کو رکھنا مشکل کام تھا۔ دروازہ لگانے کے لیے یہ ملبہ صاف کرنا ضروری تھا۔ مزدور اور دوسرا تعمیراتی سامان یہاں تک لانا مشکل کام تھا۔ اس دردسری سے بہتر تھا کہ ہم کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کرتے۔ میں نے وسیم سے اتفاق کیا اور ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ سفر مایوس کن رہا تھا لیکن ذرا آؤٹنگ ہو گئی تھی۔ جس راستے سے آئے تھے اس پر گزشتہ بارش کا پانی کھڑا تھا اور جیپ بعض مقامات سے خاصی مشکل سے گزری تھی ایک بار تو کیچڑ میں پھنس گئی تھی۔

اس لیے وسیم نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ یہ بھی کچا تھا لیکن کسی قدر بلندی پر ہونے کی وجہ سے بہتر تھا۔ درختوں کے

جولائی 2012ء کے رم جھم موسم کی دلکش سوغات

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

دراوردروازہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے فرسودہ رواجوں کے حصار میں قید صنف نازک کے عزائم جب موت اور زندگی کے درمیان فقط چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا...... ان میں سے کسی ایک کی ہار لازم تھی۔ آخری صفحات پر ایک سنسنی خیز کہانی

چراغ افغان

تاریخ کے اوراق پر بہلول لودھی کی شجاعت و بہادری اور فہم و فراست کے سبق آموز واقعات...... حصول اقتدار اور نشہ اقتدار کے نشیب و فراز۔ **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے ماضی کی پر اثر منظر کشی

گھن چکر

طویل وقفے کے بعد آپ کے پسندیدہ قلم کار **''غلام قادر''** سسپنس کے صفحات پر...... رشتوں اور جذبات کی بلیک میلنگ ہو یا ڈیلنگ، ہوس انسان کو ایک مرکز پر ٹھہرنے نہیں دیتی

کشکول

انوار صدیقی کی سوچوں کا تلاطم...... ماورائی طاقتوں کے مظاہرے اور شیطان صفت انسانوں کی قلابازیوں پر مشتمل ایک دلچسپ ہنگامہ خیز سلسلہ

غیر ضروری
ہر دلعزیز مصنف **طاہر جاوید مغل** کا دلفریب انداز۔ اچھوتے احساسات کا زیروبم...... مختصر مگر شاہکار تحریر

مزید کاشف زبیر، مریم کے خان، مختار آزاد، سلیم انور، تنویر ریاض کی شاہکار تحریریں

اس کے علاوہ .... حضرت سلمانؑ کی روداد حیات، مرزا امجد بیگ کا دلچسپ انداز، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درمیان سے گزرتے ہوئے اچانک میری نظر خانہ بدوشوں کے خیموں کی طرف گئی اور میں نے بے اختیار وسیم کو جیپ روکنے کو کہا۔ وسیم نے خانہ بدوشوں کو دیکھ لیا تھا۔ ان کے خیمے کسی قدر نشیب میں ایک تالاب کے پاس تھے۔ تالاب میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ شہری لوگ اس کا پانی پی کر بیمار پڑ جاتے لیکن یہ سخت جان خانہ بدوش آرام سے اسے استعمال کر رہے تھے۔ وہ نہ صرف اسے نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے استعمال کر رہے تھے بلکہ اسی پانی کو پی بھی رہے تھے۔ ان کے جانور بھی آس پاس بندھے تھے اور وہ بھی پانی استعمال کر رہے تھے۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ یہ مہرو کا قبیلہ تھا۔ نظر آنے والے لوگوں کے نقوش ویسے ہی تھے۔ عورتیں اور بچے گورے چٹے تھے۔ جبکہ مردوں کے رنگ کسی قدر سنولائے ہوئے تھے۔

"ممکن ہے یہ کوئی دوسرا قبیلہ ہو؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور نیچے اُتر آیا۔ "تم گاڑی میں رہو اور اگر کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے کور دو گے۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔" وسیم نے کہا اور پچھلی نشست سے اسلحہ نکالنے لگا۔ گاڑی دیکھ کر خانہ بدوش جمع ہونے لگے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے لیکن ان کے تیور جارحانہ نہیں تھے۔ مجھے دیکھنے کے باوجود کسی کے چہرے پر حیرت یا ایسے تاثرات نہیں آئے جیسے وہ مجھے جانتے ہوں۔ اس کا مطلب تھا یہ مہرو کا قبیلہ نہیں تھا ورنہ اس میں بہت سارے لوگ مجھے دیکھ چکے تھے۔ اب مجھے تو ان کے چہرے یاد نہیں تھے لیکن ان خانہ بدوشوں سے یہ توقع محال تھی کہ وہ کسی کو دیکھ کر بھول جائیں جبکہ مجھے دیکھے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ وہاں جمع ہونے والوں کے چہروں پر سوالیہ نشان تھے کہ ہم کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں؟ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"تمہارا سردار کون ہے؟"

"ایک عمر رسیدہ لیکن تنومند شخص مجمع کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ "میں ہوں سرکار حکم کرو۔" اس نے صاف اردو میں کہا۔

"تم لوگ کب سے یہاں ہو؟"

"جی ہم دو دن پہلے لاہور کی طرف سے آئے ہیں اوپر وادی نیلم کی طرف جا رہے ہیں۔"

"تم لوگ گوجر ہو؟"

"جی سرکار کشمیری ہیں۔" بوڑھا ادب سے کہہ رہا تھا۔

"چند دن پہلے اس علاقے میں ایک قبیلہ اور بھی تھا اور وہ بھی گوجر تھے۔" میں نے کہا۔

"ہوں گے سرکار ہمیں تو اپنے قبیلے سے مطلب ہے۔" وہ چالاکی سے بولا۔ "اگر کوئی کام ہے تو حکم کریں سرکار۔"

بوڑھے کا مطلب تھا کہ کام کی بات کرو ورنہ پھر پھرتے نظر آؤ۔ مہرو کا قبیلہ یقیناً اس کی طرف سے ناامید ہو کر یہاں سے جا چکا تھا ویسے فتح خان کی مخبری پر وہ اسلام آباد تک چلے آئے تھے۔ بہرحال ایک عورت کی خاطر وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے تھے۔ میں واپسی کے لیے مڑا تھا کہ عورتوں کے ہجوم میں مجھے ایک عورت کی جھلک دکھائی دی۔ جب تک میرا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوتا عورت کہیں غائب ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ مہرو ہے۔ وہی مہرو جو وادی تک میرے ساتھ گئی تھی کیونکہ اس کا اپنا قبیلہ اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا اور میں نے خود دیکھا تھا وہ اسے اور مجھے تلاش کرتے ہوئے اسلام آباد تک آ گئے تھے۔ مہرو کا واپس اپنے قبیلے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ مجھے یہاں نظر آئی تھی۔

لیکن مہرو یہاں کہاں وہ تو راجا عمر دراز کے محل میں تھی اور اس کی روسی نژاد عبدالرحمٰن سے شادی ہونے والی تھی جو اس کی خاطر مسلمان ہو گیا تھا۔ میں عورتوں میں مہرو کو دیکھ رہا تھا اور اس پر بوڑھے سردار کے تیور خراب ہونے لگے تھے۔ وہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھا کہ میں کوئی اوباش آدمی ہوں اور اس کے قبیلے کی عورتوں کو تاڑ رہا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا میں اس بات کو اپنا وہم قرار دے کر جیپ کی طرف مڑ گیا تھا۔ ایک ہی برادری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کے چہرے مہرے ایک جیسے تھے اس لیے مجھے اس لمحے بھر کو نظر آنے والی اس عورت پر مہرو کا شبہ ہوا تھا۔ وسیم مستعد اور کسی قدر ٹینشن میں تھا اس نے رائفل نیچے رکھی تھی اور ایک سیکنڈ میں اسے اُٹھا سکتا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے جیپ آگے بڑھا دی اور بولا۔

"یہ خانہ بدوش بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں جناب۔ ایک بار ایک معاملہ میں ان سے مڈبھیڑ ہو گئی اور ان غریب سے نظر آنے والے لوگوں کے پاس اتنا جدید اور مہنگا اسلحہ نکل آیا کہ میرے ساتھیوں کے لیے جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے بچ کر نکلے تھے۔"

"مجھے بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "میں نے سنا ہے کہ یہ کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو جب تک اسے پکڑ نہ لیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے؟"

"اس سے بھی زیادہ خطرناک اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔ ان کی بھی ایک مافیا ہے اور یہ سب آپس میں ملے

ہوتے ہیں آج کل ان کا سب سے اہم مسئلہ اپنے نوجوان ہوتے لڑکے اور لڑکیوں کو فرار سے روکنا ہے کیونکہ شہروں میں قیام کے دوران وہ جدید طرزِ زندگی کے شیدائی ہو جاتے ہیں۔ خانہ بدوش طرزِ زندگی ان کو بوجھ لگنے لگتا ہے اور پھر کسی بہانے فرار ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر جنس مخالف کے چکر میں بھاگتے ہیں۔ نوجوانوں کی کمی کی وجہ سے ان کی آبادی مستقل گھٹ رہی ہے۔"

"قبیلوں کا باثر طبقہ اس خانہ بدوشی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے؟"

"ظاہر ہے کیونکہ ان قبیلوں کی دولت کے اصل مالک یہی ہیں۔ تمام ناجائز دھندے ان کے اشارے پر ہوتے ہیں اور اس کا ثمر بھی یہی لوگ حاصل کرتے ہیں۔ عام لوگوں کے حصے میں سوکھی روٹی ہی آتی ہے۔ اس لیے عام نوجوان فرار ہو رہے ہیں تاکہ اپنی زندگی خود بنا سکیں۔"

"یہ اور بات ہے کہ جب وہ فرار ہو کر شہروں اور قصبوں میں بستے ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے کہ یہاں بھی ان کے سرداروں جیسے طبقات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں بھی انہیں بے بسی اور غلامی کی زندگی بسر کرنی ہوتی ہے اور کھانے کو روکھی سوکھی ملتی ہے۔ جب تک وہ خود کوئی دو نمبر کام کر کے اوپری طبقے میں نہ شامل ہو جائیں۔"

میں نے سرد آہ بھری۔ "ٹھیک کہا تم نے یہ پورا ملک ہی اوپر سے لے کر نیچے تک مافیاؤں کے چنگل میں ہے۔"

جی ٹی روڈ تک آتے آتے شام ہو گئی تھی۔ جیسے ہی موبائل پر سگنل نمودار ہوئے مانی کی کال آنے لگی۔ میں نے ریسیو کی تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"کہاں ہیں جناب میں دیر سے کال کر رہا ہوں۔"

"کیا ہوا؟"

"شہلا نے دس منٹ پہلے اپنا ڈیبٹ کارڈ اسی علاقے میں ایک پیٹرول پمپ پر استعمال کیا ہے۔"

"لوکیشن بتاؤ؟"

مانی نے لوکیشن بتائی جو میں نے وسیم کو بتائی اور اس نے کال کر کے اپنے آدمیوں کو ہوشیار کیا۔ "دونوں مت دوڑ جانا ایک سپر اسٹور کے سامنے رہے اور دوسرا جا کر پیٹرول پمپ کا معائنہ کر کے آئے۔ مجھے فوراً رپورٹ کرنا۔"

ہم اس جگہ خاصی دور تھے۔ پھر بھی میں نے وسیم سے کہا۔ "ہمیں خود بھی وہاں جانا چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ممکن ہے شہلا نظروں میں آ جائے اور ہمیں فوری فیصلہ کرنا پڑے۔"

ہم میں سے بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ پانی کے ذریعے وزن کو مستقل طور پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ پانی قدرتی طریقے سے غذا کو جذب کرتا ہے اور جسم میں موجود چربی کو توانائی میں تبدیل کرتا ہے۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر جسم میں پانی کا ذخیرہ کم ہو جائے تو جسم پر چربی بڑھ جاتی ہے جبکہ زیادہ سے زیادہ پانی پینا چربی کو کم کرتا ہے۔ وجہ یہ کہ پانی کی کمی کی وجہ سے گردے صحیح طور پر کام نہیں کرتے اور جگر پر بھی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ جگر کا بنیادی کام جسم میں موجود چربی کو توانائی میں تبدیل کرنا ہے لیکن جب یہ گردوں کا کام کرتا ہے تو اس کا اپنا فعل متاثر ہوتا ہے۔

جسم کی رطوبت برقرار رکھنے کے لیے بھی پانی بہت اہم ہے لیکن اگر پانی ضرورت اور طلب سے کم پیا جائے تو جسم اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے اندر موجود ہر قطرے کو سمیٹتا ہے اور خلیوں سے باہر اضافی خلیاتی گنجائشوں میں جمع کر دیتا ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ٹانگوں، پیروں اور ہاتھوں پر ورم ہے۔ اس طرح زیادہ موٹے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ جسم کو خوب پانی مہیا کریں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہمارا جسم صرف طے شدہ مقدار میں سوڈیم قبول کرتا ہے۔ اگر سوڈیم کا اجتماع ہمارے جسم کی ضرورت سے زیادہ ہو تو ہمارا جسم پانی جمع کرنے لگتا ہے تاکہ نمک کی زیادہ مقدار کو حل کیا جا سکے۔

اقتباس: پانی ایک نعمت
مرسلہ: نازش سلطانی، حیدرآباد

زندگی میں کوئی خوشی، کوئی رشتہ، کوئی جذبہ کبھی مستقل نہیں ہوتا، ان کے بھی پاؤں ہوتے ہیں، ہمارا سلوک اور رویہ دیکھ کر کبھی یہ بھاگ کر قریب آ جاتے ہیں اور کبھی آہستہ آہستہ دور چلے جاتے ہیں۔

اشفاق احمد کی تحریر سے اقتباس
مرسلہ: رانا محمد شاہد، بورے والا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر اسے اُٹھانے کا موقع ملے تو اس سے دریغ نہیں کرنا ہے۔" میں نے فیصلہ کیا۔ "اس خطرناک عورت کو مزید چھوٹ دینا مناسب نہیں ہوگا۔"

"سوچ لیں۔" وسیم نے دبے انداز میں کہا۔ "وہ بڑی خطرناک عورت ہے اور اپنے عورت ہونے کا پورا فائدہ اُٹھاتی ہے۔"

"تم فکر مت کرو اب اس کے معاملے میں میرا ذہن واضح ہوگیا ہے۔" میں نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ تاریکی تیزی سے چھا رہی تھی۔ فروری کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا اور موسم سرما کی شدت بھی یقیناً آخری دنوں پر تھی۔ ایک دو ہفتے سردی کی شدت میں یقیناً کمی آتی۔ دس منٹ بعد وسیم کے آدمی نے کال کر کے اطلاع دی۔ وسیم نے اسپیکر فون آن کرلیا۔

"سر وہ غائب ہے پیٹرول پمپ کے آس پاس کہیں نہیں ہے میں نے بائیک میں پیٹرول بھروانے کے بہانے ایک ملازم سے معلوم کیا ہے شہلا اپنی سرخ شیوی میں تھی۔ ملازم کو شیوی اور شہلا کے حلیے کی وجہ سے وہ یاد رہ گئی وہ اکثر یہاں آتی ہے۔"

شہلا کو ایسی تراش کے لباس پہننے کا شوق تھا جس میں اس کی تسلی بخش نمائش ہوسکے اور ظاہر ہے دیکھنے والے اسے یاد بھی رکھتے تھے یہی وجہ تھی وہ پیٹرول بوائے کو یاد رہ گئی جو دن میں سیکڑوں عورتوں کو دیکھتا ہوگا۔ وسیم نے پوچھا۔ "یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ کس طرف گئی ہے؟"

"نہیں ملازم یہ نہیں دیکھ سکا۔"

"ٹھیک ہے تم پیٹرول پمپ کی آس پاس کی سڑکوں پر گھوم پھر کر دیکھو خاص طور سے گھروں میں دیکھو اگر کہیں سرخ شیوی نظر آئے تو مجھے اطلاع کرنا۔"

"یس سر۔"

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ "یہ تو طے ہے کہ وہ اسی علاقے میں کہیں موجود ہے اور اسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔"

"مجھے تو اس کی دیدہ دلیری پر حیرت ہے وہ پھر کھلے عام گھوم رہی ہے جبکہ اسے معلوم ہے میں اسے تلاش کر رہا ہوں گا۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اس سپر اسٹور کے سامنے تھے۔ یہ خاصا بڑا اور لگژری طبقے کے لیے مخصوص سپر اسٹور تھا جہاں ہر چیز اعلیٰ درجے کی اور باہر کی یا ایکسپورٹ کوالٹی ملتی تھی اور اسی مناسبت سے مہنگی بھی تھی۔ یہاں ہر کوئی خریداری کے لیے نہیں آتا تھا اس لیے رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ وسیم جیپ میں رہا اور میں اُتر کر اسٹور کے اندر آیا۔ یہاں صرف

سیلز گرل تھیں اور تمام ہی چن کر رکھی ہوئی تھیں۔ میں اس کاؤنٹر کی طرف بڑھا جس پر زیادہ تر پروڈکٹس خواتین کے لیے مخصوص تھیں ان میں میک اپ، خوشبو، لوشن اور ہائی جین پروڈکٹ نمایاں تھیں۔ عام طور سے مرد حضرات یہاں نہیں آتے ہیں لیکن ان کی آمد پر پابندی بھی نہیں تھی۔ اسٹور کو سیل سے مطلب تھی چاہے وہ کوئی بھی لے۔ سیلز گرل نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

"سر واٹ کین آئی ڈو فار یو۔"

"مجھے ڈرائی اسکن کے لیے کچھ لوشن دکھایئے جو حساس جلد پر بھی اپلائی ہوسکیں۔"

"جی سر۔" وہ جلدی سے اردو میں بولی۔ "ہمارے پاس جرمنی سے آئے ہوئے کچھ خاص لوشن ہیں جو اسی قسم کی جلد کے لیے مخصوص ہیں آپ کس برانڈ کا چاہتے ہیں؟"

"برانڈ تو مجھے یاد نہیں ہے لیکن میری ایک جاننے والی خاتون شہلا رضوی یہاں آتی رہتی ہیں۔ انہوں نے تجویز کیا ہے کہ میں اپنی وائف کے لیے یہاں سے لوشن لے سکتا ہوں۔"

"وائے ناٹ سر۔" اس نے شہلا کے نام پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر کہا۔ "آپ کو یہاں بیسٹ کوالٹی ملے گی۔"

اس نے لوشن نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے انہیں دیکھا اور پھر کسی قدر بے بسی سے کہا۔ "مجھے یاد نہیں شہلا نے ایک خاص لوشن کہا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔"

"آپ ان کو کال کر کے معلوم کرسکتے ہیں۔"

"گڈ۔" میں نے اس کی ذہانت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ "اس کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" میں نے اپنا موبائل نکالا اور اپنا ہی ایک ایسا نمبر ملایا جو بند تھا ظاہر ہے مجھے جواب نہیں ملا۔ وہاں اتنی خاموشی تھی کہ سیلز گرل نے بھی ریکارڈ آواز سنی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔ میں نے پریشانی سے کہا۔ "نمبر تو بند ہے۔"

"آپ کے پاس کوئی اور نمبر نہیں ہے۔" سیلز گرل اب پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی۔

"نہیں اور بدقسمتی سے میں نے شہلا کا گھر بھی نہیں دیکھا ہے وہ کچھ عرصے پہلے ہی یہاں منتقل ہوئی ہے۔ یہاں ایک کام سے آیا تھا تو سوچا لوشن بھی لیتا جاؤں۔ میں واہ کینٹ میں رہتا ہوں۔"

"اوہ آپ بہت دور سے آئے ہیں۔" اسے اب ہمدردی بھی ہوگئی تھی۔ "کاش میں آپ کی مدد کرسکتی۔"

میں نے سوچنے کی اداکاری کی۔ "ہاں آپ چاہیں تو

ایک مدد کرسکتی ہیں۔ شہلا اکثر خریداری کے لیے آتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا۔" میں نے تفصیل سے شہلا کا حلیہ بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ایسا لباس پہننے کی عادی جس میں اس کی خوب صورتی نمایاں ہو۔ اس حوالے سے سیلز گرل فوراً پہنچان گئی۔

"جی وہ تو آج صبح بھی آئی تھیں اور کہیں پاس ہی رہتی ہیں کیونکہ میں نے دو تین بار انہیں سامان والی ٹرالی کے ساتھ آتے دیکھا ہے۔"

"تب ممکن ہے آپ کو یا آپ کے اسٹور میں کسی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں رہتی ہے؟"

"میں معلوم کرتی ہوں سر۔" سیلز گرل بولی اور اپنی ساتھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے میری بات پر مکمل اعتبار کیا تھا۔ ایک تو میں صورت اور حلیے سے شریف اور معزز نظر آرہا تھا دوسرے میں نے اداکاری یقیناً اچھی کی تھی اور اسے میری کہانی پر یقین آگیا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ سیلز گرل کی کسی ساتھی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ لیکن سیلز گرل اور اس کی ساتھیوں کی گفتگو کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی کو شہلا کے گھر کا علم نہیں تھا البتہ جب سیلز گرل میرے پاس واپس آئی تو پُرجوش تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "سر ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ میڈم شہلا کہاں رہتی ہیں لیکن یہاں ہمارا ایک سروس بوائے ماجد ہے۔ وہ کئی بار میڈم شہلا کے ساتھ سامان لے کر ان کے گھر تک جاچکا ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ آج صبح کی شفٹ میں تھا اور چار بجے آف کر کے جاچکا ہے۔"

"اوہ... یعنی کل صبح آئے گا لیکن میں صبح نہیں آسکوں گا۔ کیا اس کا کوئی موبائل نمبر نہیں ہے وہ صرف نشان دہی کر دے تو مکان میں تلاش کرلوں گا۔"

"موبائل نمبر تو صرف منیجر کے پاس ہوتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ میں نے سراپا التجا بن کر کہا۔

"پلیز مس آپ ان سے معلوم کر کے بتائیں۔"

میری التجا نے اسے موم کرلیا اور وہ سر ہلاتی ہوئی اسٹور کے پچھلے حصے کی طرف بڑھ گئی۔ اب میں دعا مانگنے لگا کہ منیجر کوئی خشک مزاج مشکوک آدمی نہ ہو اور وہ نمبر دینے کے بجائے بال کی کھال نکالنے میں نہ لگ جائے۔ سیلز گرل خوب صورت لڑکی تھی اور اگر منیجر ذرا بھی حسن پرست ہوتا تو وہ کامیاب لوٹتی۔ اس کی کامیاب واپسی پانچ منٹ بعد ہوگئی یقیناً یہاں تمام ملازمین کا ڈیٹا کمپیوٹرائزڈ تھا اس لیے ایک منٹ میں منیجر نے ماجد کا سیل نمبر نکال دیا۔ سیلز گرل نے نمبر مجھے دینے کے بجائے اسے اپنے سیل سے کال کی۔ وہ پوری طرح میری مدد پر آمادہ تھی۔ "ماجد میں اسٹور سے فریحہ بات کر رہی ہوں۔ ہاں ایک کسٹمر کو مسئلہ ہے تم سروس کے لیے گھروں تک جاتے ہو تمہیں وہ خوب صورت سی خاتون یاد ہیں جو آج صبح بھی آئی تھیں؟"

جواب میں ماجد نے شہلا کے حوالے سے یقیناً کوئی ایسی بات کی کہ فریحہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "پلیز کام کی بات کرو ان صاحب کو ان کے گھر کا پتا چاہیے وہ ایک لوشن کے بارے میں ان سے گائیڈنس لینا چاہتے ہیں لیکن ان کا نمبر بند جارہا ہے.... ٹھیک ہے.... لو سر سے بات کرو اور انہیں سمجھا دو۔" فریحہ نے کہتے ہوئے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے موبائل لیا۔

"جی سر۔" ماجد نامی لڑکے نے کسی قدر مسخرانہ انداز میں کہا۔ "آپ کو میڈم شہلا کے گھر کا پتا چاہیے۔"

"ہاں وہ ابھی یہاں شفٹ ہوئی ہیں اور میرے پاس ان کے گھر کا پتا نہیں ہے۔" میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اسٹور سے نکلنے کے بعد دائیں طرف مڑ جائیں اسی سڑک پر سیدھا جائیں بائیں طرف کی چوتھی لین میں بائیں طرف کا پانچواں "بنگلا" ہے اس کے گیٹ پر شیر کا سر بنا ہوا ہے۔"

اس نے پتے کی وضاحت کر دی تھی لیکن میں نے احتیاطاً موبائل پر آنے والا اس کا نمبر دیکھ کر ذہن نشین کرلیا اور موبائل شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ "میں پوچھ کر آتا ہوں۔"

"ویلکم سر اسٹور رات بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔" وہ دلکش انداز میں مسکرائی اور میں دل میں اس سے سوری کرتا باہر نکل آیا کیونکہ اب میں دوبارہ یہاں نہیں آتا۔ وسیم گاڑی میں میرا منتظر تھا۔

"کام ہوگیا۔" میں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہلا کا پتا مل گیا ہے۔"

"پتا چل گیا۔" وہ اُچھل پڑا۔ "اتنی آسانی سے؟"

"بس جب تقدیر ساتھ دینے پر آمادہ ہو تو اسی طرح سراغ مل جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی سڑک پر سیدھے چلو بائیں طرف چوتھی گلی میں موڑ لینا۔"

وسیم نے گاڑی آگے بڑھائی۔ "میں اپنے آدمیوں کو کال کرلوں؟"

"نہیں پہلے ہم جائزہ لے لیں لیکن ان کو اسٹور کے پاس بلا لو تاکہ کال کرتے ہی وہ آجائیں۔"

وسیم نے دوسرے کو کال کی اور اسے واپس آنے کا حکم دیا۔ چوتھی گلی میں بائیں طرف پانچواں بنگلا تھا اس کے گیٹ پر شیر کا سر بنا ہوا تھا۔ لیکن بنگلا اندر سے تاریک تھا اور گیٹ کی روشنیاں بھی گل تھیں گویا شہلا گھر پر نہیں تھی۔

''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''شاید وہ پیٹرول ڈلوا کر واپس نہیں آئی اور کہیں گئی ہے۔ ہمیں اس کا انتظار کرنا ہوگا۔''

یہ سارے بڑے بنگلے تھے۔ شاید ایک کنال پر پھیلے ہوئے تھے۔ گلی سنسان تھی لیکن گھروں میں روشنی تھی۔ صرف شہلا کا بنگلا تاریک تھا۔ یعنی وہ اکیلی رہتی تھی۔ ورنہ بنگلے میں تاریکی نہ ہوتی۔ شہلا کا تعلق ایک جدی پشتی رئیس جاگیردار گھرانے سے تھا اس لیے اس کی دولت مندی میں شبہ نہیں تھا پھر وہ جس فطرت کی عورت تھی اس کے اندر دولت کی بھوک تھی۔ اس نے مزید دولت کمانے کے طریقے بھی آزمائے ہوں گے۔ ممکن ہے یہ بنگلا اس کا ہو یا اس نے کرائے پر حاصل کیا ہو۔ دروازے کے ساتھ کہیں کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ جس سے پتا چلتا کہ صاحب خانہ کون ہے؟ میں اُتر کر گیٹ تک گیا۔ پہلے میں نے سن گن لی احتیاطاً میں نے چہرہ نیچے رکھا تھا کیونکہ اندر کسی سیکورٹی کیمرے کی موجودگی عین ممکن تھی جو گیٹ تک آنے والے کسی بھی فرد کی تصویر لے سکتا تھا۔ گیٹ کی جھریوں سے اندر کا جائزہ لیا اور پھر بیل بجائی۔ باہر آواز نہیں آئی تھی بیل یا تو اندر تھی یا پھر بند تھی۔ کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو میں وسیم کے پاس آیا۔

''جیپ کہیں اور لے جاؤ اس طرح کھڑے دیکھ کر کسی کو شک ہو سکتا ہے۔''

اتنی دیر میں وسیم پہلے ہی ایک جگہ دیکھ چکا تھا۔ یہ دو بنگلے آگے ایک خالی پلاٹ تھا۔ وہ جیپ وہاں لے گیا میں وہیں رہا پھر مجھے خیال آیا کہ اس طرح کھڑا ہوا تو میں خود بھی مشکوک لگ رہا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا گلی کے سرے سڑک کی سمت جانے لگا۔ وسیم جیپ میں موجود رہا تھا اس کے سیاہ شیشوں کے پیچھے اندازہ لگانا دشوار تھا کہ کوئی جیپ میں ہے یا نہیں۔ سڑک تک جا کر میں واپس آیا اور جیپ میں گھس گیا کیونکہ سردی کی شدت بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی دھند پڑنے لگی تھی۔ ذرا سی دیر میں جیپ کا شیشہ اوس پڑنے سے بالکل اندھا ہو گیا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''اس سے تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے اگر شہلا آئی تو کیسے پتا چلے گا؟''

''ایسا کرتے ہیں کھڑکی کا ذرا سا شیشہ نیچے کر لیتے ہیں اس سے نظر آتا رہے گا۔''

''نہیں جیپ اندر سے بھی یخ ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''میں اندر جانے کی سوچ رہا ہوں۔''

وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے اس ایڈونچر کی ضرورت نہیں ہے اندر جانے کے لیے آپ کو ٹریس پاس کا خطرہ مول لینا پڑے گا اور بد قسمتی سے کسی نے دیکھ لیا تو شہلا سے پہلے پولیس آ جائے گی۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا خطرہ زیادہ تھا لیکن اندر جانے کا مقصد صرف شہلا کو قابو کرنا نہیں تھا۔ ممکن ہے مجھے یہاں بریف کیس مل جاتا۔ اگر صرف شہلا کو قابو کیا جاتا تو اسے جلدی یہاں سے لے جانے کے چکر میں ہم بریف کیس آسانی سے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے وسیم کو بریف کیس کے بارے میں اپنے خیال سے آگاہ کیا تو اس کی سوچ بدل گئی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم موقع سے فائدہ اُٹھا کر اگر بریف کیس حاصل کر لیں تو اس کے بعد شہلا جہنم میں جائے۔ آپ گیٹ تو پھلانگ سکتے ہیں لیکن اندر تالے کیسے کھولیں گے؟''

''ممکن ہے مجھے کوئی دروازہ کھلا مل جائے کھڑکیوں پر تو گرل نظر آ رہی ہے۔''

''شہلا اتنی لاپروا عورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کوئی راستہ مل جائے۔ کوئی پن یا سخت تار ہے۔''

وسیم نے نیچے اُتر کر ٹول بکس سے مجھے اس قسم کے تار اور پنیں نکال دیں جن سے کسی تالے کو کھولا جا سکتا تھا۔ مجھے ایک دو بار اس قسم کے کاموں کا تجربہ ہوا لیکن مجھے مہارت نہیں تھی۔ پستول میری جیکٹ میں تھا۔ دھند کی وجہ سے مجھے آسانی تھی۔ دس گز بعد چیزیں دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔ گھروں میں کھڑکیوں کے شیشے دھندلا گئے تھے اور کھلے دروازے رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں آسانی سے گیٹ پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا اور کتّے کا خیال مجھے بعد میں آیا کیونکہ ابھی میرے پاؤں فرش سے لگے تھے کہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اگرچہ آواز کہیں دور سے آئی تھی لیکن میرا خون فوراً خشک ہو گیا اور میں نے بے ساختہ پستول نکال لیا۔ کتّا اگر سامنے سے آتا تو میں آسانی سے اس سے نمٹ سکتا تھا لیکن اگر وہ دائیں بائیں کہیں جھاڑیوں سے نمودار ہوتا تو میرے پاس اس سے نمٹنے کا وقت کم رہ جاتا۔ شہلا کی کوٹھی میں لان کا رقبہ اتنا نہیں تھا لیکن اس پر آرائشی جھاڑیوں سمیت بہت کچھ لگا تھا۔ لیکن پہلی آواز کے بعد کتّا کہیں سے نمودار نہیں ہوا۔

''شش....'' میں نے آہستہ سے آواز نکالی کہ اگر کتّا کہیں ہو تو تشریف لے آئے۔ ابھی تو میں ہوشیار تھا بعد وہ بے خبری میں آ لیتا تو میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کتّا اس بار بھی نہیں آیا میں نے آس پاس دیکھا گیٹ کے دونوں طرف لان تھا جس میں کراٹا کی باڑھ لگی تھی۔ آہستہ آہستہ میں نے آگے پیچھے کے پورے لان کا معائنہ کر لیا۔ کتا کہیں نہیں تھا وہ شاید کسی پڑوس میں تھا اور آہٹ سن کر بھونکا تھا یا پھر اس کی طبیعت گدگدائی تھی۔ میں گھوم کر کوٹھی کے پیچھے آیا۔ اس طرف کئی کھڑکیاں تھیں لیکن سوائے صرف ایک کے سب پر گرل لگی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس کھڑکی پر گرل کیوں نہیں ہے۔ میں اسے چھونے جا رہا تھا کہ میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ میں نے کھڑکی کی جالی کو ہاتھ لگانے کے بجائے اپنے پاس موجود تار اس پر کھینچ کر مارا اور فوراً ہی جالی سے چنگاریاں پھوٹی تھیں اس میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ اگر میں اسے ہاتھ لگاتا تو مرحوم نہ بھی ہوتا تب بھی کرنٹ مجھے بے دم ضرور کر دیتا۔

یہ ٹریپ تھا چوروں کی طرح آنے والا فوراً اس کھڑکی کی طرف متوجہ ہوتا اور اندر جانے کی کوشش میں وفات پا جاتا اور یہ ٹریپ بتا رہا تھا کہ اندر کوئی چیز تھی جس کی حفاظت کے لیے یہ ٹریپ لگایا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کی اور کھڑکی کا معائنہ کیا لیکن مجھے کہیں سے کوئی تار جالی کو چھوتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ یعنی یہ سسٹم اندر سے تھا۔ میں زیادہ دیر ٹارچ نہیں جلا سکتا تھا آس پاس گھروں میں سے کوئی دیکھ سکتا تھا۔ میں پلٹ کر سامنے والے حصے میں آیا گیٹ کے پاس سرکٹ بریکر اور سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ پرانے طرز کی کوٹھی تھی جس میں اس قسم کی چیزیں باہر ہوتی تھیں آج کل لوگ سوئچ بورڈ اور سرکٹ بریکر گھر کے اندر لگانا پسند کرتے ہیں تاکہ کسی قسم کی خرابی کی صورت میں ان کو گھر سے باہر نہ جانا پڑے۔ میں نے مین سوئچ بند کیا اور دوبارہ جا کر جالی پر تار مار کر چیک کیا اس بار چنگاریاں نہیں اُڑی تھیں۔ پھر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کو ہاتھ لگایا۔

یہ المونیم کی کھڑکی تھی جس پر ایک فکس پٹ تھا اور دو سلائیڈ کرنے والے پٹ تھے باہر والا پٹ فلائی نیٹ کا تھا جسے مزید مضبوط کرنے کے لیے اس پر لوہے کی باریک جالی لگائی گئی تھی اور کرنٹ اسی میں دوڑ رہا تھا۔ مین سوئچ آف کرنے سے کرنٹ رک گیا تھا۔ میں نے زور لگا کر پٹ کھسکایا اور پھر اندر والا بھی کھسکا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کچن کے ساتھ لاؤنج تھا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کے دونوں پٹ برابر کیے اور پھر ٹارچ کی روشنی میں مکان کے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے اس لیے روشنی باہر جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ البتہ میرے کان باہر کسی آہٹ پر مرکوز تھے آنے والے کا پتا آوازوں سے چلتا۔ میرے پاس موبائل تھا اور میں نے اسے سائلنس کر کے وائبریٹ پر کر دیا۔ اب وسیم یا کوئی اور مجھے کال کرتا تو مجھے پتا چل جاتا۔

یہ ایک منزلہ کوٹھی تھی جس کا حجم بتا رہا تھا کہ اس میں کم سے کم تین بیڈ روم تھے۔ لاؤنج کے بعد ایک راہداری تھی جو بائیں طرف ایل کی شکل میں مڑ رہی تھی۔ اس میں دائیں طرف بڑا سا ڈرائنگ روم تھا اور بائیں طرف دو بیڈ روم تھے۔ آگے جہاں راہداری مڑ رہی تھی وہاں ایک بیڈ روم اور اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ میں نے نشست گاہ میں جھانکا اور پھر اس کی مخالف سمت میں واقع بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ اندر تاریکی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ ایک جہازی سائز بیڈ کے ساتھ اسی طرح کا شاندار ڈریسر اور بہت بڑی چار پٹ والی الماری تھی۔ میں نے الماری چیک کی اس کے دروازے لاک تھے چابیاں تلاش کرنے میں وقت ضائع ہوتا میں نے بلاتکلف پٹ کھینچ کر لاک توڑ دیے اور اندر موجود چیزوں کو نیچے گرانے لگا۔ مجھے بریف کیس کی تلاش تھی لیکن میں نے سامان کا وہ حال کیا جو کوئی پیشہ ور چور کر سکتا تھا۔

ذرا دیر میں میں چاروں پٹ کھول کر اس میں موجود سامان نیچے گرا چکا تھا۔ پھر میں نے الماری کے اندر موجود لاکر کو کھولا تو اس میں اندر خاصی بڑی رقم نظر آئی یہ ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں والی گڈیاں تھیں اور رقم کی مالیت کم سے کم پانچ لاکھ تھی۔ میں نے گڈیاں سمیٹ کر جیکٹ میں رکھ لیں۔ میرا ارادہ رقم چوری کا نہیں تھا لیکن میں اسے شہلا کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لاکر میں ایک بڑا سیٹ زیور کا رکھا تھا میں نے وہ بھی ڈبے سے نکال کر جیکٹ میں ڈال لیا۔ کچھ زیور مجھے ڈریسر سے ملا۔ لیکن بیڈ روم میں کہیں بریف کیس نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اور خاص چیز تھی۔ یہاں سے نمٹ کر میں نے دوسرے بیڈ روم کا رُخ کیا۔ یہ استعمال میں نہیں تھا اور یہاں کچھ نہیں ملا۔ پھر بھی میں نے اس کا بھی وہی حال کیا۔ تیسرا بیڈ روم خالی تھا۔ مزید نصف گھنٹے میں، میں نے سارا گھر چھان مارا تھا۔ میں نے دیواروں جائزہ لیا کہ اس میں کہیں کوئی خفیہ خانہ نہ ہو۔ دیواروں پر لگی تمام تصویروں کو اُتار کر پھینک دیا۔ کچن اور اسٹور روم بھی دیکھ لیا۔ کوٹھی میں تہ خانہ نہیں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ یقین کرنے کے بعد کہ بریف کیس یا بینک لاکر سے نکلنے والا بلیک میلنگ کا مواد یہاں نہیں ہے۔ میں نے وسیم کو کال کی۔ ''یہاں کچھ نہیں ہے ہمیں اسے قابو کرنا ہوگا۔''

''آپ نے مکمل تلاشی لی ہے؟''

''ایک.... ایک جگہ کی یار، میں نے گھر کے ساتھ پیشہ ور چوروں والا سلوک کیا ہے۔''

وسیم خوش ہوگیا۔ ''کیا یاد کرے گی شہلا۔''

''میرا خیال ہے اس نے اپنے اسی مکان میں سب کچھ چھپا رکھا ہوگا کیونکہ اس میں چوری چھپے داخلہ ناممکن ہے۔ مکان کو جدید ترین ڈیجیٹل سیکورٹی دی گئی ہے۔''

''یعنی ہمیں شہلا کو پکڑنا پڑے گا۔''

''بالکل اس کی واپسی تک میں اندر ہی رہوں گا۔''

''لیکن وہ مکان میں گھستے ہی ہوشیار ہوجائے گی۔''

''اچھا یاد دلایا مکان میں گھستے ہی نہیں بلکہ گیٹ پر پہنچتے ہی کیونکہ میں نے مین سوئچ آف کردیا ہے اور ڈور بیل کے ساتھ جلنے والی سرخ ایل ای ڈی آف ہوگی۔ تم ہوشیار رہنا اور جیسے ہی وہ آئے مجھے خبردار کردینا میں مین سوئچ آن کرنے جارہا ہوں۔''

میں ایک دروازے سے باہر آیا اور سایوں کی آڑ لیتا مین گیٹ تک آیا سوئچ آن کرکے میں واپس اسی راستے سے اندر آیا اور سب سے پہلے کچن کا رُخ کیا کیونکہ مجھے بھوک لگ رہی تھی دوپہر میں میں نے جو پھیکا سیٹھا کھانا کھایا تھا وہ زود ہضم بھی تھا اس لیے اب پیٹ خالی تھا۔ میں نے ایک چولہے پر فریج سے دستیاب ہونے والے انڈوں کو ابالنے کے لیے رکھا اور دوسرے چولہے پر کافی کا پانی چڑھایا۔ ڈبل روٹی تھی اور ساتھ میں پنیر مکھن سب دستیاب تھا میں نے مال مفت سمجھ کر ہر چیز کا دل کھول کر استعمال کیا۔ اس خود ساختہ ڈنر سے فارغ ہوکر میں نے وسیم کو کال کرکے باہر کا احوال لیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سفیر کو اطلاع کردوں لیکن نمبر انگیج جانے کا سوچ کر میں نے یہ کام وسیم کے سپرد کردیا۔ جیسے ہی وسیم سے بات کرکے کال کاٹی فوراً ہی اسکرین روشن ہوگئی سویرا کا نام جگمگا رہا تھا لیکن کال منحوس صورت فتح خان کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔

''فتح خان کیا بات ہے میں ذرا مصروف ہوں۔''

''میں جانتا ہے تمہاری مصروفیت....'' اس نے کہا تو ایک لمحے کو میں سمجھا کہ وہ جان گیا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ ''تم آج کل مرشد کے چکر میں ہے۔''

''وہ تو تم بھی ہو'' میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''بلکہ شاید نادر کے چکر میں بھی ہو۔''

میری جوابی کارروائی پر اسے بھی ایک لمحے کو سانپ سونگھ گیا تھا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ''نادر... اس سے میرا کیا تعلق...؟''

''یہ تو تمہیں ہی معلوم ہوگا لیکن تم اتنا تو جانتے ہو کہ وہ ایسا سانپ بن گیا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو اور صرف اپنی جگہ پڑا تلملا سکتا ہے۔''

''میں نہیں جانتا اس کے بارے میں۔'' فتح خان نے صاف انجان بن کر کہا۔ وہ اچھا اداکار تھا اگر اسے توقع ہوتی کہ میں نادر کے بارے میں پوچھوں گا تو وہ پہلے سے سوچ کر جواب دیتا اور مجھے شک بھی نہ ہوتا لیکن جلدی میں اس کا لہجہ مصنوعی ہوگیا تھا۔

''تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں اب کام کی بات کرو۔''

''تم نے گورا لوگ سے بات کیا؟''

''وہ مجھے منہ لگائیں گے تو میں بات کروں گا اور میں کس منہ سے ان سے بات کروں جبکہ میری اپنی پوزیشن مشکوک ہے۔''

''تم چاہے تو کرسکتا ہے۔'' فتح خان نے کسی قدر معنی خیز انداز میں کہا۔

''کس سے؟''

''ڈیوڈ شا سے۔''

''ڈیوڈ شا سے کس خوشی میں؟''

''کیونکہ ڈیوڈ شا اگر چاہے تو اپنا حکومت کو راضی کرسکتا ہے۔''

''تب تم اس سے بات کیوں نہیں کرلیتے... تم ایک زمانے میں اس کے دست راست رہے ہو اور تمہیں شاید اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ انگریز اُلٹے ہاتھ کا وہ استعمال نہیں کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں۔''

فتح خان شاید میری بات سمجھا نہیں تھا اس نے کہا۔ ''میں اس کا ملازم تھا اس سے اس طرح بات نہیں کرسکتا۔ تم اس سے برابر سے بات کرسکتا ہے۔''

''تم اس سے برابر سے بات نہیں کرسکتے لیکن اس کی بھتیجی کو ٹریپ کرکے اس کا تاوان مانگ سکتے تھے۔''

''وہ دوسرا بات ہے اور ڈیوڈ شا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا ایمن اس کا دشمن ہے۔''

''تب تو اس کی خواہش ہوگی کہ اس کی جیکٹ صحیح سالم نہ اُترنے پائے۔''

''ہاں اس کا خواہش تو یہی ہوگا لیکن تم نہیں جانتا اس کا سب سے بڑا خواہش کیا ہے اگر وہ پورا ہونے کا چانس نظر آئے تو وہ ایمن کو چھڑوا سکتا ہے۔''

میں فتح خان کی بات سمجھ رہا تھا اور اس سے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اس سارے کھیل کے پیچھے ڈیوڈ شا تو نہیں ہے۔ مگر فتح خان کے لیے ہیرے اور پانچ کروڑ ڈالرز کی رقم معمولی نہیں تھی اور ڈیوڈ شا یقیناً اسے اتنا معاوضہ نہیں دے سکتا تھا۔ فی الحال میں نے اس خیال کو مسترد کردیا لیکن فتح خان کی بات میں وزن تھا۔ ڈیوڈ شا وادی کے چکر میں تھا اور اس کے لیے میرے چکر میں تھا اس لیے اگر میں ایمن کی خاطر اس سے بات کرتا تو وہ کم سے کم میری بات سن سکتا ہے اور ہوسکتا تھا اس کے بعد تصفیے کی بھی کوئی صورت نکل آتی۔ مگر میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے دشمنوں میں ایک وہی تھا جو اس وقت خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اسے چھیڑنا سوئے ہوئے اژدے کو چھیڑنے کے برابر تھا۔

''فتح خان تم ڈیوڈ شا کی بات چھوڑو اپنی بات کرو۔ تم اپنے مطالبے میں لچک کرو تو ممکن ہے تمہیں تاوان مل جائے۔''

''میں اپنے مطالبے میں کمی تو اس وقت کرے جب دوسرا طرف سے اس کا بات کیا جائے۔'' فتح خان کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اتنا.... نکلے گا۔''

اس نے بڑی مہارت سے خالی جگہ میں ایک گالی فٹ کی تھی۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ تہلکہ مچ جائے گا۔''

''میں تم سے متفق ہوں لیکن برٹش حکومت کے رویّے سے مجھے بھی بہت مایوسی ہوئی ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ میں گوروں کو بھنبھوڑنے کے لیے کیا کام کرچکا تھا۔

''اگر یہ میرے کو رقم نہیں دے گا تو میں ایمن کو نہیں چھوڑے گا۔''

''فتح خان اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے یہ سب تم اپنے لیے نہیں کررہے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''تم یہ کام ڈیوڈ شا کے لیے کررہے ہو'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ فتح خان حیران ہوا۔

''تمہارا مطلب ہے میں پانچ کروڑ ڈالرز کا ڈراما کررہا ہے۔''

''فتح خان شاید تمہیں بھی پتا ہے تمہیں پانچ کروڑ ڈالرز نہیں مل سکتے ہیں لیکن ایمن ضرور اپنی جان سے جاسکتی ہے

میرے عظیم قائد!

سلام مسنون، بصد آداب۔

آج میں اپنی قوم کو کیسے بتاؤں کہ آپ کیا تھے اور اب ہم کیا ہوکے رہ گئے ہیں۔ ہم کہ جن کا نہ تو دعا پر ایمان رہا، نہ ہی راہ عمل پر یقین محکم۔ نظم کی خو رہی نہ وفا کی بو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو صرف ایک فرعون سے اپنی قوم کو نجات دلائی مگر آپ کے مقابل کئی فرعون تھے۔ میکاولی کے پیرو صاحب اقتدار فرنگی۔ چانکیہ کے پجاری مکار اہلِ ہنود۔ کوتاہ نظر متعصب ملّا۔ خود پرست وجاہ پرست مسلم امرا۔ ان بھیڑیا صفت فراعین کے نرغے میں چومکھی لڑنا اور پھر جذبۂ ایمانی کے ساتھ یقین، اتحاد اور نظم کی بنیاد پر غالب آنا، وہ بھی انتہائی قلیل وقت میں۔ اس معجزے سے کس کا فر کو انکار ہوسکتا ہے۔ ارضِ پاک پاکستان کا نظریاتی وجود اس معجزے پر دال ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا۔

لیکن میرے عظیم قائد۔ آج میں اور میری نسل کے لوگ یقین، اتحاد اور نظم سے محروم ہوچکے ہیں، یکسر محروم۔ اور آپ جیسے معجزہ نما راہ نما کی تلاش میں دیوانہ وار بھٹک رہے ہیں، آج کے فرعون کسی جناح کو نہ پاکر پھر کھیل رہے ہیں۔ نہتکوں بھرے بھنور اور سیلاب میں گھری قوم کی کشتی پھر کسی مخلص و جرأت مند ملاح یعنی جناح کی منتظر ہے۔ بھیڑیوں کے نرغے میں پھنسی ملت بیضا اپنے میرِ کارواں کی راہ تک رہی ہے۔ ہاں، وہی ملت کا پاسباں محمد علی جناح جس کے نہ جھکنے، نہ بکنے پر اپنے پرائے سب کا اٹل یقین تھا اور آپ کے کردار و یقین کی شمشیر خارا شگاف نے غلامی کی تمام زنجیریں کاٹ کے رکھ دیں۔ آزادی کا سورج طلوع ہوا مگر آج یہ سورج گہنا گیا ہے۔ فراعین وقت کی سیاہ کاریوں، اندھے تعصب اور ستم کاریوں نے اندھیر مچا رکھا ہے بالکل اسی طرح کا اندھیر جس میں آپ روشنی کا استعارہ بن کر چمکے تھے اور اس خالص اور پاکیزہ روشنی کے گرد قوم پروانہ وار جمع ہوگئی تھی اور دیوانہ وار قربانیوں پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن آج ظاہری اور مصنوعی روشنیوں کی چکاچوند نے قوم کو گمراہ کررکھا ہے۔ جھوٹے خود غرض راہ نماؤں کے ہاتھوں زخم پہ زخم کھانا۔ راہ بر کو نہ پہچان سکنا، اس معصوم قوم کا مقدر بن کے رہ گیا ہے۔

اس لیے کہ آج کوئی جناح خضر راہ نہیں۔ نہ محمد علی جناح نہ محترمہ فاطمہ جناح۔

تو پھر دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اے اللہ! ہمیں آج پھر جناح جیسا راہ نما عطا فرما۔ (آمین)

مرسلہ: محمد ایاز راہی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس میں بھی صرف ڈیوڈ شا کا فائدہ ہو سکتا ہے۔"

فتح خان یوں چپ ہوا جیسے میں نے اسے لاجواب کر دیا ہو لیکن کچھ دیر بعد اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "یہ تمہارا سوچ ہے شہباز خان۔"

"ممکن ہے.... لیکن تم خود سوچو اگر برٹش حکومت نہیں مانتی ہے تو ایمن ماری جائے گی اور فائدہ ڈیوڈ شا کا ہوگا۔ اس کی جاگیر اور خطاب کے لیے واحد خطرہ بھی ٹل جائے۔ اگر میں ایمن کو بچانے میں کوئی کردار ادا کرتا ہوں اور اس کے بدلے مجھے ڈیوڈ شا کی کوئی بات ماننی پڑے تب بھی فائدہ اسی کا ہوگا۔"

"یہ تمہارا سوچ ہے میں نے تم کو ڈیوڈ شا سے بات کرنے کا اس واسطے نہیں کہا تھا۔"

"فتح خان' میرا خیال ہے تمہیں اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ملے گا سوائے ایک گناہ بے لذت کے اور بین الاقوامی ایجنسیاں ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے تم ایمن کو چھوڑ دو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "بیشک کچھ بھی ہو فتح خان کسی سے ڈرنے والا نہیں ہے۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کس سچویشن میں تھا اور میں اتنی دیر سے اس سے بات کر رہا تھا اگر شہلا آ جاتی اور وسیم مجھے آگاہ کرنا چاہتا تو میرا نمبر اسے انگیج ملتا۔ میں نے عجلت میں کہا۔ "فتح خان میں مصروف ہوں تم سے پھر بات کروں گا۔"

اس کی بات سنے بغیر میں نے لائن کاٹ دی تھی۔ موبائل رکھ کر میں نے سامنے والی کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ فی الحال وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اگر اس دوران میں شہلا آ جاتی تو ممکن ہے اس کے اندر آنے کے بعد مجھے اس کی آمد کا پتا چلتا اور اس وقت تک وہ مجھے ہینڈز اپ کرا چکی ہوتی یا گولی مار چکی ہوتی۔ میں کھا پی کر فارغ ہو گیا تھا اور اب مجھے وسیم کا خیال آیا وہ بے چارہ بھوکا بیٹھا تھا لیکن میں اسے سینڈوچز پیش کرنے نہیں جا سکتا تھا اس دوران میں شہلا آ جاتی یا کوئی اور اس آمد و رفت کو نوٹ کر لیتا تو ہم مشکل میں پڑ جاتے اس لیے میں نے اپنی جگہ رہنا مناسب سمجھا رات کے نو بجنے والے تھے۔ شہلا پتا نہیں کہاں اور کتنی دیر کا ارادہ لے کر گئی تھی؟ کم سے کم رات کا کھانا وہ باہر ہی کھاتی اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کے بعد بھی اس کا کہیں باہر شب بسری کا ارادہ ہو۔ وہ کوئی گھریلو عورت نہیں تھی جسے گھر واپس آ کر چولہے ہانڈی کی فکر ہوتی دوسرے وہ آزاد خیال تھی اور ممکن ہے اس کا ارادہ رات کہیں

وہ منتظر تھے کہ میں باہر آؤں تو وہ مجھ پر بھی قابو پا لیں۔ میں نے دوبارہ عبداللہ کو کال کر کے وسیم کے ساتھیوں کی خاموشی کی اطلاع دی۔ وہ فکرمند ہو گیا۔ "جناب باہر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے آپ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر لیں۔"

"عبداللہ میں ایک گھر میں گھسا ہوا ہوں اور زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا اگر انہوں نے پولیس کو کال کر دی۔"

"ہم پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ کو بس اتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

"دیکھو دشمن اتنی مہلت دیتے ہیں یا نہیں...." میں نے کہا اور کال کاٹ کر.... نشست گاہ کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے کہیں سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور کوئی چیز اندر آ کر گری۔ میں نے ٹارچ کا رُخ اس کی طرف کیا تو فرش سے دھواں سا اُٹھتا دکھائی دیا میں پلٹ کر بھاگا۔ باہر سے گیس بم پھینکا گیا تھا لیکن اس سے پہلے گیس گھر کے دوسرے حصوں تک جاتی میں نے نشست گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ مگر فوراً ہی دوسری کھڑکیوں سے ایسے ہی گیس کے بم اندر گرے تھے۔ گیس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ایک منٹ سے بھی پہلے گیس دوسرے کمروں میں بھی پھیل چکی تھی۔ میں سانس روکے ایک باتھ روم میں گھسا۔ وہاں موجود ٹاول بھگو کر منہ پر رکھ لیا مجھے لگا تھا کہ یہ آنسو گیس جیسی کوئی چیز ہے لیکن جیسے ہی میں نے سانس لی۔ میرا ذہن چکرایا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ آنسو گیس نہیں تھی۔ یہ کوئی زود اثر گیس تھی جو بھیگے ہوئے تولیے سے بھی گزر کر اثر کرتی ہے۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے آخری کام یہ کیا کہ جیب سے موبائل نکال کر کموڈ میں ڈال دیا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ تاکہ یہ آنے والوں کے ہاتھ نہ لگ سکے اگر لگے بھی تو بیکار ہو جائے۔ یہ کام کرنے کے بعد میں ایک طرف دیوار سے ٹک گیا اور پھر شاید نیچے گر گیا کیونکہ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

فتح خان میرا وہ دشمن تھا جو تواتر سے میرے پیچھے رہا تھا اس سے دشمنی میں اونچ نیچ بھی ہوتی رہی تھی۔ لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے اس کی دشمنی میں ایک چونکا دینے والا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سمت سے وار کرتا تھا جس طرف میرا دھیان نہیں جاتا تھا ہمیشہ اس وقت میرے پیچھے آتا تھا جب میں نے اس بارے میں سوچا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ہوتے کاموں میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ لیکن اس بار ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اس کے پھیلائے جال میں پھنس گیا تھا۔ شہلا کی اس گھر میں موجودگی اور پھر ہمیں اس کی اطلاع ملنا ایک جال تھا۔ ہم نہایت ہوشیاری سے اس جال میں آن پھنسے تھے۔ یہ

اس دور کے سائنس دانوں کا نظریہ یہ ہے کہ زمین کے حجم میں آہستہ آہستہ کمی ہو رہی ہے۔ فلکیات کے مشہور ماہر سر جیمز جینیز (1877-1946ء) کا خیال ہے کہ آغاز میں ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زور کشش سے سورج کا ایک ٹکڑا کٹ کر دور خلا میں گھومنے لگا اور زمین کہلایا۔ شروع میں زمین کا درجہ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے' رفتہ رفتہ زمین ٹھنڈی ہونے لگی اور اب تک ہو رہی ہے۔ جب یہ گرم تھی تو اس کا حجم زیادہ تھا' ٹھنڈی ہو جانے کے بعد یہ سکڑنے لگی اور سکڑتی چلی جا رہی ہے۔

یہ بات آج سے ایک ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے لوگوں کے تصور میں نہیں آ سکتی تھی لیکن قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے سکیڑتے چلے جا رہے ہیں؟"

(الرعد 41:13)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام اسرار جو جدید سائنس کو اس دور میں معلوم ہوئے' قرآن مجید میں کس طرح بیان ہو گئے؟ وہ کون ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آج سے چودہ سو سال پہلے یہ باتیں بتا دیں جبکہ دوربینیں تھیں' نہ سائنسی تحقیق و تفتیش کے آلات تھے۔ ہر سمجھ دار انسان یہ بات اچھی طرح جان سکتا ہے کہ یہ باتیں قرآن مجید میں انسانی تخیل کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ اللہ اور صرف اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کی خبریں ہیں' وہ فرماتا ہے۔

"اے نبی! کہہ دیجئے اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے۔"

(الفرقان 6:25)

یہ تمام حقائق جن سائنس دانوں کو آج معلوم ہوئے' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چودہ سو سال قبل معلوم تھے یہ اپنی جگہ حجت قاطعہ ہیں اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے وجود اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر روشن دلائل ہیں جن کا کوئی ہوشمند انسان انکار نہیں کر سکتا۔

اقتباس: "اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات"
از آئی اے ابراہیم' حسن فارانی
انتخاب: اظہر جمیل صدیقی' کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لازمی تھا کہ خالی مکان دیکھ کر ہم اندر گھسیں گے اور پکڑے جائیں گے۔

لیکن صرف میں اندر آیا تو انہوں نے تبدیل شدہ پلان کے ساتھ پہلے وسیم اور دوسروں کو گھیرا اور پھر جب میں نے باہر آنے کے بجائے مدد طلب کی تو انہوں نے راست اقدام کیا۔ گھر میں یقیناً مائکروفون لگے تھے اور میری باتیں کہیں باہر سنی جارہی تھیں۔ فتح خان نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا تھا وہ میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کیوں کھیل رہا تھا؟ میں سمجھنے سے قاصر تھا اس نے سویرا کو اتنے جتن اور خطرات مول لینے کے بعد اغوا کیا اور پھر حویلی پہنچا دیا۔ اگر اسے مجھ پر قابو پانا ہوتا تو سویرا کو اپنے قبضے میں رکھنا بھی کافی ہوتا۔ کیا سویرا کو اس طرح اغوا کر کے حویلی پہنچانا اس کا ذاتی فعل تھا؟ اور مجھے ٹریپ کر کے پکڑنے کا کام وہ دوسروں کے ساتھ مل کر کسی کے لیے کر رہا تھا؟ ان سارے سوالوں کے جواب مجھے آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔

☆☆☆

ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو ایک صاف ستھرے لیکن سادہ بستر پر پایا۔ کمرا خالی تھا یعنی اس میں سوائے اس بستر کے اور کچھ نہیں تھا جس پر میں استراحت فرما رہا تھا۔ ذہنی اور جسمانی حالت ٹھیک تھی کہیں کوئی تکلیف یا چکر وغیرہ نہیں تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی آزاد تھے ویسے عام طور سے دشمن کی قید کی مجھے اچھی حالت میں ہی ہوش آتا رہا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد بُری حالت سے بھی گزرنا پڑا ہو۔ اس بار بھی دشمنوں نے مجھے اچھی حالت میں رکھا تھا۔ خود کو اکیلے پا کر میں نے اطمینان محسوس کیا تھا کیونکہ امکان یہی تھا کہ انہوں نے وسیم اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا ہوگا ورنہ وہ بھی یہاں میرے ساتھ ہوتے۔ مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کہیں اور رکھے گئے ہوں۔ ایک بات یقینی تھی کہ میں ایک بار پھر فتح خان کی گرفت میں آگیا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد مجھے ایک زبردست ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ دروازہ کھلا اور پہلے دو چاق و چوبند مسلح افراد اندر آئے انہوں نے چھوٹے سائز کی لیکن تباہ کن شارٹ گن اُٹھا رکھی تھیں۔ ان کا بلٹ گردن سے ٹانگوں اور بازوؤں کے علاوہ کہیں بھی لگے جان لیوا ہوتا ہے۔ انہوں نے کمرے کے دونوں کونوں میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے حرکت میں آتے ہی وہ فائر کر دیں گے۔ اس لیے میں نے حرکت میں آنے سے گریز کیا اور استہزائیہ انداز میں بولا۔

"کیا کسی اسٹریٹ وار کا امکان ہے؟"

"نہیں یہ تمہیں کسی غلط حرکت سے روکنے کے لیے ہے۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی اور میں اُچھل پڑا تھا۔ دروازے پر ایک وہیل چیئر میں نادر علی موجود تھا۔ اپنی معذوری سے قطع نظر وہ صحت مند اور ہٹا کٹا نظر آرہا تھا لیکن وہیل چیئر بتا رہی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ہتھیوں پر رکھے تھے اور ایک بیلٹ اس کے پیٹ سے ذرا اوپر بندھی تھی جیسے اسے سہارا دے کار ہو۔ اس کا مطلب تھا وہ بغیر سہارے کے وہیل چیئر پر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے عقب میں ایک خوب صورت لڑکی تھی جو نرس کی یونیفارم میں تھی۔ پتا نہیں سچ مچ نرس تھی یا نادر نے اسے اپنی تسکین طبع کے لیے رکھا ہوا تھا نرس کی وردی پہنا کر۔ میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ نادر کے مکروہ ہونٹوں پر مخصوص شیطانی مسکراہٹ تھی۔ "کیا بات ہے شہباز ملک مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو ابھی تک پہنچا نہیں۔"

"شیطان کسی بھی روپ میں ہو میں اسے پہنچان سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور آلتی پالتی مار کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "ویسے تمہیں یہ لاؤ لشکر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہیں خدشہ تھا کہ اس بار میں تمہاری گردن توڑوں گا۔"

میرے جواب اور لہجے پر اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپکا تھا لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پالیا۔ "شہباز .... تم نے ہوش میں آنے کے بعد اندازہ لگا لیا ہوگا کہ فی الحال تم غیر دوستانہ ماحول میں نہیں ہو۔"

"فی الحال۔" میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ "یعنی ماحول بدل بھی سکتا ہے؟"

"اس کا انحصار تم پر ہے۔"

"مجھ پر کیسے میں تو تمہاری قید میں ہوں، ویسے میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کام فتح خان کا ہوگا۔"

"کام فتح خان نے ہی کیا ہے۔" نادر بولا۔ "لیکن میرے لیے کیا ہے۔"

"تمہیں کیا ضرورت پیش آگئی مجھے اغوا کرانے کی؟ تم میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہو تمہیں تو چاہیے تھا اسی جگہ مجھے مروا دیتے یا پھر تم اپنے سامنے مجھے مرتا دیکھنا چاہتے ہو؟"

نادر دروازے سے ذرا ہی اندر آیا تھا اور وہ بالکل محفوظ جگہ تھا۔ میں اگر اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو بستر سے اُترنے سے پہلے اس کے محافظ مجھے شوٹ کر دیتے۔ یعنی اسے مجھ پر قطعی اعتبار نہیں تھا کہ موقع ملنے پر میں اسے بخش دوں گا۔ وہ میرے لیے اس سے کہیں زیادہ بے اعتبار تھا اس لیے یہ جان کر مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نادر کی قید میں تھا

اور اب تک ٹھیک ٹھاک تھا۔ نہ تو مجھے اُلٹا لٹکا کر ہنٹروں سے مارا گیا تھا اور نہ ڈنڈوں سے میری ہڈیاں توڑی گئی تھیں۔ اس کے بجائے میں ایک آرام دہ بستر پر موجود تھا۔ نادر نے نفی میں سر ہلایا۔

"میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے اور میں نے کہا نا ماحول خراب ہونے کا انحصار تمہارے رویّے پر ہے۔ میں نے بات کرنے کے لیے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "نہ جانے آج کل دشمنوں کو کیا ہو گیا جس کا بات کرنے کو دل چاہتا ہے مجھے اُٹھوا لیتا ہے۔"

"مجبوری ہوتی ہے کیونکہ تم سے رابطے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔" نادر علی نے کہا۔

"حیرت ہے تمہارے حکم کے غلام فتح خان نے تمہیں نہیں بتایا کہ اس کا مجھ سے مستقل رابطہ ہے۔"

نادر نے انکار کیا۔ "فتح خان میرا ملازم نہیں ہے اس نے مجھے معاوضے پر یہ کام کر کے دیا ہے اگر اس کا تم سے کوئی رابطہ ہوتا تب بھی اسے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ فتح خان اور تمہارا آپس میں کوئی گٹھ جوڑ نہیں ہے اور وہ صرف عارضی طور پر تمہارے لیے کام کر رہا ہے۔"

"یہی بات ہے۔"

"تم ایک ایسے شخص سے کام لے رہے ہو جو تمہارے سگے بھائی مرشد کا دشمن بنا ہوا ہے اور اسے بے پناہ نقصان پہنچا چکا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" نادر کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "میرا خیال ہے تم بھی بے خبر نہیں ہو کہ مرشد سے میرے اختلافات شدت اختیار کر گئے ہیں اور بھائیوں والی بات ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ اب مرشد کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں جلد از جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔"

"تم دونوں آپس میں دشمن بن گئے ہو؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے صرف شانے اُچکائے۔ "یہ الگ موضوع ہے۔"

"ٹھیک ہے جو موضوع اس وقت مناسب ہو اس پر بات کرنی چاہیے مثلاً مجھے یہاں کیوں بلوایا گیا ہے؟"

"میں دشمنی ختم کرنا چاہتا ہوں۔" نادر نے صاف لہجے میں کہا۔

"یہ بات تمہارے بھائی نے بھی کی تھی۔"

"مرشد۔" اس کے لہجے میں نفرت آگئی۔ "وہ کمینہ آدمی ہے وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔"

"اور تم شریف آدمی ہو۔" میں ہنس پڑا۔ "مجھے کہے الفاظ کا پاس رکھو گے ورڈ آف آنر کا خیال رکھو گے۔"

"میں شریف آدمی نہیں ہوں۔" نادر کا چہرہ بگڑ گیا۔ "شہباز سنجیدہ ہو جاؤ تم اس وقت بڑی مشکل میں ہوں۔"

"جب سے تمہاری صورت دیکھی ہے کسی چھوٹی مشکل کا سامنا نہیں کیا ہے۔ بہر حال تم کہتے ہو تو میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔"

"میں دشمنی کے اس باب کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

کیونکہ میں اس سے سنجیدہ رہنے کا اقرار کر چکا تھا اس لیے میں نے مذاق اُڑانے سے گریز کیا اور پوری سنجیدگی سے کہا۔ "نادر تمہاری بات میری لیے اتنی ہی ناقابلِ یقین ہے جتنی کسی زہریلے سانپ کی جو کہے میں نے ڈسنا چھوڑ دیا ہے۔"

اس کا چہرہ پھر بگڑا تھا لیکن اس نے جلدی سے خود کو سنبھال لیا۔ "شہباز ابھی میں تمہیں یقین نہیں دلا سکتا ہوں، لیکن جلد وقت آئے گا جب تم میری بات پر یقین کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے بہ شرط کہ تم جہاں جا رہے ہو وہاں سے زندہ واپس آسکو۔"

میں چونکا۔ "ایک منٹ .... میں کہاں جا رہا ہوں؟"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔" اس نے کہا اور نرس کو اشارہ کیا اس نے وہیل چیئر گھمائی اور نادر کو وہاں سے لے جانے لگی۔ میں نے کہا۔

"ایک منٹ نادر میرے ایک سوال کا جواب مل سکتا ہے؟"

نادر کے اشارے پر وہیل چیئر رک گئی لیکن، وہ مڑا نہیں۔ "پوچھو۔"

"میرے ساتھ میرے تین ساتھی اور تھے، وہ کہاں ہیں؟"

"یہاں صرف تم آئے ہو۔" اس نے جواب دیا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس کے دونوں گرگے بھی اسی مستعد انداز میں اُلٹے قدموں کمرے سے نکلے اور دروازہ بند ہو گیا۔ نادر کے جواب سے بالکل واضح نہیں تھا کہ میرے ساتھی سرے سے نہیں لائے گئے تھے یا ان کو اُٹھا لیا تھا لیکن رکھا کہیں اور تھا۔ دروازے کے سامنے دیوار تھی۔ میں کہاں تھا اور کتنی دیر بے ہوش رہا تھا؟ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ کمرے کا درجہ حرارت نارمل تھا اور مجھے اپنے لباس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرے لباس سے ہر چیز نکال لی گئی تھی۔ میری کلائی سے گھڑی بھی اُتار لی تھی۔ البتہ میرے پیروں میں جوتے تھے۔ میں نے اپنے بازوؤں کا جائزہ لیا پھر جسم کے دوسرے حصوں میں تکلیف محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اگر میری بے ہوشی کو طویل رکھنے کے لیے مجھے انجکشن دیا گیا تھا تو مجھے سوئی کی چبھن محسوس ہوتی۔

لیکن ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی اس کا مطلب تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے بعد ہوش میں آ گیا تھا اور ابھی صبح کا وقت تھا۔ شاید پانچ یا چھ بجے تھے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے ڈٹ کر انڈے پنیر کے سینڈوچز کھائے تھے اس لیے پیٹ خالی ہونے کا احساس تھا لیکن بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں ورزش کرنے لگا۔ پہلے پنجوں کے بل اُچھل کر جسم کو گرم کیا پھر مختلف ورزشیں کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد میں تھک گیا تھا اور پسینا آ گیا تھا۔ لیکن سانس قابو میں تھا۔ مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ میرا اسٹیمنا بہتر تھا۔ ورزش سے دبی ہوئی بھوک چمک اُٹھی تھی مگر دشمن کی قید میں طعام کی امید رکھنا بے وقوفی ہوتی۔ اگرچہ مجھے کوئی تکلیف نہیں دی گئی تھی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ میری خاطر تواضع کرتے۔

جب میری تھکن اُتر گئی تو میں نے دوبارہ ورزش کی اس بار بھی نصف گھنٹے تک جاری رکھی اور جب تھک گیا تو لیٹ کر ستانے لگا۔ اس ایک گھنٹے کی ورزش نے مجھ پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اوّل میں فضول سوچوں سے بچ گیا تھا اور دوسرے جسمانی لحاظ سے بہترین کنڈیشن میں آ گیا تھا۔ اگر مجھے موقع مل جاتا اور فرار ہونا پڑتا تو میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا تھا۔ فتح خان اور نادر کا گٹھ جوڑ بڑی جلدی سامنے آ گیا تھا۔ اگرچہ نادر نے انکار کیا تھا کہ فتح خان اس کا ساتھی ہے لیکن مجھے یقین تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ فتح خان بڑے چکر میں تھا وہ کسی بھی معاوضے کے بدلے نادر کے لیے کام نہیں کر سکتا تھا۔ شاید نادر نے اسے کسی طرح مدد دی ہو۔ آدمیوں اور دوسرے طریقوں سے مدد کی اور جواب میں فتح خان اس کے کام آ رہا تھا۔ مجھے ایمن کا خیال آیا جس کے پاس اب شاید پچاس پچپن گھنٹوں کی مہلت باقی رہ گئی تھی۔

میری فتح خان سے جو گفتگو ہوئی تھی اس میں ڈیوڈ شا کا ذکر بھی آیا تھا اور یہ بے سبب نہیں تھا۔ فتح خان نے کمزور انداز میں انکار کیا تھا کہ اس کا ڈیوڈ شا سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اس معاملے میں کہیں نہ کہیں شامل ہو چکا تھا۔ فتح خان کو مجھ سے براہِ راست اُلجھنے کی ضرورت نہیں تھی اور نادر علی مجھے کسی صورت بخشنے والا نہیں تھا لیکن دونوں کا رویہ میری توقع کے خلاف تھا۔ اس کے پیچھے ڈیوڈ شا کی موجودگی فرض کر لی جاتی تو دونوں کے رویّے کا جواز سمجھ میں آتا تھا۔ یعنی کھیل ڈیوڈ شا کا تھا لیکن کھیل فتح خان اور نادر رہے تھے۔ ڈیوڈ شا کی وجہ سے وہ مجبور ہوئے تھے۔ فتح خان میرے ساتھ پنگا لینے پر مجبور ہوا تھا جبکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ نادر علی مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا اور ڈیوڈ شا کی وجہ سے صرف خون کے گھونٹ پی کر رہ جانے پر مجبور ہوا تھا۔ ایمن کے ساتھ ہونے والے واقعے کا فائدہ اُٹھا کر ڈیوڈ شا معاملے میں ملوث ہو سکتا تھا مگر ساتھ ہی اپنی موجودگی کو پوشیدہ بھی رکھ رہا تھا۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے ناشتے کی ٹرے اندر رکھ دی۔ اس سے پہلے میں بستر سے اُٹھتا وہ نہایت پھرتی سے دروازہ بند کر چکا تھا۔

میں نے ٹرے اُٹھائی اس میں ایک عدد اُبلا ہوا انڈا، دو عدد سادہ توس اور چائے کا ایک مگ تھا۔ طلب کے لحاظ سے رسد نہ ہونے کے برابر تھی لیکن قیدی کو اپنی مرضی اور حساب کا مینو چننے کی اجازت کہاں ہوتی ہے؟ یہ میری بھوک کا تہائی بھی نہیں تھا لیکن مجھے اسی پر گزارا کرنا تھا۔ میں نے صبر شکر کر کے یہ ناشتا کیا۔ آدھے گھنٹے بعد دوبارہ دروازہ کھلا اور اس بار ان دو مسلح افراد کی صورت دکھائی دی جو نادر کے ساتھ آئے تھے ان کے ہاتھوں میں شارٹ گن تھیں۔ پہلی بار میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے سیاہ رنگ کی بھاری پتلون اور سیاہ ہائی نیک جرسی پہن رکھی تھی اس کے اوپر بغیر بازو کی سیاہ کمانڈو جیکٹ تھی۔ اپنے انداز اور حلیے سے وہ کمانڈو ہی لگ رہے تھے۔ ایک نے گن سے اشارہ دے کر کہا۔ ”باہر آؤ دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ میرے باہر آتے ہی وہ دائیں بائیں ذرا پیچھے ہو گئے تھے۔ یہ راہداری تھی جس کے دونوں طرف کئی کمرے تھے۔ ساخت سے بالکل پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کس مکان کا حصہ ہے؟ اور کس فلور پر ہے؟ میں اشارے پر آگے چل پڑا تھا۔ راہداری آگے سے گھوم رہی تھی۔ مجھے ایک دروازے کے سامنے روک کر کہا۔ ”یہ واش روم ہے اگر تم چاہو تو ضروریات سے فارغ ہو سکتے ہو اب تمہیں لمبے سفر پر جانا ہے۔“

ایک سفر کا حوالہ نادر نے بھی دیا تھا کیا یہ بھی اسی سفر کی بات کر رہا تھا؟ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”کہیں

ہمیشہ کے سفر پر تو روانہ نہیں کر رہے ہو؟“

”جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”تم لوگوں کے انداز سے ایسا لگ رہا ہے اس لیے میں نے پوچھ لیا۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا مگر اس بار وہ خاموش رہے تھے۔ اب مجھے اپنے خیال پر ترمیم کرنا پڑی تھی۔ ان آدمیوں کا تعلق نادر سے نہیں تھا وہ خود چھچھورا اور اوچھی طبیعت کا مالک تھا اس لیے اپنے آس پاس لوگ بھی ایسے ہی رکھتا ہوگا۔ یہ دونوں بہت ٹھنڈے مزاج کے اور پیشہ ور لگ رہے تھے۔ واش روم چھوٹا سا تھا اور صاف ستھرا تھا۔ عمارت کا جتنا حصہ میں نے دیکھا تھا وہ صاف ستھرا اور خاموش تھا جیسے یہاں زیادہ لوگ نہ رہتے ہوں۔ میں نے ایک بات اور نوٹ کی تھی کہ کہیں آس پاس.... ایسی کوئی آواز نہیں تھی جو آبادیوں میں آتی ہیں ایسا لگ رہا تھا کہ یہ عمارت کسی آبادی میں بھی تھی تو بہت بڑے پلاٹ پر تھی اور آس پاس بھی ایسی ہی عمارتیں تھیں۔

ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے منہ ہاتھ دھویا اور وہاں موجود کنگھے سے اپنے لمبے ہو جانے والے بے ترتیب بال درست کیے۔ واش روم میں اندر کی طرف کنڈی نہیں تھی یہ صرف خودکار طریقے سے بند ہو جانے والے ہینڈل پر مشتمل تھا۔ جیسے ہینڈل گھما کر دونوں طرف سے کھولا جا سکتا تھا۔ میں باہر آیا تو وہ پہلے کی طرح مستعد تھے انہوں نے اپنے نرغے میں لیا اور اسی راہداری میں لے کر آگے چلنے لگے۔ وہ مستعد اور چوکنا تھے لیکن عام مسلح لوگوں کی طرح اعصاب زدہ نہیں تھے۔ ان کے ہاتھ ٹریگر پر نہیں تھے لیکن اس سے زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک دروازہ تھا اسے کھولا تو میں نے خود کو ایک بند گیراج میں پایا۔ وہاں ایک پرانی ساخت کی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی اس کے پاس ایک چھوٹی سیاہ لیکن جدید اور طاقتور جیپ کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک نے اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھولا اور میری طرف دیکھا۔

”اندر داخل ہو جاؤ۔“

میں قدم مضبوطی سے جما کر کھڑا ہوا۔ ”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو....“

وہ ہر قسم کی صورتِ حال کے تیار تھے اس لیے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میری کمر.... پر عقب سے لات پڑی اور میں بے ساختہ آگے گیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر دروازے کے پاس کھڑے محافظ کی شارٹ گن پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے صفائی سے گن پیچھے کی اور گھوم کر مجھے نسبتاً ہلکی لات ماری جس نے میری رفتار میں اضافہ کیا اور میں عقبی خانے میں جا گرا فوراً ہی دروازے بند ہوئے اور باہر سے لاک بھی ہو گئے کیونکہ میری چلائی جوابی لات بے سود ثابت ہوئی تھی۔ خانہ بند ہو چکا تھا۔ انہیں پہلے ہی اندازہ تھا کہ میں مزاحمت کروں گا اس لیے وہ تیار تھے اور انہوں نے بغیر محنت کیے مجھے اس ڈبے میں بند کر دیا۔ میری لات خاصی قوت سے دروازے پر لگی تھی۔ مگر اس کی دھات میں ذرا بھی لرزش نہیں ہوئی تھی۔ میں نے آج تک کسی اسٹیشن ویگن میں اس قسم کا خانہ نہیں دیکھا تھا یہ خاص طور سے قیدیوں کو لانے لے جانے کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔

یہ حصہ اندر سے بالکل کسی ٹھوس فولادی بکس کی طرح تھا اس میں چاروں طرف موٹی چادر چڑھی تھی اور اسے کسی صورت توڑا نہیں جا سکتا تھا شاید یہ بلٹ پروف بھی تھی۔ دروازہ بند ہو گیا اور ایک منٹ بعد وین بے آواز طریقے سے حرکت میں آئی۔ انجن اتنا خاموش تھا کہ آواز بالکل نہیں آئی حالانکہ وین خاصی پرانے قسم کی تھی۔ کچھ دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ اصل میں وین کا یہ خانہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا اور اس سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی تھی اسی طرح باہر کی آواز اندر نہیں آ سکتی تھی۔ ایک بار پھر میرا شبہ بڑھنے لگا کہ مجھے اغوا کرانے کی کارروائی نادر کی نہیں ہو سکتی تھی وہ اس معاملے میں شامل تھا اور کسی وجہ سے اس کی مجھ سے ملاقات بھی کرائی گئی تھی لیکن اس سارے چکر کے پیچھے کوئی اور ہی شخص تھا۔ نادر کو سامنے لانے کا مقصد شاید مجھے خوف زدہ کرنا بھی ہو سکتا تھا اور سچی بات ہے کچھ دیر کے لیے میں سچ مچ خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔ مگر اس کا رویہ میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔ پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ اس کے اداکاری کی برف تلے میرے لیے نفرت کا لاوا موجود تھا۔ اگر سچ مچ اسی نے مجھے اغوا کرایا ہوتا تو اس وقت میں اذیت کے کسی ناقابلِ بیان مرحلے سے گزر رہا ہوتا۔

میں غور کرنے لگا کہ کیا میرے دشمن جمع ہو گئے تھے اور اگر جمع ہوئے تھے تو ان کے کیا مقاصد ہو سکتے تھے؟ ایک مقصد تو واضح تھا انہوں نے مجھے اپنے قبضے میں لینا چاہا اور اس میں کامیاب رہے۔ اب اس کا مقصد کیا تھا وہ سامنے آنے والا تھا۔ فتح خان کے لیے میں بیکار تھا کیونکہ بہ ظاہر میرے ہمیشہ کے لیے گم ہو چکے تھے۔ نادر اور مرشد میرے خون کے پیاسے تھے ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ فوراً میرا خاتمہ کر دیتے۔ صرف ڈیوڈ شا ایک ایسا دشمن تھا جسے میری زندگی درکار نہیں تھی اور اسے مجھ سے غرض بھی تھی۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ فتح خان جیسے طرم خان اور نادر و مرشد جیسے فرعون اس کے آگے دُم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہلانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ ان کو اپنی پلاننگ پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ ذہنی لحاظ سے وہ ان دشمنوں سے بہت آگے تھا۔ فتح خان کی شخصیت اور ذہن میں اتنی بڑی تبدیلی بھی یقیناً ڈیوڈ شا کی صحبت کا اثر تھی، ورنہ وہ ایک گرم مزاج بدمعاش سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

وین روانہ ہوئی صرف ہچکولوں اور حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چل رہی تھی ورنہ آواز کوئی نہیں تھی۔ اسی طرح اندر کا درجہ حرارت معمول کے مطابق تھا یعنی ہلکا سا سرد تھا اور مجھے اس میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ جس طرح میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے کہاں ہوش آیا تھا اسی طرح میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا؟ مگر کچھ دیر بعد ایسا لگا جیسے وین کسی چڑھائی والی سڑک پر ہو جو سیدھی اور صاف ہو۔ اگر میں راولپنڈی اسلام آباد میں تھا تو اس وقت مری ہائی وے یا اس کی متبادل ہائی وے پر سفر کر رہا تھا کیونکہ بلندی کی طرف جانے والی یہی دو سڑکیں سیدھی اور ہموار تھی۔ ان میں گھماؤ پھراؤ کچھ دیر بعد آتا۔ اگر پندرہ بیس منٹ بعد وین موڑ لینے لگتی تو میرا اندازہ درست ثابت ہوتا۔ میں ایک طرف ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ پہلا موڑ آیا تو وین واضح طور پر جھولی اور میں ایک طرف سرک گیا اس کے بعد بار بار موڑ آنے لگے تھے۔ دھات کے چکنے فرش پر میں پھسل رہا تھا۔ اس میں پکڑنے والی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے میں پھسلنے پر مجبور تھا۔ تنگ آ کر میں نے پشت دائیں طرف لگائی اور پاؤں سامنے دیوار پر ٹکا دیے اس طرح میں پھسل نہیں رہا تھا۔

لیکن یہ پوز بھی آرام دہ نہیں تھا۔ کیونکہ بیٹھ کر پاؤں دیوار سے نہیں لگ رہے تھے اور انہیں دیوار سے لگانے کے لیے مجھے ذرا نیچے ہونا پڑتا تھا اور میری کمر دوہری ہو جاتی۔ آدھے گھنٹے بعد کمر اس طرح دکھنے لگی کہ مجھے مجبوراً سیدھا ہو کر بیٹھنا پڑا اور جب وین موڑ لیتی تو میں ذرا سا پھسلتا تھا میرے پاؤں سامنے دیوار سے ٹکراتے تھے۔ بہرحال کمر کی تکلیف سے یہ بہتر ہی تھا۔ جب دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھی وین کے کہیں رکنے کے آثار نظر نہیں آئے تو میں فکرمند ہو گیا تھا۔ ہم مری یا اس کے گردونواح سے آگے تو نکل چکے تھے۔ اب مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا؟ ابھی میں چند دن پہلے تو پہاڑوں سے دھکے کھا کر واپس آیا تھا۔

صرف چند دن پہلے نہیں بلکہ آج سے بارہ تیرہ سال پہلے جب میں پہاڑوں کے عشق میں مبتلا ہوا تھا تب سے اب تک میں زیادہ تر پہاڑوں میں دھکے کھاتا رہا تھا۔ پہلے کاروبار کے نام پر اور اب حالات مجھے بار بار پہاڑوں پر لے جاتے تھے۔ اس بار بھی دشمن مجھے کہیں پہاڑوں پر لے جا رہے تھے۔ مری سے آگے ہم کہاں جا سکتے تھے؟ کیا فتح خان مجھے دوبارہ اس وادی کی طرف لے جا رہا تھا جہاں ہیرے دفن تھے۔ یا دشمن اپنے کسی دور دراز ٹھکانے پر لے جا رہے تھے لیکن اتنی دور لے جانے کا کیا مقصد تھا؟ اگر انہوں نے مجھ سے کچھ منوانا تھا تو مجھے شہر میں بھی رکھ سکتے تھے۔ ان کے یقیناً کچھ مقاصد تھے جس کے لیے وہ مجھے یوں لے جا رہے تھے۔

دونوں نگرانوں نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مجھے طویل سفر پر بھیجا جا رہا ہے اس لیے میں ضروریات سے اچھی طرح فارغ ہو جاؤں، ورنہ راستے میں مجھے موقع نہیں ملے گا۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ راستے میں کسی قسم کا بھی موقع نہیں ملے گا اور یہ سفر نان اسٹاپ جاری رہے گا۔ راستے میں صرف دو بار وین شاید دس پندرہ منٹ کے لیے رکی تھی اور وہ بھی شاید ایندھن اور پانی وغیرہ ڈالنے کے لیے کیونکہ اتنا طویل سفر انجن لازمی گرم ہو جاتا۔ اس کے بعد یہ سفر کوئی دس گھنٹے لگاتار جاری رہا تھا۔ رفتار خاصی تیز تھی اور میرا اندازہ تھا کہ پہاڑوں پر بھی وین نے کم سے کم چار سو میل کا سفر طے کر لیا ہوگا۔ مسلسل حرکت میں رہنے سے میرا جسم اس ردھم کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ جب اچانک وین رکی اور پھر رکی رہی تو کچھ دیر میرا جسم حرکت میں رہا تھا۔ ایک خیال یہ آیا کہ وین پہلے کی طرح دس پندرہ منٹ کے لیے رکی ہے۔ مگر فوراً ہی دروازوں کا لاک کھلنے کی آواز آئی اور جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی شدید سرد ہوا اندر گھس آئی اور میں کانپ اٹھا۔ سامنے وہی دونوں مسلح نگران موجود تھے ان میں سے ایک بولا۔

"نیچے اُتر آؤ دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر۔"

میں نے کسی قدر مشکل سے جسم سیدھا کیا اور نیچے اُتر آیا۔ رات ہو چکی تھی لیکن چاروں طرف برف کی سفیدی نمایاں تھی۔ وین ایک لکڑی سے بنے کیبن کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وین کی آمد کی اطلاع اندر پہنچ گئی تھی اور اندر سے ایک طویل قامت شخص نمودار ہوا جس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی تاریکی میں ہونے کی وجہ سے میں اسے شناخت نہیں کر سکا تھا وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آیا اور پھر اس نے کہا۔

"مسٹر شہباز ملک.... خوش آمدید۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(سید خضر عباس بخاری، شجاع آباد کا جواب)

انتساب علی خان.....لاہور

یہ دھوپ تو ہر رُخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ

ارباز گل.....پشاور

یہ کیسی دھوپ نفرت کی پڑی ہے
محبت بھاپ بن کر اُڑ گئی ہے

نواز علی خان.....لاہور

یہ خال و خط لب نہیں مصرع ہیں غزل کے
لاریب کسی میر کا دیوان ہیں چہرے

منظر علی خان.....ٹاؤن شپ لاہور

یہی تو ایک تمنا رہی ہے دنیا میں
ہمیں عروج ملے وہ جسے زوال نہ ہو

زویا احمد.....کامل پور

یہ معجزہ بھی عجب بیسویں صدی کا ہے
غریب شہر کے تن پر کوئی لباس نہیں

(منظر علی خان، لاہور کا جواب)

ثمینہ شمس الحسن.....بھکر

لکھتے لکھتے زندگی کی شام ہوگئی
یوں ہی آخر زندگی تمام ہوگئی

ناصر خان آفریدی.....چارسدہ

لالۂ کاروں سے تری بادِ خزاں کے باوصف
اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے

(راجا ثاقب نواز ثاقب، ساہیوال کا جواب)

نینا نسرین.....کراچی

اندھی گلی کے موڑ پہ بیٹھا ہے تاک میں
دشمن عظیم ہے تو اُجالے میں کیوں نہیں

نرجس افروز ملک.....ملتان

ایک ہی بیگانہ نہیں اس ہوش و خرد کی دنیا سے
تیرے شہر میں جو آیا ہے رستہ بھولنے آیا ہے

ارشد علی خان.....ملک وال

آج چہرے گلوں کے زرد ملے
شاید ان سے بھی اہلِ درد ملے

حکیم سید محمد رضا شاہ.....میانوالی

اظہارِ محبت نہ کیا بس اسی ڈر سے
ایسا نہ ہو گر جاؤں کہیں اُن کی نظر سے

ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، برہ زئی، جھجھ

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اِک واقعہ ذرا سا

عشرت علی.....جرمنی

اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
رسوائی سے ڈرنے والو بات تبھی پھیلاؤ گے

مہر عقیل.....رانی پور، سندھ

ابھی تو خشک بہت ہے موسم، بارش ہو تو سوچیں گے
ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

سعدیہ شکیل.....میر پور خاص

ایسے انداز میں رخصت ہوا کوئی مجھ سے
وہی لمحہ وہی منظر ہے نظر میں اب تک

نوشین ملک.....مظفر گڑھ

ایک حسرت سجی رہ گئی گل بہ گل
ایک ماتم چمن در چمن رہ گیا

(سعید احمد چاند، کراچی کا جواب)

فرخ رضا بھٹی.....ملتان

وہ سرخوشی ہو کہ سرخوشی بھی رقص کرے
وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

راجا ثاقب نواز ثاقب.....ساہیوال

وہ پرندہ جسے پرواز سے نہ تھی فرصت
آج تنہا ہے تو میری دیوار پہ آ بیٹھا ہے

طاہرہ سموں.....جیکب آباد

وہی بے بسی، وہی بے کلی، وہی بندشیں، وہی چاہتیں
میں ابھی تلک نہ سمجھ سکا تو نصیب ہے کہ نصاب ہے

ثاقب آفریدی.....پارہ چنار

وقت کہیں پہ رکا ہوا ہے عمر رواں کے ساتھ بھی ہے
وہی ہمارے پاس بہت ہیں جن لوگوں سے دور رہے

(محمد اختر، رحیم یار خان کا جواب)

شمیم بانو ناگوری.....کراچی

روکے سے مقدر کا خسارہ نہیں رکتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدرت کے ہاتھ مگر دکھائی نہیں دیتے
ثمر فیروز.....فیصل آباد

روح پر نقش تھے وہ نقش ابھی تک جن میں
رنگ بچپن کی کسی یاد نے بھر رکھا تھا
آمنہ حق.....لالہ موسیٰ

رسوا تو نہیں ہوتے تنہا تو نہیں اُٹھتے
احسان جو کر دیتی اس بزم میں گویائی
(خالد یوسفی، لیہ کا جواب)

ایس صارم آرائیں.....گولارچی

طوفان کی اس ادا میں بھی کتنا خلوص ہے
ساحل تک آ گیا ہے مجھے ڈھونڈتے ہوئے
(محمد سعید قاسمی، چکوال کا جواب)

عذرا پروین.....سیالکوٹ

حادثہ تھا گزر گیا ہوگا
کس کے جانے کی بات کرتے ہو
(ابوذر محسن، لندن، یوکے کا جواب)

تنویر رفیق.....کراچی

یاد کر کے تو میرے پیار کو روتا ہوگا
چاند جب جب تیرے آنگن میں اُترتا ہوگا
(رانا محمد سجاد، شاہ جمال کا جواب)

عالم شیر زاہد.....چنیوٹ

ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو
نداعلی.....میاں چنوں

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
واصف چنگاری.....جیکب آباد

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
نصرت جاوید.....حاصل پور

اگر اس دور میں جلنا ہی مقدر ٹھہرا
اپنی اُجڑی ہوئی محفل کے چراغوں میں جلیں
زاہد بنگش.....پشاور

اظہر تم نے عشق کیا کچھ ہم سے کہو کیا حال ہوا
کوئی نیا احساس ملا یا سب جیسا احوال ہوا
نوشین اظفر.....وہاڑی

اب دل میں سرِ شام چراغاں نہیں ہوتا
شعلہ ترے غم کا کہیں بجھنے نہ لگا ہو
صنوبر جونیجو.....حیدر آباد

اب تو اسے مروت زانو کی بھیک دو
سر تھک گیا حضور گرانی کے بوجھ سے
(نازش سلطانہ، لاہور کا جواب)

ڈاکٹر اقرا بانو ناگوری.....کراچی

مکاں سارے نہ ڈھادیں کہ ختم ہو تفریق
امیرِ شہر نے یہ سوچا ہے بے گھروں کے لیے
نواز بٹ.....نوشہرہ

میں تو ترے بغیر مکمل نہ ہوسکا
پھر میرا نام تیرے حوالے میں کیوں نہیں
فراست ترمذی.....ملتان

میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور کہتا ہوں
مری رگوں میں بہت زہر ہے رقابت کا
(اقرا بانو ناگوری، کراچی کا جواب)

عنایت علی بنگش.....پارہ چنار

حیرت ہے وہ برسوں کی ہوا باندھ رہے ہیں
ہم کو تو بھروسا نہیں آتے ہوئے دم کا
اختر سہگل.....کراچی

حسن رخسار و سحر، شعلۂ گل، دست صبا
اب تو جو نام ہے وہ نام ہے تیرے جیسا

(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)

نصرت جاوید.....جویلی لکھاں

نہ دل نے مانی کوئی بات لاکھ سمجھایا
کہ وہ زمانے میاں قیس و کوہکن کے گئے
نداعلی.....میاں چنوں

نہ پھول ہیں اب نہ رنگ و خوشبو نہ تتلیاں ہیں
ہماری آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں ہیں
فیروز حسن.....فیصل آباد

نہ جانے کتنی رتیں دُھوپ میں گزاری تھیں
وہ شخص سایۂ دیوار میں جو بیٹھا تھا

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علمی آزمائش۔ 82

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے؟ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جولائی 2012ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

میرا جنم پہلی ستمبر 1915ء کی صبح 3 بج کر 47 منٹ پر لاہور میں ہوا۔ ہر ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے، اس کا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے۔ میرے باپ کی بھی یہی تمنا تھی۔ ایسا نہیں کہاں معلوم تھا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب کلکٹر بھی میرے ادب میں کھڑے ہو جائیں گے۔ میری ماں برہمن تھی اور باپ چھتری۔ اسکول جانے کی عمر تک شرلاک ہومز کے کارنامے پڑھ ڈالے۔ میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خریدا جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لائی۔ پرائمری سے مڈل تک پہنچتے پہنچتے وہ میں نے ہضم کرلیں۔ اردو میں خوب شاعری کی کہانیاں لکھیں اور فلم نگری میں بھی وقت گزارا مگر وہی 12 بجے والی بات کہ 12 بجتے ہی سردار جی عقل کو جیب میں رکھ لیتے ہیں، میں بھی سب بھول بھال بیٹھا اور وہی قلم گھسیٹتا رہا۔

علمی آزمائش 80 کا جواب

1298ھ بمطابق **1875ء** میں لکھنو اور کانپور کے درمیان واقع اناؤ ضلع کے قصبہ موہان کے ایک صاحب علم گھرانے میں حسرت موہانی پیدا ہوئے۔ علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ ادبی دنیا کو زیروزبر کر ہی رہے تھے کہ صحافت سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اخبار سے وابستگی ہوئی تو ایسے ایسے مضامین لکھے کہ حکمراں طبقے میں ہلچل مچ گئی۔ اربابِ اقتدار نے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ ایسے وقت میں گرفتاری عمل میں آئی جب شیر خوار بچی نعیمہ سخت علیل تھی۔ انہیں لے جا کر چکی کی مشقت پر لگا دیا گیا۔ ہر روز ایک من گیہوں ہاتھ کی چکی سے پیستے۔ اس دور میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ادب میں شہکار کہلایا۔ ان کی نظمیں زبان زدعام ہوتی گئیں۔ 13 مئی 1951ء کو انہوں نے دنیا سے کوچ کیا۔

انعام یافتگان

1- ارشد علی، کھلابٹ **-2** نسیم الحسن، لاہور **-3** ابیہہ فاطمہ، کراچی

4- فیروز ملک، نارووال **-5** شبیر شاہ، پشاور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: وکیل الرحمٰن، محسن اختر بلوچ، سدرہ علی، سعید احمد چاند، محمد مناف فاضلانی، سید عزیز الدین، انصار حسین، نور احمد، نگار پیمائی، بختاور شاہ، دانش قریشی، سید سعید الدین اشرف، مہوش رفیق، عارفہ سلطان، کہکشاں تسنیم، ابرار احمد، عنایت مسیح، کاوش اختر علی احمد، نجم الدین حیدر، اسما توفیق، منور علی، نواز علی شاہ، کلیم اللہ فہمی، رجب علی میرزا، تنویر حسین زیدی، فہیم احمد فہیم، قاضی شرف معروف، نصرت فاروق، ملک سرفراز گوندل، ناصر افروز، وجیہہ الحسن، جاوید علی، خلش مضطر، بشریٰ گوندل۔ راولپنڈی سے: ڈاکٹر غلام یاسین، نسرین اشرف، فتح الاسلام خان، زویا بخاری، نرجس علی، کائنات بانو، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زاہد عباسی، بخت خاں، سید محمد نقی، تنویر الحسن، رانا فتح یاب، صفدر شیرازی، چوہدری ذوالفقار علی ایڈووکیٹ۔ اسلام آباد سے: ثمین جاوید، انور یوسف زئی، ممتاز احمد، راشد القیوم، محمد شہزاد، بشریٰ فاروقی، شہناز فیضی، شاہین اشفاق، ردا ممتاز، محمد متین، سعید اختر، خضر حیات عباسی۔ لاہور سے: عبدالرزاق رزمی، اسلام ملک، حمیرا تبسم، الحاج کرم الٰہی اعوان، عفان صدیقی، نصیر بٹ نصیر، عروج ارم، تابش عطاری، سید ممتاز الحسن، ناصر حسین، زبیر اسلم، ارشاد علی، نعمان بٹ، حمیرا خاتون، ہما جبیں، نازش خان، ابرار احمد، ابرار حیدر، انعام الحق، نثار اختر، احمد علی مشرقی، نعمان اشرف، ملک جاوید، نیاز احمد ملک، پروین ضیا، اکرام صدیقی، گل زیبا، حدیقہ اشرف، ارباز خان، ممتاز الحسن، نعمان اشرف، فہیم مرزا، احمد بشیر بٹ، خالد علی، عقیل سندھو، برق ضیائی۔ ملتان سے: مناف سید، فضل الحق، جمیل ملک، بہادر خان، کوکب جہاں، فہیم اللہ فاروقی، خالد ڈار، جنید ارشد، توفیق سلطان، اشرف علی شیروانی، زبیر شاہ، نگار سلطانہ، ابریز بشیر، نیاز احمد ملتانی، بیگم احمد دین، ندا یونس، عزادار حسین، مہوش زرولی خان ڈرائیور، نشاط جہاں، زینب چوہان، قدوس بخش، امام بخش ملک، جعفر عباس (شاہ رکن عالم ٹاؤن) محمد معین چشتی، اللہ دتہ، فاضل خان اچکزئی، اسامہ حمید، فرزانہ ملک، محمد عتیق، سعیدہ جلال، رضوانہ اختر، لبنیٰ ظہیر۔ جہلم سے: ملک شفاعت، کمال احسن کمال، ارباز خان اچکزئی، اقبال حسن سید، صلاح الدین، سرفراز حسین زیدی، نذر کلیم چغتائی، عثمان علی شاہ، شاور ترمذی، ندیمہ امتیاز (گورنمنٹ کالج ویمنس)۔ چکوال سے: عنایت علی سید، فرحان سعید قاسمی، ناصر غنی، امتیاز احسن، اقبال حمیدی، نوشابہ صفدر ملک۔ کوئٹہ سے: نذر خان، قاضی شجاع الدین، ممتاز احسن ملک، تقی چنگیزی، راؤ رشید، ضمیرا چکزئی، نگار بٹ، نصرت چنگیزی، خاقان اعوان، صالح بشیر، قتیل سید پوری، فیض اللہ خان، ارباز خان۔ سرگودھا سے: حیات خان، خلیق الحق، خضر حیات، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، فصیح الزمان، نادر شاہ۔ شجاع آباد سے: زوار حسین زیدی، ارباز خان، سید عباس علی، ڈاکٹر سید محمد عالمگیر جاوید۔ حیدرآباد سے: نواز عثمان آبادی، تہمینہ سلطان، عبدالقیوم حسن خان، انوار علی زبیری، کاشان دولتانہ، نظر علی بھٹو، ممتاز خان، نصیر بھٹو، رام مل چوگھامل اسرانی، طٰہ یاسین۔ ساہیوال سے: فدا حسین، ممتاز فخر، امجد سروش، نوازش حسن، محمد حسین مبین کھٹانہ۔ حاصل پور سے: اختر عباس، خالد بن ماجد، مہوش ملک، شیخ فخر الدین۔ ڈی جی خان سے: نعمت خان، فرحت اللہ شیرازی، گل شیر میو، عدنان منور مانک، عباس فدا حسین۔ ڈی آئی خان سے: محمد سہیل انجم، نصیر الدین نصیر، رانا وجدانی، زبیر ملک، کاشف زیدی۔ بہاولپور سے: میثم حسن، شمیم وٹو، فہیم شیخ، نازش کریم، حمیدہ کوکب واسطی۔ میرپور خاص سے: مرزا طاہر الدین بیگ، نوازش علی نوازش، ابرار صدیقی، دھیرو مل۔ جہانیاں سے: زبیر خان، خضر حیات، انیق احمد، صالح احمد، وزیر حسن، خوش خان۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید، نعمت اللہ۔ حسن ابدال سے: سید محمد رضا، کرم الٰہی۔ چوٹالہ سے: فلک شاہ، ثنا احمد۔ پاک پتن سے: سدرہ شفیق۔ جھنگ سے: زویا رفیق، امجد علی انجم (احمد پور سیال) امتیاز حسن، ملک سرفراز، عجب گل، احباب زیدی۔ سکھر سے: نعمان شیخ۔ پشاور سے: نسیم فردوس، جویریہ، بشیر نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیا الحق، جمال شاہ، نوید فہیم، محمود اچکزئی، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ اوکاڑہ سے: راجا احسن، سید احسن محمود، ملک صفدر، اظہر الدین، لیاقت علی مجاز۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، نرجس زیدی، مہ جبیں فلک، محمد رضا، اسلام الدین، نصیر اجتہادی، فراست اللہ، ام حبیبہ، ناصر خان، جاوید محمود ملک، فیض الحسن۔ اٹک سے: ثنا جبران، زمیر اللہ خان، عرفینہ اقبال۔ حافظ آباد سے: خالد جاوید، خالد جاوید ٹیچر، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم محمد صدیق مستری۔ نواب شاہ سے: ارحم شاہ، عزیز حسن، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے: سنجیدہ احمد، نوید انصاری۔ میرپور آزاد کشمیر سے: نصرت رند، کاشف حسین۔ میاں والی سے: نوشین احمد، حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ، نعمان نیازی۔ بھکر سے: غازی شاہ، حافظ گل عمر۔ ٹنڈوآدم سے: ناصر بگھیو، فاطمہ عباسی، خالد خان چوٹالہ۔ کمالیہ سے: ناصر ملک۔ لیہ سے: خالد یوسفی، راجا ابرار۔ گولارچی سے: سید ایس ڈی ساغر (فتح آباد) ایس صارم آرائیں (توحید آباد) نارووال سے: محمد عدیل اختر (موٹے کلاں) انعام احسن، شاہ جمال سے رانا محمد سجاد۔ ایبٹ آباد سے: محمد خورشید جدون، میاں احسن۔ مردان سے: محمد انور (باڈی چم ہوتی) معراج الدین۔ تربیلا ڈیم سے: صفدر حسین جعفری۔ چھچھ برہ زئی سے: ملک جاوید خان سرکانی درانی، محمد ایاز ایاز (چھچھ کوٹکے)

ممالک غیر سے: شیزا موسیٰ زبیری، احسن فاروقی (العین، یو اے ای) نصیر خان ناصری (جدہ، سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جال

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔ میری یہ پہلی کاوش ہے۔ اس کا ہر لفظ سچ پر مبنی ہے۔ اگر اسے سرگزشت میں جگہ دے دیں تو عنایت ہوگی اور ان بھولی بھالی لڑکیوں کا بھلا ہوگا جو ذرا سے بہکاوے پر بہک جاتی ہیں۔ اس عیّار و مکّار دنیا میں کیسے کیسے لوگ رہ رہے ہیں، کس کس قسم کے جال پھیلے ہوئے ہیں اس کا ادراک بھی ہوجائے گا۔
نجمہ
(دینہ ، جہلم)

میرا نام نجمہ ہے۔ متوسط طبقے سے تعلق ہے۔ گھر میں ہم صرف پانچ افراد تھے۔ والد، والدہ اور مجھ سمیت تین بہنیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ والدین ساری زندگی بیٹے کی آرزو ہی کرتے رہے مگر قدرت کی مصلحتیں انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہیں۔ کہیں کوئی کثرتِ اولاد سے پریشان ہے اور کہیں کوئی صرف ایک بچے کے لیے ترستا رہتا ہے۔ کسی کے گھر میں بیٹے ہی بیٹے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور کسی کے یہاں نسل کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ایک چراغ بھی روشن نہیں ہوتا۔ میں جس وقت سے اپنی داستان کا آغاز کررہی ہوں، اس وقت میرے والد اشتیاق احمد صاحب پولیس انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوچکے تھے۔ وہ ان گنتی کے چند پولیس افسران میں شامل تھے جنہوں نے پوری سروس میں کبھی ایک روپیہ بھی ناجائز آمدنی کا حرام سمجھا تھا جس کا نتیجہ عملاً یہ نکلا تھا کہ جس وقت وہ ریٹائر ہوئے تو ہمارے پاس اپنا کوئی ذاتی مکان بھی نہیں تھا۔ جب پوری تنخواہ ملتی تھی تب ہی گھر کا خرچ، کرائے کے مکان کے ساتھ بہ مشکل ہی پورا ہوتا تھا اس لیے ظاہر تھا کہ صرف پنشن کی آمدنی سے گزارا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور غنیمت تھا کہ ابو کے ریٹائر ہونے سے قبل اپنی تعلیم مکمل کرچکی تھی۔ چنانچہ گھر کا خرچ چلانے کے لیے میرا سروس کرنا ایک امر مجبوری تھا۔ میں نے بی اے پاس کرنے کے علاوہ صرف ملازمت حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس بھی کرلیا تھا جس کی مدد سے مجھے ایک پرائیویٹ کمپنی میں منیجر کی پرسنل سیکریٹری کی جاب حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ منیجر صاحب پختہ عمر کے بہت ہی شریف، ہمدرد، مخلص اور بلند اخلاق آدمی تھے۔ میں نے تقریباً ایک سال ان کے ساتھ کام کیا اور اس دوران انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنی سیکریٹری ہی نہیں، اپنی بیٹی کی طرح سمجھا۔ وہ کمزور صحت کے مالک تھے۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا۔ عموماً بیمار رہتے تھے۔ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے اور بال آخر اسی مرض کی وجہ سے وہ اس قدر بیمار پڑے کہ ان کے لیے اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ناممکن ہوگیا۔ کمپنی کے مالک بھی بہت شریف اور اپنے تمام اسٹاف کے لیے دل میں محبت اور احترام رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے منیجر صاحب کی مسلسل علالت کے پیشِ نظر یہی بہتر سمجھا کہ انہیں پنشن دے دی جائے۔

پرانے منیجر صاحب گئے تو اس جگہ کے لیے بہت سے امیدوار آئے اور بال آخر کمپنی کے مالک نے ایک ہونہار، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کا انتخاب کرلیا۔ نئے منیجر صاحب کا نام اشرف حسین تھا۔ تعلیمی اعتبار سے وہ ایم بی اے تھے۔ ایک دو جگہ عارضی طور پر کام کرنے کا تھوڑا بہت تجربہ بھی تھا۔ عمر میرے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ اٹھائیس اور تیس کے درمیان تھی۔ وہ کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ جب ان کی تقرری عمل میں آچکی تو قدرتی طور پر ان کے لیے سب سے پہلی پرابلم کسی مناسب رہائش گاہ کی تلاش تھی۔ کمپنی کی طرف سے منیجر کو رہائش اور سواری کی سہولت فراہم کی جاتی تھی مگر مالک کمپنی پرانے منیجر صاحب کو ریٹائر کرنے کے باوجود انہیں کمپنی کے دیے ہوئے مکان سے بے دخل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اشرف صاحب سے کہا کہ وہ سردست کہیں اپنی رہائش کا انتظام کرلیں تقرری کی عارضی مدت ختم ہونے پر جب انہیں مستقل کیا جائے گا تب کوئی مکان بھی فراہم کردیا جائے گا۔ فی الحال اشرف صاحب ایک ہوٹل میں مقیم تھے مگر ظاہر تھا کہ وہ زیادہ دن تک ہوٹل میں قیام کی گراں اخراجات برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

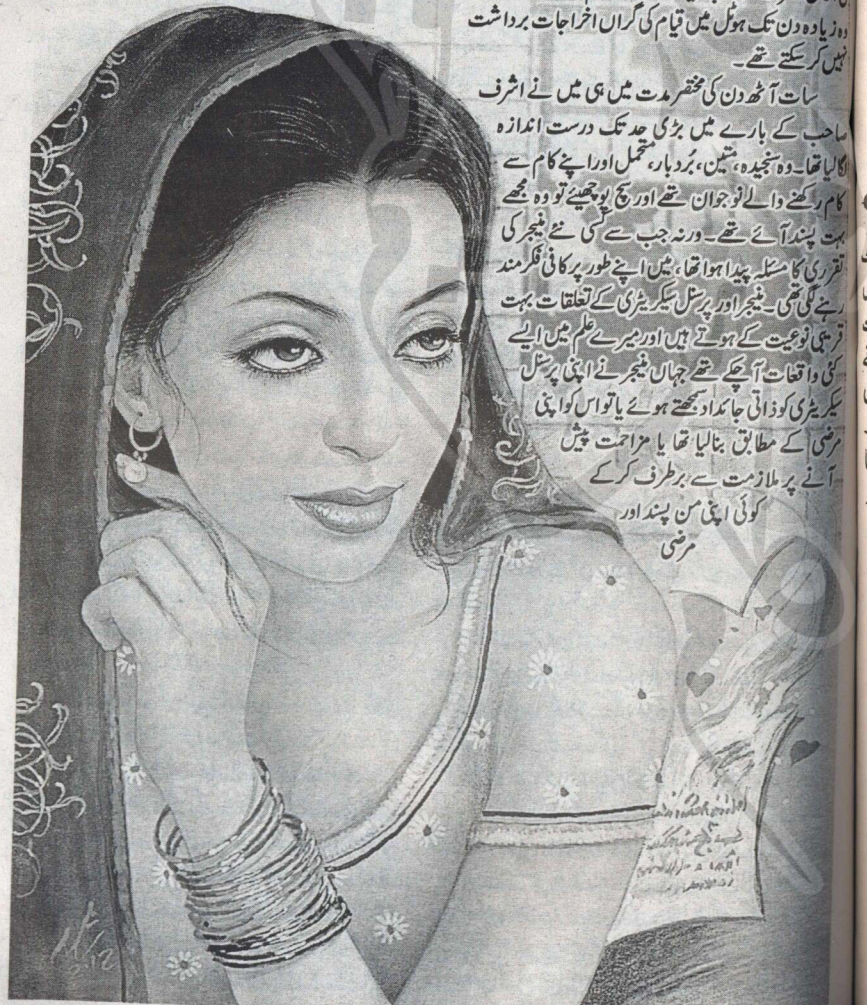

سات آٹھ دن کی مختصر مدت میں ہی میں نے اشرف صاحب کے بارے میں بڑی حد تک درست اندازہ لگالیا تھا۔ وہ سنجیدہ، متین، بُردبار، متحمل اور اپنے کام سے کام رکھنے والے نوجوان تھے اور سچ پوچھیے تو وہ مجھے بہت پسند آئے تھے۔ ورنہ جب سے کسی نئے منیجر کی تقرری کا مسئلہ پیدا ہوا تھا، میں اپنے طور پر کافی فکرمند رہنے لگی تھی۔ منیجر اور پرسنل سیکریٹری کے تعلقات بہت قریبی نوعیت کے ہوتے ہیں اور میرے علم میں ایسے کئی واقعات آچکے تھے جہاں منیجر نے اپنی پرسنل سیکریٹری کو ذاتی جائداد سمجھتے ہوئے یا تو اس کو اپنی مرضی کے مطابق بنالیا تھا یا مزاحمت پیش آنے پر ملازمت سے برطرف کرکے کوئی اپنی من پسند اور مرضی کے مطابق چلنے والی سیکریٹری کا انتخاب کرلیا تھا۔ میں فکرمند تھی کہ اگر میرا سابقہ بھی کسی ایسے ہی آدمی سے پڑ گیا تو ظاہر ہے کہ مجھے سروس چھوڑنا پڑے گی اور گزشتہ سال ڈیڑھ سال کے دوران نہ صرف ملازمتوں کا حصول قدرے دشوار ہوگیا تھا بلکہ کسی نئی جگہ مجھے اتنی اچھی تنخواہ اور دوسری سہولتوں کے علاوہ اتنا اچھا دفتری ماحول ملنے کی توقع بہت کم تھی لیکن جب اشرف صاحب کا اپائنٹمنٹ ہوا اور دوسرے دن سے انہوں نے اپنی ذمے داریاں سنبھالیں تو پہلے دن ہی ان کے رویّے کو دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ میرا نام جاننے کے علاوہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے مجھ سے جو بات بھی کی اس کا تعلق آفس اور آفس کے کام سے تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھتے ہوں یا میری طرف دیکھنے سے گریزاں ہوں، لیکن میں نے ان کی نگاہوں میں ایک دوستانہ اور شریفانہ تاثر کے علاوہ کوئی تاثر نہیں دیکھا اور آپ یقین کریں کہ لڑکیاں خواہ وہ کتنی ہی ناتجربہ کار کیوں نہ ہوں، نوجوانوں کی بدلی ہوئی نظروں اور ان کے پسِ پردہ چھپے ہوئے خیالات کو بہ خوبی پڑھ لیتی ہیں۔ ایک دن برسبیلِ تذکرہ اشرف صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان کی رہائش کی پرابلم حل کرنے میں کوئی مدد کرسکتی ہوں اور تھوڑا غور کرنے پر میرے ذہن میں ایک مناسب حل آ گیا۔

ہمارے محلّے میں ایک غریب مگر بے حد شریف خاندان رہتا تھا۔ جناب حبیب الرحمان صاحب ایک سرکاری محکمہ میں اپر ڈویژن کلرک تھے۔ مکان ان کا آبائی اور ذاتی تھا۔ اہلِ خانہ میں ان کی بیگم کے علاوہ چار بچے شامل تھے۔ جن میں دو لڑکیاں تھیں اور دو لڑکے۔ سب سے بڑی لڑکی ثریا کی عمر بیس اکیس سال کے درمیان تھی اور وہ بی اے فائنل میں پڑھ رہی تھی۔ اس سے چھوٹا بھائی پھر بہن اور پھر بھائی یہ گویا ترتیب تھی۔ چھوٹے بھائی اور ثریا کی عمر میں کافی فرق تھا جو اسی ایک بات سے سمجھ میں آ سکتا تھا کہ وہ اس وقت نویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس سے چھوٹی بہن ساتویں کلاس میں اور سب سے چھوٹا بھائی چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ حبیب الرحمان صاحب کی تنخواہ اس قدر کم تھی کہ اپنا مکان ہونے کے باوجود بس گزراوقات ہی ہوتی تھی۔ پھر ان کے لیے ایک اہم مسئلہ ثریا کی شادی کا بھی تھا۔ جسے وہ زیادہ سے زیادہ سال دو سال میں حل کرنے کے شدید خواہش مند تھے مگر آمدنی اتنی کم تھی کہ ابھی تک جہیز کے نام سے ایک جوڑا بھی فاضل نہیں بنا سکے تھے۔ ان کا مکان کافی بڑا تھا اور افراد خاندان کی ضرورت سے زیادہ تھا۔

مجھے خیال آیا کہ اگر حبیب الرحمان صاحب اپنے مکان کا ایک الگ تھلگ کمرا اشرف صاحب کو کرائے پر دے دیں اور ساتھ ہی ان کے ناشتے، کھانے پینے کا انتظام بھی اپنے ذمّے لے لیں تو بہ طور پینگ گیسٹ اشرف صاحب کی مشکل بھی حل ہوسکتی تھی اور حبیب الرحمان صاحب کو بھی معقول آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ ہاتھ آ سکتا تھا لیکن ہماری معاشرت میں ابھی پینگ گیسٹ کا رواج خال خال ہی ہے بلکہ بعض گھرانوں میں تو اسے معیوب بھی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے بھی پورا یقین نہیں تھا کہ حبیب الرحمان صاحب میرے کہنے سے ایک اجنبی نوجوان کو اپنے گھر میں جگہ دینے کے لیے آمادہ ہوجائیں گے۔

"سوال صرف آپ کے قیام کا ہی نہیں، کھانے پینے کا بھی ہے۔" میں نے جواب دیا "بالفرض آپ کو کوئی چھوٹا مکان مناسب کرائے پر مل بھی گیا تو کھانے اور گھر کی صفائی ستھرائی کا کیا انتظام ہوگا۔ کوئی ملازم یا ملازمہ رکھیں گے تو اخراجات ہوٹل جیسے ہی ہوجائیں گے۔"

"کھانا کسی ریسٹورنٹ میں کھایا جاسکتا ہے۔" اشرف صاحب نے کہا "اور گھر کی جھاڑ پونچھ میں خود کرلوں گا۔"

"ہاں، یہ بھی ایک حل ہے مگر مناسب نہیں۔" میں نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا "باہر کا کھانا عام طور پر مضرِ صحت ہوتا ہے اور آپ دفتر میں کام اور گھر میں جھاڑ پونچھ کریں گے تو آرام کے لیے وقت کہاں سے لائیں گے؟ قطعِ نظر اس کے کہ ایک بڑی کمپنی کا منیجر ہاتھ میں جھاڑو لیے کھڑا ہو اور کوئی ملنے آجائے تو وہ کیا رائے قائم کرے گا؟"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے ذہن میں کوئی مخصوص حل آ گیا ہے۔" اشرف صاحب بھی مسکرائے "ایسا ہے تو صاف صاف بات کرونا۔"

"میں سوچ رہی تھی کہ اگر آپ کو کہیں پینگ گیسٹ کے بہ طور قیام گاہ مل جائے تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں لیکن ایسا ہونا عملاً بہت مشکل ہے۔"

"میں جانتی ہوں، مگر میرے ذہن میں ایک شریف گھرانا ایسا ہے جس کے پاس کافی بڑا مکان ہے اور افراد خاندان کم ہیں۔" میں نے جواب دیا "وہ بہ آسانی ایک انڈیپنڈنٹ کمرا فارغ کرسکتے ہیں اور چونکہ انہیں اضافی آمدنی کی ضرورت بھی ہے اس لیے ممکن ہے وہ مان بھی جائیں۔"

"تب پھر ان سے ضرور بات کرو۔ یہ پرابلم حل ہوجائے تو میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر جائے۔"

میں اسی شام کو دفتر سے واپسی پر حبیب الرحمان صاحب کے گھر آئی۔ تب تک وہ بھی آفس سے آچکے تھے۔ میں نے ذکر چھیڑا تو جیسا کہ میرا خیال تھا ابتدا میں وہ متامل نظر آئے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ اس طرح انہیں کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہانہ کی اضافی آمدنی ہوسکتی ہے۔ کھانے پینے اور ناشتے میں صرف ناشتا ہی ایسی چیز ہے جس کا انہیں کچھ خصوصی اہتمام کرنا پڑے گا، ورنہ کھانے کی حد تک جو کچھ ان کے گھر میں پکے اسی میں تھوڑے اضافہ سے کام چل سکتا ہے۔ اس طرح دن کے خرچ میں مجموعی طور سے زیادہ سے

زیادہ چار پانچ سو روپے کا اضافہ ہوگا اور خالص بچت پانچ چھ سو سے کم نہیں ہوگی۔ نیز یہ کہ اشرف صاحب نوجوان ہونے کے باوجود بہت ہی نیک سرشت آدمی ہیں۔ وہ کبھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنیں گے۔ تب تک مجھے حبیب الرحمان صاحب کے مکان کا پورا جغرافیہ معلوم نہیں تھا اب اس تجویز کے پیشِ نظر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک بیرونی کمرا جس میں اٹیچ باتھ بھی ہے اور آمد و رفت بھی صرف باہر سے رکھی جاسکتی ہے اس کام کے لیے بے حد موزوں ہے۔ کمرے کا رابطہ گھر سے دو طرح سے تھا، ایک تو اندرونی دروازہ تھا جو گھر میں ایک دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ دوسری گیلری تھی جس کے ذریعے کھانا ناشتا وغیرہ پہنچایا جاسکتا تھا۔ غرض وہ کمرا کچھ ایسا تھا جیسے خاص اس مقصد سے ہی بنایا گیا ہو۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ حبیب الرحمان صاحب کے والد کے زمانے میں جب حالات اتنے خراب نہیں تھے۔ اگر کوئی مہمان آتا تھا تو اسی کمرے میں ٹھہرایا جاتا تھا۔

قصّہ مختصر یہ کہ میں نے حبیب الرحمان صاحب کو آمادہ کرلیا۔ دوسرے دن جاکر اشرف صاحب کو بتایا اور معذرت بھی چاہی کہ میں نے ان سے مشورہ کیے بغیر ایک ہزار روپے ماہانہ کی آفر دے دی ہے۔ اگر وہ اسے نامناسب خیال کرتے ہوں تو اپنی پیشکش بتادیں، میں حبیب صاحب سے دوبارہ بات کرلوں گی لیکن اشرف صاحب نے جواب دیا کہ ان کے خیال میں یہ رقم مناسب ہے مزید یہ کہ کچھ دن رہنے کے بعد وہ فراہم کردہ سہولتوں کا جائزہ لینے کے بعد اگر یہ محسوس ہوا کہ رقم کم ہے تو وہ اس میں اضافہ بھی کرسکتے ہیں۔ تین دن کے بعد اشرف صاحب اپنی نئی قیام گاہ میں منتقل ہوگئے۔ حبیب صاحب نے صرف کمرا ہی نہیں دیا بلکہ اپنی طرف سے ممکن حد تک اسے فرنشڈ بھی کردیا یعنی ایک پلنگ، ایک میز کرسی کمرے میں رکھوادی۔ پانی کی ٹنکی اور کچھ دوسرا ضروری سامان اشرف صاحب نے خریدلیا اور یوں ایک ایسے باب کا آغاز ہوا جو آگے چل کر اس آپ بیتی کے بیشتر واقعات کی بنیاد بن گیا۔

☆☆☆

ایک ہی ماہ کے قیام کے اندر حبیب الرحمان صاحب اور اشرف صاحب کے درمیان بہترین تعلقات قائم ہوگئے۔ کمرے کا اندرونی دروازہ ابتدائی دنوں میں زیادہ تر بند رہا مگر پھر اعتماد قائم ہونے پر وہی باہمی واسطے کا ذریعہ بن گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، اشرف صاحب اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ انہوں نے سوائے حبیب صاحب کے گھر کے باقی افراد سے غیر ضروری تعلق قائم کرنے سے احتراز کیا۔ ناشتا اور کھانا کبھی دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک اور کبھی ثریا کی چھوٹی بہن ان تک پہنچادیتے تھے۔ وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کمرے سے نکلتے اور پھر شام کو چھ سات بجے تک دفتر سے واپس آتے تھے۔ نئے شہر میں ان کی واقفیت کسی سے نہیں تھی اور نہ ہی وہ سیر و تفریح سے کوئی دلچسپی رکھتے تھے اس لیے شام کو دفتر سے واپس آنے کے بعد اگلی صبح دفتر روانگی تک ان کا تمام وقت کمرے میں گزرتا تھا۔ فطری بات تھی کہ جیسے جیسے باہمی اعتماد اور بھروسا بڑھتا گیا، پابندیاں اور احتیاطی تدابیر نرم سے نرم تر ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ کھانے، ناشتا یا دوسری ضروریات کے سلسلے میں ثریا سے پردے کا بھی کوئی خاص اہتمام باقی نہیں رہا۔ انہوں نے ثریا کو اتنا زیادہ دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو مگر ثریا انہیں اکثر دیکھتی رہتی تھی اور رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر وہ اشرف صاحب کو پسند کرنے لگی۔

ہمارے محلّے میں ملی جلی آبادی تھی۔ زیادہ تعداد متوسط طبقے کے ایسے سفید پوش خاندانوں پر مشتمل تھی جنہیں اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کرنا پڑتے تھے مگر وہ سب کم سے کم تعلیم یافتہ اور مہذب ضرور تھے۔ کچھ مزدور پیشہ طبقہ کے افراد بھی آباد تھے اور کچے یا نیم پختہ مکانات میں رہتے تھے۔ کچھ گھرانے ایسے بھی تھے جو انتہائی غریب تھے۔ محنت مزدوری کرکے گزراوقات کرتے تھے۔ جن کے بچوں کو تعلیم کی سہولت میسر نہ تھی اور جب وہ جوان ہوتے تھے تو زیادہ تر آوارگی میں... پڑجاتے تھے۔ مالکان کم تھے، کرایہ دار زیادہ تھے اور اس صورت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ناپسندیدہ عناصر بھی گھس آئے تھے۔ مکانوں کے مالک زیادہ تر ماڈرن بستیوں میں رہتے تھے اور انہیں اپنے کرائے کی وصولیابی سے زیادہ کسی بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے ہی ایک دو مکانات میں جرائم پیشہ لوگ بھی آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان میں ایک نوجوان یعقوب تھا جو دو کمروں کے ایک گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ بہ ظاہر تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ زیادہ تر قمیص پتلون، بش شرٹ پینٹ یا جیکٹ اور پتلون میں نظر آتا تھا اور کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے یا اس کا ذریعۂ آمدن کیا ہے؟ اس کے گھر پر اکثر محلّے کے آوارہ نوجوانوں کا مجمع لگا رہتا تھا اور وہ سب جمع ہوکر تاش، کیرم وغیرہ کھیلتے رہتے تھے۔ خوب شور وغل مچاتے تھے۔ عموماً بلند آواز سے فلمی گانوں کے کیسٹ بجاتے رہتے تھے۔ محلّے میں کوئی یعقوب کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی ناپسندیدہ حرکات پر اسے روکنے ٹوکنے کی ہمت بھی کسی کے اندر نہیں تھی۔ یہاں تک کہ جب بھی وہ سب گھر کے باہر کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور آتی جاتی عورتوں، لڑکیوں پر آوازیں کستے تھے یا سیٹیاں بجاتے تھے تب بھی عورتیں اور لڑکیاں خاموشی سے سر جھکائے گزر جاتی تھیں۔

ایک دو مرتبہ محلّے کے چند سرکردہ اصحاب نے چاہا کہ پولیس میں ان کی رپورٹ کردی جائے مگر ہر شریف آدمی پولیس اور غنڈوں سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ ابو نے اس صورتِ حال کے خلاف کئی مرتبہ مقامی پولیس اسٹیشن کے انچارج کو توجہ دلائی تھی مگر چونکہ کوئی اور ان کے خلاف رپورٹ کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا یا پھر اس علاقے کی پولیس ان سے کچھ بھتہ وغیرہ وصول کرتی تھی کہ ابو کے توجہ دلانے کے باوجود یعقوب اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

ثریا چادر اوڑھ کر بس سے کالج آتی جاتی تھی۔ یعقوب نے جب اسے دیکھا تو خاص طور سے اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کا تعاقب بھی کیا۔ راستے میں روک کر بات کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر ثریا سیدھی سادی اور ہر شریف لڑکی کی طرح بزدل اور ڈرپوک ہونے کے باوجود کبھی اس کے دام میں نہیں آئی۔ وہ عموماً محلّے کی تین چار لڑکیوں کے ساتھ مل کر کالج جاتی تھی اور ان ہی کے ساتھ واپس آتی تھی اس لیے یعقوب اپنی غنڈہ گردی کے باوجود کبھی ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ جب ثریا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی اس کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تب اس نے اپنے سازشی ذہن سے ایک ایسا جال بچھایا جس میں ثریا اپنی سادگی کی وجہ سے بہ آسانی پھنس گئی۔

اس نے ایک چالاک اور لالچی عورت نذیراں کو بھاری رقم کا لالچ دے کر اپنی سازش میں آلۂ کار بنایا۔ نذیراں نے رفتہ رفتہ حبیب صاحب کے گھر میں اپنی آمدورفت شروع کردی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ صورت شکل سے ذرا معصوم اور بے ضرر سی لگتی تھی۔ بہ ظاہر اس کی گزر اوقات مختلف گھروں میں برتن جھاڑو کر کے یا کپڑے دھو کر اس کے بدلے ملنے والی اجرت سے ہوتی تھی۔ حبیب الرحمان صاحب کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اس نے اسی عذر کی آڑ تلاش کی تھی کہ آج کل اس کے پاس کام کم ہے، حبیب صاحب خود اپنے گھر میں یا اپنے جاننے والوں میں سے کسی گھر میں اسے کام دلا دیں۔ اور جب ایک مرتبہ اس کے قدم گھر کے اندر آگئے تو اس نے اپنی خوشامدانہ باتوں سے ثریا کی ماں کو متاثر کرلیا۔ ظاہر تھا کہ حبیب صاحب کے گھر میں تو اسے کام نہیں مل سکتا تھا کہ تمام کام ثریا اور اس کی ماں مل جل کر کرلیا کرتی تھیں اور نہ ہی حبیب صاحب کا حلقۂ احباب اتنا وسیع یا خوش حال تھا کہ وہ اسے کہیں اور کام دلا سکتے مگر نذیراں نے ثریا کی ماں کے حسن اخلاق اور شرافت کے گن گا گا کر اپنی خصوصی محبت اور تعلق کا اظہار کرتے ہوئے آمدورفت جاری رکھی اور اس آنے جانے میں اس نے ثریا کے معمولات، اس کے اُٹھنے بیٹھنے، پسند ناپسند کو خاص طور سے نگاہ میں رکھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی ثریا کے ذمے تھی جس میں کبھی کبھی اس کی چھوٹی بہن بھی ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔ جب سے اشرف صاحب آئے تھے، ان کے کمرے کی جھاڑ پونچھ خاص طور سے کی جانے لگی۔ کمرے کا اندرونی دروازہ گھر میں کھلتا تھا اس لیے ثریا عموماً کالج سے واپس آکر اشرف صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کیا کرتی تھی۔ اس صفائی میں میز کرسی، الماری اور دوسری چیزیں بھی شامل تھیں۔ پلنگ کی چادر تبدیل کرنا یا تکیہ کے غلاف کا بدلنا بھی اسی ضمن میں آتا تھا۔ پھر جیسے جیسے ثریا کا تعلق اشرف صاحب سے بڑھتا گیا، وہ اس صفائی میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگی۔ اس تاخیر کے پیچھے اس کے دل کی یہ ہی چھپی ہوئی آرزو تھی کہ وہ اس بہانے جتنی دیر بھی کمرے میں رہ سکتی ہے، رہے۔ کارنس پر الارم کلاک، گلدان اور کیلنڈر کے ساتھ ہی اشرف صاحب کی ایک تصویر بھی رکھی تھی اور ثریا جب تک کمرے میں رہتی، یہ تصویر اس کی نگاہوں کا مرکز بنی رہتی تھی۔ کام کرتے کرتے وہ تصویر کے سامنے آکھڑی ہوتی، کچھ دیر تک اسے بڑی توجہ اور پیار سے دیکھتی رہتی اور پھر دوبارہ کام میں لگ جاتی۔ اسی طرح اسے کبھی کبھی اتنی دیر بھی ہوجاتی تھی کہ اشرف صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا وقت ہوجاتا تھا۔ یا کسی دن وہ معمول کے خلاف ذرا جلدی آجاتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر جب وہ باہر سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے تھے (جس میں وہ قفل لگا کر جاتے تھے) تو ثریا سے ٹکراؤ ہوجاتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر عموماً دروازے میں ہی رک جاتے تھے اور ثریا جلدی سے بھاگ کر گھر میں چلی جاتی تھی۔

نذیراں کی تیز اور تجربہ کار نظروں سے ثریا کی مجموعی کیفیت زیادہ دن تک چھپی نہ رہ سکی اور اس نے درست طور پر اندازہ کرلیا کہ یہ خوبصورت مگر بھولی بھالی لڑکی اپنے مہمان کو چاہنے لگی ہے۔ ایک دن جبکہ ثریا کی ماں پڑوس میں

کہیں گئی ہوئی تھیں، نذیراں کو ثریا سے بات کرنے کا موقع مل گیا جس کی وہ تلاش میں تھی۔

''بیٹی، یہ تمہارے مہمان اشرف صاحب مجھے تو کوئی بہت ہی شریف خاندان، بلند اخلاق اور پاکیزہ کردار نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، وہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔'' ثریا نے جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے کہ وہ کسی بڑی کمپنی میں منیجر ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ ابھی تک ان کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔'' نذیراں نے ثریا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

فطری طور پر یہ بات سن کر ثریا کے چہرے پر حجاب آمیز سرخی سی جھلکی۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''ایسا شریف، خوبصورت اور بڑے عہدے پر کام کرنے والا نوجوان جس لڑکی کی بھی قسمت میں لکھا ہوگا، وہ کوئی بڑی ہی نصیب والی ہوگی۔''

ثریا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے خدا نے گھر بیٹھے تمہارے ابا کی ایک مراد پوری کردی ہو۔'' نذیراں بولی۔

''کیا مطلب؟'' ثریا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''اشرف میاں کبھی آتے جاتے راستے میں مجھے مل جاتے ہیں اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تم لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔'' نذیراں ایک ایک بات بہت ناپ تول کر کر رہی تھی ''اور بُرا نہ مانو بی بی، تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم بھی انہیں دل ہی دل میں پسند کرنے لگی ہو۔''

ثریا نے چونک کر گھبراتے ہوئے نذیراں کی طرف دیکھا۔

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

''میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے بی بی! محبت کرنے والی نظریں کبھی چھپی نہیں رہتیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اشرف میاں بھی تمہیں چاہتے ہیں۔''

''کیا انہوں نے تم سے کچھ کہا ہے۔'' ثریا کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔

''کیا تم نے کبھی مجھے کچھ بتایا مگر میں نے تمہارے چہرے سے تمہارے دل کی بات جان لی۔'' نذیراں نے جواب دیا ''اچھا، سچ بتاؤ کیا تم اشرف میاں کو پسند نہیں کرتیں؟''

ثریا شرما کر جواب تو نہیں دے سکی لیکن اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس اسی طرح اشرف میاں نے بھی مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا مگر مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔'' نذیراں نے بات آگے بڑھائی ''پھر کیا کبھی تم دونوں نے ایک دوسرے سے بات کرنے کی کوشش کی؟''

ثریا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو اس طرح خاموشی سے کیسے کام چلے گا۔'' نذیراں بولی ''وہ تمہارے ہی گھر میں رہتے ہیں، بات کرنے کے ہزار مواقع پیدا کیے جاسکتے ہیں۔''

''میں اس کی ہمت نہیں کرسکتی۔'' بڑی مشکل سے ثریا نے جواب دیا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پہل اشرف میاں کو کرنا چاہیے۔'' نذیراں نے سر ہلایا ''تم کہو تو میں کوشش کروں؟''

''کیسی کوشش؟'' ثریا نے جلدی سے پوچھا۔

''تم دونوں کو ملانے کی؟'' نذیراں نے جواب دیا ''بی بی، اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اپنی جوانی کے زمانے میں، میں نے بھی ایک شریف نوجوان سے محبت کی تھی۔ وہ بھی مجھے چاہتا تھا مگر ہم دونوں شرم وحیا کے مارے کبھی ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ ماں باپ نے میری شادی کسی اور کے ساتھ کردی اور میری شادی کے بعد وہ ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا پتا نہیں چلا۔ میری زندگی بھی روتے روتے گزری اور شاید اب بھی اپنے شرابی شوہر کے گھر میں مار پیٹ برداشت کر رہی ہوتی اگر میرا میاں ایک رات شراب کے نشے میں ٹرک کے نیچے آکر مارا نہ گیا ہوتا۔ اب میں اسی آس پر جی رہی ہوں کہ شاید کسی دن وہ جانے والا پلٹ آئے یا مجھے اس کا پتا چل جائے تو ہم ایک بار پھر سے اپنی زندگی کی شروعات کریں۔''

''تمہیں کیا معلوم شاید اس نے بھی شادی کرلی ہو۔'' ثریا نے اس داستان میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کی جھجک بڑی حد تک دور ہوگئی تھی۔

اور نذیراں نے بڑی چالاکی سے یہ فرضی آپ بیتی سنائی بھی اسی مقصد سے تھی۔

''اسے شادی کرنا ہوتی تو خاص اپنی شادی کے دن ہی گھر سے غائب نہ ہوتا۔'' اس نے بتایا ''وہ ایک پرچہ بھی لکھ کر چھوڑ گیا تھا کہ جب اسے اپنی محبت ہی نہیں مل سکی تو وہ کسی اور لڑکی کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میرے کہنے کا مطلب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ چونکہ میں خود چوٹ کھا چکی ہوں اس لیے مجھے ہر اس لڑکی اور لڑکے سے ازخود ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور پھر میں انہیں ملانے اور ان کی شادی کرانے کے لیے جو کچھ بھی میرے بس میں ہوتا ہے کر گزرتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج اس شہر میں کتنے ہی محبت کرنے والے میری کوشش کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں تمہیں اور اشرف میاں کو بھی کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں اور اس سلسلے میں ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں۔''

''تم کیا مدد کر سکتی ہو؟''

''ایک دم سے بات کرنے میں قدرتی طور پر جھجک ہوتی ہے۔'' نذیراں بڑی چالاکی سے گفتگو کو اپنے ڈھب پر لا رہی تھی ''اس لیے عام طور پر رابطے کی ابتدا خط و کتابت سے ہوتی ہے۔ تم چاہو تو اشرف میاں کے نام خط لکھ سکتی ہو۔ ان تک پہنچانے کی ذمّے داری میری ہے۔''

''میں لڑکی ہوں نذیراں مائی، میں اتنی ہمت بھی نہیں کر سکتی۔''

''سچ کہہ رہی ہو۔'' نذیراں نے سر ہلایا ''ٹھیک ہے۔ پھر میں کبھی موقع پا کر اشرف میاں سے بات کروں گی اور ان سے کہوں گی کہ پہلے وہ تمہیں خط لکھیں۔ اچھا، اگر انہوں نے خط لکھا تو تم جواب تو دو گی نا؟''

''کوشش کروں گی۔'' ثریا نے جواب دیا اور پھر اپنی ماں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر جلدی سے گھبرا کر نذیراں کے پاس سے اُٹھ گئی۔

☆☆☆

ظاہر ہے کہ مجھے ثریا اور نذیراں کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا کوئی علم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں تو بہت بعد میں کئی واقعات پیش آنے کے بعد مجھے معلوم ہوئیں مگر میں واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے انہیں اسی ترتیب سے بیان کرنے کی کوشش کر رہی ہوں جس ترتیب سے وہ پیش آئے تھے۔

اس گفتگو کے چار پانچ دن بعد نذیراں نے موقع پا کر چپکے سے ثریا کے ہاتھ میں ایک تہ در تہ کیا ہوا کاغذ پکڑا دیا۔ کاغذ ہاتھ میں آتے ہی ثریا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نذیراں کی معنی خیز نظریں نہ بھی دیکھتی تب بھی اسے احساس ہو جاتا کہ یہ کاغذ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ مٹھی بند کیے اپنے کمرے میں آئی، دروازہ بند کیا اور بے قابو ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ بہت احتیاط سے کاغذ کی تہ کھولیں ...

کاغذ کاپی سائز سے زیادہ بڑا نہیں تھا اور جیسا کہ ثریا کا دل گواہی دے رہا تھا، وہ خط ہی تھا۔ اشرف کا خط! جس میں اس نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ثریا سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ جب سے اس نے ثریا کو دیکھا ہے، پہلی ہی نگاہ میں اس کا اسیر ہو گیا ہے اور اس سے بے اختیار محبت کرنے لگا ہے اور اگر اسے جواب میں ثریا کی محبت نہ ملی تو اس کی زندگی کسی ویران صحرا کی طرح اداس اور تنہا ہو جائے گی۔ وہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور یہ کہ اسے پورا یقین ہے کہ اگر اس کا پیار سچا ہے تو ثریا بھی اس کی وارفتگی سے غیر متاثر نہیں رہ سکتی۔ ساتھ ہی اس نے بڑی التجائیں کی تھیں کہ ثریا اس خط کا جواب ضرور دے۔ اگر وہ اسے نہیں چاہتی تب بھی جواب دے تاکہ اس کی خوش فہمی دور ہو جائے اور وہ اپنی ناکام تمناؤں کا ماتم کرتے ہوئے اس کا گھر چھوڑ کر چلا جائے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، ثریا بہت معصوم اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ خود اس کے دل میں اشرف کی چاہت پیدا ہو چکی تھی لیکن ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی وہ جواب ضرور دیتی اور شاید اثبات میں ہی دیتی کیونکہ خط کے الفاظ اور فقرے اسے اپنی ہی خواہشوں کا عکس محسوس ہوئے اور سیدھے اس کے دل میں اُتر گئے۔ اس نے خط کا جواب دیا اور ظاہر ہے کہ وہ یہی تھا کہ اگر اشرف اس سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اشرف نے اپنے خط میں یہ تاکید بھی کی تھی کہ راز داری کے خیال سے نہ وہ خط پر اپنا یا ثریا کا نام لکھے گا اور نہ ہی ثریا اس کا نام لکھے لیکن اس کے دل کی تسکین کے لیے خط کے آخر میں اپنا نام ضرور لکھ دے۔ ثریا نے ایسا ہی کیا۔ خط تو بغیر القاب کے شروع کیا مگر آخر میں اپنا نام لکھ دیا۔ پھر جیسے جیسے یہ خط و کتابت آگے بڑھتی گئی، القاب کی جگہ اشرف کی جانب سے مائی ڈارلنگ، جانِ تمنا، روحِ زندگی وغیرہ کے القاب لکھے جانے لگے اور جواباً ثریا نے بھی میری امیدوں کے مرکز، میرے خوابوں کے شہزادے جیسے القابات استعمال کرنا شروع کر دیے۔

اس نامہ و پیام کو ایک ڈیڑھ ماہ گزر گیا تو اشرف کی طرف سے ملاقات کی خواہش کا اظہار ہونے لگا۔ وہ لکھتا کہ اگرچہ گھر کے اندر بھی وہ کافی آسانی سے رات کے وقت مل سکتے ہیں لیکن جب تک اس کے والدین باقاعدہ رشتہ لے کر نہ آئیں، وہ اپنے محسن اور محترم بزرگ حبیب الرحمان صاحب کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ اگر خدانخواستہ گھر کے اندر انہیں کسی نے ملتے ہوئے دیکھ لیا تو

یہ گویا اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ اس لیے اگر ثریا ملاقات کرنے پر آمادہ ہو تو وہ گھر سے قریب ہی کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرے گا جہاں وہ دن و رات میں کسی بھی وقت دوسروں کی نظروں سے چھپ کر مل سکیں اور وہ جگہ ایسی ہوگی کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ البتہ ثریا کو اتنا ضرور کرنا پڑے گا کہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلے اور نذیراں کے ساتھ اس جگہ تک پہنچ جائے۔

اتنے دنوں کی خط و کتابت اور صاف صاف اظہارِ محبت کے باوجود اشرف کے ظاہری رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی ثریا کو دیکھنے کی کوئی ارادی کوشش کرنا تو کجا اگر کبھی کمرے کے اندر ان دونوں کی اتفاقی ملاقات (وہی صفائی کے سلسلے میں تاخیر اور اشرف کے کچھ جلدی دفتر سے واپس آنے کے موقعے پر) بھی ہو جاتی تو اشرف اس وقت تک کمرے میں داخل نہ ہوتا تھا جب تک ثریا بھاگ کر گھر میں نہ چلی جاتی۔ ثریا نے اشارتاً ایک دو مرتبہ اپنے خطوط میں اس کی شکایت بھی کی تھی کہ وہ کمرے کے اندر کیوں نہیں آتا، باہر ہی کیوں رک جاتا ہے تو جواب میں اشرف نے یہی لکھا تھا کہ وہ کسی طرح بھی یہ نہیں چاہتا کہ گھر کا کوئی فرد انہیں ایسے حال میں دیکھ لے جس سے اسے کوئی شک کرنے کا موقع مل جائے۔

آخر جب اشرف کی جانب سے متواتر ملاقات کے لیے اصرار کیا گیا تو ثریا کو ہاں کہنا پڑی۔ اس کے چند روز بعد اشرف نے اپنے خط میں لکھا کہ اس محلّے میں اس کا ایک دوست رہتا ہے جو ثریا اور اشرف کی محبت سے واقف ہے اور اس نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جب بھی ان دونوں کو ملنا ہو وہ اس کے گھر میں ملاقات کر سکتے ہیں۔ وہ اس دن کسی نہ کسی بہانے سے اپنے گھر والوں کو کہیں اور بھیج دے گا اور یوں اس ملاقات سے کوئی بھی واقف نہیں ہو سکے گا۔

ثریا نے اس سے قبل کبھی کسی سہیلی کے گھر آنے جانے کے سلسلے میں اپنی ماں سے اجازت لیتے ہوئے جھوٹ نہیں بولا تھا اس لیے فطری طور پر اسے کئی دن ارادہ کرنے کے باوجود ماں سے اجازت لینے کی ہمت نہیں پڑی۔ مگر نذیراں اسے مستقل اُکساتی رہتی تھی۔ اور انتظام بھی یہی طے ہوا تھا کہ ثریا گھر سے تو اکیلی ہی نکلے گی مگر گھر سے کچھ آگے چل کر اسے نذیراں مل جائے گی۔ وہ سرِ راہ کوئی بات نہ کرے بس اس کے پیچھے چپ چاپ چلتی جائے۔ نذیراں اسے مطلوبہ مکان تک پہنچا دے گی، آخر ثریا کو ہمت کرنا ہی پڑی پھر بھی اس نے اتنی احتیاط کی کہ اجازت لیتے ہوئے دو دن کا وقفہ رکھا۔ بہانہ یہ کیا کہ دو دن بعد اس کی سہیلی فرحت کے یہاں کچھ اور سہیلیاں بھی کسی دعوت کے سلسلے میں جمع ہو رہی ہیں اس لیے وہ بھی جانا چاہتی ہے۔ وقت دوپہر کے ایک بجے کے بعد کا رکھا گیا اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ چونکہ گرمیوں کا موسم تھا اس لیے بارہ ایک بجے سے لے کر سہ پہر کے تین چار بجے تک محلّے کی سڑکیں اور گلیاں عموماً ویران اور سنسان رہا کرتی تھیں۔ اس لیے یہ امکان کم تھا کہ کوئی ثریا کو آتے جاتے دیکھ لے گا۔ دوسرا پہلو اس وقت کے تقرر میں یہ تھا کہ ثریا اپنے والد کے دفتر سے واپس لوٹنے سے پہلے گھر آ سکتی تھی۔

☆☆☆

اشرف صاحب کو حبیب الرحمان صاحب کے گھر منتقل ہوئے تقریباً پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران انہوں نے کمپنی کے تمام کاروباری اور تنظیمی امور سے واقفیت اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غیر معمولی محنت، لگن اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ کمپنی کے مالک عبداللطیف صاحب ان کی اس محنت اور احساسِ ذمّے داری سے بہت خوش تھے اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی تھی کہ چھ ماہ کی عارضی تقرری کی مدت گزرنے کے بعد اشرف صاحب کو ان کی جگہ مستقل کر دیا جائے گا۔ دفتر کے جملہ اسٹاف کے ساتھ بھی اشرف صاحب کا طرزِ عمل اس قدر اچھا تھا کہ سب ہی لوگ ان کی نہ صرف عزت و احترام کرتے تھے بلکہ انہیں دل سے پسند بھی کرتے تھے۔

اس دوران ان کے ساتھ میرے روابط حسبِ معمول تھے۔ ہمارے درمیان عموماً صرف دفتری معاملات پر گفتگو ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت تو نہیں مگر بعد میں زندگی میں ایک دو موڑ ایسے آئے جن سے احساس ہوا کہ میں اور اشرف صاحب ایک دوسرے کو نیم شعوری کیفیت کے ساتھ پسند کرنے لگے تھے۔ ان کا رویّہ وہی کام سے کام رکھنے والا تھا اور میں بھی غیر ضروری طور پر ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی لیکن اس کے باوجود ہمارے تعلق میں بہت کچھ بے تکلفی اور اپنائیت آ گئی تھی۔ کبھی کبھی ان کی نگاہیں مجھے کوئی ایسا پیغام دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں جس کا اظہار ان کی زبان سے بالکل نہیں ہوتا تھا اور اسی طرح میرے دل میں ان کے لیے کوئی ایسا نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا جو پرسنل سیکریٹری اور منیجر کے دفتری تعلقات سے کچھ مختلف نوعیت کا تھا۔

اس تبدیلی کا پہلا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میری پھوپی اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئیں۔ بزرگوں کے درمیان یہ بات بہت پہلے سے کم و بیش طے تھی کہ وقت آنے پر میری شادی شہزاد سے ہوگی، جو میڈیکل تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

پھوپی نے بتایا (اور ہمیں معلوم بھی تھا) کہ شہزاد نے ایم بی بی ایس پاس کرلیا ہے اور ان دنوں ہاؤس جاب کررہا ہے۔ سال بھر کے بعد وہ یا تو کسی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں سروس کی کوشش کرے گا یا پھر اپنا ذاتی کلینک کھول لے گا۔ اس لیے شادی بے شک اس سلسلے میں کوئی واضح قدم اُٹھانے کے بعد ہونا چاہیے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ذہنوں میں موجود ایک رشتہ کو کم سے کم روایتی اور رسمی حیثیت تو دے دی جائے۔ دوسرے الفاظ میں ان کا مقصد تھا کہ وہ انگوٹھی پہنا کر بہت سادگی سے منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتی ہیں۔ شہزاد میرے پھوپی زاد تھے۔ میں انہیں بچپن سے جانتی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بزرگوں نے ہم دونوں کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ اس لیے فطری طور پر میں انہیں پسند کرتی تھی اور شادی کے حوالے سے ان سے زندگی بھر کی رفاقت کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی اُلجھن یا پریشانی نہیں تھی بلکہ جیسا کہ عام حالات میں ہوتا ہے، اس بات کے تذکرے سے دل میں خوشی کا احساس ہوتا تھا اور کچھ انجانے خواب آنکھوں کو سجانے لگتے تھے۔ پھوپی یہ تجویز لے کر آئیں تو ظاہر ہے کہ میرے والدین کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ انہوں نے فوراً منظور کرلیا۔ مگر عجیب سی بات تھی کہ مجھے یہ خبر سن کر جو خوشی ہونا چاہیے تھی، اس کا احساس دور دور تک نہیں تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا، اس ایک طرح کی افسردگی کی تہ میں جھانکا تو احساس ہوا کہ شاید میں اشرف صاحب کو چاہنے لگی ہوں۔ اگرچہ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ جذبہ یکطرفہ نہیں ہے لیکن ان کی جانب سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو مجھے ان کے دل کی کیفیت کا یقین دلاتی۔ چنانچہ میں یہ خبر سن کر بھی خاموش رہی اور جب منگنی کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی گئی تب بھی کوئی ردِعمل کیے بغیر لب بستہ سب کچھ ہونے دیا۔ البتہ نہ جانے کس خیال کے تحت میں وہ انگوٹھی پہن کر کبھی دفتر نہیں گئی۔

☆☆☆

ایک دن میری طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی، سر میں درد تھا اور کچھ حرارت بھی محسوس ہورہی تھی۔ میں دفتر تو چلی گئی لیکن کام کرنا مشکل معلوم ہورہا تھا۔ اشرف صاحب نے میری کیفیت دیکھتے ہوئے مجھے لنچ ٹائم کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میں بس سے دفتر آتی جاتی تھی۔ بس اسٹاپ گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں بس سے اُتر کر گھر جارہی تھی کہ میں نے ثریا کو نذیراں کے ساتھ جاتے دیکھا۔ میں سڑک کے دوسری جانب فٹ پاتھ پر چل رہی تھی اس لیے غالباً ان دونوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے ثریا کو نذیراں کے ساتھ کہیں جاتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ نذیراں کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں نے اسے کئی مرتبہ یعقوب کے گھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس لیے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس وقت یہ دونوں کہاں جارہی ہیں؟ میں بھی ان کے تعاقب میں چل پڑی۔ جلد ہی نذیراں ایک گلی میں گھوم گئی اور اس کے ساتھ ثریا بھی۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے ان دونوں کو ایک مکان کے عقبی دروازے میں داخل ہوتے دیکھا اور فوراً پہچان لیا کہ وہ یعقوب کے مکان کا عقبی دروازہ تھا۔

اس سنسان دوپہر میں نذیراں ثریا کو لے کر یعقوب کے گھر کیوں گئی ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر تھا کہ نذیراں، ثریا کی لاعلمی میں یا اسے کسی طرح بہلا پھسلا کر یعقوب کا شکار بنانے لائی ہے۔ میں نے بغیر کسی مضبوط دفاع کے یعقوب کے گھر میں داخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ جتنی جلدی ممکن ہوسکتا تھا، گھر آئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد گھر کے افراد عموماً آرام کرنے لیٹ جاتے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ کسی نے مجھے گھر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابو کا ریوالور کس الماری کی دراز میں رکھا رہتا ہے۔ میں نے خاموشی سے ریوالور نکالا۔ اطمینان کیا کہ وہ بھرا ہوا ہے اور پھر جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے دوبارہ گھر سے باہر نکل گئی۔ میری منزل یعقوب کا مکان تھا۔

☆☆☆

ثریا نذیراں کے ساتھ اس گھر میں داخل تو ہوگئی مگر وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ نذیراں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ آرام سے کمرے میں بیٹھ جائے اشرف کچھ ہی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ اور اتنا کہہ کر وہ ثریا کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر واپس چلی گئی کہ دو گھنٹے کے بعد آئے گی اور تب اسے اس کے گھر تک پہنچا دے گی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرے میں کوئی داخل ہوا اور ثریا نے خطرے کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ دیکھا کہ وہ اشرف نہیں یعقوب ہے۔

وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور بھاگ کر کمرے سے نکل جانا چاہا لیکن یعقوب نے اس کا راستہ روک لیا۔

''اب تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے جو کچھ میں کہوں، کرتی جاؤ۔'' اس نے کہا ''اس وقت تم میرے گھر میں موجود ہو اور میں تمہیں نہیں لایا، تم اپنی مرضی سے آئی ہو۔ اگر شور مچاؤ گی تو بلاشبہ محلّے والے جمع ہوجائیں گے۔ مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں یا ناکام، تمہیں میرے گھر سے برآمد ہوتے دیکھ کر محلے والے جو رائے قائم کریں گے وہ ظاہر ہے۔ تم اپنی بے گناہی میں کچھ بھی کہو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ مجھے سب ہی جانتے ہیں۔ تم سارے محلے میں بدنام ہو جاؤ گی اور تمہارے ماں باپ اس ذلت و رسوائی کو سہہ کر زندہ بھی رہے تب بھی تمہاری زندگی لازماً برباد ہو جائے گی۔ کوئی تمہیں قبول نہیں کرے گا۔ اتنا ہی نہیں تمہاری بہن اور بھائیوں کا مستقبل بھی تباہ ہو جائے گا۔ اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ میری بات مان لو۔ تھوڑی سی دیر کی بات ہے۔ پھر نذیراں جس طرح چپکے سے تمہیں یہاں لائی ہے، تمہارے گھر بھی پہنچا دے گی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی کہ یہاں کیا کچھ ہو گیا؟ میں بھی آئندہ تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔"

ثریا نے جان لیا کہ وہ بُری طرح پھنس چکی ہے۔ یعقوب جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ نذیراں اگر یعقوب کی آلہ کار تھی تو اشرف نے اسے اپنا راز دار کیوں بنایا؟ فوری طور پر اس کے ذہن میں جو خیال آ رہا تھا وہ یہی تھا کہ اشرف نے کسی اور جگہ ملنے کے لیے بلایا ہوگا مگر نذیراں اسے دھوکا دے کر اور یعقوب سے سازش کر کے اسے یہاں لے آئی۔ مگر یہ تمام باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں بعد میں بھی سوچا اور معلوم کیا جا سکتا تھا۔ سر دست تو اسے یعقوب کے ہاتھوں سے خود کو بچانا تھا۔ چنانچہ ثریا نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ شور تو بے شک نہیں مچائے گی مگر پوری طاقت سے یعقوب کی مزاحمت کرے گی اور خواہ اسے اپنی جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑے، وہ یعقوب کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

یعقوب نے ثریا پر قابو پانا چاہا اور ثریا اِدھر اُدھر بھاگ کر کمرے میں رکھی ہوئی مختلف چیزیں یعقوب پر پھینک کر مارتے ہوئے خود کو اس کی دسترس سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

اندر یہ کشمکش ہو رہی تھی کہ میں نے یعقوب کے بیرونی دروازے پر دستک دی۔ یعقوب دستک سن کر یقیناً چونک پڑا ہوگا۔ اس نے کچھ دیر میری دستک کو نظر انداز کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن پھر اسے مجبوراً یہ دیکھنے کے لیے دروازے تک آنا ہی پڑا کہ اس وقت اس کے عزائم کے راستے میں مزاحم ہونے والی یہ دوسری ہستی کون ہے؟ اس نے ثریا کو اسی کمرے میں بند کرتے ہوئے باہر سے دروازے کی چٹخنی لگا دی اور پھر چند لمحے کے بعد بیرونی دروازہ کھل گیا۔

میں ہاتھ میں ریوالور لیے دروازہ کھلنے کی منتظر ہی تھی جیسے ہی پٹ کھلا، میں اسے زور سے دھکا دیتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ یعقوب لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ وہ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔

"کیا..... کیا بات ہے؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ثریا کو بڑی چالاکی سے اپنے گھر بلایا ہے اور کیوں بلایا ہے اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ..... آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔" وہ بولا "میں گھر میں بالکل اکیلا ہوں۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا "میں گھر کی تلاشی لینا چاہتی ہوں۔"

گھر میں دو کمرے تھے جن میں سے ایک کا دروازہ کھلا اور دوسرے کا باہر سے بند نظر آ رہا تھا اس لیے یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی کہ ثریا کس کمرے میں ہو سکتی ہے۔ میں نے یعقوب کو ریوالور کی زد پر رکھے ہوئے اسی کمرے کی جانب قدم بڑھائے۔ دروازے تک پہنچی، چٹخنی کھولی۔ اِدھر میں نے چٹخنی پر ہاتھ رکھا اُدھر یعقوب نے بیرونی دروازے کی طرف ایک جست لگائی اور بھاگ نکلا۔ میں اس کے پیچھے لپکی مگر وہ تو گھر سے باہر نکل کر بگٹٹ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ میں بیرونی دروازہ اندر سے بند کر کے واپس آئی، کمرا کھولا۔

ثریا ایک گوشے میں سہمی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھی اور بے اختیار روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔

"نجمہ باجی!" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی "اس وقت خدا نے آپ کو اپنی رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ اگر آپ نہ آ جاتیں تو میں برباد ہو جاتی۔"

"میں نے تمہیں نذیراں کے ساتھ اس مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔" میں نے بتایا "اور جانتی تھی کہ یہ یعقوب کا مکان ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم دانستہ اس بدمعاش کے قبضے میں کیسے آ گئیں؟"

پہلے ثریا کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھی مگر میں نے اسے سمجھایا کہ جب تک وہ مجھے تمام حالات بالکل سچ سچ نہیں بتائے گی، میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔ ممکن ہے میرے علاوہ کسی اور نے بھی اسے یعقوب کے مکان میں

آتے دیکھ لیا ہو ایسی صورت میں یہ بات چند روز کے اندر پورے محلے میں اس کی اور اس کے خاندان کی ذلت اور رسوائی کا سبب بن سکتی ہے۔ خدا نے اسے یعقوب سے بچا لیا مگر وہ کس کس کو یقین دلائے گی کہ یعقوب کے گھر سے آنے کے بعد وہ پاک دامن ہی ہے۔

اور پھر بالآخر ثریا نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ قدرتی طور پر مجھے اس کے بیان کردہ واقعات سن کر افسوس ہوا۔ مجھے اشرف سے کسی ایسی حرکت کی خواب میں بھی توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے بے حد غصہ بھی آیا کہ وہ ایک طرف اپنی خاموش نظروں سے میرے دل کے دروازے پر دستک دینے کی کوشش کرتے رہے اور دوسری جانب ثریا جیسی معصوم سیدھی سادی لڑکی کو عشقیہ خطوط لکھ لکھ کر اپنی محبت کے جال میں پھانستے رہے۔ مگر یہ غصہ کے جذبات تھوڑی دیر کے لیے ہی تھے۔ دوسرے لمحے میری نگاہوں کے سامنے ان کا مجموعی طرزِ عمل آ گیا۔ دل کے اندر سے آواز ابھری کہ نہیں، ایسے آدمی کے خلاف کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر شک کرنا مناسب بات نہیں ہے۔

"تمہارے پاس وہ تمام خطوط تو ہوں گے جو اشرف صاحب نے تمہیں لکھے ہیں؟" میں نے ثریا سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ثریا نے سر جھکائے جواب دیا۔ "مگر مجھے اس واقعے میں ان کی کوئی شرارت نہیں معلوم ہوتی۔ نذیراں نے میری طرح انہیں بھی دھوکا دیا ہے۔ انہوں نے مجھے کہیں اور بلایا ہوگا مگر نذیراں مجھے یہاں لے آئی۔"

"کیا اس وقت بھی تمہارے پاس ان کا کوئی خط ہے؟" میں نے ثریا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ثریا نے اثبات میں جواب دیا "میرے پاس ان کا آخری خط ہے جس میں انہوں نے آج ملنے کے لیے بلایا تھا۔"

"ذرا مجھے تو دکھاؤ۔"

ثریا نے وہ خط مجھے دے دیا۔ میں نے اسے کھولا اور اس کی عبارت پر ایک نظر ڈالتے ہی سمجھ گئی کہ یہ اشرف صاحب کا خط نہیں ہو سکتا۔ میں ان کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ ان کی تحریر اور اندازِ تحریر دونوں سے واقف تھی۔ خط کی تحریر اشرف صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی عبارت آرائی سے ان کے اندازِ تحریر کو کوئی نسبت تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ثریا نے عبارت کے انداز سے یہ اندازہ کیوں نہیں لگا لیا کہ وہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور شریف نوجوان کا خط نہیں ہو سکتا۔ خط کے الفاظ اور فقرے۔ اگرچہ یعقوب نے بہت احتیاط کی تھی۔ بڑے عامیانہ اور سوقیانہ انداز میں لکھے تھے۔ اب یہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں رہا تھا کہ اشرف صاحب کا اس تمام واقعے سے سرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یقیناً وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔ یعقوب نے نذیراں کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ نذیراں نے ثریا کی حالت دیکھی اور اس کی تجربہ کار نظروں نے تاڑ لیا کہ ثریا اشرف صاحب کو چاہتی ہے۔ اس نے اشرف صاحب کا نام استعمال کر کے ثریا اور یعقوب کے درمیان خط و کتابت کرائی اور جب دیکھ لیا کہ پھل شاخ سے خود بہ خود گر سکتا ہے تو اس ملاقات کی سازش تیار کی۔ اگر خوش قسمتی سے میں نذیراں اور ثریا کو نہ دیکھ لیتی تو یعقوب کو اپنی سازش میں کامیابی کا قطعی امکان تھا۔

اب میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میں ثریا کو کیسے بتاؤں، اسے خطوط لکھنے والا یعقوب تھا۔ وہ اشرف صاحب سے بے پناہ محبت کرتی ہے، یہ بات اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہوگی کہ اشرف اس سے محبت نہیں کرتے اور وہ اتنے دنوں سے محض ایک خوبصورت خواب ہی دیکھ رہی تھی۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ یعقوب کے چنگل میں آتے آتے بچی تھی۔ یہ انکشاف اس کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا "اب تم میرے ساتھ اپنے گھر چلو اور کسی سے بھی آج کے واقعے کا ذکر مت کرنا۔"

"مگر..... مگر..... اشرف میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" ثریا نے آہستہ سے کہا۔

"کیا تم اس حالت میں بھی ان سے ملنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا "سر دست تمہیں اس واقعہ کو سب سے چھپانا ہوگا۔ نذیراں تو اب تمہارے گھر میں قدم نہیں رکھے گی مگر خدا کے لیے تم اشرف صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوئی کوشش مت کرنا۔ ضرورت ہوگی تو وہ خود ہی تم سے بات کرنے کا کوئی اور ذریعہ تلاش کر لیں گے۔"

ثریا نے اثبات میں سر ہلایا۔ چادر اوڑھی۔ میں اسے عقبی دروازے سے ساتھ لے کر باہر نکلی۔ اسے اپنے گھر سے چلے ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ وہ گھر میں سب کو یہی بتائے کہ چونکہ تمام سہیلیاں جمع نہیں ہو سکی تھیں اس لیے دعوت ملتوی کر دی گئی۔

☆☆☆

میرا خیال تھا کہ یعقوب اپنی سلامتی کے خیال سے کوئی مزید کارروائی نہیں کرے گا۔ میں اس کے خلاف عینی گواہ تھی۔ نذیراں سے بھی اعترافِ جرم کرایا جا سکتا تھا اس لیے اگر پولیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں رپورٹ درج کردی جاتی تو یقیناً یعقوب مشکل میں پڑ جاتا۔ مگر وہ شیطان صفت انسان دوسرے پہلو سے حملہ آور ہوا۔ اس نے حبیب الرحمان صاحب کو ایک خط لکھا کہ وہ اپنی بیٹی ثریا کی شادی اس کے ساتھ کردیں کیونکہ وہ اور ثریا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے درمیان کئی ماہ سے محبت بھری خط و کتابت جاری ہے جس کے ثبوت میں وہ ثریا کا ایک خط بھی اپنے مکتوب کے ساتھ روانہ کررہا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر حبیب صاحب نے شادی سے انکار کیا یا ان کے زور زبردستی سے ثریا نے بھی اس کے ساتھ محبت سے انکار کردیا تب بھی وہ باز آنے والا نہیں ہے اور ثریا کے لکھے ہوئے تمام خط سارے محلّے کے گھروں میں بھجوادے گا۔ مزید یہ کہ ثریا کی کہیں اور شادی بھی نہیں ہونے دے گا۔ اوّل تو اس رسوائی کے بعد کوئی شریف آدمی رشتہ لے کر آئے گا ہی نہیں اور آیا بھی تو وہ اسے تمام واقعات بتا کر لوٹ جانے پر مجبور کردے گا۔ مجھے یعقوب کی جسارت پر حیرت ہوئی کہ اس نے اس دوپہر کے واقعے کا بھی ذکر کردیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ثریا اپنی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ بنا کر اس سے ملنے اس کے گھر آئی تھی اور اس کی گواہ مس نجمہ بھی ہیں جو بعد میں اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ یعقوب کو یہ جرأت اس بات سے ہوئی ہے کہ ہم نے اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی اس سے اس نے اندازہ لگالیا کہ حبیب صاحب اپنی عزت بچانے اور رسوائی سے بچنے کے لیے اب بھی پولیس کے پاس جانے کی کوشش نہیں کریں گے۔

فطری طور پر حبیب صاحب کو یہ خط پا کر بے حد صدمہ ہوا۔ انہوں نے ثریا سے باز پرس کی اور ثریا نے صاف انکار کردیا کہ اس نے یعقوب کو ہرگز کوئی خط نہیں لکھا۔ مگر وہ اس سے کیسے مکر جاتی کہ جو خط یعقوب نے بھیجا تھا وہ اس کا تحریر کردہ نہیں تھا۔ وہ اشرف کا نام نہیں لے سکتی تھی۔ مجبوراً اسے خاموش ہونا پڑا اور اس کی خاموشی سے حبیب صاحب نے یہی اندازہ لگایا کہ یعقوب نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے۔ انہوں نے ثریا کے یعقوب کے گھر جانے کے واقعے کی تصدیق کے لیے مجھ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ ایسے موضوع پر بات کرنے وہ میرے گھر نہیں جاسکتے تھے اس لیے دفتر آئے اور مجھے یعقوب کا خط دکھاتے ہوئے وضاحت چاہی۔ میں نے دفتر میں اس نوعیت کی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا کہ ان کے گھر آکر بات کروں گی۔

دوسری طرف ثریا کو بھی یہ معلوم کرکے شاک پہنچا تھا کہ اس کے خطوط یعقوب کے پاس ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس نے جو خط اشرف صاحب کو لکھے تھے وہ یعقوب کے پاس کیسے پہنچ گئے۔ اگر نذیراں درمیان میں نہ ہوتی تو اشرف صاحب کو موردِ الزام ٹھہراتی لیکن اس کا ذہن ایک جواب دے رہا تھا کہ اس کے خط نذیراں کے ذریعے یعقوب تک پہنچے ہیں۔ اور اگر اس کے لکھے ہوئے نذیراں نے یعقوب کو دیے تھے تو پھر اشرف صاحب خطوط کا جواب کیسے دے رہے تھے؟ وہ اسی خلجان میں مبتلا تھی کہ میں اپنے وعدے کے مطابق اسی شام کو حبیب صاحب کے گھر گئی اور مجھے حالات کے تحت سب کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اپنا اندازہ..... جو حقیقت پر مبنی تھا، بتانا پڑا۔ میں نے کہا کہ ثریا غیر شعوری طور پر اشرف صاحب کو پسند کرنے لگی تھی۔ دوسری طرف یعقوب اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نذیراں کو استعمال کیا۔ نذیراں نے چند دنوں میں ہی اندازہ لگالیا کہ ثریا اشرف صاحب کو چاہتی ہے اور اس نے اس کی اس چاہت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ثریا کو خط و کتابت پر آمادہ کیا۔ وہ تمام خطوط یعقوب نے لکھے تھے جنہیں نذیراں اشرف صاحب کے خطوط بتا کر ثریا کو دیتی رہی۔ اس دن وہ ثریا کو اشرف صاحب سے ملانے کا جھانسا دے کر ہی اپنے ساتھ لے گئی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ میری مداخلت کی وجہ سے یعقوب اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ جہاں تک میرا خیال ہے اشرف صاحب ان تمام باتوں سے نہ صرف یہ کہ غیر متعلق ہیں بلکہ ان کے وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ کوئی اس طرح ان کے نام کو استعمال کررہا ہے۔

بات اتنی صاف اور واضح تھی کہ حبیب صاحب کی سمجھ میں آگئی۔

"مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا، کیا جائے؟" انہوں نے پوچھا۔

"میرے نزدیک اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل ہے۔" میں نے جواب دیا "کہ ثریا کی شادی اشرف صاحب سے کردی جائے۔"

"کوئی رشتہ یکطرفہ طور پر قائم نہیں ہوتا۔" حبیب صاحب نے افسردگی سے کہا "اگر اشرف کے والدین رشتہ لے کر آتے تو میں اسے اپنی اور ثریا کی خوش نصیبی خیال کرتا مگر موجودہ صورتِ حال میں کیا بے شرم بن کر میں اشرف سے بات کروں کہ میری لڑکی کو قبول کرلو اور پھر وہ قبول بھی کرلیں تو یعقوب کا کیا ہوگا جو ہمیں ذلیل و رسوا کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے؟"

"کام بلاشبہ بہت مشکل ہے۔" میں بولی "لیکن ہمیں خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اشرف صاحب بہت شریف النفس آدمی ہیں۔ شادی کے سلسلے میں، میں ان سے بات کروں گی اور مجھے امید ہے کہ حالات سے واقف ہوکر بھی وہ آمادہ ہوجائیں گے۔ رہا یعقوب تو میں اس کا بھی کوئی علاج کرنے کی کوشش کروں گی۔"

میری بات سن کر حبیب صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"بیٹی، اگر تم ہمیں اس ذلت و رسوائی سے بچالو تو ہم ساری زندگی تمہارے احسان مند رہیں گے۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ان سے بات کرکے میں ثریا سے بھی ملی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ برابر کے کمرے میں ہماری گفتگو سن رہی ہوگی۔ اور یہ اندازہ درست ہی تھا۔ جب میں اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ بری طرح آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"قسمت میں کیا لکھا ہے، کوئی نہیں جانتا۔" میں نے کہا "لیکن تمہاری لگن اگر سچی ہے تو کامیابی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ جو ہونا تھا، ہوچکا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بدمعاش تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ اس کی دھمکیوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ابو پولیس انسپکٹر رہ چکے ہیں۔ میں یعقوب کو ایسا سبق دوں گی کہ وہ ساری زندگی نہیں بھلا سکے گا۔"

"مگر میں اپنے والدین اور خود اپنی نظروں سے تو گر ہی گئی۔" ثریا روتے ہوئے بولی "اشرف صاحب کو اس بارے میں معلوم ہوگا تو وہ کیا سوچیں گے؟"

"تم سے انجانے میں ایک غلطی ہوگئی تھی اور بس!" میں نے جواب دیا "اب اسے بھول جاؤ۔ جہاں تک اشرف صاحب کا تعلق ہے تو انہوں نے تمہیں دیکھا ہے اور کون ایسا بے دل انسان ہوگا کہ تمہیں دیکھنے کے بعد پسند نہ کرے۔ عین ممکن ہے کہ وہ بھی دل ہی دل میں تمہیں چاہتے ہوں اور مناسب وقت کے انتظار میں ہوں کہ جب وہ تمہارے والدین سے تمہارا ہاتھ مانگ سکیں۔"

"آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، وہ سچ بھی ہو تو تمام حالات معلوم ہونے کے بعد ان کی نظروں میں میری کیا عزت رہ جائے گی؟"

"اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "کیا یہ ممکن نہیں کہ جب اشرف صاحب کو معلوم ہو کہ تم انہیں چاہتی ہو اور تمہیں ان ہی کی چاہت کے نام پر دھوکا دیا گیا تھا تو وہ تمہاری محبت کے اور زیادہ قائل ہوجائیں۔"

"کیا ایسا ہوسکتا ہے؟"

"سب کچھ ہوسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا "مجھ پر بھروسا رکھو، میں تمہاری خوشی کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھوں گی۔"

☆☆☆

دوسرے دن میں نے اشرف صاحب سے آفس کی تنہائی میں ملاقات کی۔ ان کو تمام واقعات بلاکم و کاست سنادیے۔

"اب ثریا کی زندگی اور اس شریف خاندان کو ذلت و رسوائی سے بچانا آپ کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے آخر میں کہا "آپ نے خود بھی دیکھا ہوگا کہ ثریا بہت ہی پیاری لڑکی ہے، وہ آپ کی زندگی کو خوشیوں سے بھردے گی۔"

"میں مانتا ہوں کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اشرف نے جواب دیا "مگر میں نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"تو اب دیکھ لیں۔" میں نے قدرے شوخی سے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ میں کبھی تم سے اس موضوع پر بات نہیں کرسکوں گا۔" دفعتاً اشرف نے کہا "لیکن اب تم نے محبت کے موضوع کو چھیڑ ہی دیا ہے تو کہنے کی ہمت کررہا ہوں کہ مجھے بھی کسی سے محبت ہے مگر وہ ثریا نہیں ہے، تم ہو۔ کیا تم آیندہ زندگی میں میرا ساتھ دینا قبول کرسکو گی؟"

مجھے توقع نہیں تھی کہ بات یکدم اس طرح پلٹ جائے گی۔ کچھ دیر کے لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ یہ بات بہرحال ثابت ہوگئی تھی کہ اشرف صاحب کے بارے میں میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے جذباتی شاک بھی لگا۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر معاشرتی شرم و حجاب نے ہمیں اپنے اپنے خیالات کے اظہار سے باز رکھا۔ اس ایک لمحے میں مجھے یقین ہوگیا کہ اگر یہ بات اشرف صاحب کی زبان پر پہلے آجاتی تو میں شہزاد سے منگنی پر کبھی آمادہ نہ ہوتی مگر اب وہ وقت گزر چکا تھا۔ تقدیر اپنا فیصلہ دے چکی تھی۔

"آپ نے اپنے جذبات کے اظہار میں بہت دیر کردی۔" میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب میری منگنی میرے پھوپی زاد کے ساتھ ہوچکی ہے اور ہمارے ہاں منگنی کو بھی نکاح جیسی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ میں چاہوں بھی تو اب اس فیصلے سے بغاوت نہیں کرسکتی۔ آپ ایک ذہین اور سمجھ دار انسان ہیں۔ اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ آپ یقیناً مجھے اپنے والدین اور خاندان کی عزت و شرافت کے خلاف کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدم اُٹھانے کا مشورہ نہیں دیں گے۔"

میری بات سن کر اشرف صاحب کا چہرہ زرد اور افسردہ ہو گیا تھا۔

"مگر میں تمہیں کھونے کے بعد زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ تو کر سکتا ہوں؟" وہ بولے "یہ تو میرے اختیار میں ہے۔"

"آپ ایسا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا "مگر آپ کو ایسا کرنا نہیں چاہیے۔ آپ ایک پریکٹیکل ذہن رکھنے والے آدمی ہیں۔ آپ کو سوچنا ہوگا کہ اس فیصلے کا تعلق تنہا آپ کی ذات سے نہیں۔ آپ کے والدین بہن بھائیوں نے بھی آپ سے کچھ توقعات وابستہ کر رکھی ہوں گی۔ خاص طور سے والدین۔ آپ صرف اپنی ضد کے لیے ان سب کی خوشیوں کو برباد نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وقت جلد یا بدیر ہر زخم کو بھر دیتا ہے، ہر صدمے کو بھلا دیتا ہے اور کسی بھی فرد کے لیے تنہائی اور اکیلے پن کی زندگی گزارنا، کسی ہمدم دمساز، کسی مونس وغمگسار کے بغیر زندہ رہنا انتہائی مشکل اور اپنے آپ کو ایک کڑی آزمائش میں ڈالنا ہے۔ تو آپ ایسا فیصلہ کریں ہی کیوں جو آپ سمیت آپ سے متعلق کسی بھی فرد کے لیے مفید نہیں ہے اور جس کے بارے میں قوی اندیشہ ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی آپ کو بدلنا ہی پڑے گا۔"

"آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟" اشرف صاحب نے بے بسی سے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ ثریا کو قبول کر کے ایک شریف خاندان کو ذلت ورسوائی سے بچالیں۔" میں نے جواب دیا "محبت صرف پانے ہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی محبت کو بچانے کا نام بھی ہے۔ تقدیر یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اب میں اور آپ ایک ہی راستے کے راہی نہیں بن سکتے۔ تب پھر آپ کسی اور کو تباہی سے بچا کر ایثار وقربانی سے کام کیوں نہ لیں، جو آپ کی ناکامی میں بھی ایک امتیازی شان پیدا کر دے۔ ثریا آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی رفاقت نہ صرف آپ کو اپنا غم بھولنے میں مدد دے گی بلکہ ایک دن آئے گا جب آپ اس کی محبت کا جواب پورے خلوص کے ساتھ محبت ہی سے دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"میں اگر تمہاری بات مان بھی لوں تو ضروری نہیں کہ میرے والدین بھی اس رشتے کو تسلیم کر لیں۔" اشرف نے سوچتے ہوئے کہا "غریبی امیری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن جو لڑکی بدنام ہو چکی ہو..... خواہ غلط طور پر ہی سہی..... اسے کون سے والدین اپنی بہو بنانے پر آمادہ ہو جائیں گے؟"

"ثریا بدنام نہیں ہوگی۔ اس کا بندوبست کرلوں گی۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا "ابھی تک جو کچھ بھی ہوا ہے وہ اس کے والدین یا میرے اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔"

"تم اس بدمعاش یعقوب کو بھول رہی ہو۔ ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔" میں نے کہا "آپ صرف یہ وعدہ کریں کہ کچھ فرصت میں اپنے والدین کو خط لکھ کر ثریا سے شادی کی اجازت لیں گے۔ ضرورت پڑی تو گھر بھی جائیں گے اور اپنے والدین کو منا کر رشتہ لانے پر آمادہ کر لیں گے۔"

☆☆☆

میرے کہنے سننے کا اثر یہ ہوا کہ اشرف دوسرے ہی دن چند روز کی چھٹی لے کر اپنے شہر چلے گئے۔ دوسری طرف میں نے مقامی پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کیا۔ اس دوران یعقوب کو یہ تسلی ہو گئی تھی کہ ثریا کے والدین اس کے رشتے پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی جگہ خوش اور مطمئن تھا کہ اس نے ثریا کے والدین کو بھی اچھی طرح پھانس لیا ہے۔ وہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھا ہی نہیں سکتے۔

مجھے معلوم تھا کہ ماضی میں میرے ابو نے کئی مرتبہ یعقوب اور محلے کے دوسرے غنڈوں کے خلاف پولیس کی توجہ مبذول کرائی تھی لیکن ان کا سابقہ پولیس انسپکٹر ہونا بھی کام نہیں آیا اور کسی نامعلوم وجہ سے مقامی پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او نے کوئی کارروائی نہیں کی پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں ایک مرتبہ تو انسپکٹر چنگیزی سے ضرور ملوں گی اور اسے بتاؤں گی کہ اگر اس نے میری رپورٹ کو بھی نظر انداز کر دیا تو اگر مجھے آئی جی تک بھی جانا پڑا تو ضرور جاؤں گی۔

لیکن پولیس اسٹیشن پہنچی تو حالات کافی مختلف نظر آئے۔ اس سے قبل جو عملہ گپ شپ یا پھر کسی شغل بیکاری میں مصروف نظر آتا تھا، اپنی اپنی جگہ موجود اور کچھ نہ کچھ کام کرتا دکھائی دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انسپکٹر چنگیزی کا تبادلہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ جو نئے ایس ایچ او صاحب یعنی انسپکٹر عارف آئے ہیں، وہ نظم وضبط، اصول وقواعد کے بہت پابند ہیں۔ بلایت وتعل کیے یا انتظار کرائے انہوں نے مجھے ملنے کے لیے بلا لیا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف ابو کو جانتے ہیں بلکہ ان کے بے حد مداح بھی ہیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے یعقوب اور اس کے بدمعاش

ساتھیوں کے بارے میں بتایا اور پھر رازداری کا وعدہ لیتے ہوئے انہیں ثریا کے حالات بھی بتا دیے۔

''ان میں سے کسی کا بہ ظاہر کوئی ذریعۂ آمدنی معلوم نہیں ہوتا۔'' میں نے آخر میں کہا ''پھر بھی وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی قسم کے ناجائز اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اس لیے مجھے پورا یقین ہے کہ اگر آپ اچانک یعقوب کے مکان پر چھاپہ ماریں تو آپ کو وہاں سے ضرور ایسے ثبوت و شواہد مل جائیں گے جو انہیں برسوں تک جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے کافی ہوں، پھر بھی آپ کو اپنی کارروائی کے لیے کوئی شکایت، کوئی رپورٹ درکار ہو تو میرا نام لکھ لیں۔''

انسپکٹر عارف نے بڑی دیانت داری سے تعاون کیا۔ اسی رات یعقوب کے مکان پر چھاپہ مارا گیا اور خلاف توقع اس چھاپے میں انسپکٹر عارف کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یعقوب کے گھر سے چرس اور ہیروئن کی کثیر مقدار برآمد ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ آس پاس کے علاقوں میں ناجائز منشیات کی سپلائی کا کام کرتا تھا۔ اس کے کئی ساتھی بھی گرفتار کر لیے گئے اور ایک بہت ہی اچھی بات یہ ہوئی کہ یعقوب کی ایک الماری میں رکھے ہوئے ایک چھوٹے بکس میں ثریا کے تمام خطوط مل گئے اور یہ انسپکٹر عارف کی شرافت تھی کہ انہوں نے وہ بکس کارروائی سے الگ کر کے خاموشی کے ساتھ مجھے واپس کر دیا اور میں نے پہلی فرصت میں تمام خطوط جلا کر ضائع کر دیے۔ ثریا وہ تمام خط پہلے ہی جلا چکی تھی جو اسے اشرف کے نام سے یعقوب نے لکھے تھے۔

یعقوب اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کی گرفتاری سے نہ صرف اہالیان محلہ نے اطمینان کی سانس لی بلکہ حبیب الرحمان صاحب کو بھی بے حد خوشی ہوئی، خاص طور پر یہ معلوم کر کے کہ اب اگر یعقوب ضمانت پر یا اپنی سزا پوری کر کے رہا بھی ہو جائے تب بھی وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ ثریا کو فریب دے کر جو خط لکھوائے گئے تھے، اب ان کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔

''باجی، آپ نے مجھے تباہی سے اور میرے والدین کو ذلت و رسوائی سے بچا کر جو احسانِ عظیم کیا ہے اس کے لیے میں ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔'' اس نے کہا۔

میں نے موقع محل کی مناسبت سے مناسب الفاظ میں اسے جواب دیا۔ ظاہر تھا کہ یہ بات صرف میں اور اشرف ہی جانتے تھے کہ اگر قسمت نے انہیں پینگ گیسٹ بنا کر حبیب الرحمان صاحب کے گھر میں نہ پہنچا دیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اس آپ بیتی کا انجام کچھ اور ہی ہوتا۔

☆☆☆

تقریباً ایک ہفتے کے بعد اشرف اپنی والدہ اور بڑی بہن کو ساتھ لے کر واپس آئے، وہ لوگ حبیب الرحمان صاحب کے گھر گئیں۔ ثریا کو دیکھا۔ بے حد پسند کیا اور جس رشتے کو ایک گومگو کی کیفیت میں لے کر آئی تھیں، وہ پوری دلجمعی اور اطمینان خاطر کے ساتھ پیش کر دیا۔ حبیب صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اسی گفتگو میں اگلے دن منگنی اور دوسرے ماہ شادی کی تاریخ طے پا گئی۔ قسمت کی ایک اور ستم ظریفی یہ تھی کہ اشرف کی والدہ اور ہمشیرہ میرے گھر بہ طور مہمان ٹھہری تھیں۔

☆☆☆

اگلے ماہ ثریا اور اشرف کی شادی ہوگئی۔ دو مہینے بعد میں نے ملازمت چھوڑ دی کیونکہ میں بھی اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر اپنی پھوپی کے گھر جا چکی تھی اور شہزاد میری ملازمت کے حق میں نہیں تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ میرے سروس سے استعفیٰ دینے کے بعد اشرف صاحب بھی زیادہ دن اس کمپنی میں نہیں رہے۔ انہیں اپنے ہی شہر میں ایک اچھی جاب مل گئی جسے غنیمت جانتے ہوئے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ان کا یہ فیصلہ ہر اعتبار سے ضروری تھا۔ یہ درست ہے کہ شادی کے بعد ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور اکثر حالات میں یہ نیا رشتہ ان تمام پرانی یادوں کو رفتہ رفتہ ذہن سے بھلا دیتا ہے جن کے گاہے گاہے پھانس کی طرح چبھنے کا امکان ہو لیکن ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ ہم سب کے درمیان تعلقات قائم نہ رہتے اور ہوسکتا تھا کہ کسی لمحہ ہمیں گزری باتیں افسردہ کر دیا کرتیں۔

آج میں بالکل نہیں جانتی کہ ثریا اور اشرف کہاں اور کس حال میں ہیں کیونکہ اشرف صاحب نے جب خود وہ شہر چھوڑا تو حبیب صاحب اور ان کے اہلِ خاندان کو بھی مجبور کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ غالباً انہیں بھی یہی خطرہ تھا کہ ایک ہی شہر کی فضا میں موجود رہتے ہوئے ہم اپنی اپنی قسمت کے فیصلوں کے ساتھ شاید مکمل انصاف نہیں کر سکیں گے۔ میں بہر حال شہزاد کی رفاقت اور اپنے بچوں کی معیت میں ایک خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں اور دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ ثریا اور اشرف جہاں بھی ہوں، وہ بھی ایک کامیاب اور مسرتوں سے بھرپور گھریلو اور ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

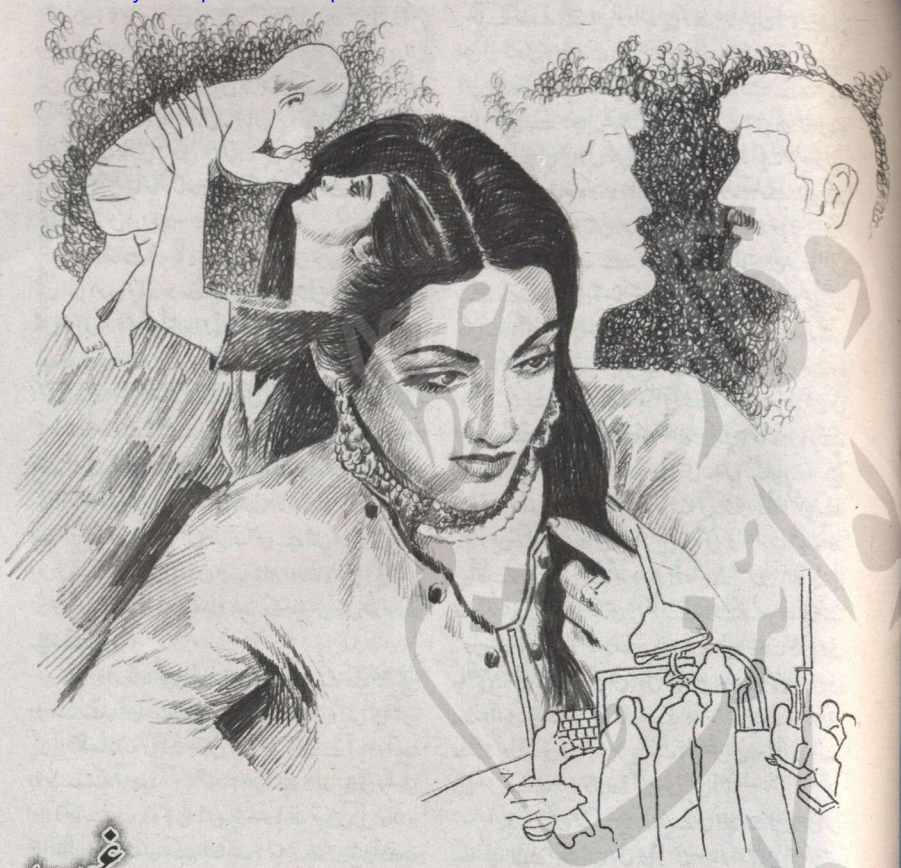

غیب

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

گزشتہ ماہ میں نے ایک ڈاکٹر کی آپ بیتی پڑھی۔ پیشے کے اعتبار سے میں بھی ڈاکٹر ہوں، میرے پاس بھی ایک بہت دلچسپ آپ بیتی ہے اس کو بھیج رہی ہوں۔ اگر پسند آجائے تو شائع کردیں۔

ڈاکٹر منیرہ سرفراز

(فیصل آباد)

آدمی کو غیب کا علم نہیں ہے۔ وہ آنے والے کل کے بارے میں اندازہ تو لگا سکتا ہے مگر دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ مستقبل اس کے لیے کیا لے کر آرہا ہے۔ اسی طرح تقدیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو کچھ بھی ہم پر بیت چکا ہے، بیت رہا ہے یا بیتنے والا ہے، وہ پہلے سے ہی ہماری تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا اور یہ کہ ہم خواہ کیسی ہی تدبیر کیوں نہ کرلیں، تقدیر نہیں بدل سکتی۔ یہ سب کچھ سچ سہی لیکن کبھی کبھی زندگی ایسے حالات وواقعات سے بھی دوچار ہوتی ہے کہ انہونی بات ہوجاتی ہے۔ بہ ظاہر جو کچھ قسمت کا لکھا معلوم ہو رہا ہو، وہ بدل جاتا ہے۔ کسی انسانی تدبیر کے نتیجے میں نہیں بلکہ کسی ایسے نیک عمل یا دعاؤں کے باعث جو رب کائنات کی بارگاہ میں مقبول ہوجائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا نام منیرہ ہے۔ پیشے کے اعتبار سے لیڈی ڈاکٹر ہوں اور میں نے اپنی تقریباً تیس سالہ پریکٹس کے دوران میں ایسے کئی معجزے دیکھے ہیں کہ جہاں جدید ترین میڈیکل سائنس فیل اور ناکام ہوگئی۔ وہاں پروردگار کی رحمت نے بگڑی بات بنادی۔ ایسی ہی ایک سچی کہانی جسے ایک حد تک آپ بیتی بھی کہا جاسکتا ہے، میں آج سرگزشت کے قارئین کی نذر کررہی ہوں۔

یہ واقعات تقریباً دس بارہ سال قبل پیش آئے تھے۔ میں ان دنوں ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال اور میٹرنٹی ہوم میں سروس کررہی تھی لیکن اس کہانی کے بیشتر مرکزی کرداروں سے میری واقفیت میرے پیشے کی مرہونِ منت نہیں تھی۔ میں انہیں اپنے ہوش سنبھالنے سے جانتی تھی۔ ہم ایک ہی محلّے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے۔ خاندانی تفصیلات اور پس منظر کی جزویات میں جاؤں تو بات بہت طویل ہوجائے گی اور عملاً اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا کہ کہانی کے واقعات سے ان کا براہِ راست تعلق نہیں۔ اس لیے میں کہانی کا آغاز اس زمانے سے کررہی ہوں جب ناصر اور حامد اپنی اپنی تعلیم مکمل کرکے زندگی کی عملی جدوجہد کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔

ناصر اور حامد بچپن سے ہی ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ان کے درمیان کوئی رشتے داری نہیں تھی لیکن سچی اور مخلصانہ دوستی نے انہیں حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب کردیا تھا۔ ناصر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھ رہا تھا تو اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے والد ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ وہ ایلو پیتھک دواؤں کے ہول سیلر ڈیلر تھے۔ چنانچہ تعلیم سے فارغ ہوکر ناصر نے اپنے والد کا کاروبار سنبھال لیا۔ حامد کے والد سرکاری ملازمت میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ وہ بیٹے کو بھی سرکاری ملازمت میں لانا چاہتے تھے مگر حامد کو انجینئرنگ سے دلچسپی تھی۔ وہ بچپن سے ہی پائلٹ بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سول ایوی ایشن کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرکے ہوائی جہاز اُڑانے کی تربیت مکمل کی اور دو سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر اسے ایک فضائی کمپنی میں کو پائلٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ وہ تین بھائی اور دو بہنیں تھے اس لیے اس کے والد نے بھی اس کے اصرار کے سامنے ہار مان لی اور سرکاری ملازمت دلانے کا شوق اپنے باقی دو بیٹوں سے پورا کرلیا۔

جوان بیٹے جب اپنے پیروں پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کھانے کمانے لگتے ہیں تو والدین کو جو پہلا خیال آتا ہے، وہ ان کی شادی کا ہوتا ہے۔ ناصر تو یوں بھی اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کے والد نے جب یہ دیکھ لیا کہ ان کے بیٹے نے بزنس کو بڑی خوبی سے سنبھال لیا ہے تو انہوں نے اس کی شادی کا فیصلہ کرلیا۔ دل ہی دل میں وہ بہت پہلے اپنے ایک عزیز ترین دوست کی بیٹی شاہدہ کو بہو بنانے کا ارادہ کرچکے تھے۔ ان کے یہ دوست قریبی شہر میں ہوزری کے ایک اوسط درجے کے کارخانے کے مالک تھے۔ شریف ومعزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زندگی کی آسائشوں اور دولت کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر بھی ان کی امیدیں ایک ایسے المیہ سے دوچار تھیں جس کا کوئی تدارک یا سدِباب ان کے بس سے باہر تھا۔ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ بدقسمتی سے زچگی کا مرحلہ ان کی اہلیہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن کر آتا تھا۔ ہر بار بچے کی پیدائش میجر آپریشن سے ہوتی تھی۔ اس کے باوجود بیٹے کی آرزو میں ان کی بیگم چار مرتبہ اس کڑی آزمائش سے گزریں۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ ہر مرتبہ ایک اور بیٹی کو لے کر اسپتال سے گھر واپس آئیں۔ آخری بار تو سچ مچ جان پر بن گئی تھی اور لیڈی ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب کوئی اور بچہ ہوا تو بیگم صاحبہ کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اس بار بھی لڑکی ہی ہوئی تھی لیکن ان کے شوہر جو بیوی سے والہانہ محبت کرتے تھے، بیٹے کی خواہش سے دستبردار ہوگئے اور لیڈی ڈاکٹر کو مزید ایک آپریشن کی اجازت دے دی جس کے بعد اولاد کا ہونا ممکن ہی نہیں رہا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کے لیے ان کی محبت میں کوئی کمی آگئی ہو۔ وہ اپنی ہر بیٹی کو دل وجان سے چاہتے تھے اور ان کی پرورش، ناز برداری، تعلیم وتربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ جب ناصر کے والد نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا تو وہ اپنی دو بیٹیوں کی شادی کافی دھوم دھام سے کرچکے تھے۔ شاہدہ ان کی تیسری بیٹی تھی۔ انتہائی قریبی دوستانہ روابط کے باعث انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ پیام منظور کرلیا گیا اور شادی کی تاریخ کے تعین پر بات ہونے لگی۔

دوسری جانب حامد لڑکپن سے ہی اپنی پھوپی زاد رقیہ کو پسند کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے دونوں طرف کے بزرگوں کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے جن دنوں حامد پائلٹ کی تربیت حاصل کررہا تھا، ان دونوں کی منگنی بھی کردی گئی۔ ناصر کو جب اپنے والد کے فیصلے کا علم ہوا تو وہ حامد سے ملا۔ دونوں دوستوں نے بہت پہلے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر ممکن ہوا تو وہ ایک ساتھ اپنی زندگی کے اس نئے باب کا آغاز کریں گے۔ بات شیخ چلی کے خواب جیسی ہی کیوں نہ ہو مگر ان کا خیال تھا کہ ایک ساتھ شادی کرنے پر عین ممکن ہے کہ ان کے یہاں بچے بھی ایک ساتھ یا آگے پیچھے وقت کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ پیدا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بھی امکان تھا کہ ایک کے یہاں بیٹی اور دوسرے کے گھر بیٹا پیدا ہو اور انہوں نے باہم وعدہ کیا تھا کہ وہ دوستی کے بندھن کو رشتہ داری میں بدلنے کے لیے بڑے ہونے پر ان دونوں کی شادی کردیں گے۔

مگر حامد کے لیے تھوڑی سی دشواری یہ تھی کہ ایک بہن اس سے بڑی بھی تھی جس کی شادی اصولاً پہلے ہونا چاہیے تھی۔ اس کی بات اگرچہ طے ہوچکی تھی۔ شادی کے تذکرے بھی ہورہے تھے۔ اس لیے حامد اپنے والدین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بہن کی شادی روک کر پہلے اس کے سر پر سہرا سجادیں۔ ناصر نے مشورہ دیا کہ اگر بہن سے پہلے اس کی شادی نہیں ہوسکتی تو کم سے کم ایک ساتھ تو ہوسکتی ہے۔ اگر حامد اپنے والدین کو اس تجویز پر آمادہ کرلے تو ناصر اپنی شادی ایک دو ماہ کے لیے موخر بھی کراسکتا ہے۔

حامد کے والدین کے لیے اپنے محدود وسائل کے سبب بہ یک وقت دو شادیوں کے اخراجات کا متحمل ہونا ذرا دشوار تھا پھر رقیہ کے والدین کی تیاریاں بھی مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر ناصر اور حامد دونوں کے والدین اپنے بیٹوں کے انتہائی قریبی دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات سے واقف تھے۔ کافی غور وفکر کے بعد حامد کے والد اپنی بہن کے پاس گئے، انہیں سمجھایا کہ اگر ان کی تیاری مکمل نہیں بھی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ آخر رقیہ کسی غیر کے گھر میں تو نہیں جارہی ہے جہاں جہیز کی کمی بیشی پر اسے باتیں سننا پڑیں۔ سردست سادگی کے ساتھ شادی کردی جائے۔ پھر جو کچھ وہ اپنی بیٹی کو دینا چاہتی ہیں، شادی کے بعد کوئی ان کا ہاتھ تو نہیں پکڑے گا۔ یوں بھی بیٹی کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ والدین شادی کے بعد بھی اس کی ذمے داری سے سبکدوش نہیں ہوتے، بے شمار مواقع آتے ہیں جبکہ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہرچند اس کا یہ مطلب نہیں کہ حامد کے والد اپنی بہن سے بھی ایسی ہی توقع رکھتے ہیں لیکن وہ اپنی خوشی سے اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے اگر آئندہ بھی کچھ کرنا چاہیں گی تو کوئی ان کا مزاحم نہیں ہوگا۔

بالآخر یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ پہلے ناصر کی شادی ہو اور حامد اس میں پورے جوش وخروش سے حصہ لے پھر دوسرے ہفتے حامد اور اس کی بہن کی شادی اس طرح کی جائے کہ بہن کی شادی کا کھانا حامد کے ولیمے کا کھانا بن جائے یوں حامد کے والدین بھی ضرورت سے زیادہ اخراجات سے زیر بار نہ ہوں۔

☆☆☆

دونوں دوستوں کی شادیاں بہ خیر وخوبی انجام پائیں۔ حامد کی بیوی رقیہ سے میں بہ خوبی واقف تھی۔ اس کی بڑی بہن ساجدہ میری بہت اچھی سہیلی تھی۔ دونوں گھروں میں خاصے قریبی تعلقات بھی تھے۔ ساجدہ کی شادی ہوچکی تھی اور جب سے وہ بیاہ کر اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی تھی میرا رقیہ کے گھر آنا جانا قدرتی طور پر کم ہوگیا تھا مگر میں نے رقیہ کو اس کے بچپن سے دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت سمجھ دار، معاملہ فہم، ہر ایک سے محبت کرنے والی، مخلص اور غمگسار لڑکی ہے۔ حالات سے سمجھوتا کرنا اور ضرورت کے مطابق خود کو تبدیل کرلینا اس کی نمایاں خصوصیات ہیں اس لیے پسند کی شادی کے باوجود مجھے اس کی ازدواجی زندگی کے کامیاب ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ پسند کی شادی میں نے اس لیے کہا کہ عام طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی پسندیدگی میں صرف ظاہری اوصاف کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مزاجی خصوصیات وعادات، خیالات پر ان کی توجہ بہت کم ہوتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ پسندیدگی کے زمانے میں اپنے آپ کو دوسرے فریق کے لیے زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بلکہ پُرکشش بنا کر پیش کیا جائے۔ بقدر آزادی...... ہر قسم کے وعدے وعید بھی ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے بلکہ عملاً کہا بھی جاتا ہے کہ ہر فریق دوسرے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار وآمادہ ہے۔ مگر شادی کے بعد جب عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو محبت کے پُرجوش جذبات جلد یا بدیر

نظام حیدرآباد اور مہاراجا کشمیر نے آزاد رہنے پر اصرار کیا جبکہ نواب جوناگڑھ اور اس کے ہمسایہ دوسرے مسلم حکمرانوں نے ہندو رعایا کی اکثریت اور چاروں طرف سے ہندوستان میں محصور ہونے کے باوجود پاکستان سے الحاق کا اعلان کردیا۔ اس سلسلے میں بلوچستان کی ایک چھوٹی سی ریاست لسبیلہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس ریاست کے نواب نے تیرہ ماہ قبل ہی متوقع پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کردیا جبکہ اس وقت پاکستان قائم ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا۔

اقتباس: فریڈم ایٹ مڈنائٹ از لیری کولنز

مرسلہ: احمد فرید، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آسودگی پا کر نارمل ہوجاتے ہیں اور تب ایک دوسرے کے مزاجی اختلافات سامنے آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ زمانہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی دونوں یا دونوں میں کوئی ایک بھی اپنی شادی سے قبل دیکھے ہوئے خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر حقیقت پسندی کا ثبوت نہ دے سکے تو پھر ایسی محبت یا پسند کی شادیاں بڑے تلخ حالات سے دوچار ہوتی ہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی تھی کہ حامد اور رقیہ دونوں بڑے تحمل، بردبار اور اعتدال پسند ثابت ہو رہے تھے۔

شاہدہ سے میں بالکل انجان تھی۔ شادی کے دن دلہن کے لباس میں وہ ایک نازک سی خوبصورت گڑیا نظر آرہی تھی۔ مگر اس نے قدرے کمزور صحت اور ناز پروردہ ہونے کے باوجود بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ خود کو ایک نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرلیا۔ اس کے مزاج میں تھوڑی سی تیزی، اور قدرے خودسری بھی تھی لیکن یہ اس کی سمجھ داری اور معاملہ فہمی تھی کہ اس نے کبھی اپنی مرضی کو ناصر پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں ناصر کی گھریلو اور ازدواجی زندگی بھی ایک خوشگوار انداز میں بسر ہونے لگی۔ مگر ان دونوں کے باہمی تعلقات میں جو اپنائیت اور گرم جوشی تھی، وہ ان کی بیویوں کے درمیان اس سطح پر قائم نہ ہوسکی یوں دونوں ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی تھیں لیکن شاہدہ کچھ مزاجاً کم گو اور تنہائی پسند تھی۔ رقیہ اگر چار مرتبہ اس سے ملنے آتی تو شاہدہ ایک مرتبہ بھی مشکل سے ہی بلکہ زیادہ تر ناصر کے کہنے پر اس کے گھر جاتی تھی۔ اس کا کچھ نہ کچھ ردعمل رقیہ پر بھی ہوا۔ اس کی محبت اور خلوص میں تو کمی نہیں آئی مگر غیر شعوری طور پر اس کی آمد و رفت ضرور کم ہوگئی۔

قدرت کو بھی شاید دونوں دوستوں کے جذبات کا خیال تھا کہ شاہدہ اور رقیہ کم و بیش ایک ساتھ ہی امید سے ہوئیں۔ فطری طور پر یہ بات جان کر ناصر اور حامد بہت خوش ہوئے اور اسی وقت سے اندازے لگانا شروع کردیے کہ ان کے یہاں یہ ہوگا تو وہ یہ کریں گے۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ میں ایک اچھے اسپتال میں سروس کررہی ہوں اور اسپتال بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک طرح سے گھر کی لیڈی ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے انہیں آنا تو میرے ہی پاس تھا لیکن اسپتال میں ہونے کی وجہ سے انہوں نے رجسٹریشن بھی وہیں کرالیا کہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا۔ میں نے ان دونوں کو تاکید کی تھی کہ وہ ہفتہ میں نہیں تو دو ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور اپنی بیویوں کو معائنہ کے لیے لاتے رہیں۔

رقیہ کا حال تو تقریباً نارمل چل رہا تھا لیکن شاہدہ اپنی نسبتاً کمزور صحت کی وجہ سے زیادہ متاثر تھی۔ وہ روز بہ روز کمزور ہوتی جارہی تھی۔ اگرچہ میں نے اس کے لیے ضرورت کے مطابق ٹانک اور دوائیں لکھ دی تھیں لیکن صرف دواؤں سے ہی تو کچھ نہیں ہوتا جب تک آدمی ٹھیک طرح سے غذا اور پھل وغیرہ نہ کھائے جبکہ شاہدہ کا حال یہ تھا کہ اس کا کھانا جو پہلے بھی اس کی جسمانی ضروریات کے مطابق نہیں تھا اور بھی کم ہوگیا۔ اس کا عذر تھا کہ اسے بھوک ہی نہیں لگتی، کوئی بھی چیز کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے بھوک لگانے کے لیے دوا تجویز کی اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ دشواری یہ تھی کہ شاہدہ کے لیے غذا ہی نہیں دودھ اور پھل کھانا بھی مشکل تھا۔ ٹانک وہ بلاشبہ پی رہی تھی مگر صرف ٹانک ہی تو کافی نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہدہ پہلے سے بھی کمزور ہوگئی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے ہاں زچگی آسان نہیں ہوگی۔

میرے اندازے کے مطابق دونوں کے ڈیلیوری ٹائم میں بیس پچیس دن کا فرق تھا۔ شاہدہ کا امکان پہلے تھا۔ اسپتال میں میری ڈیوٹی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ کبھی صبح سے سہ پہر تک، کبھی سہ پہر سے رات تک اور کبھی رات سے صبح تک۔ مگر میں نے ناصر اور حامد کو اطمینان دلانے کے لیے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی ضرورت پیش آئے گی، میں اسپتال پہنچ جاؤں گی۔ خواہ میری ڈیوٹی ہو یا نہ ہو۔ شاہدہ معائنہ کے لیے بھی پابندی سے نہیں آرہی تھی اس لیے کبھی کبھی میں خود بھی ناصر کے گھر جاکر اسے دیکھتی رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ ٹانک وغیرہ کھانے کا زیادہ فائدہ بچے کو پہنچ رہا ہے اور یہ صورت حال اس لیے قدرے تشویش ناک تھی کہ ماں کمزور ہو اور بچہ صحت مند تو ڈیلیوری ..... اور وہ بھی پہلی ..... ذرا دشوار بن جاتی ہے۔

جو تاریخ میں نے دی تھی، اس سے دو دن قبل ہی ایک رات شاہدہ کو درد شروع ہوا اور ناصر گھبرا کر اسے اسپتال لے آیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس ہفتے میری رات ہی کی ڈیوٹی تھی۔ میں نے شاہدہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور یہ معلوم کرکے پریشان ہوگئی کہ بچے کی پوزیشن نارمل نہیں تھی۔ بیرونی طریقوں سے میں نے اسے نارمل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ شاہدہ شدید اذیت میں تھی۔ درد ہو رہے تھے مگر کوئی دوسری وجوہات سے بھی ڈیلیوری نارمل انداز میں نہیں ہو رہی تھی۔ وہ رات یونہی گزری۔ ہر دوسرے طریقے میں ناکام رہ کر آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ میں نے اسپتال کی سینئر لیڈی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا۔ انہوں نے خود شاہدہ کا معائنہ کیا اور آپریشن ہی کی رائے دی۔ مگر سوال یہ تھا کہ آیا شاہدہ اس آپریشن کو برداشت کرسکے گی یا نہیں؟

ناصر نے رات ہی میں اپنی سسرال والوں کو تار دے کر مطلع کردیا تھا کہ شاہدہ کو اسپتال میں داخل کردیا گیا ہے۔ ایک طرف شاہدہ اس کیفیت سے گزر رہی تھی کہ دوسری جانب رقیہ صبح کو منہ ہاتھ دھوتے ہوئے باتھ روم میں پھسل کر گر پڑی اور گری بھی تو پیٹ کے بل جس کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہوگئی۔ حامد اسے فوراً اسپتال لے آیا۔ شاہدہ کی حالت کے پیش نظر میں ڈیوٹی ختم ہونے پر بھی گھر واپس نہیں گئی تھی۔ میں نے رقیہ کا معائنہ کیا۔ گرنے سے اسے بیرونی چوٹیں تو کم آئی تھیں لیکن پوری توجہ سے سننے کے باوجود میں بچے کی دھڑکن سننے یا کوئی حرکت محسوس کرنے سے قاصر رہی۔ فطری طور پر ذہن میں یہی شبہ ابھرا کہ کہیں شدید اندرونی ضرب پہنچنے کی وجہ سے بچہ مرنہ گیا ہو۔

ظاہر تھا کہ میں دونوں کیس خود نہیں سنبھال سکتی تھی اس لیے میں نے خصوصی درخواست کرکے سینئر لیڈی ڈاکٹر کو آمادہ کرلیا کہ وہ شاہدہ کا آپریشن کریں۔ رقیہ کے ساتھ بھی پہلے نارمل طریقہ سے ڈیلیوری کی کوشش کی گئی مگر بچہ کی موت کا یقین ہوجانے کے بعد اس کے لیے آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ قدرتی طور پر ناصر اور حامد دونوں ہی اس صورت حال سے بہت پریشان تھے۔ نہ صرف اپنی اپنی بیوی اور بچے کے لیے بلکہ دوست کی بیوی اور بچے کے لیے بھی۔ دونوں آپریشن ان کی اجازت سے کیے گئے۔ شاہدہ نے ایک صحت مند لڑکے کو جنم دیا اور رقیہ کے یہاں ایک مردہ لڑکی پیدا ہوئی۔

آپریشن میں شاہدہ کا خون زیادہ بہا۔ اگرچہ وہ آپریشن کی نوعیت کے پیش نظر زیادہ نہیں تھا مگر شاہدہ کی کمزور صحت نے اسے زیادہ بنادیا۔ اس کے جسم میں خون کی نمایاں کمی واقع ہوگئی۔ اسپتال میں اس کے گروپ کا خون موجود نہیں تھا۔ شہر کے بلڈ بینکوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ناصر اور حامد نے اپنا اپنا خون بھی ٹیسٹ کرایا۔ مگر قسمت اپنا فیصلہ کرچکی تھی۔ نہ ہی کسی بلڈ بینک سے مطلوبہ خون دستیاب ہوسکا اور نہ حامد یا ناصر کے خون کا گروپ شاہدہ سے میچ ہوسکا اور پھر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ شاہدہ سہ پہر تک انتقال کرگئی۔

رقیہ کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ اس کا بھی میجر آپریشن کیا گیا تھا۔ خون بھی ضائع ہوا تھا۔ قوی اندیشہ تھا کہ اس کیفیت میں اگر اسے مردہ بچی پیدا ہونے کی خبر دی گئی تو شاید وہ برداشت نہ کرسکے۔ میرے کمرے میں ناصر، حامد اور میں تینوں ان پے در پے حادثات سے پریشان سوچ رہے تھے کہ کیا، کیا جائے؟ ناصر اسی وقت اپنی سسرال والوں کو دوسرا تار دے کر آیا

کچھ ذکر تیرتھ رام فیروز پوری کا

میری نسل کے لوگوں کو تیرتھ رام فیروز پوری کی ترجمہ کی ہوئی نئی کتاب مل جاتی تو بہت زیادہ خوشی ہوتی۔ اس زمانے میں ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ انہوں نے زیادہ تر جاسوسی ناولیں ترجمہ کی تھیں۔ بعد میں جاسوسی کے علاوہ رینالڈز جو اپنے زمانے کا بہت مقبول عام مصنف تھا، اس کے کئی ناولوں کا ترجمہ کیا۔ رینالڈز ایک زمانے میں ہندوستان میں بہت مقبول تھا۔ تیرتھ رام فیروز پوری کی خصوصیت بس ترجمہ تھی اور اس میں واقعی میں کمال حاصل تھا۔ اس نے ایک لاکھ انگریزی صفحات اردو میں ترجمہ کیے۔ مجھے ستر ہزار صفحات کا پتا چل گیا ہے۔ 110 ٹائٹل مجھے مل چکے ہیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کی تحریروں میں دلچسپی تو تھی۔ 80ء میں پہلی بار لاہور آیا تو صلاح الدین محمود سے تیرتھ رام فیروز پوری کا ذکر ہوا تو وہ کہنے لگے کہ ان کے نزدیک اردو کا سب سے بڑا محسن تیرتھ رام فیروز پوری ہے۔ یہ بات ذہن میں بیٹھی رہی کہ ہم سب اس کو اتنا مانتے اور چاہتے ہیں اور اس پر کوئی مضمون نہیں ملتا، ادھر میری توجہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کے تو حالات زندگی کہیں نہیں ملتے، ہندوستان میں ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے۔ اس میں تاریخ پیدائش غالباً 1880ء اور تاریخ وفات 1954ء بتائی گئی ہے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ فیروز پوری لکھتے تھے لیکن ان کی تالیفات اور ترجموں کا آغاز لاہور سے ہوتا ہے۔ وہ لاہور میں رہتے تھے۔ یہاں لاہور سے ایک پبلشر نے ان کی کتابیں چھاپنی شروع کیں اور پھر اس کی مدد سے تیرتھ رام نے ''ترجمان'' کے نام سے رسالہ بھی نکالا جو 1915ء سے 1918ء تک نکلتا رہا۔ شروع میں تو وہ فلسفیانہ اور ادبی رسالہ تھا لیکن بعد میں صرف ناولوں کے تراجم، سلسلہ وار چھپتے تھے۔ تیرتھ رام کے بارے میں لمبا مضمون بنے گا جس میں ان کی تالیفات اور تراجم کے نام، کس کتاب سے انہوں نے ترجمہ کیا، کب شائع ہوا اور کہاں سے شائع ہوا اور کتنے صفحات تھے، یہ سب بتایا جائے گا۔ ان کے تراجم پر بھی تبصرہ ہوگا۔ ترجمہ وہ بہت عمدہ کرتے تھے۔ اصل کو زیادہ مسخ نہیں کرتے تھے۔ ان کے تراجم پڑھ کر آپ کو ادبی لطف بھی ملتا تھا اور ایک تسلسل کا احساس ہوتا۔ زبان اکھڑی اکھڑی نہیں ہوتی تھی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا جس میں اس نے انہیں شاہدہ کی موت کی خبر دی تھی۔

''شاہدہ کو تو قسمت نے چھین لیا۔'' ناصر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''مگر رقیہ بھابی ابھی زندہ ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ ہمیں ہر صورت میں انہیں بچانے کی کوشش کرنا ہے۔''

''مگر کس طرح؟'' حامد افسردگی سے بولا ''وہ مزاجاً بچوں سے بڑی اُنسیت رکھتی ہے۔ خود ماں بننے کی اسے اس قدر خواہش اور خوشی تھی جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ آنے والے بچے کے استقبال کے لیے اس نے کیا کچھ کیا تھا، اس کا کچھ اندازہ تم ہمارے کمرے کی اس الماری کو دیکھ کر لگا سکتے ہو جو کپڑوں اور کھلونوں سے بھری ہوئی ہے۔ اب اگر اسے یہ بتایا گیا کہ اس کے تمام خواب ٹوٹ گئے، بچی مردہ پیدا ہوئی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس صدمے کو برداشت نہیں کرسکے گی۔''

''میں بڑی دیر سے اسی مسئلے پر غور کررہا ہوں۔'' ناصر نے جواب دیا ''اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہم تینوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں کہ شاہدہ ایک لڑکے کو دنیا میں لانے کے بعد خود واپس چلی گئی اور نہ ہی کوئی یہ جانتا ہے کہ رقیہ بھابی کے یہاں مردہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ ایک طرف میرے بیٹے کو زندہ رکھنے کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنی ماں سے محروم ہوچکا ہے اور دوسری جانب رقیہ بھابی کی زندگی کا سوال ہے کہ وہ اپنی بچی کی موت برداشت نہیں کرسکیں گی۔ اس لیے میرے ذہن میں ایک ایسا حل آرہا ہے جس سے ہم دونوں کی پریشانیاں ختم ہوسکتی ہیں۔''

''وہ کیا؟'' حامد نے پوچھا۔

''تم میرا بیٹا رقیہ بھابی کو دے دو کہ جیسے وہ ہی اس کی ماں ہے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' حامد نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ضرور ہوسکتا ہے۔'' ناصر نے میری طرف دیکھا ''بشرطیکہ منیرہ بہن ہم سے تعاون کریں۔ میری سسرال والے ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ انہیں صرف شاہدہ کے انتقال کی خبر ہے۔ انہیں بتایا جاسکتا ہے کہ شاہدہ کے یہاں مردہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ تمہارے گھر اور سسرال کے لوگ اگرچہ اسپتال میں موجود ہیں مگر ابھی انہیں یہ معلوم نہیں کہ رقیہ بھابی کے ساتھ کیا پیش آیا۔ شاہدہ اور رقیہ بھابی دونوں لیبر روم کی آپریشن ٹیبل پر ہیں۔ کسی بھی دشواری کے بغیر دونوں بچے بدلے جاسکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان دو نرسوں کو اور سینئر لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کو صورتِ حال کے پیشِ نظر اس فیصلہ کی ضرورت کی وضاحت اور رازداری کی تاکید کردی جائے گی۔ ہم کوئی جرم بھی نہیں کررہے ہیں، جو کچھ ہوگا، ہماری مرضی سے ہوگا اور اس مقصد سے ہوگا کہ ایک بچے اور ایک ماں کی جان بچائی جاسکے۔''

''مگر..... مگر..... میں تمہارے گھر کا چراغ کیسے لے سکتا ہوں؟'' حامد نے کہا ''وہ بھی اس صورت میں کہ شاہدہ بھابی کا انتقال ہوچکا ہے۔''

''تمہارے انکار کی صورت میں یہ چراغ بجھ بھی سکتا ہے۔'' ناصر نے سمجھایا ''اس کے علاوہ ہم مستقبل کے کسی مسئلے سے نہیں، فوری طور پر ایک حل طلب معاملے سے دوچار ہیں۔ مستقبل میں تو خدا نے چاہا تمہارے یہاں اور بھی بچے ہوسکتے ہیں اور کون جانے مجھے بھی کبھی کوئی دوسرا چراغ مل جائے۔ مگر سوال مستقبل کا نہیں حال کا بلکہ ابھی کا ہے اور اس فیصلے سے اس وقت دو زندگیاں بچائی جاسکتی ہیں۔''

حامد نے جیسے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

''میرے خیال میں موجودہ پریشان کن صورتِ حال سے خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹنے کے لیے یہ فیصلہ بہترین ہی نہیں بلکہ شاید ناگزیر بھی ہے۔'' میں نے جواب دیا ''میں اپنی سینئر لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں سے بات کرلوں گی اور مجھے پورا یقین ہے کہ ایک نیک مقصد کے لیے ان میں سے کوئی بھی تعاون سے انکار نہیں کرے گا۔''

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ناصر کے نومولود بیٹے کو رقیہ کے پہلو میں لٹا دیا گیا اور اسپتال کے کمرائے انتظار میں موجود حامد کے اور رقیہ کے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنادی گئی کہ رقیہ ایک صحت مند بیٹے کی ماں بن گئی ہے۔ دوسری طرف شاہدہ کے والدین، بہنوں اور دوسرے عزیز واقارب کے علاوہ ناصر کے والد کو بھی یہ صدمہ برداشت کرنا ہی پڑا کہ شاہدہ بچے کی ولادت کے سلسلے میں آپریشن سے جانبر نہ ہوسکی اور یہ کہ پیدا ہونے والی بچی بھی اپنی ماں سے پہلے ہی رخصت ہوچکی تھی۔ اس المناک واقعے میں..... اگر اسے ان کے لیے تسکین کا سبب کہا جاسکے۔ یہ پہلو ضرور موجود تھا کہ اگر بچی زندہ ہوتی تو وہ اس کی پرورش کی انتہائی مشکل آزمائش سے بچ گئے تھے اور انہوں نے یہ سوچ کر کہ اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہوگی اس المیہ کو صبر وضبط سے برداشت کرلیا تھا۔

☆☆☆

ناصر نے بڑے ایثار سے کام لیا تھا مگر وہ اس حقیقت کو کیسے فراموش کردیتا کہ اس کا بیٹا..... جس کا نام حامد کے والد

نے زاہد رکھا تھا، نہ صرف یہ کہ زندہ سلامت موجود ہے بلکہ اس کے عزیز دوست کی بیوی کی گود میں پرورش پارہا ہے۔ اس نے بڑے ضبط سے کام لینے کی کوشش کی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی حامد کے گھر جانے اور اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش پوری کرنے کے لیے مجبور تھا۔ اور وہ جب بھی جاتا، بچے کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے جاتا۔ غنیمت تھا کہ حامد کے گھر میں کسی نے بھی اس کی زیادہ آمدورفت اور بچے سے اس کی بڑھتی ہوئی محبت کو کسی اور زاویے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سب ہی کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ ایک فطری بات تھی کہ اپنی بیوی اور بچی کے انتقال کے بعد ناصر کی محبت اپنے دوست کے بیٹے پر مرکوز ہوجائے بلکہ رقیہ تو یہاں تک کہہ دیا کرتی تھی کہ بھائی صاحب، زاہد کو آپ اپنا ہی بیٹا خیال کریں کہ اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا یا حامد کا ہے۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ شاہدہ کی چھوٹی بہن عابدہ کی منگنی شاہدہ کی شادی کے کچھ ہی دن بعد ایک جگہ ہوگئی تھی۔ بلکہ شادی کی تاریخ بھی تقریباً مقرر ہوچکی تھی کہ ایک معمولی سی بات پر لڑکے کی والدہ اور شاہدہ کی امی کے درمیان اختلاف رائے ہوگیا۔ شاہدہ کے والدین رسم ورواج کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ سادگی کو ترجیح دیتے تھے جبکہ لڑکے والوں کے طور طریقے اس باب میں انتہا پسندی کو پہنچے ہوئے تھے۔ ابٹن اور مہندی کی بات چھڑی تو شاہدہ کی ماں نے کہا کہ ہم ان رسموں کو دوطرفہ بنیاد پر دھوم دھڑکے سے نہیں مناتے۔ ابٹن آپ اپنے طور پر کرلیں، ہم اپنے طور پر کرلیں گے۔ رہی مہندی کی بات تو اصل مقصد ضروری ملبوسات اور دوسری ضمنی چیزوں کا پہنچانا ہوتا ہے اس کے لیے چند افراد کافی ہیں۔ مگر لڑکے والے دونوں رسموں میں اپنے کم سے کم پچاس مہمان لانے پر بضد تھے۔ اس مسئلے پر بحث چلی تو بڑھ کر جہیز اور مہر کے موضوعات تک پہنچ گئی۔ کچھ سنجیدہ مزاج بزرگوں نے افہام وتفہیم کی کوشش کی مگر لڑکے والوں کی انتہا پسندی جھکنے پر آمادہ نہ ہوئی اور انہوں نے یکطرفہ طور پر منگنی توڑنے کا اعلان کردیا۔

شاہدہ کے والدین اس حادثے سے کافی دلگیر تھے۔ بیٹی کے انتقال کے بعد خدا جانے ازخود یا کسی کے کہنے پر انہیں خیال آیا کہ اگر عابدہ کی شادی ناصر سے کردی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ دونوں گھرانوں میں دوستانہ روابط تو بہت پہلے سے تھے۔ شاہدہ کی شادی سے جو نیا تعلق قائم ہوا تو وہ بھی کامیاب رہا۔ داماد کی حیثیت سے ناصر انہیں بہت پسند تھا۔ عابدہ بڑی بہن سے صرف دو سال چھوٹی تھی اس لیے دونوں کی عمروں میں بھی کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں تھا۔ یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ ناصر کے والد بیٹے کو زیادہ دن اکیلا نہیں رہنے دیں گے، اس کی دوسری شادی بہرحال ہوگی تو پھر وہ عابدہ سے کیوں نہ ہو؟ مگر وہ لڑکی والے تھے، دوست ہونے کے باوجود ناصر کے والد سے گفتگو کرنا تو کجا اشارتاً بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

شاہدہ کے والد نے بیوی سے مشورہ کرنے کے بعد ایک مشترکہ دوست کو درمیان میں ڈالا جس نے یہ تجویز بڑی خوبی کے ساتھ ناصر کے والد تک پہنچائی۔ ناصر کے والد خود بھی شاہدہ کے سلسلے میں دوست کو پہنچنے والے صدمے کا کسی نہ کسی طرح ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ پھر انہیں عابدہ کی منگنی ٹوٹنے کا علم بھی تھا اور جانتے تھے کہ ایسا عابدہ کی کسی خامی کی وجہ سے نہیں بلکہ لڑکے والوں کی ناجائز ضد اور ہٹ دھرمی سے ہوا۔ انہوں نے ٹھیک ہی سوچا کہ اگر ناصر کی شادی عابدہ سے ہوجائے تو نہ صرف ناصر کا گھر پھر سے آباد ہوجائے گا۔ شاہدہ کی کمی پوری ہوجائے گی بلکہ ان کے دوست بھی ایک پریشان کن ذمے داری سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مناسب موقع دیکھ کر ناصر کا پیام عابدہ کے لیے دے دیا جو حسبِ توقع بخوشی منظور کرلیا گیا اور یوں شاہدہ کی پہلی برسی کے کچھ ہی دن بعد عابدہ اپنی بہن کی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے ناصر کے گھر آگئی۔

☆☆☆

عابدہ شکل صورت میں بھی اپنی بڑی بہن سے نسبتاً بہتر تھی اور اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ دونوں بہنوں کے مزاج اور عادات میں بھی کافی فرق تھا۔ عابدہ زیادہ محنتی، زیادہ منتظم، سنجیدہ مزاج اور کم وبیش ہر معاملے میں اعتدال پسند تھی۔ وہ نہ شاہدہ کی طرح تنہائی پسند تھی اور نہ رقیہ یا ناصر کی طرح ضرورت سے زیادہ دوست نواز مگر اس میں ایک کمزوری ایسی تھی جو عموماً گھریلو اور ازدواجی زندگی کے بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ قدرے شکی مزاج اور اس سے زیادہ کانوں کی کچی تھی۔ سنی سنائی باتوں پر بلاسوچے سمجھے جلد اعتبار کرلیتی تھی۔

زاہد کی وجہ سے ناصر ہفتہ میں دو تین مرتبہ ضرور حامد کے گھر جاتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کبھی یہ خیال بھی نہیں رکھا کہ حامد گھر پر موجود ہے یا نہیں۔ وہ تو اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے بیٹے کو دیکھنے اور کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے اس کی معصوم بچکانہ باتیں اور شرارتیں دیکھنے اور ایک انجانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی تشنگی کو بجھانے کے لیے جاتا تھا۔

حامد تو اس کی جذباتی کیفیت کو خوب سمجھتا تھا مگر رقیہ اور دوسرے گھر والوں کو بھی اس سے ہمدردی تھی، وہ بھی اپنے طور پر یہی سوچتے تھے کہ بیوی اور بچی کی ایک ساتھ جدائی نے ناصر کے لیے جو جذباتی خلا پیدا کر دیا ہے وہ اسے اپنے بھائی جیسے دوست کے بیٹے سے پیار جتا کر بھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر وہ دیکھتے بھی تھے کہ جب تک ناصر موجود رہتا تھا، وہ زاہد کے علاوہ مشکل سے ہی کسی دوسرے کی طرف توجہ دیتا تھا۔ اس لیے کبھی کسی نے اس کی آمد و رفت کو کسی اور رنگ میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

وقت گزرتا گیا۔ ناصر اور عابدہ کی شادی کو دو سال گزر گئے مگر ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہونا تو درکنار پیدائش کے آثار تک ظاہر نہ ہوئے۔ ناصر کو خاص طور سے بچے کی شدید خواہش تھی۔ وہ شعوری طور پر محسوس کرتا تھا کہ زاہد کے ساتھ اس کی ضرورت سے زیادہ وابستگی مسائل پیدا کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ دل سے چاہتا تھا کہ خود اس کے گھر کوئی بچہ آجائے تاکہ وہ اسے اپنی پدرانہ شفقت کی آسودگی کا مرکز بنالے۔ اس کو اپنے بارے میں تو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لیے بار بار اس کے ذہن میں ایک ہی خیال اُبھرتا کہ وہ زیادہ وقت گزرنے سے پہلے عابدہ کا ڈاکٹری معائنہ کرالے تاکہ اگر کسی علاج کی ضرورت ہو تو جلد سے جلد شروع کیا جاسکے۔

دوسری طرف تقدیر ایک اور انقلاب لانے کی تیاری کر رہی تھی۔ حامد اب تک کیپٹن بن چکا تھا اور حسب ڈیوٹی اکثر و بیشتر بیرونی ممالک کی پروازوں پر جاتا رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک پرواز کے دوران جو کہ نیویارک جا رہی تھی، پانچ نقاب پوش ہائی جیکروں نے جدید ترین اسلحے کے زور پر طیارے پر قبضہ کرلیا اور حامد کو مجبور کیا کہ وہ یونان کے ائرپورٹ ایتھنز لے چلے۔ طیارے کے مسافروں اور عملے کی حفاظت کے خیال سے حامد کو ان کا حکم ماننا پڑا۔ اسے ایتھنز ائرپورٹ پر اُترنے کی اجازت مل گئی۔ ہائی جیکروں کا تعلق کسی دہشت گرد تنظیم سے تھا اور وہ امریکا میں قید اپنے کچھ ساتھیوں کے علاوہ ایک بڑی رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ طیارے کو ان کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے ہر قسم کی تدابیر پر غور کیا جا رہا تھا جس میں مرکزی اہمیت اس تجویز کو حاصل تھی کہ ہائی جیکروں کو بات چیت میں اُلجھا کر کمانڈو ایکشن کے ذریعے ان پر حملہ کر کے گرفتار کرلیا جائے۔

ہائی جیکر اپنے مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں طیارے کو بم سے اُڑا دینے کی دھمکی دے رہے تھے اور اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ انہیں اپنی جانوں کی بھی پروا نہیں ہے۔ وہ طیارے اور اس کے تمام مسافروں کو ضرور تباہ کر دیں گے، خواہ ان کے ساتھ خود بھی کیوں نہ ختم ہو جائیں۔ ان کے دیے ہوئے الٹی میٹم کی مدت میں بڑی مشکل سے ایک بار چند گھنٹوں کی توسیع کرائی جاچکی تھی۔ امریکا ان کے مطالبات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا مگر بہ ظاہر یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ انتہائی اعلیٰ سطح پر مذاکرات جاری ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ مطالبات تسلیم کرلیے جائیں جبکہ اندرون پردہ توسیع شدہ مدت کے اندر کمانڈو ایکشن کے لیے منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔

رات کی تاریکی میں ..... مسافروں کو کھانا اور طبی امداد پہنچانے والوں کے بھیس میں، کئی کمانڈوز طیارے میں پہنچ گئے۔ باہر سے بھی کمانڈوز کی بڑی تعداد نے طیارے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ اندر ایک مقررہ وقت پر کشمکش کا آغاز ہوا تو باہر والے کمانڈوز نے بھی طیارے پر حملہ کر دیا۔ اندر اور باہر شدید فائرنگ ہوئی۔ حامد نے اپنی جان پر کھیل کر ایک ہائی جیکر کی پشت سے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اسے مغلوب کر کے اس کی مشین گن چھیننے اور ایک دوسرے ہائی جیکر کو نشانہ بنانے میں تو کامیاب ہو گیا مگر خود بھی تیسرے ہائی جیکر کے برسٹ کی زد میں آکر گولیوں سے چھلنی ہو کر گر پڑا۔ ایکشن صرف پانچ چھ منٹ جاری رہا۔ چار ہائی جیکر مارے گئے۔ ایک کو شدید زخمی حالت میں پکڑ لیا گیا۔ بہت سے مسافر کھڑکیوں کے ذریعے طیارے سے کودنے کی کوشش میں یا تو مر گئے یا ہاتھ پیر توڑ بیٹھے۔ طیارے کے اندر بھی کئی مسافر مارے گئے۔ بہت سے زخمی بھی ہوئے مگر ایک بڑی تعداد کو سلامتی کے ساتھ آزاد کرا لیا گیا۔

☆☆☆

اس جانکاہ حادثے کی خبر حامد کے والدین اور دیگر اہل خاندان کو ملی تو ایک کہرام مچ گیا۔ ہر چند اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے دوران اپنی جان کی بازی لگانے پر حامد کی ہر جانب سے تعریف و توصیف کی گئی۔ اعزازات سے نوازا گیا۔ انشورنس کی رقم کے علاوہ جان کے معاوضے میں کثیر رقم بھی ادا کی گئی مگر ظاہر تھا کہ یہ تمام قدر و عزت افزائی نہ حامد کو دوسری زندگی دے سکتی تھی اور نہ رقیہ کی اُجڑی ہوئی مانگ کو پھر سے آباد کر سکتی تھی۔ لیکن اب صبر کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ رقیہ اور حامد کے والدین کو بھی تقدیر کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

ناصر کو بھی اپنے عزیز ترین دوست کی جوانمرگی کا شدید

غم تھا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے حامد کے ماں باپ اور رقیہ کو تسکین و تسلی دینے اور ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ مگر کسی بھی انسانی کوشش سے کہیں زیادہ وقت کا گزرتا ہوا دھارا ایسے زخموں کو رفتہ رفتہ مندمل کر دیتا ہے۔ رقیہ اور حامد کے والدین کو بھی صبر آ گیا۔ ان کا غم غلط کرنے کے لیے حامد کے دوسرے بھائی بہن موجود تھے اور رقیہ نے اپنی تمام تر توجہ اور چاہت کا مرکز زاہد کو بنا لیا۔

☆☆☆

مزید ایک سال بیت گیا۔ عابدہ کی گود جیسی سونی تھی، ویسی ہی رہی۔ ناصر کو بالآخر ڈاکٹروں سے رجوع کرنا پڑا۔ اس نے سب سے پہلے مجھ سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ یہ میری لائن نہیں تھی کہ اس کی کوئی عملی مدد یا علاج تجویز کر سکتی لیکن جدید میڈیکل سائنس میں اس موضوع پر بھی ریسرچ ہو رہی تھی۔ مختلف ممالک میں کئی طریقہ ہائے علاج دریافت ہو چکے تھے جن کی انتہائی ٹیسٹ ٹیوب بچوں کا تجربہ بن چکی تھی۔ شہر میں بھی ایسے کئی ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر موجود تھے جو اس مخصوص فیلڈ میں پریکٹس کر رہے تھے۔ میں نے ناصر اور عابدہ کو اپنی واقف ایک ایسی ہی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ مختلف معائنے اور ٹیسٹ کیے گئے جن کے نتائج سے معلوم ہوا کہ ناصر اپنی جگہ قطعی نارمل ہے مگر عابدہ کے اندرونی نظام میں دو تین ایسی رکاوٹیں ہیں کہ فطری طور پر اس کا ماں بننا تقریباً ناممکن ہے۔ تقریباً کی وضاحت یہ کی گئی کہ ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ مواقع میں ایک چانس ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حسن اتفاق کے نتیجے میں ماں بن جائے۔

جب مشورہ لینے کا مرحلہ آ ہی گیا تو ناصر نے کسی ایک ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر انحصار نہیں کیا بلکہ اس سلسلے میں تمام نمایاں ڈاکٹروں سے کنسلٹ کیا۔ سب کی رائے کم و بیش ایک ہی جیسی تھی۔ دو تین مصنوعی طریقے بھی اختیار کیے گئے، اتنا ہی نہیں، مختلف طریقہ ہائے علاج کو آزمایا گیا۔ دعائیں، وظائف، تعویذ گنڈے بھی کیے گئے۔ لیکن نخل مراد بار آور نہ ہو سکا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، ناصر اور عابدہ کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ناصر کے والد تو کاروبار بیٹے کے سپرد کر کے عملی زندگی سے تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے۔ شاہدہ کے انتقال کے بعد سے ان کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی اور وہ اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔ ان کا بیشتر وقت نماز روزے اور دینی کتابوں کے مطالعے میں صرف ہونے لگا۔ ظاہر تھا کہ بیٹے کی بے اولادی کا دکھ انہیں بھی تھا مگر وہ کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ خاموشی کے ساتھ اپنے پروردگار سے دعاؤں میں مصروف رہتے تھے کہ وہ ان کے خاندان کو بے چراغ نہ رہنے دے۔

دوسری طرف ناصر کی مایوسی جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھی، ویسے ویسے اس کی محبت زاہد کے ساتھ زیادہ ہوتی جا رہی تھی اور اس کے نتیجے میں حامد کے گھر اس کی آمد و رفت بھی۔ وہ کم و بیش روزانہ زاہد کو دیکھنے جانے لگا تھا۔ رقیہ اور حامد کے گھر والے تو اب بھی اسی خلوص سے پیش آتے تھے مگر دوسروں کے معاملات کی ٹوہ اور تجسس میں رہنے والے حامد کی موت کے بعد اس بڑھتی ہوئی آمد و رفت کو کچھ اور ہی معنی دینے لگے تھے۔ دوسرے تو پھر دوسرے تھے، ایسے لوگ بھی تھے جنہیں کسی گھر کا امن و سکون راس نہیں آتا تھا۔ رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ بنانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ جنہیں بھس میں چنگاری ڈالنے سے خوشی محسوس ہوتی تھی مگر عابدہ کا شکی مزاج بھی ناصر کی بڑھتی ہوئی توجہ کو کسی اور ہی انداز میں دیکھنے لگا تھا۔ باتیں بنانے والوں کو موقع ملا۔ انہوں نے عابدہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔

اس نے ناصر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ہی باز پرس بھی شروع کر دی۔

''آپ اپنی دکان کس وقت تک بند کرتے ہیں؟'' ایک دن اس نے پوچھا۔

''پانچ ساڑھے پانچ بجے تک۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''دکان سے گھر تک آنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس منٹ۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کو چھ بجے تک گھر پہنچ جانا چاہیے۔'' عابدہ نے کہا ''مگر شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو جب آپ آٹھ نو بجے سے پہلے گھر میں داخل ہوئے ہوں، کہاں جاتے ہیں؟''

''جیسے تم جانتی نہیں ہو؟''

''میں آپ سے سننا چاہتی ہوں۔''

''بھئی میں عموماً حامد کے گھر سے ہوتے ہوئے آتا ہوں۔''

''وہاں اتنی پابندی سے جانے کی وجہ؟''

''حامد میرا بہترین دوست تھا۔ وہ تو بچھڑ گیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے گھر والوں اور خاص طور سے رقیہ بھابی سے میرا قلبی تعلق بھی ختم ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس کا بیٹا زاہد مجھے اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''زاہد کی آڑ کیوں لے رہے ہیں؟'' عابدہ کی زبان سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکل گیا "یوں کہیے کہ آپ کسی اور کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ناصر چونکا۔

"جان بوجھ کر انجان نہ بنیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آپ رقیہ سے ملنے جاتے ہیں۔"

"عابدہ!" ناصر تیزی سے بولا "تمہارا ذہن اتنی گری ہوئی بات سوچ سکتا ہے، مجھے معلوم نہیں تھا۔ رقیہ بھابی میرے دوست کی بیوہ ہیں، ان کی عزت و احترام میرے دل میں ایک بہن کی طرح ہے۔"

"مگر لوگ تو کچھ اور ہی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک حامد صاحب کے گھر والوں نے اس طرف کوئی توجہ کیوں نہیں دی؟"

"وہ حامد سے میرے قلبی تعلق کو جانتے ہیں، وہ کبھی ایسی ذلیل سوچ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" ناصر نے جواب دیا "اور تم سے بھی میں یہی کہوں گا کہ دنیا والوں کے بہکاوے میں آ کر میری اور اپنی زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش مت کرنا۔"

لیکن حامد کے گھر والوں کے بارے میں ناصر کا اعتماد کتنا ہی درست کیوں نہ ہو، وہ لوگ بھی آخر رہتے تو اسی معاشرے میں تھے، رفتہ رفتہ یہ چہ میگوئیاں ان کے کانوں میں بھی پہنچنے لگیں۔ شروع میں انہوں نے ان افواہوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھا مگر کب تک، ایک بات ہر طرف سے کانوں میں پڑنے لگے تو اچھے بھلے ذہن بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ ناصر سے بدظن ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن پہلے دبی زبان اور اشاروں کنایوں سے اسے روکنے کی کوشش کی اور پھر صاف کہہ دیا کہ اب وہ ان کے گھر نہ آیا کرے۔ حامد کی زندگی تک بات اور تھی۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسے زاہد سے بہت پیار ہے مگر دوسرے یہ بات نہیں سمجھتے۔ وہ اس کے آنے جانے کا کچھ اور ہی مطلب نکالتے ہیں۔ وہ عزت دار لوگ ہیں۔ سچ ہو یا نہ ہو لیکن کوئی ان کے گھر کی بہو بیٹی کے لیے ایسی ویسی بات زبان سے نکالے تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس لیے اگر اسے اپنی اور اپنے دوست کی عزت پیاری ہے تو آئندہ ان کے گھر میں قدم نہ رکھے۔

☆☆☆

ناصر پر اس پابندی سے کیا گزری یہ اس کا دل ہی بہتر جانتا تھا۔ بیٹے کو حامد کے حوالے کرتے ہوئے وہ جانتا تھا کہ اب کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتا سکے گا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ دوسری شادی کر لینے کے باوجود وہ اولاد سے محروم رہے گا اور نہ ہی کبھی اس کے وہم و گمان میں آیا تھا کہ اس پر اپنے بیٹے کو دیکھنے تک پر پابندی لگ جائے گی۔ وہ کئی دن تک انتہائی مضطرب اور پریشان رہا۔ نہ ٹھیک سے کھانا کھاتا تھا، نہ رات کو چین سے سو سکتا تھا۔ کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس صورتِ حال سے عابدہ کے شکوک و شبہات کو اور تقویت ملی۔ اسے تو قع تھی کہ اب جبکہ حامد کے گھر جانا بند ہو چکا ہے، ناصر دکان سے اٹھ کر سیدھا گھر آئے گا لیکن ناصر اب اور بھی زیادہ تاخیر سے واپس آ رہا تھا۔ شروع میں اس نے دکان سے اٹھ کر یونہی سڑکوں پر بلا مقصد گھومنے پھرنے سے دل کو تسکین پہنچانا چاہی۔ اس سے اضطراب میں کمی نہ ہوئی تو وہ دکان ہی میں دس بجے تک بیٹھنے لگا۔ اس کے پاس زاہد، حامد، رقیہ اور دوسرے گھر والوں کے دو تین فوٹو البم تھے۔ دکان میں دو سیلز مین، ایک اسٹور کلرک اور ایک پارٹ ٹائم اکاؤنٹنٹ کام کرتے تھے۔ اور یہ سب لوگ زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک چھٹی کر جاتے تھے۔ دکان کھولنا اور بند کرنا ناصر نے اپنے ذمے ہی رکھا تھا۔ پہلے وہ بھی ساڑھے پانچ بجے تک دکان بند کر کے حامد کے گھر کا رُخ کرتا تھا مگر اب وہ اپنی دُکان میں ہی بیٹھا بار بار تصویروں کے البم دیکھتا رہتا یا پھر نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہتا تھا۔ عابدہ نے ناصر کو پہلے سے بھی زیادہ دیر سے گھر آتے دیکھا تو اس کے شکی ذہن میں یہ شبہ اُبھرا کہ ناصر اور رقیہ یقیناً گھر سے باہر کہیں ملاقاتیں کرتے ہیں۔

وہ پہلے سے کہیں زیادہ ناصر کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ بیڈ روم کی ایک الماری ایسی تھی جس میں کاروبار سے متعلق پُرانی فائلیں رجسٹر اور دوسرے ضروری کاغذات مقفل رہتے تھے۔ ناصر نے الماری کے قفل کی چابی بھی عام چابیوں کے گچھے سے الگ رکھی تھی۔ عابدہ اس کی تمام جیبوں، دوسری الماریوں، کتابوں، خطوط اور متفرق کاغذات کی کئی مرتبہ تلاشی لے چکی تھی مگر اپنے شبہ کی تائید میں کوئی ثبوت اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اب اس کی نظر اسی مقفل الماری پر تھی مگر ناصر اس کی چابی عموماً دکان میں رکھتا تھا اور گاہے گاہے صرف کسی ایسے موقعے پر ساتھ لاتا تھا جب اسے پُرانے ریکارڈ میں کسی خاص چیز کی ضرورت ہوتی تھی۔ عابدہ اس کے سو جانے کے بعد بلا ناغہ اس کی جیبوں کی تلاشی لیتی تھی، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اسے حامد کے کوٹ کی اندرونی جیب میں اس الماری کی چابی مل گئی۔

بھرپور تجسس کی بیتابی کے ساتھ اس نے الماری کھولی۔ پہلی نظر میں اسے الماری کے تمام خانوں میں فائلوں، موٹے موٹے رجسٹروں اور نوٹ بکوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے ایک آدھ فائل اور رجسٹر دیکھے مگر وہ سب بزنس

ریکارڈ تھا۔ پھر اس نے نوٹ بکوں کی طرف توجہ دی۔ ان میں کچھ ڈائریاں بھی تھیں۔ شاہدہ کے انتقال تک ناصر زندگی کے اہم واقعات و معاملات ڈائری میں لکھنے کا عادی تھا۔ یہ عادت شاہدہ کے انتقال کے بعد کم ہوتی گئی اور حامد کی حادثاتی موت کے بعد تو ناصر نے ڈائری لکھنا ہی بند کر دی تھی۔ عابدہ نے بڑی دلچسپی کے ساتھ ایک دو ڈائریاں نکال کر انہیں جستہ جستہ دیکھا مگر اسے کوئی قابلِ گرفت تحریر نہیں مل سکی۔ ناصر اور حامد کی شادی کے بارے میں اندراجات بھی اس کی نظر سے گزرے۔ ناصر نے ہر جگہ رقیہ کا ذکر ادب و احترام سے کیا تھا۔ اس نے کچھ مایوسی کے ساتھ ایک اور ڈائری اُٹھائی۔ دو تین جگہ سے دیکھا اور پھر دفعتاً وہ حیرت و تعجب سے اُچھل پڑی۔ شاہدہ کی رحلت کی تاریخ کے ذیل میں ناصر نے وہ سب کچھ لکھ دیا تھا جو اس کے حامد کے اور میرے درمیان طے پایا تھا۔

عجیب جذبات و خیالات کے درمیان گھرے ہوئے عابدہ نے وہ ڈائری الماری سے نکال کر اس کا قفل بند کیا اور چابی ناصر کے کوٹ کی اسی جیب میں ڈال دی جس میں سے نکالی تھی۔ ڈائری کو اپنے کپڑوں کی الماری میں چھپا کر وہ اپنے پلنگ پر لیٹی تو ذہن متضاد سوچوں کی زد میں تھا۔ ایک جانب اسے ناصر کی ذات سے اپنی بدگمانی پر بے حد شرم و ندامت بھی تھی۔ اس کے حامد کے گھر جانے کا راز بھی سمجھ میں آ گیا تھا تو دوسری جانب ایک انجانی مسرت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ بلاشبہ شاید اس کی قسمت میں اولاد نہیں تھی لیکن ناصر کا خاندان بے چراغ نہیں تھا۔ زاہدہ، ناصر اور شاہدہ کا بیٹا تھا۔ جن حالات میں اسے حامد کے سپرد کیا گیا تھا تب اس کا کوئی جواز بنتا بھی تھا تو اب حامد کے گھر والوں یا رقیہ کو یہ استحقاق ہرگز حاصل نہیں تھا کہ وہ اس کا گھر تاریک کر کے اپنے یہاں اُجالا کریں۔ وہ ہر قیمت پر زاہد کو رقیہ سے واپس لے کر رہے گی۔

☆☆☆

دوسرے دن ناصر کے دکان جانے کے بعد عابدہ گھر سے نکلی۔ پہلے اس نے ایک دکان سے ڈائری کے ان صفحات کی دو فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوائیں جن میں زاہد کی پیدائش، شاہدہ کے انتقال سے لے کر رقیہ کے یہاں مردہ بچی کے پیدا ہونے اور پھر زاہد کو حامد کے حوالے کرنے کا ذکر تھا۔ پھر گھر واپس گئی۔ ڈائری کو حفاظت سے الماری میں بند کیا اور ان اوراق کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی ساتھ لے کر حامد کے گھر پہنچ گئی۔ رقیہ نے حیرت آمیز مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

"آیئے، آیئے عابدہ بہن!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں شرمندہ ہوں کہ کچھ حالات کے باعث میں ایک مدت سے آپ کے گھر نہیں آ سکی۔ مجھے آج آپ کے آنے سے بے حد خوشی ہوئی ہے، تشریف رکھیں۔"

"مگر مجھے افسوس ہے کہ میں ایک انتہائی ناگوار مگر قطعی طور پر جائز فرض کی انجام دہی کے لیے آئی ہوں۔" عابدہ نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"شاید آپ ناصر بھائی.....!"

"نہیں، وہ بات نہیں۔" عابدہ نے رقیہ کی بات کاٹ دی "مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ لوگ خواہ کچھ بھی کہیں مگر ناصر صاحب اور آپ کے درمیان بہت ہی پاکیزہ رشتہ تھا۔ ان کے یہاں اس قدر زیادہ آنے کی وجہ آپ نہیں، زاہد تھا۔"

"میں جانتی ہوں، وہ زاہد کو اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے ہیں۔"

"اور بالکل بجا کرتے ہیں۔" عابدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "کیونکہ وہ حقیقت میں ان کا ہی بیٹا ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ اسے کوئی تہمت خیال کریں، میں مزید وضاحت کر دوں کہ زاہد میری مرحوم بہن شاہدہ اور ناصر صاحب کی اولاد ہے۔"

"یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" رقیہ گھبرا کر بولی "یہ قطعی جھوٹ ہے۔ شاید آپ نے اور ناصر بھائی نے اپنی اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے کوئی سازش کی ہے۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، اسے ثابت کرنے کے لیے میرے پاس مکمل ثبوت موجود ہے۔" عابدہ نے جواب دیا "اسپتال میں آپ اور شاہدہ باجی کم و بیش ایک ساتھ داخل ہوئی تھیں۔ ان کے یہاں آپریشن سے ایک بیٹا پیدا ہوا مگر وہ خود جانبر نہ ہو سکیں، آپ نے ایک مردہ بچی کو جنم دیا جس کی موت اس حادثے کے باعث ہوئی جو آپ کو پیش آیا۔ آپ کا بھی آپریشن ہوا تھا اور نازک حالت میں تھیں۔ ناصر صاحب نے آپ کی زندگی بچانے اور اپنے بے ماں کے بچے کی بہتر پرورش کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے کر اپنا بیٹا آپ کو دے دیا اور آپ کی مردہ بچی کے بارے میں کہہ دیا کہ وہ شاہدہ باجی کے یہاں پیدا ہوئی تھی۔"

"آپ نے داستان تو خوب سوچی ہے۔" رقیہ نے غصے سے کہا "مگر میں اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہوں۔"

"یہ داستان نہیں حقیقت ہے، جس کا اظہار ناصر صاحب نے اپنی ڈائری میں کیا ہے۔ میں ڈائری کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندراجات کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لائی ہوں تا کہ آپ خود بھی پڑھ سکیں اور اپنی سسرال والوں کو بھی دکھا سکیں۔''

''مجھے کچھ پڑھنے اور دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زاہد میرا بیٹا ہے۔'' رقیہ نے تیزی سے کہا ''اب اتنے برسوں کے بعد آپ یا ناصر صاحب کسی ڈائری میں کچھ بھی لکھ لیں، اس سے کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''بات صرف ناصر صاحب کی تحریر ہی کی نہیں۔'' عابدہ نے جواب دیا ''ظاہر بات ہے کہ ایسا کوئی معاملہ لیڈی ڈاکٹر منیرہ کے علم اور ان کے تعاون کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں، ناصر صاحب کی تحریر کا اعتبار نہیں تو لیڈی ڈاکٹر منیرہ اور ان کی سینئر لیڈی ڈاکٹر سے معلوم کرسکتی ہیں۔ ساتھ ہی ان دونرسوں کی گواہی بھی لے لیں جو اس موقعے پر آپ کے اور باجی شاہدہ کے آپریشن کے وقت موجود تھیں۔ سردست میں صرف آپ کو آگاہ کرنے آئی ہوں اور ڈائری کی فوٹو اسٹیٹ کاپی چھوڑے جارہی ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کرلیں۔ مگر میں آپ کو خبردار کرتی ہوں کہ اگر ایک ہفتے کے اندر آپ نے زاہد کو ہمارے سپرد نہیں کیا تب پھر مجھے مجبوراً کسی مجاز عدالت سے رجوع کرنا پڑے گا۔''

☆☆☆

ظاہر تھا کہ اس دھماکے سے حامد کے گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ پہلے رقیہ نے اور پھر حامد کے والد نے ڈائری کی تحریر پڑھی۔ اس میں وہ سب کچھ بڑی تفصیل سے لکھا تھا جو عابدہ زبانی طور پر بتا گئی تھی۔ خود تحریر کا انداز اور جذباتی پن اس کی سچائی کی دلالت کررہا تھا لیکن حامد کے والد نے ناصر کو فون کرکے اس کی تصدیق چاہی۔ سوئے اتفاق سے ناصر اس وقت اپنی دکان میں موجود نہیں تھا، کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس سے رابطے میں ناکامی کے بعد حامد کے والد رقیہ کو ساتھ لے کر گھبرائے ہوئے اسپتال میں میرے پاس پہنچے۔ وہ بہرحال میرے پاس آنے کا فیصلہ کرچکے تھے، ناصر کو صرف دل کی تسلی کے لیے فون کیا تھا۔

میں ان کی زبانی یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آگئی۔ مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ حالات کا تانا بانا کبھی ایسی صورتِ حال بھی پیدا کردے گا۔ قسمت نے دونوں ہی دوستوں کے ساتھ ستم ظریفانہ مذاق کیا تھا۔ شاہدہ زندہ رہتی تو ناصر کے یہاں اور بچے ہوسکتے تھے اور ممکن تھا کہ ان کی ڈلیوری خطرناک ثابت نہ ہوتی۔ یہی صورت رقیہ کے ساتھ تھی۔ حامد حیات ہوتا تو وہ بھی ایک سے زیادہ مرتبہ ماں بن سکتی تھی اور حادثے ہر مرتبہ پیش نہیں آتے، ان کی اولاد بھی زندہ رہ سکتی تھی۔ مگر اب ایک طرف ناصر کو بے اولادی کا سامنا تھا اور دوسری جانب رقیہ بھی جب تک دوسری شادی نہ کرلے، ماں نہیں بن سکتی تھی۔ پھر حامد کے والد تو زاہد کو اپنے مرحوم بیٹے کی نشانی خیال کررہے تھے۔

مگر یہ بات بھی طے تھی کہ حقیقت سامنے آہی گئی تھی تو میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور صرف میرے کہنے سے بھی کیا ہوتا۔ میری سینئر لیڈی ڈاکٹر اور وہ دونوں نرسیں اب بھی اسپتال میں موجود تھیں۔ میں نے بادل ناخواستہ رقیہ اور حامد کے والد صاحب کو سب کچھ بتادیا۔ تمام متعلقہ افراد سے تصدیق بھی کرادی۔

''پھر کیا اب مجھے اپنا بیٹا ناصر صاحب کو دینا پڑے گا؟'' رقیہ نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔

''ناصر نے اپنے دوست کی خاطر ایثار سے کام لیتے ہوئے تمہاری زندگی بچانے کے لیے اپنا بیٹا تمہاری گود میں ڈال دیا تھا۔'' میں نے نرمی سے کہا ''ویسے اس کے سامنے بھی ایک بن ماں کے بچے کی پرورش کا دشوار کام تھا۔ مگر بن ماں کے بچے بھی پل ہی جاتے ہیں اور پھر زاہد تو غیر معمولی طور پر تندرست پیدا ہوا تھا۔ میں اس مسئلے کے قانونی پہلو کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن اصولاً زاہد ناصر ہی کا بیٹا ہے۔ وہ اسے اب بھی واپس نہ لینا چاہے تو دوسری بات ہے، لیکن آپ لوگ زاہد کو واپس کرنے سے انکار نہیں کرسکتے اور اگر عابدہ جیسا کہ اس نے دھمکی دی ہے اس معاملے کو عدالت میں لے گئی تو ظاہر ہے کہ ہم سب کو عدالت میں سچ بیان کرنا ہی پڑے گا اور اس صورت میں توقع نہیں کہ فیصلہ آپ کے حق میں ہوسکے۔ اب اگر آپ زاہد کو دینا نہیں چاہتے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ ناصر سے تعاون کی درخواست کریں۔''

''ہم کس منہ سے یہ بات کرسکتے ہیں۔'' حامد کے والد نے کہا ''حقیقت کیا تھی اور ہم لوگوں کے کہنے سننے میں آکر اسے کیا سمجھ رہے تھے۔ ہم نے اس کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز برتاؤ روا رکھتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے اس کے لیے بند کردیے تھے۔ وہ بے اولاد بھی ہے۔ اب میں یا رقیہ کس طرح اس سے آنکھیں چار کرکے زاہد کو مانگ سکتے ہیں۔ ہمیں ہی اپنے دلوں پر صبر کی بھاری سِل رکھتے ہوئے زاہد کو واپس دینا پڑے گا۔''

''میں اب بھی قطعی طور پر ناامید نہیں ہوں۔'' میں نے کہا ''میرا اندازہ ہے کہ ناصر کی لاعلمی میں ڈائری عابدہ کے

ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس نے جو کچھ کیا فطری طور پر اس کا یہی ردِعمل ہونا چاہیے تھا خاص طور پر اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے ماں بننے کے امکانات معدوم ہیں۔ میرا مشورہ ہے سردست آپ انتظار کریں۔ دیکھیں کہ خود ناصر اس سلسلے میں کیا قدم اٹھاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ قدرت اس اُلجھن کا کوئی ایسا حل نکالے جس سے آپ اور ناصر دونوں ہی مطمئن ہوجائیں۔''

☆☆☆

میں نے ناصر کو اس کی دکان فون کرکے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے پہلے تو اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس کی ذرا سی غفلت کے باعث عابدہ کو اس راز کا علم ہوگیا۔ اسے شبہ تھا کہ عابدہ اپنے شکّی مزاج کی تسکین کے لیے اس کی جیبوں اور چیزوں کی تلاشی لیتی ہے، ایسی صورت میں اسے الماری کی چابی کوٹ کی جیب میں چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس کا دوسرا ردِعمل یہ تھا کہ جب وہ زاہد کو اپنے مرحوم دوست کو دے چکا تو اب اسے واپس لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ عابدہ کو سمجھانے اور اپنی اس ضد سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرے گا۔

جب ناصر شام کو گھر پہنچا تو عابدہ نے اتنی موقع شناسی کا مظاہرہ ضرور کیا کہ کھانے سے فارغ ہونے تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ ناصر بھی اسی خیال سے خاموش رہا کہ گھر میں قدم رکھتے ہی اختلافی موضوعات پر بات چھیڑ دینا اس کی عادت نہیں تھی۔ کھانے سے فارغ ہوکر جب ناصر بیڈ روم میں پہنچا تو عابدہ نے شکایتی انداز میں اپنی بات کا آغاز کیا۔ اس نے بتایا کہ اسے معلوم ہوچکا ہے کہ زاہد ناصر کا بیٹا ہے۔ وہ ناصر اور رقیہ کے بارے میں اپنی غلط فہمی پر شرمندہ ہے مگر یہ کہ ناصر نے اگر کسی وقتی مجبوری کے تحت پہلے کوئی فیصلہ کیا بھی تھا تو اب اس فیصلے کو برقرار رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حامد کے والد کے دو بیٹے اور بھی ہیں۔ ان کی اولاد بھی ہے اس لیے اپنے خاندان کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے انہیں زاہد کی اتنی ضرورت نہیں جتنی خود ناصر کو ہے۔ وہ آج رقیہ سے ملنے گئی تھی اور اسے بتا آئی ہے کہ زاہد اس کا بیٹا نہیں۔ اس لیے اسے زاہد کو واپس کرنا ہی پڑے گا۔ عابدہ نے یہ بھی زور دے کر کہا کہ موجودہ حالات میں اسے پورا یقین ہے کہ ناصر اس کے اس فیصلے کی تائید کرے گا۔

ناصر نے عابدہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سچ ہے کہ زاہد اس کا بیٹا ہے لیکن وہ اسے اپنے دوست کو دے چکا ہے۔ حامد زندہ ہوتا تو وہ اس سے زاہد کو واپس لینے کے سلسلے میں بات کرسکتا تھا کیونکہ یہ عین ممکن تھا کہ رقیہ اب تک کسی اور بچے کی ماں بن چکی ہوتی اور اس کے لیے زاہد کو واپس کرنا اتنا شدید جذباتی مسئلہ نہ ہوتا مگر اب زاہد اس کے لیے ناگزیر بن چکا ہے۔ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ زاہد بھی اسی کو اپنی ماں سمجھتا ہے اگرچہ اس حقیقت کے اظہار سے کہ زاہد حامد کا بیٹا نہیں، رقیہ کا یہ یقین تو ٹوٹ گیا کہ زاہد اس کے مرحوم شوہر کی نشانی ہے مگر اس اظہار سے بھی اس کے قلبی تعلق میں کوئی فرق نہیں آئے گا جبکہ دوسری طرف زاہد...... ایک چار پانچ سالہ بچہ مسئلے کی نزاکت کو بالکل نہیں سمجھ سکتا۔ اب ان دونوں کو الگ کرنا دونوں پر ظلم، زیادتی کے مترادف ہے۔ اس لیے عابدہ بھی ایثار سے کام لے اور زاہد کو رقیہ کے پاس ہی رہنے دے۔

مگر عابدہ نے ناصر کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ زاہد صرف ناصر کا ہی نہیں بلکہ اس کی بڑی بہن شاہدہ کا بھی بیٹا ہے۔ ناصر کا اپنا خون ہے، اس کے خاندان کو آگے چلانے کی آخری امید ہے۔ وہ اپنی بہن کی آخری نشانی کو رقیہ کے پاس نہیں چھوڑ سکتی، خاص طور سے اس صورت میں کہ اسے اور ناصر کو اس سے کہیں زیادہ زاہد کی ضرورت ہے، جتنی رقیہ یا حامد کے والدین کو ہوسکتی ہے۔ اس نے دھمکی بھی دی کہ اگر ناصر نے زاہد کو واپس نہیں لیا تو وہ اپنی زندگی ختم کرلے گی۔

ناصر ایک مشکل اُلجھن کا شکار تھا۔ وہ زاہد کو واپس بھی نہیں چاہتا تھا اور دوسری طرف اس بات سے بھی خوف زدہ تھا کہ عابدہ ضد میں آکر اپنی دھمکی پر عمل کر بیٹھی تو کیا ہوگا؟ وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آیا اور عابدہ کے ساتھ اپنی گفتگو اور اس کی دھمکی بیان کرکے مجھ سے مشورہ چاہا۔ میں نے یہ تمام باتیں رقیہ کو بتادیں۔ رقیہ اب تک صورتِ حال کا ادراک ہی نہیں کرسکی تھی بلکہ اس نے اس حقیقت کو بھی تسلیم کرلیا تھا کہ زاہد ناصر کا ہی بیٹا ہے۔ سب کچھ سن کر اس نے کہا کہ میں ناصر بھائی کی ممنون ہوں کہ انہوں نے میری زندگی اور مجھے مایوسی سے بچانے کے لیے اتنا بڑا ایثار کیا۔ لیکن اب جبکہ یہ بات کھل ہی چکی ہے کہ زاہد میرا بیٹا نہیں اور ناصر بھائی کو مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت ہے تو میں کسی ضد، خود غرضی اور جبر و زبردستی سے کام نہیں لوں گی۔ ناصر بھائی سے کہیں وہ مجھے دو چار دن کی مہلت دیں۔ میں کسی روز زاہد کو خود ان کے سپرد کردوں گی۔''

☆☆☆

اور اس طرح زاہد بالآخر ناصر کے گھر آگیا۔ وہ ناصر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی مانوس تھا مگر ظاہر تھا کہ عابدہ اس کے لیے تقریباً اجنبی تھی۔ پھر ابھی اس کی عمر بہ مشکل پانچ برس کی تھی۔ ناصر اسے ہمہ وقت بہلانے کے لیے گھر پر موجود نہیں رہ سکتا تھا۔ عابدہ نے زاہد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے لیے کھلونوں، ٹافیوں، بسکٹوں کے ڈھیر لگا دیے لیکن زاہد تقریباً سارا دن رقیہ کے پاس جانے کی ضد کرکے روتا رہتا تھا۔ جس مامتا بھری چاہت کا خلا اس کی زندگی میں پیدا ہوگیا تھا، اکیلا ناصر اسے پر نہیں کرسکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زاہد بیمار پڑ گیا۔ دوسری طرف رقیہ بھی کوشش کے باوجود اس کی جدائی برداشت نہ کرسکی۔ حامد کے ساتھ چھوڑ جانے سے اس کے دل کو زبردست صدمہ پہنچا تھا۔ وہ کئی ہفتہ بیمار رہی تھی اور اگر زاہد موجود نہ ہوتا تو شاید وہ اسی غم میں گھل گھل کر اپنی زندگی کو کوئی جان لیوا روگ لگا لیتی۔ زاہد کی محبت اس کی پرورش اور اسے ایک دوسرا حامد بنانے کی آرزو نے اس میں جینے کی امنگ برقرار رکھی تھی۔ اب زاہد کی جدائی کے بعد اسے اپنی زندگی سے اپنے مستقبل سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی۔ دوسرا غم اس کے لیے بڑا مہلک ثابت ہوا وہ بھی بیمار پڑ کر پلنگ سے لگ گئی۔ دل جو ابھی حامد کی موت کے صدمے سے نہیں سنبھلا تھا، اور بھی کمزور ہوگیا۔ میں نے بھی اس کا معائنہ کیا دوسرے ماہر ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا گیا اور سب نے یہی اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر زاہد رقیہ کو واپس نہیں ملا تو خدانخواستہ اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

ناصر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے عابدہ سے دوٹوک گفتگو کی اور اس پر الزام لگایا کہ وہ محض اپنی خوشی پوری کرنے کے لیے زاہد اور رقیہ کی زندگی سے کھیل رہی ہے۔ زاہد رقیہ کے بغیر اور رقیہ زاہد کے بغیر جی نہیں سکتے، پھر کیا وہ بھی اس فرضی ماں کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے جس کو بچے کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس نے بچے کی ماں کو بچے سے محروم رکھنے کے لیے قاضی کا یہ فیصلہ مان لیا تھا کہ بچے کے دو ٹکڑے کرکے دونوں دعوے دار ماؤں کے سپرد کردیے جائیں۔ عابدہ نے پندرہ بیس دن کے اندر..... خواہ زبانی طور پر اعتراف نہ کیا ہو مگر..... دل ہی دل میں اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ زاہد پانچ برس تک جس آغوش میں رہ چکا ہے، اب اسے اس سے جدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے زاہد سے محبت نہیں تھی۔ اپنی بڑی بہن اور ناصر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ اسے بھی عزیز ہو چکا تھا اور وہ یہ تو بہرحال نہیں چاہتی تھی کہ زاہد کو اپنانے کی کوشش میں اس کی زندگی کو ہی خطرے میں ڈال دیا جائے۔ ناصر نے نرمی سے سمجھایا تو عابدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے کہا کہ ناصر زاہد کو پھر ایک بار رقیہ کو دے دے۔ اگر خود اس کی قسمت میں کسی بچے کی ماں بننا نہیں لکھا ہے تو وہ اپنی قسمت سے جنگ نہیں کرسکتی۔ اتنا ہی نہیں وہ خود زاہد کو ساتھ لے کر حامد کے گھر گئی۔ اور رقیہ سے کہا کہ یہ اس کی بھول ہی تھی کہ اس نے ماں اور بیٹے کو جدا کرنے کی کوشش کی۔ زاہد پر اب صرف اور صرف رقیہ کا حق ہے۔ وہ اسے اپنی خوشی سے واپس کرنے آئی ہے اور اس سلسلے میں اس کی وجہ سے رقیہ اور زاہد کو جو جذباتی صدمہ پہنچا ہے اس کے لیے دل سے شرمندہ اور معذرت خواہ ہے۔

☆☆☆

عابدہ کے اس ایثار سے سب ہی بہت متاثر ہوئے۔ اس نے اپنی ضد ہار کر سب کے دل جیت لیے تھے۔ زاہد اور رقیہ جیسے ہی صحت مند ہوئے، رقیہ نے یہ اپنا معمول بنا لیا کہ وہ صبح ناشتے کے بعد زاہد کو ساتھ لے کر عابدہ کے گھر پہنچ جاتی۔ دن بھر وہیں رہتی۔ وہ دونوں ہی زاہد کا خیال رکھتیں۔ شاید رقیہ نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ زاہد، عابدہ سے اتنا مانوس ہوجائے کہ وہ اس کے بغیر بھی عابدہ کے پاس رہ سکے تو وہی رفتہ رفتہ زاہد کو بھول جانے اور اس کی زندگی سے نکل جانے کی کوشش کرے گی۔ مگر قسمت نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔ شاید رب کائنات کو عابدہ کا یہ ایثار پسند آ گیا یا پھر خوبی تقدیر سے ڈاکٹروں نے ہزار میں سے جس ایک امکان کا خیال ظاہر کیا تھا وہ بروئے کار آ گیا کہ چند ماہ بعد ہی عابدہ کی کچھ طبیعت خراب ہوئی اور میں نے اس کا معائنہ کیا۔ علامات کی بنیاد پر کچھ ٹیسٹ کیے تو مجھ پر یہ خوشگوار اور حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ عابدہ ماں بننے والی ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن کے ذریعے اس بے پناہ مسرت کا اظہار کروں جو ناصر، عابدہ، عابدہ کے والدین، ناصر کے والد اور پھر ان سب سے زیادہ نہیں تو کسی اعتبار سے کم بھی نہیں رقیہ کو اس خبر سے ہوئی۔ کوئی گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مشیت الٰہی نے اس دشوار مسئلے کا اتنا آسان حل سوچ رکھا ہے۔ مقررہ وقت گزرنے کے بعد عابدہ ایک خوبصورت صحت مند بیٹے کی ماں بن گئی۔ خدا نے رقیہ اور عابدہ دونوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں بتایا، اس واقعے کو دس بارہ سال گزر چکے ہیں۔ دونوں گھرانے ہر اعتبار سے پُرسکون اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں اور میری دعا ہے کہ پروردگار اپنی رحمت سے انہیں ہمیشہ یونہی مسرور اور شاداں رکھے، آمین۔

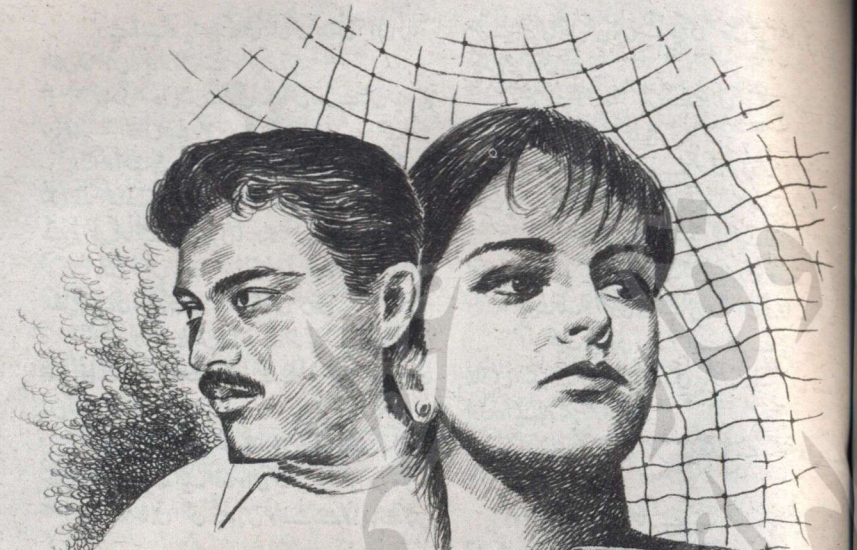

بساطِ زیست

بس سے اُترنے سے پہلے ہی میں وہ کار دیکھ چکی تھی۔ جیسے ہی بس رکی، میں اُتر کر تیزی سے اس جانب بڑھی، کار کا دروازہ مجھے دیکھتے ہی کھل چکا تھا اور پھر جوں ہی میں بیٹھی، کار آگے بڑھ گئی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گی۔'' کار کچھ دور آگے بڑھی تو انہوں نے مجھ سے کہا اور میں مسکرا دی۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ بس سے مرسیڈیز کا سفر تو میں طے کرچکی ہوں، اب صرف یہ کرنا ہے کہ مرسیڈیز میں اپنی جگہ مستقل کرنی ہے۔

''میں جو وعدہ کرتی ہوں اسے پورا کرتی ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

وہ بھی مسکرا دیے۔

محترم مدیر

السلام علیکم!

میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ معمولی شکل وصورت کی ہوتے ہوئے بھی اپنی حسین وجمیل بہنوں کو زندگی کی بساط پر بُری طرح شکست دی ہے۔ جو خواب انہوں نے دیکھے تھے، انہیں تعبیر میں نے دی مگر اپنے لیے۔ کیسے، یہ آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔ اس آپ بیتی میں ایک لفظ بھی غلط نہیں صرف نام تبدیل کیے ہیں۔

نائلہ

(شکاگو)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ویسے آپ کو یہ امید کیوں نہیں تھی کہ میں آؤں گی؟'' انہیں خاموش دیکھ کر میں نے سوال کر دیا۔

''ہماری عمروں میں جو فرق ہے اس وجہ سے میں یہ سوچ رہا تھا.....'' انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا تھا۔

''اگر آپ سچ پوچھیں تو میں خود آپ سے ملنا چاہتی تھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور انہوں نے گاڑی چلاتے ہوئے مجھے یوں دیکھا جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔

''کوئی خاص بات.....؟'' انہوں نے سوال کیا، ان کے چہرے کی بے یقینی ان کے لہجے میں بھی تھی۔

''اس روز جب میں سارہ کے ساتھ آپ سے ملی تھی تب بھی آپ مجھے بہت اچھے لگے تھے۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ مسکرا دیے۔

''سارہ نے ذکر کیا تھا لیکن اس کے بعد تم آئی ہی نہیں۔'' انہوں نے ایک اور سوال کیا تو میں مسکرا کر رہ گئی۔ منصوبے کے مطابق ابھی مجھے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کرنی تھی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے گفتگو کا رُخ موڑنے کے لیے سوال کیا۔

''فلیٹ پر.....'' انہوں نے مختصراً جواب دیا اور میں خاموش رہی۔

''تمہیں کوئی اعتراض .....؟'' مجھے خاموش دیکھ کر انہوں نے سوال کیا اور میں ہنس دی۔

''میں آپ پر اعتماد کر کے آئی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس بار انہوں نے بغور میرا جائزہ لیا تھا، جیسے میری بات کو تول رہے ہوں۔

''تم دونوں بہنوں میں کتنا فرق ہے؟'' انہوں نے کہا اور میں ہنس دی۔

''چھ سال کا فرق ہے ہم دونوں میں۔'' میرا جواب سن کر وہ بھی ہنس پڑے تھے۔

ابھی ہماری ہنسی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے اکھڑے لہجے میں فون ریسیو کرتے ہوئے کہا تھا لیکن پھر فوراً ہی دوسری جانب سے جو کہا گیا اسے سن کر ان کے چہرے پر سنجیدگی بڑھتی چلی گئی۔

''انہیں روکو، میں آتا ہوں۔'' سنجیدگی سے پوری گفتگو سننے کے بعد انہوں نے کہا تھا اور لائن کاٹ دی تھی۔

''ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔'' انہوں نے میری جانب مڑے بغیر کہا تھا لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کار کی رفتار یکدم تیز ہو گئی ہے۔

''خیریت تو ہے؟'' میں نے سوال کیا لیکن انہوں نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

''یا تو میں تمہیں ساتھ لے کر فیکٹری جاؤں یا تمہیں فلیٹ پر ڈراپ کر دوں اور تم انتظار کر لو؟'' انہوں نے کہا۔

''جو آپ مناسب سمجھیں لیکن اگر فلیٹ دور نہیں تو میں انتظار کر لوں گی۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ سوچنے لگے۔

''فلیٹ تک تو ہم پہنچ ہی چکے ہیں۔'' ان کا جواب تھا۔

''اگر فلیٹ پر کوئی ہے تو اسے میرے بارے میں بتا دیں، میں خود ہی فلیٹ تک چلی جاؤں گی۔'' میں نے کہا اور وہ ایک بار پھر مسکرا دیے۔

''اب اس قدر بھی ایمرجنسی نہیں ہے۔'' انہوں نے جواب میں کہا تھا۔

وہ فلیٹ سمندر کے کنارے ایک بڑے پروجیکٹ میں تھا۔ تین بڑے بیڈ روم کی دو گیلریز سمندر کی جانب کھلتی تھیں۔ ہم فلیٹ پر پہنچے تو ان کا ملازم ہمارا منتظر تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''مجھے آنے میں دیر نہیں لگے گی۔'' اور پھر ملازم سے کہا ''ان کا خاص خیال رکھنا اور ٹی وی کھول دینا۔''

''آپ اطمینان سے اپنا کام کر کے آئیں، میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' میں نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے اگر دیر ہو گئی تو تم کھانا کھا لینا۔'' انہوں نے جواب دیا اور میں مسکرا دی تھی۔

''کھانا میں آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔'' میں نے لگاوٹ والے انداز میں کہا اور ان کے اُٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ایسے جیسے وہ نہ جانا چاہتے ہوں لیکن پھر اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

میں پلٹ کر آئی تو ملازم میرا منتظر تھا۔ اس کی نظریں مجھے اس طرح تول رہی تھیں جیسے قصائی کی نظریں ذبح کرنے سے پہلے بکرے کو تولتی ہیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟ ظاہر ہے میں اس فلیٹ میں اس طرح آنے والی پہلی لڑکی تو نہیں تھی۔

''آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں گی یا.....'' اس نے عجیب سے انداز میں سوال کیا تھا۔

''بیڈ روم کا ٹی وی آن کر کے اس پر میچ لگا دو۔'' میں نے کوئی تاثر لیے بغیر جواب میں کہا اور وہ کوئی جواب دیے بغیر بیڈ روم کی جانب مڑ گیا۔ مجھے کرکٹ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن میرے منصوبے میں چونکہ کرکٹ سے دلچسپی ایک خاص حصہ تھا اس لیے میں کرکٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی تھی ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان کے گھر میں بیٹھ کر ایسی صورت میں جبکہ پاکستان کا میچ ہو کچھ اور دیکھ لیتی کیونکہ میں جانتی تھی کہ ملازم انہیں میری تمام رپورٹ دے گا۔

ٹی وی اسکرین پر کرکٹ میچ چل رہا تھا لیکن میں نے اپنے پلان پر دوبارہ غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب تک میرے اندر کہیں سے یہ آوازیں بھی آ رہی تھیں کہ میں صحیح نہیں کر رہی ہوں، لیکن میں انہیں دبانے میں کامیاب بھی ہو رہی تھی۔

''میں ان دونوں پر ثابت کر دوں گی کہ شکل صورت میں ممکن ہے وہ مجھ سے بہتر ہوں، لیکن اپنی عقل مندی اور بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ میں ان سے بہتر زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں نے ان اُبھرتی ہوئی آوازوں کو دباتے ہوئے سوچا اور پھر بے اختیار ہی میں ماضی میں سفر کرتی چلی گئی۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ دو بہنیں جڑواں تھیں نہیں بلکہ ہزاروں میں ایک تھیں لیکن میں ان کے بالکل برعکس تھی یا شاید یہ بات بھی تھی کہ ان دونوں کی موجودگی میں میری خامیاں کچھ اور زیادہ نکھر کر سامنے آتی تھیں۔ سارہ مجھ سے چھ سال اور صائمہ سات سال بڑی تھیں۔ جبکہ مجھ میں اور بھائی میں چار برس کا فرق تھا۔

ہوش سنبھالتے ہی اس طرح کے فقرے میرے کانوں میں آنے لگے جو مجھے احساس کمتری کا شکار کرنے کے لیے کافی تھے اور ابتدا میں اس احساس کمتری کا میں شکار ہوئی بھی، لیکن پھر میں نے اپنا علاج خود ہی تجویز کیا اور میں کتابوں میں کھو گئی۔ اسکول میں پہلی پوزیشن مخصوص ہو گئی تھی لیکن میری دلچسپی ہر طرح کی کتابوں میں تھی۔ ادب، خود نوشت سے لے کر سفر ناموں اور فلسفہ کی کتابیں میری توجہ کا مرکز بن گئی تھیں اور اس مطالعے نے جیسے میرا ذہن روشن کر دیا تھا۔

ہمارا تعلق درمیانے بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تھا لیکن اس کے باوجود امی کی توجہ دونوں بڑی بہنوں پر پوری طرح رہتی تھی۔ امی کا خیال تھا کہ وہ انہیں بہتر انداز میں محفلوں میں پیش کریں گی تو ان کی قسمت سنور جائے گی لیکن ہوا یہ کہ امی کی بے پناہ توجہ اور ان دونوں کی جائز و ناجائز خواہشات کو پورا کرنے سے وہ صرف خود پسند اور خود سر ہی نہیں ہو گئیں بلکہ ان کے خواب بھی بلند سے بلند تر ہونے لگے۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ تمام ترتیعشات ان کا حق ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان پر حقیقتیں واضح ہونے لگیں، لیکن اس کے باوجود دونوں ہی حقائق کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

گریجویشن کے بعد پہلے صائمہ اور پھر سارہ دونوں نے نوکریاں کر لی تھیں، ان دونوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنے لیے بہتر مستقبل بہ آسانی تلاش کر لیں گی، لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا کئی ناکامیوں کے بعد بھی ان کی کوششیں جاری رہیں لیکن اب ان دونوں کی توجہ کا مرکز اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ تھے لیکن کامیابی اس کے باوجود ان کے مقدر میں نہیں تھی۔

ان دونوں کی منصوبہ سازی کو اس وقت زبردست دھچکا لگا جب صائمہ اپنے جنرل منیجر کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس بات کا علم گھر پر ہوا تو ہم سب جیسے سکتے میں آ گئے۔ امی اس سے ملیں تو اس چالاک شخص نے امی کو بھی اپنی باتوں سے شیشے میں اُتار لیا۔

''میں انکاری نہیں ہوں، بالکل بھی انکاری نہیں ہوں، لیکن ذرا سوچیں، اس بچے یا بچی کا کیا مستقبل ہو گا جو شادی کے پانچ یا چھ ماہ بعد پیدا ہو گا؟'' اس نے کمالِ عیاری سے امی کو اپنی باتوں کے جال میں اُلجھا لیا تھا۔

امی نے اس کی بات مان لی۔ حمل ختم کروا لیا گیا لیکن پھر اچانک ایک دن معلوم ہوا کہ وہ صاحب صرف نوکری ہی نہیں بلکہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ صائمہ چند دن اس صدمے سے نڈھال رہی لیکن بات چونکہ چند لوگوں تک محدود رہی تھی اس لیے اس کی زندگی کی گاڑی دوبارہ پٹری پر آنے میں دیر نہیں لگی، لیکن اب اس نے اونچے خواب دیکھنے کم کر دیے تھے۔

صائمہ کے حادثے کا سارہ نے یہ اثر لیا کہ وہ بہت زیادہ محتاط ہو گئی تھی بلکہ وہ یہ کہنے لگی تھی کہ مرد کی دسترس میں آ جانے کے بعد عورت بے وقعت ہو جاتی ہے۔

سارہ کے باس اس پر مہربان ہوئے تو سارہ کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب کچھ سہانے ہو گئے۔ اب اختر صاحب کی صورت میں اسے اپنا ہر خواب پورا کرنے والا نظر آ رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اکثر شامیں گزارنے لگی لیکن انہیں اتنا بھی قریب نہیں آنے دیتی تھی کہ وہ اسے چھو سکیں۔ میں اس کی ہر بات خاموشی سے سنتی تھی اس لیے وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرنے لگی تھی لیکن نہ وہ مجھ سے کوئی مشورہ مانگتی تھی نہ میں اسے کوئی مشورہ دیتی تھی جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ غلط کر رہی ہے۔

میرا خیال اس وقت اور زیادہ پختہ ہو گیا جب ایک بار سارہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اختر صاحب نے اس روز اسے ڈنر پر مدعو کیا تھا اور سارہ نے کمپنی ڈنر کا بہانہ بنایا تھا لیکن مجھے محافظ کی حیثیت سے ساتھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اختر صاحب تنہائی میں اپنی حدود سے گر کر اس کرنے کی کوشش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کریں گے اور پھر ہوا بھی ایسے ہی، اختر صاحب نے فلیٹ پر ڈنر کرنے کی آفر کی جسے سائرہ نے مسترد کرنے میں سیکنڈ کا وقفہ بھی نہیں لیا تھا۔

''آپ ایسا کریں کہ آپ ہمیں یہیں ڈراپ کردیں، ہم رکشا لے کر گھر چلے جائیں گے۔'' سائرہ نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہاری بہن تمہارے ساتھ ہے.....'' اختر صاحب نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ سائرہ نے درمیان سے ان کی بات اچک لی۔

''آپ باس بن کر حکم دیں گے تب بھی آپ کی بات نہیں مانوں گی۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا اور اختر صاحب کو اس کی بات ماننی پڑی تھی۔

فائیو اسٹار ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے بھی سائرہ نے اپنی ناراضی اس طرح ظاہر کی تھی کہ وہ دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔

''اب یہاں پر بہت سے جان پہچان کے لوگ ملیں گے اور میرے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔'' انہوں نے نہایت آہستگی سے مجھ سے کہا تھا۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔'' میں نے ان سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اب کوئی ایسا شخص مل گیا جو سائرہ کو میرے آفس میں دیکھ چکا ہو تو تم سمجھ سکتی ہو کہ میری کیا پوزیشن ہوگی۔'' ان کا لہجہ مزید شاکی ہوگیا تھا۔

''مجھے احساس ہے لیکن آپ اتنا تو سمجھ گئے ہوں گے سائرہ ایک ضدی لڑکی ہے۔'' میں نے ایک بار پھر ان سے اتفاق کیا تھا۔

یہ شاید محض اتفاق تھا کہ ہمیں بالکل کونے کی اور قدرے الگ تھلگ ٹیبل مل گئی اور سائرہ کچھ ناراض سی وہاں بیٹھ گئی اور اختر صاحب نے کوشش کی کہ اسے منالیں ''اب تو تمہاری بات مان لی، اب کیوں ناراض ہو؟'' انہوں نے فدویانہ انداز میں کہا تھا اور سائرہ نے تکبرانہ انداز میں میری جانب دیکھا تھا اور پھر اس نے مان جانے میں دیر بھی نہیں لگائی۔

اختر صاحب سے وہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن سائرہ ان کا تذکرہ کرچکی تھی کہ میں ان کے بارے میں تقریباً تمام باتیں جان چکی تھی اور مجھے حیرت بھی تھی کہ وہ سائرہ میں کیا تلاش کررہے تھے۔

اس پہلی ملاقات کے پہلے آدھ گھنٹے کے روٹھنے اور منانے کے عمل میں مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اس ٹھرکی بوڑھے کی کون سی خواہشیں ہیں جن کی تسکین کے لیے سائرہ کے بھی ناز نخرے اُٹھا رہا ہے اور تبھی میں نے اسے اس جانب متوجہ کرنے اور اپنے اندر برسوں کی بھڑکتی ہوئی ''پیاس'' کی آگ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور تبھی میں نے وہ گفتگو شروع کی جس نے اختر صاحب کو مجھ کم شکل کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کردیا۔

سائرہ مجھے بتا چکی تھی کہ اختر صاحب کو بے شمار شعر یاد ہیں جنہیں وہ پڑھتے ہیں لیکن سائرہ کی سمجھ میں وہ نہیں آتے تھے اور اس لیے اختر صاحب کو اکثر ان کی تشریح بھی کرنی پڑتی تھی۔ اختر صاحب نے اپنی عادت کے مطابق سائرہ کے مان جانے کے بعد ایک شعر پڑھا تو میں نے اس کے جواب میں اسی طرح کا ایک اور شعر پڑھا اور وہ میری جانب متوجہ ہوگئے۔ ایک بار مجھے اپنی قابلیت جھاڑنے کا موقع ملا تو میں نے اپنے برسوں کے مطالعے کا نچوڑ پیش کرنا شروع کردیا اور سائرہ کچھ ہی دیر میں وہاں ثانوی ہوگئی۔

سائرہ جیسی خود پسند لڑکی کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی لیکن میں اپنی چال چلتی رہی یہاں تک کہ گھر پہنچ کر سائرہ نے اس انداز میں ہنگامہ کیا کہ امی اور صائمہ کو یہ کہنا پڑا کہ ''آئندہ سائرہ کہیں بھی مجھے ساتھ لے کر نہ جائے۔''

ان دونوں کا فیصلہ سن کر میں دل ہی دل میں خوب ہنسی تھی کیونکہ اس روز بھی سائرہ نے اپنی مجبوری کے تحت مجھے ساتھ لیا تھا ورنہ تو میں بچپن سے یہ سننے کی عادی تھی کہ ہم اسے ساتھ نہیں لے جائیں گے کیونکہ اسے دیکھ کر ہماری سہیلیاں عجیب عجیب سے سوال کرتی ہیں جن سے ہماری بے عزتی ہوتی ہے۔''

سائرہ تو کیا اختر صاحب کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کون سا بیج بو کر آئی ہوں، اب کسر تھی تو اتنی کہ میں اسے پانی دے کر تناور درخت بنادوں لیکن وہ سب کچھ ایک پلان کے تحت بہت ہوشیاری سے کرنا تھا اور بار بار اپنے پلان کو کراس چیک بھی کرتے رہنا تھا کہ کہیں کوئی ایسی غلطی نہ ہوجائے کہ ہمارے گھر میں وہی کہرام ایک بار پھر آئے جو پہلے صائمہ کی وجہ سے آیا تھا۔

جو کام میں کرکے آئی تھی اس کے بارے میں مجھے توقع تھی کہ اس کا نتیجہ نکلنے میں دو یا تین دن ضرور لگیں گے لیکن مجھے حیرت ہوئی جب اگلے ہی روز لینڈ لائن پر اس وقت ان کا فون آیا جب گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ یہ بات میں باتوں باتوں میں بتا چکی تھی کہ دونوں بہنوں اور بھائی کے دفتر نکلنے کے بعد امی روزانہ دس بجے کے قریب سودا لینے جاتی ہیں

والا جاہ عرصۂ دراز تک ارکاٹ میں حکومت کرتے رہے۔ ان کا نام جنوبی ہند کی تاریخ میں مختلف وجوہ سے مشہور ہے۔ ان کے زمانے میں ارکاٹ میں علم وفن کی گرم بازاری رہی۔ سید محمد موسوی والہ تخلص کرتے تھے۔ کم عمری ہی میں نظم ونثر میں کافی دست گاہ پیدا کرلی تھی، والہ نے اردو میں بھی مہارت پیدا کرلی تھی اور شعر موزوں کرتے تھے، ایک مثنوی ''طالب اور موہنی'' کے نام سے لکھی جو کہ ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ تقریباً ایک ہزار اشعار کی اس مثنوی کا خلاصہ یوں ہے۔

ایک نوجوان طالب علم کا گزر ایک گاؤں کے پنگھٹ پر ہوا۔ وہاں گاؤں کے مہاجن کی لڑکی موہنی پانی بھرنے کے لیے آئی۔ طالب، موہنی کے تیر نظر کا گھائل ہوگیا۔ عشق سے مجنوں بن گیا۔ موہنی کے پیچھے اس کے مکان پر چلا آیا، مہاجن نے کوشش کی کہ موہنی کا نام بدنام نہ ہو اور طالب وہاں سے چلا جائے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لوگوں نے کہا دیوانہ ہے، جانے دو۔ اس طرح تین دن گزر گئے۔ طالب نے کچھ کھایا اور نہ پیا۔ اب لوگوں نے مشورہ دیا موہنی کے ذریعے اس کو کھانا دیا جائے اور کھلا پلا کر روانہ کردیا جائے۔ چنانچہ مہاجن نے ایسا ہی کیا۔ طالب نے موہنی کا لایا ہوا کھانا تو کھالیا مگر گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ یہ حالت دیکھ کر عامل سے شکایت کی گئی۔ عامل نے طالب کو طلب کیا، واقعات معلوم کیے، سچے عشق سے باخبر ہوا اور طالب کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی اور مہاجن کو فہمائش کی کہ اس کے گھر میں رک کر خبر گیری کی جائے، موہنی کے ذریعے روز ایک وقت طالب کو کھانا تو دیا جاتا مگر دونوں کو کبھی ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ موہنی کی دایا طالب پر مہربان ہوگئی اور ہولی کے تہوار میں طالب سے کہا کہ فلاں باغ میں جائے وہاں موہنی سے ملاقات ہوسکے گی۔ مگر مہاجن کے ایک سخت گیر ملازم کو اس کی خبر ہوگئی۔ وہ باغ میں پہنچ گیا مگر ایک کالے ناگ نے اس کو ڈس لیا۔ مہاجن کے دوستوں نے اس کو مشورہ دیا کہ دایا کو دوسرے گاؤں میں چند روز کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس کے غیاب میں موہنی کی بیماری مشہور کی گئی، پھر مرنے کا اعلان کیا گیا اور جب فرضی جنازہ لے چلے تو طالب بھی گریہ کرتا جنازے کے ساتھ ہولیا۔ اب لوگوں نے طعنہ دیا کہ معشوق مرگیا اور عاشق کہلا کر زندہ ہے۔ اس طعنے کا طالب پر فوری اثر ہوا۔ اس نے ایک کنویں میں گر کر اپنی جان دے دی۔ موہنی کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ بھی آکر کنویں میں گر پڑی۔ لوگ جمع ہوئے اور لاشیں نکالی گئیں تو دونوں کی لاشیں باہم پیوستہ تھیں، لاکھ کوشش کی گئی مگر جدا نہ ہوسکے۔ عامل کو اطلاع ہوئی اس نے آکر نماز جنازہ کے بعد دونوں کو ایک ساتھ قبر میں دفن کیا۔''

قریب قریب اسی مضمون کی ایک اور مثنوی ''مہیار اور چندر بدن'' کے نام سے عادل شاہی عہد میں مقیمی نے لکھی ہے۔

اقتباس: دکنی فکشن از محمد نصیر الدین ہاشمی۔ انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

اور میں کالج بند ہونے کی وجہ سے گھر پر اکیلی ہوتی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اختر صاحب کے لیے سائرہ کی فائل سے اس کے گھر کا نمبر تلاش کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔

اختر صاحب نے فون پر پہلا سوال یہی کیا کہ ''رات خیریت سے گزری؟'' اور جواب میں ہنستے ہوئے میں نے تمام روداد انہیں سنادی۔

''تم جب بول رہی تھیں اس وقت میں نے جو تاثرات سائرہ کے چہرے پر دیکھے تھے، اس کے بعد مجھے یقین تھا کہ گھر پہنچ کر تمہاری خیریت نہیں رہے گی۔'' انہوں نے میری روداد سن کر کہا تھا۔

''تب تو آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی.....اختر صاحب!'' میں نے معصومانہ انداز میں کہا اور وہ ہنس دیے۔

''بات دراصل یہ تھی کہ مجھے بھی تم سے بات کرنے میں مزہ آرہا تھا۔'' انہوں نے میری تعریف کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''میں زندگی میں پہلی بار کسی ایسے شخص سے مل رہی تھی جس کی گفتگو میں اتنی گہرائی ہو لیکن اس کے باوجود اگر مجھے شبہ بھی ہوتا کہ میری اس حرکت سے سائرہ کو تکلیف پہنچے گی تو میں ایک لفظ بھی نہ بولتی۔'' میں نے مکمل طور پر جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

ایک گھنٹے تک وہ مجھ سے بات کرتے رہے اور میرے یہ کہنے پر کہ امی واپس آتی ہوں گی، انہوں نے میرا موبائل نمبر لے کر بات ختم کی لیکن میں نے ان سے کہا تھا کہ رات دس بجے سے پہلے فون نہ کریں۔

میں دن بھر فارغ ہی ہوتی تھی لیکن ابھی آتشِ شوق کی آنچ کو مزید بھڑکنا چاہیے تھا اس لیے میں نے دس بجے سے پہلے فون کرنے سے منع کیا تھا پھر دس بجے سے پہلے ہی فون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بند کر دیا تھا۔

اگلی صبح اس سے پہلے کہ ان کا فون آتا میں نے فون کر دیا۔

"رات کے لیے معذرت۔" میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا" کچھ مہمان آ گئے تھے جن کے سامنے میں فون ریسیو نہیں کر سکتی تھی اس لیے فون بند کر دیا تھا۔" میں نے جواز دیا جسے انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا۔

اس روز پھر ہم نے ایک گھنٹے سے زیادہ بات کی اور اختر صاحب نے ملنے کی خواہش کی تو میں نے پلان کے مطابق ان سے کہا" میں کیسے آ سکتی ہوں، میں تو کہیں جاتی ہی نہیں ہوں؟"

وہ مجھے مختلف بہانے بتاتے رہے لیکن ہر بہانے کا توڑ میرے پاس تھا لیکن گفتگو کے آخر میں، میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ" میں کچھ سوچوں گی۔"

جو کچھ میں نے سوچا تھا اس کا اظہار رات کی گفتگو میں کیا تو وہ بھڑک ہی اُٹھے۔

"تمہارا نتیجہ آنے میں ابھی پندرہ دن ہیں تو کیا پندرہ دن تک انتظار کروں گا؟" انہوں نے کہا اور میں ہنس دی۔

"اس کے علاوہ جو راستہ ہے اس پر میرے گھر والے گھر سے نکال دیں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"کوئی راستہ نکالو لڑکی......!" انہوں نے اصرار کیا۔

"آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے... میں آپ سے زیادہ آپ سے ملنے کی خواہش مند ہوں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟" میں نے افسردہ لہجے میں کہا لیکن اس کے جواب میں وہ خاموش ہی رہے۔

اس کے بعد میں نے ان کی تعریفوں اور اپنی کم مائیگی کو اس طرح بیان کیا کہ وہ کبھی مجھے دلاسے دیتے اور کبھی میری تعریفیں کرتے رہے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلا یہاں تک کہ میں نے ایک روز انہیں خبر دی کہ مجھے گھر سے اس بات کی اجازت مل گئی ہے کہ رزلٹ سے دو روز قبل کالج میں ہونے والی" گیٹ ٹو گیدر" میں شریک ہو سکتی ہوں۔

"گیٹ ٹو گیدر کے بعد میں تمہیں کالج سے پک کر لوں گا۔" اختر صاحب نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔

"پک تو آپ اس وقت کریں گے جب گیٹ ٹو گیدر ہو گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ مزید خوش ہو گئے۔

ان چودہ دنوں میں ہماری گفتگو بہت آگے بڑھی تھی لیکن ہماری گفتگو کو اگر چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا تو تین حصے ان کی تعریف ہوتی اور ایک حصہ میری مظلومیت کی داستان تھی۔ ان چودہ دنوں میں انہیں پوری طرح یہ یقین دلانے میں کامیاب رہی تھی کہ میں ان کی شخصیت، ان کے مطالعے یہاں تک کہ ان کے اندازِ گفتگو کی پوری طرح اسیر ہوں۔

"کیا قسمت ہے آپ کی نائلہ بی بی کہ جب پلان کے دوسرے مرحلے پر عمل کرنے کا وقت آیا تو ایمرجنسی ہو گئی۔" میں مسکراتے ہوئے خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

میں ماضی سے حال میں آئی تو جو پہلا احساس ہوا وہ یہ کہ مجھے بہت زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ دوسرا احساس یہ ہوا کہ میچ بھی اپنے اختتام کی جانب ہے لیکن پاکستان کی پوزیشن کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ کمنٹیٹر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اب بھی پاکستان کو دو وکٹیں مل جائیں تو وہ گیم میں واپس آ سکتا ہے اور تیسرا احساس یہ ہوا کہ اختر صاحب کو گئے ہوئے دو گھنٹوں سے زیادہ ہو چکے ہیں۔

مجھے ماضی سے حال میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اختر صاحب آ گئے اور آتے ہی تیزی سے بیڈ روم کی جانب لپکے جہاں میں بہ ظاہر پورے انہماک سے میچ دیکھ رہی تھی۔

"کیوں وقت ضائع کر رہی ہو؟ پاکستان میچ ہار چکا ہے۔" انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی دو وکٹیں گریں گی اور میچ جیتنے کے چانس ہو جائیں گے۔" میں نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا تھا اور اختر صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا لیکن اس حیرت میں ایک خوشی کا تاثر بھی تھا۔

"اگر تمہاری زبان مبارک ہوئی تو میرے پانچ لاکھ بچ جائیں گے۔" اختر صاحب نے کہا تھا۔ سائرہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ وہ کرکٹ پر لمبا سٹہ کھیلتے ہیں لیکن پاکستان کی شکست پر سٹہ نہیں لگاتے۔

"پانچ لاکھ بچ گئے تو ڈھائی پرسنٹ مجھے ضرور دینا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ ہنس دیے۔

"جیت کی تمام رقم تمہاری......" انہوں نے ہنسی کا جواب ہنسی میں دیا تھا۔

"تو پھر دیکھیے، کیسے وکٹیں گرتی ہیں۔" میں نے بھی اسی موڈ میں کہا اور پھر یہ ہوا کہ ایک گیند درمیان میں گئی اور دو کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہو گئے۔ میچ یکدم تبدیل ہو گیا تھا۔

"تم تو یار، کوئی بابا ہو۔" انہوں نے میرے برابر بیٹھتے

ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی آواز لگائی" شکیل، کھانا یہیں لے آؤ۔"

میں میچ میں محو ہونے کی اداکاری کر رہی تھی جب ان کا ہاتھ مجھے اپنی کمر میں محسوس ہوا تھا۔ میں نے پہلے انہیں گھورا اور جیسے ہی ان کا ہاتھ پیچھے ہوا، میں ہنس دی تھی۔

"اختر صاحب، بابا ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور وہ بھی مسکرا دیے تھے لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ واپس اسی جگہ آ گیا جہاں میرے گھورنے سے پہلے تھا۔

ملازم کھانے کی ٹرالی وہیں لے آیا لیکن اختر صاحب کی حرکتیں اسی طرح جاری تھیں۔ ملازم کھانا رکھ کر واپس چلا گیا تو اختر صاحب نے کھانے کی پلیٹ میری جانب بڑھائی جسے میں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ ذمّے داری خواتین کی ہوتی ہے۔

میں کھانا اس انداز میں پیش کر رہی تھی جیسے میں میزبان ہوں اور اختر صاحب میرے مہمان۔ اسی دوران میں میچ تبدیل ہوتا چلا گیا اور جب تک کھانا ختم ہوتا، پاکستان کی جیت یقینی ہو گئی تھی۔

"تم تو میرے لیے واقعی خوش نصیب ہو۔" اختر صاحب نے اس وقت کہا تھا جب نویں وکٹ گری تھی۔

"اگر میں یہ سوال کروں کہ یہ فقرہ آپ اس سے پہلے کتنی لڑکیوں سے کہہ چکے ہیں تو آپ کا کیا جواب ہو گا؟" میں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا تھا۔

"ایک سے بھی نہیں......" اختر صاحب نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر کہا تھا۔

"اور یہ بات کتنی لڑکیوں سے کہی ہے؟" میں نے اسی لہجے میں سوال کیا۔

"کون سی بات......؟" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"یہی کہ ایک سے بھی نہیں۔" میں نے وضاحت کی اور وہ صرف مجھے دیکھتے رہے۔

"یہ کس طرح کے سوال کر رہی ہو؟" اختر صاحب کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"میں جانتی ہوں اختر صاحب، کہ میں آپ کی زندگی میں آنے والی نہ پہلی لڑکی ہوں اور شاید آخری بھی نہیں ہوں لیکن آپ پہلے شخص ہیں جن سے میں اس حد تک متاثر ہوئی ہوں کہ آپ کا ہر حکم میرے سر آنکھوں پر۔" میں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا اور اختر صاحب مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ میرے جواب

> ہمارے ساتھ ایک مسافر فرضی نام کے تحت سفر کر رہا تھا۔ اس کا اصلی نام علی عسکر تھا اور اس نے بعد میں بتایا کہ وہ رستم ایران تھا۔ اس نے اپنے بھیس کی توجیہہ کے لیے یہ کہانی سنائی جس کی تصدیق بعد میں کیپٹن کرسٹی نے یہ کہہ کر کی کہ اس نے خود یہ کہانی یزد میں بھی سنی۔ کوئی دو سال پہلے شاہی پہلوان نے چیلنج دیا کہ کوئی ایرانی شاہ کے حضور اس سے مقابلہ کرے اور علی عسکر اس کے مقابلے کے لیے دربار میں پہنچا۔ زور خانے میں ایک وسطی فوارہ تھا۔ ابتدائی نوک جھونک کے بعد علی عسکر نے حریف کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا اور اس زور سے فوارے پر دے مارا کہ اس کی ران ٹوٹ گئی اور اسے اس بُری طرح زخمی کیا کہ وہ چند ہفتوں میں چل بسا۔ شاہ نے علی عسکر کو جلاوطن کر دیا لیکن وہ چھپا رہا اور 1809ء کی خزاں میں جب بادشاہ میدان سلطانیہ سے تہران واپس آ رہا تھا، وہ اسے اس شہر سے چار فرسخ یا تقریباً سولہ میل پر ملا اور اس کے گھوڑے کے عین روبرو رجعت قہقہری کا کمال دکھانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ دو بڑے بڑے ڈنڈ لگا تار اور زمین کی طرف دیکھے بغیر اپنے سر کے گرد گھمانے لگا۔ شاہ اس مظاہرۂ قوت پر اتنا خوش ہوا کہ اسے معاف کر دیا اور وہ آزادی سے گھومنے پھرنے لگا۔
>
> لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے" سفرنامہ بلوچستان اور سندھ" سے اقتباس
>
> تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

میں کچھ کہنا چاہ رہے ہیں، لیکن شاید انہیں مناسب الفاظ نہیں مل پا رہے تھے اور یہی میرے لیے مناسب موقع تھا کہ گرم لوہے پر چوٹ لگا دوں۔

"میں جانتی ہوں کہ مجھ میں کوئی بھی ایسی خوبی نہیں جس کی وجہ سے آپ میری جانب متوجہ ہوں اور جو ایک واحد خوبی ہے وہ بھی ایسی نہیں ہے کہ میں چند دن سے زیادہ آپ کو اپنی جانب متوجہ رکھ سکوں۔" بولتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا تھا اور تب ہی اختر صاحب نے میرے کاندھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہیں ہے نائلہ!" انہوں نے بہ مشکل کہا تھا۔

"میں سچ کا سامنا کرنا جانتی ہوں۔" انہوں نے کاندھوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیے تھے لیکن میں نے جو کہنا تھا وہ میں کہہ گئی۔

فضا میں ایک عجیب سی گمبھیرتا سی چھا گئی تھی۔ میں اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کہہ چکی تھی اور اب منتظر تھی کہ ان کی جانب سے کیا ردِعمل آتا ہے، ان چودہ دنوں میں جو کچھ ہوا تھا وہ ایک منصوبے کے تحت ہوا تھا۔ میرا وہاں آنا اور یہاں کہا گیا ایک ایک لفظ ایک پلان کے تحت تھا اور مجھے پوری پوری توقع تھی کہ اس کا ردِعمل بھی وہی ہوگا جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔

خاموشی کا وقفہ طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ اختر صاحب کے ہاتھ میرے کاندھوں سے ہٹ گئے تھے لیکن وہ کچھ دور موجود کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ خاموشی کے اسی وقفے میں پاکستان میچ جیت گیا لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس جانب متوجہ نہیں ہوا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ میری نظروں سے آج تک تم جیسی سمجھ دار لڑکی نہیں گزری تو تم میری بات کا یقین کرلو گی؟'' خاموشی کے طویل ہوتے ہوئے وقفے کو بالآخر اختر صاحب نے ہی ختم کیا تھا۔

اختر صاحب نے سوال کیا تھا لیکن میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اس قدر کم عمری میں اتنی سمجھ دار لڑکی آج تک میری نظروں سے نہیں گزری۔'' اختر صاحب نے میری جانب سے کوئی جواب نہ پا کر وضاحت کی تھی۔

''آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے لیے حرفِ آخر ہے۔'' میں نے جواب میں کہا اور اختر صاحب کچھ دیر کے لیے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔

''تم وہ لڑکی ہو جو زبان سے لفظ نکلنے سے پہلے معاملہ سمجھ جاتی ہو۔'' انہوں نے مزید کہا۔

''مجھے آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے کہ آپ کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔'' میں نے آنچ اور تیز کی تھی۔

''میں جو بھی کہوں گا وہ مان لو گی؟'' اختر صاحب نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میرا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

''آزما کر دیکھ لیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔ میں نے اپنی جانب سے پورا اعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بھی مجھے اپنی آواز کی لرزش سی محسوس ہوئی تھی۔

اختر صاحب میرا جواب سن کر جس انداز سے آگے بڑھے تھے، اس سے ان کے ارادے صاف ظاہر تھے۔

''میں جانتی ہوں اختر صاحب، میرے پاس آپ کو دینے کے لیے صرف ایک ہی چیز ہے اور مجھے وہ آپ کو دینے میں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے لیکن.....؟'' میں نے اپنا فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑا تھا۔

''لیکن کیا.....؟'' انہوں نے وہی سوال کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔

''چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی، آپ مجھے اپنی بیوی بنالیں۔ مجھ سے شادی کرلیں، صرف میری تسلی کے لیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کروں گی.....'' میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' انہوں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''یہ چودہ دن میں اس لیے آپ سے دور تھی کہ میرا شناختی کارڈ نہیں بنا تھا۔'' میں نے سرخ لوہے پر آخری ضرب لگائی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ آپ پر کسی بھی طرح سے کوئی حرف آئے۔'' میں مزید جذباتی ہو گئی تھی۔

''ہماری عمروں کا فرق.....'' وہ بہ مشکل کہہ پائے تھے۔

''اختر صاحب، صرف اور صرف میری خواہش کے لیے.....'' میں نے کہا اور دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا پھر جیسے ہی ان کے ہاتھوں کو میں نے اپنے جسم پر محسوس کیا، میں ان کے سینے میں چھپ گئی۔

''تم جیسا چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔'' اختر صاحب نے مجھے اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

''میں دو تین دن میں تمام انتظام کرلوں گا۔'' انہوں نے کہا تھا اور میرا دل چاہا کہ میں نعرہ لگاؤں ''وہ مارا!'' لیکن میں ایسا نہیں کر سکی۔

اس کے بعد دو گھنٹوں تک میں ان کے ساتھ رہی لیکن ایک خاص حد سے وہ آگے نہیں بڑھے اور میں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا یہاں تک انہوں نے خود ہی کہا کہ ''آؤ، میں تمہیں ڈراپ کر آؤں۔''

اس کے بعد کی کہانی بہت مختصر سی ہے۔ تین روز بعد انہوں نے اسی فلیٹ میں اپنے چند مخصوص ملازموں کی موجودگی میں مجھ سے نکاح کیا اور وہ فلیٹ بھی میرے نام کر دیا۔ میں چھ برس تک ان کی بیوی بلکہ چہیتی بیوی رہی اور پھر اختر صاحب کی بیوہ بن گئی۔ اپنی زندگی میں وہ میرے نام اتنا کچھ کر گئے کہ ان کے بعد مجھے ان کی فیملی سے کچھ نہ کہنا پڑا۔ ایک برس بعد تمام جائداد بیچ کر اور دوسری شادی کر کے امریکا شفٹ ہو گئی۔ اب یہاں ایک اسٹور چلا رہی ہوں اور ساتھ ہی شوہر پر حکم بھی چلاتی ہوں۔ سائرہ اور صائمہ نے بھی شادیاں کرلی ہیں لیکن اب بھی دونوں نوکریاں کر رہی ہیں کیونکہ گھر چلانے کے لیے ان کا نوکری کرنا اشد ضروری ہے۔

میں نے موبائل آن کیا اور اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں اس وقت ایک پارک کے گیٹ پر کھڑا تھا شاہینہ مجھ سے ملنے کے لیے آنے والی تھی اب ظاہر ہے کہ شاہینہ میری دوست لڑکی ہوگی اسی لیے میں پارک کے گیٹ پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

شاہینہ کے ساتھ پرابلم یہ تھی کہ وہ اس پارک کا ایڈریس نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک ٹیکسی میں آ رہی تھی اسی لیے وہ گھڑی گھڑی فون کر کے مجھ سے ایڈریس معلوم کر رہی تھی۔

اس وقت بھی میں نے اسے ایڈریس ہی سمجھایا تھا۔

موبائل آف کر کے جیب میں رکھا ہی تھا کہ ایک بائیک میرے پاس آ کر رکی تھی۔ اس میں سے دو آدمی اترے، دونوں ہی کے پاس ٹی ٹی تھی۔ ''لا بھائی اپنا موبائل جلدی۔'' ایک نے ٹی ٹی لہرائی۔

میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔

''جلدی کر سوچ کیا رہا ہے؟'' دوسرا غرایا۔

''بھائی کسی کو ملنے کے لیے آتا ہے میں اسے ایڈریس سمجھا رہا ہوں۔'' میں نے کہا تھا۔

''بکواس مت کر۔''

''اب میں کیا کہہ سکتا تھا میں نے دل ہی دل میں ان دونوں پر لعنت بھیجتے ہوئے اپنا موبائل ان کے حوالے کر دیا۔ وہ دونوں موبائل لے کر روانہ ہو گئے اور میں احمقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔

اب ایک لمبی جھنجٹ میرے سامنے تھی کہ جا کر سم بند کرواؤ، پولیس میں رپورٹ کرو، اس کے علاوہ سب سے بڑی پرابلم یہ تھی کہ شاہینہ کیا کرے گی؟

وہ تو پورے علاقے میں بھٹکتی پھرے گی۔ میں اسے کیسے ایڈریس سمجھاؤں گا، اب مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا صرف اس لیے کہ شاہینہ کو اتنی دور ایک ویران پارک میں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟

یہاں دور دور تک کوئی کال آفس بھی نہیں تھا جہاں سے فون کر کے میں اپنی سم بلاک کرواتا اور شاہینہ کو منع کرتا کہ وہ اب نہ آئے۔

مرتا کیا نہ کرتا ایک طرف مارکیٹ کی تلاش میں پیدل

محترم ایڈیٹر سرگزشت
مودبانہ سلام!

میں رائٹر نہیں ہوں لیکن لکھنے کا شوق بہت ہے کیونکہ ڈائجسٹ پڑھنے کا جو شوقین ہوں۔ تقریباً تین ماہ قبل میرے ساتھ ایک واقعہ گزرا تھا جسے میں نے من وعن بیان کردیا ہے۔ اگر آپ کو پسند آئے تو اسے شائع کردیں اس طرح میں خود کو رائٹر کہلوا سکوں گا۔

انور کمال
(سرگودھا)

ذرا سی بات

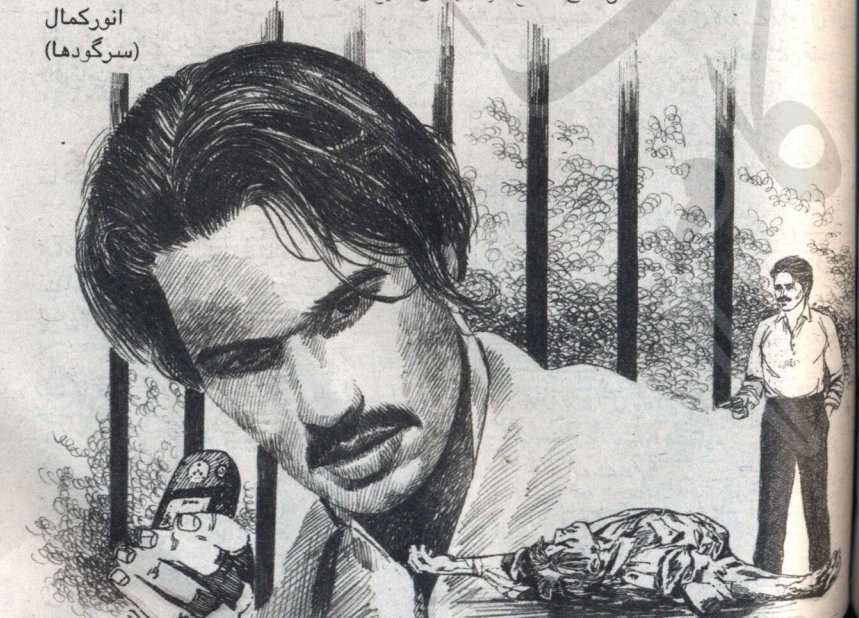

چل پڑا۔

مارکیٹ بھی کم بخت ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ میں نے سب سے پہلے شاہینہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی کیونکہ اس کا نمبر تو یاد ہی نہیں تھا وہ نمبر تو اس سم میں محفوظ تھا۔

اب میں کہاں سے اس کا نمبر تلاش کرتا دو چار غلط نمبر ملانے کے بعد میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ کال آفس والا بہت دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا صاحب کیا نمبر یاد نہیں آ رہا؟''

''ہاں بھائی۔ پتا نہیں شاہینہ کا کیا نمبر ہے۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''اس کا نمبر میرے پاس لکھا ہوا ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں اس کا نمبر کیسے معلوم؟''

''اس کا نمبر کون نہیں جانتا؟ اس علاقے کے بچے بچے کو اس کا نمبر معلوم ہے۔''

''یار تم کس شاہینہ کی بات کر رہے ہو؟''

پھر پتا چلا کہ اس نام کی ایک کال گرل اس علاقے میں رہتی ہے اور پورا محلہ اسے جانتا ہے اسی لیے دکاندار نے یہ سمجھا تھا کہ شاید میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔

''نہیں بھائی، میں تمہاری شاہینہ کو تلاش نہیں کر رہا۔ میں اپنی شاہینہ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس کا نمبر موبائل میں تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے دو بندوں نے میرا موبائل چھین لیا ہے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا صاحب۔'' اس نے موبائل چھیننے والوں کو دو چار گالیاں دیں۔ ''میرا خیال ہے صاحب کہ آپ والی شاہینہ موبائل کمپنی میں کام کرتی ہوگی۔''

''نہیں تو اس کا موبائل کمپنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تو پھر سب سے پہلے اپنی سم بند کروانے کی سوچیں صاحب یہ آپ شاہینہ کے چکر میں کیوں پڑ گئے۔''

''میرے عزیز سم بند کروانے کے لیے شناختی کارڈ نمبر ہونا بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے زبانی یاد نہیں ہے اب میں پہلے گھر جاؤں گا وہاں سے پھر موبائل کمپنی جاؤں گا۔''

''میں نے جاتے ہوئے ایک رکشے کو ہاتھ دیا وہ رکشا رک گیا تھا۔ ''کہاں جانا ہے؟'' رکشے والے نے اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں دریافت کیا۔

''نارتھ ناظم آباد۔''

''یہ کہاں پر ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' کیا تم نارتھ ناظم آباد بھی نہیں جانتے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ میں کل ہی گاؤں سے آیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بس تم مجھے راستہ بتاتے رہنا اور بار ایک بات اور میں نے گاڑی چلانا بھی کل ہی سیکھا ہے اگر کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو معاف کر دینا۔''

''معاف کرنے کے قابل رہوں گا تو معاف کروں گا نا۔''

''صاحب گھبراؤ نہیں بس بیٹھ جاؤ۔''

''اور میں خدا کا نام لے کر اس کے رکشے میں بیٹھ گیا۔ پہلے تو مجھے یہ فکر تھی کہ شاہینہ اِدھر اُدھر بھٹک نہ جائے اور سیدھی پارک تک پہنچ جائے پھر موبائل چھن جانے کے بعد یہ فکر ہونے لگی کہ سم بند کروائی جائے۔

پھر یہ فکر ہوئی کہ نہ جانے شاہینہ کہاں چلی گئی ہوگی اور یہ فکر ہونے لگی کہ رکشے والا کہیں کسی بس وغیرہ سے نہ بھڑا دے۔ انسان کے ساتھ پریشانیاں لگی ہی رہتی ہیں۔

بہر حال کوئی خاص حادثہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ایک موڑ پر رکشا الٹ گیا تھا اور میں تھوڑا زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

کسی نہ کسی طرح اپنے گھر تک پہنچ گیا اور رکشے والے نے پورے دو سو روپے اس بات کے وصول کر لیے کہ وہ بھی تھوڑا زخمی ہوا ہے یعنی یہ بات اس نے میرے کھاتے میں ڈال دی تھی۔

گھر آ کر میں نے جلدی جلدی گھر والوں کو اس حادثے کے بارے میں بتایا اور شناختی کارڈ لے کر موبائل کمپنی کے دفتر کی طرف دوڑ پڑا جو میرے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔

میرے پاس چونکہ اپنی گاڑی نہیں ہے اس لیے میں آنے جانے کے لیے رکشا وغیرہ لیا کرتا ہوں لیکن اس وقت بدقسمتی سے کوئی رکشا یا ٹیکسی بھی نہیں مل سکی تھی اس لیے پیدل ہی چل پڑا تھا۔

ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک دم سے پھر ایک موٹر سائیکل میرے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں بھی دو آدمی سوار تھے اور ان دونوں کے پاس بھی اسلحے تھے۔

''چلو شرافت سے اپنا موبائل ہمارے حوالے کر دو۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''بھائی جان، ابھی کچھ دیر پہلے میرا موبائل چھن چکا ہے۔'' میں نے تقریباً روتے ہوئے بتایا۔

''بکواس کر رہے ہو تم؟''

''یہ بکواس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر یقین نہ ہو تو میری تلاشی لے لیں۔''

ظاہر ہے کہ انہیں یقین کہاں آ سکتا تھا لہٰذا انہوں نے میری تلاشی لی اور جیب میں موجود سات سو بیس روپے نکال لیے۔ ان کا احسان یہ تھا کہ انہوں نے مجھے گولی نہیں ماری تھی۔ شناختی کارڈ بھی جیب میں رہنے دیا تھا۔

میں بہت بھنایا ہوا پھر آگے چل پڑا۔

اس وقت میرے دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگر میرے پاس بھی اسلحہ ہوتا تو میں ان دونوں کم بختوں کو وہیں پر شوٹ کر دیتا۔

میں اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوا موبائل کے دفتر پہنچ گیا۔

سامنے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک شخص سے میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا تو اس نے کہا۔ ''وحید صاحب کو آنے دیں۔ اس قسم کی شکایات وہی ڈیل کرتے ہیں۔''

''اور یہ وحید صاحب کب تک آئیں گے؟''

''یہ تو خود وحید صاحب بتا سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھائی وحید صاحب لنچ کرنے گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

شام کے چار بج رہے ہیں، اس وقت کون سا لنچ ہوتا ہے؟'' میرا دماغ آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا تھا۔

''یہی آپ ان سے پوچھیے گا۔''

''حد ہو گئی۔ اگر وحید صاحب نہیں ہیں تو اس دفتر میں کوئی کام ہی نہیں ہوگا۔''

''یہ بھی وحید صاحب ہی بتائیں گے۔''

اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میں نے جھلا کر ایک زور دار تھپڑ اس شخص کے چہرے پر رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر وہ ایک لمحے کے لیے تو سکتے میں رہ گیا تھا پھر اس نے جوابی کارروائی کے طور پر ایک زور دار گھونسا جڑ دیا اور اس سے پہلے کہ میں دوسرا ہاتھ مار سکتا اس دفتر کے گارڈ نے آ کر مجھے پکڑ لیا تھا۔

پھر سب نے مل کر میری دھلائی شروع کر دی۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ بس مار پیٹ کر رخصت کر دیا تھا۔ میں گھر اس حال میں پہنچا ہوں کہ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے چہرہ سوجا ہوا تھا اور ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔

گھر والوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ سب کرید کرید کر پوچھ رہے تھے اور میں مارے شرمندگی کے انہیں الٹا سیدھا جواب دے رہا تھا، اس وقت میرے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔

میری کیفیت کا اندازہ ان ہی کو ہو سکتا ہے جو اس قسم کے حادثات سے گزرے ہوں لیکن کوئی کیوں ایسی کیفیت سے گزرنے لگا یہ سب تو میری ہی قسمت میں لکھا تھا۔

بدقسمتی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی تو آغاز تھا۔

میں ابھی ٹھیک سے سانس بھی نہیں لینے پایا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ پریشان ہو کر خود دروازے پر آ گیا۔ دروازے پر پولیس والے کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا، ہر شریف آدمی کی طرح۔

''انور کمال تم ہی ہو؟'' ایک پولیس والے نے پوچھا۔

''جی جناب۔ میں ہی ہوں لیکن بات کیا ہے؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تمہیں ہمارے ساتھ تھانہ چلنا پڑے گا۔'' ایک نے کہا۔

''تھانے! وہ کس خوشی میں؟''

''ایک لڑکی کو اغوا کرنے کے جرم میں۔''

''لڑکی کو اغوا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں نے کس کو اغوا کیا ہے؟''

''یہ تو تھانے چل کر معلوم ہوگا۔''

میں احتجاج کرتا رہ گیا لیکن کون سنتا ہے۔ وہ سب میری باقاعدہ چھترول کرنے لگے اور دھکے دیتے ہوئے موبائل میں بٹھا دیا۔ ذہن تقریباً ماؤف ہو گیا تھا۔

نہ جانے اس دن کیسے کیسے واقعات ہو رہے تھے۔ صبح سے جو ٹھکائی کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ گھر والوں اور محلے والوں کے سامنے میری بے عزتی الگ ہوئی تھی۔ سب نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے، پورے محلے کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے کسی لڑکی کو اغوا کیا ہے۔

مجھے تھانے بڑے صاحب کے سامنے پہنچا دیا گیا۔

''یہی ہے انور کمال۔'' مجھے وہاں تک لانے والے نے بڑے صاحب کو بتایا۔

''واہ۔ دیکھنے میں تو بہت شریف معلوم ہوتے ہو۔'' بڑے صاحب نے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاحب، میں بالکل شریف نہیں ہوں۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''میں بہت کمینہ انسان ہوں جس آدمی کا موبائل چھن جائے، جس آدمی کا رکشا الٹ جائے، جو آدمی سم بند کروانے جائے اور وہاں اس کی ٹھکائی ہو جائے۔ جس آدمی کو بلاوجہ کسی لڑکی کو اغوا کرنے کے جرم میں مارتے ہوئے تھانے تک لایا جائے، وہ شریف کہاں سے ہو سکتا ہے؟ وہ تو بہت بڑا مجرم ہے۔ ایسے شخص کو تو گولی مار دینی چاہیے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا ہے تو۔" اس نے کہا۔ "اب سیدھی طرح بتا دے کہ اس لڑکی کو کہاں رکھا ہے؟"

"پہلے یہ تو پتا چلے کہ کس لڑکی کی بات ہو رہی ہے؟"

"زلیخا نام ہے اس کا؟" اس نے بتایا۔

"زلیخا!" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "میں تو اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔"

"یہ اس طرح نہیں مانے گا صاحب۔" مجھے لانے والے نے کہا۔ "اس کی خاطر کرنی پڑے گی۔"

اور پھر میری خاطر تواضع ہونے لگی۔ وہ بار بار پوچھتے رہے لیکن میں اس نام سے واقف ہوتا تو بتاتا۔ اس وقت پتا چلا کہ زلیخا ایک لڑکی تھی جسے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا تھا۔ اغوا کرنے والوں میں سے کسی ایک کی جیب سے ایک موبائل گر گیا تھا اور جب اس موبائل کی "سم" دیکھ کر اس کا نمبر ٹریس کیا گیا تو وہ میرا موبائل تھا۔ وہی جو مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ وہ موبائل مجھ سے چھین لیا گیا تھا لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ وہ میری ٹھکائی کرتے رہے اور صبح تک میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب ہوش آیا تو پتا چلا کہ آزاد ہو گیا ہوں اور اپنے گھر پر ہوں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اغوا کرنے والے پکڑے گئے تھے اور انہوں نے مجھ سے موبائل چھیننے کا اعتراف کر لیا تھا۔

میری جان تو چھوٹ گئی تھی لیکن میری جو بے عزتی ہوئی تھی، جو ٹھکائی ہوئی تھی اس کا ازالہ کس طرح ہو سکتا تھا؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

بہر حال کئی دنوں تک گھر ہی میں پڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ ابھی اور بہت کچھ ہونا تھا۔

اور وہ بہت کچھ یہ تھا کہ اب شاہینہ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اس سے رابطہ ہوا تھا۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھی۔ میں نے جب خود پر گزرنے والی داستان بتائی تب جا کر اسے یقین ہوا تھا۔

میری اس سے گفتگو فون پر ہوئی تھی۔

"تو پھر یہ بتاؤ کہ کیا تم چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں اب جا کر ہوا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر کے والٹی میں آ جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں پانچ بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

کے والٹی ایک ریستوران کا نام تھا جہاں ہم دونوں اکثر ملا کرتے تھے۔ میں ٹھیک ساڑھے چار بجے کے والٹی کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

یہ ریستوران ایک بہت پُرسکون جگہ پر تھا۔ اندر سکون اور باہر بھی سکون۔

میں ریستوران کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا کہ ایک بائیک میرے پاس آ کر رک گئی۔ میں بھڑک کر قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب تو میں اپنے سائے سے بھی خو کھانے لگا تھا۔

اور خوف بلاسبب نہیں تھا۔ اس بار بھی ایک آ پستول لیے بائیک سے اتر کر میرے پاس آ گیا تھا۔ " جلدی سے اپنا موبائل دو۔" اس نے پستول والا ہاتھ لہرایا۔

"لعنت ہو...... میرے پاس کوئی موبائل نہیں ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم!"

اور نہ جانے کیا ہوا کہ میرا شاید دماغ پھر گیا تھا۔ اب انتہا ہو گئی تھی۔ میں نے ایک جنونی کیفیت میں اس کے پستول والے ہاتھ پر ایک زوردار ہاتھ مار دیا۔

اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ وہ بوکھلا کر بھاگا لیکن میں نے اس کا پستول اٹھا کر اس پر گولی چلا دی تھی۔ دو گولیاں لگی تھیں اس کو۔ ایک اس ٹانگ میں اور دوسری اس کی شانے میں۔ وہ ایک چیخ مار کر پڑا تھا۔

اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ مجھے وہاں سے بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ذرا سی دیر میں پولیس موبائل وہاں آ پہنچی تھی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

جانتے ہیں کس جرم میں؟

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ میں موبائل چھیننے وا ہوں۔ یہ الزام اس زخمی نے لگایا تھا جو مجھ سے موبائل چھینے کے لیے آیا تھا۔ اسی کم بخت نے یہ بیان دے دیا تھا۔

اور اب میں داستان جیل میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس دور میں شرافت نام کی کوئی چ نہیں رہی ہے اسی لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ جب جیل سے رہا ہو جاؤں گا تو پھر موبائل ہی چھیننے کا کام کروں گا کیونکہ اس معاشرے میں وہ نہیں پکڑے جاتے جو موبائل چھینتے ہیں بلکہ موبائل رکھنے والے پکڑے جاتے ہیں۔

کیا اسٹریٹ کرائمز کی اس سے بڑی مثال اور کوئی ہو سکتی ہے۔

کاش

محترم معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

یہ سرگزشت میں نے کافی تگ ودو کے بعد لکھی ہے کیونکہ میں کوئی لکھاری تو ہوں نہیں، پڑھتے پڑھتے خیال آگیا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے اور میں نے قلم سنبھال لیا۔ اب میں نے کس پائے کا لکھا ہے، یہ تو آپ ہی بتاسکیں گے۔

صندل

(لاہور)

کاش۔ میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

یا شاید میں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی تھا۔ میں اس داستان کو کہاں سے شروع کروں۔ ابتدا سے یا اس کے انجام سے۔ ابتدا تو خیر اچھی طرح یاد ہے لیکن انجام؟ گرچہ وہ بھی سامنے ہے لیکن وہ بڑی حد تک مبہم ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ ایک لڑکی اغوا ہو گئی۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ چلیں کہانی بیان کرنے کے لئے اس کا نام رعنا سمجھ لیتے ہیں۔

تو رعنا ایک خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ کالج کی طالبہ۔ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ پڑھا لکھا گھرانا۔ وہ گھر سے کالج بس کے ذریعے جایا کرتی تھی اور کبھی جب دیر ہونے لگی تو رکشا پکڑ لیتی۔

لیکن اس دن وہ کالج جانے کے لئے نکلی لیکن کالج نہیں پہنچ سکی۔ گھر والوں کو اس کے اغوا ہو جانے کی خبر ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہو سکی تھی۔ پھر جب وہ مقررہ وقت پر گھر واپس نہیں آئی تو پھر تشویش ہونے لگی۔ اس کی دوستوں سے معلوم کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ تو کالج ہی نہیں آئی تھی۔

رات ہوتے ہوتے اس کے گھر والوں کی حالت غیر ہوگئی۔ اس کے رشتے دار بھی پہنچ گئے۔ سب نے مل کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا، جہاں جہاں امکانات ہو سکتے تھے۔ اس کی سہیلیاں دوست، اسپتال، ایدھی کا سرد خانہ، ہر جگہ دیکھ لیا گیا لیکن اس کا پتا نہیں چل سکا۔

اس کے بارے میں یہ سب مجھے ٹی وی چینل سے معلوم ہوا تھا۔ چینل والے اس کے غائب ہونے کی سلائڈ چلا رہے تھے۔ پھر یہ پتا چلا کہ وہ رات ایک بجے گھر پہنچ چکی ہے لیکن اس طرح کہ اس کا اپنا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ دو لڑکوں نے کالج جاتے ہوئے اسے اغوا کر لیا تھا۔

اسے نامعلوم مقام پر رکھا گیا تھا اور دونوں لڑکے اس کی عزت پامال کرتے رہے تھے۔ یہ سب ہمارے معاشرے یا ملک کے لئے کوئی نئی بات نہیں..... اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ٹی وی اسکرین پر خبریں آتی رہتی ہیں۔ اخبارات بھرے رہتے ہیں۔

ہر حادثے کے بعد کچھ دنوں تک شور ہوتا رہتا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا حادثہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق۔ کون کہاں تک دھیان دے۔ لوگوں نے اب توجہ دینی ہی بند کر دی ہے۔

لیکن یہ حادثہ نہ جانے کیوں میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت معصوم بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اپنی اداسی کے باوجود بہت پُرکشش لگ رہی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بھی ایک لڑکی تھی۔ اسی طرح کالج آیا جایا کرتی تھی اور برا وقت تو کبھی کہہ کر نہیں آتا۔

اور ہاں ایک مماثلت یہ بھی تھی کہ میں بھی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ دونوں مجھ سے بڑے تھے اور میرا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔ خاص طور پر امان جو مجھ سے صرف دو سال بڑا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان بے انتہا پیار بھی تھا اور لڑائی جھگڑے بھی ہوا کرتے اور ہر بار محبت پہلے سے زیادہ ہو جاتی۔ ہم پھر نارمل ہو کر ہنسنے بولنے لگتے تھے۔

جب یہ حادثہ میرے ذہن سے کچھ زیادہ ہی چپک گیا

اور میں نے اسی کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیں تو میرے بھائی امان نے کہا۔ ''گڑیا۔ تم یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤ گی کیوں ہر وقت وہی بات کرتی رہتی ہو؟''

''پتا نہیں کیوں؟ مجھے جب بھی اس کا خیال آتا ہے۔ خوف سا محسوس ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ میں بھی اسی طرح اکیلی کالج جایا کرتی ہوں۔ کبھی بس کے ذریعے کبھی رکشے وغیرہ میں۔ خدانہ کرے کبھی۔''

''خبردار۔ آگے کچھ مت بولنا۔'' امان تڑپ کر بولا تھا۔ ''چیر کر رکھ دوں گا اس کو۔''

''اچھا بھائی ایک کام تو کر دو۔ تم مجھے اس لڑکی کا پتا لا کر دے دو۔''

''اس لڑکی کا پتا۔ وہ کیوں؟'' امان نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اس کے گھر جاؤں گی۔ ملوں گی اس سے۔ اس کی دل جوئی کروں گی۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ لڑکی اپنی زندگی سے بے زار ہو گئی ہوگی۔ اس نے خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیا ہوگا۔''

''خدا کے لئے گڑیا۔ خدا کے لئے۔ تم نے اس کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ لعنت بھیجو اس پر۔ اپنی ذہنی کیفیت سنبھالو۔ ورنہ پاگل خانے بھیجنا پڑے گا۔''

میں چپ تو ہو گئی لیکن میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس لڑکی سے ضرور ملوں گی۔ دراصل یہ میرا شوق بھی تھا اور میرے سبجیکٹ کی ضرورت بھی۔ میں نفسیات کی طالبہ تھی اور اس قسم کی لڑکیوں سے ملاقات میرے علم کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی۔ وہ کیا سوچتی ہے۔ ان کا ذہنی رویہ اب کیا ہوگا۔ ان کی سوچ معاشرے کے لئے کہیں زیادہ منفی تو نہیں ہو گئی ہے۔ پوری دنیا کو وہ اب کس اینگل سے دیکھ رہی ہے؟ وغیرہ۔ وغیرہ۔ اس قسم کی بے شمار باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

میں نے گھر والوں کو تو کچھ نہیں بتایا لیکن اپنے طور پر اس لڑکی کا گھر تلاش کرنے نکل پڑی۔

یہ تو معلوم ہی تھا کہ رعنا گلبرگ کی رہنے والی ہے لیکن گلبرگ بہت بڑا علاقہ تھا۔ بہت دشواری ہوئی نہ جانے کتنے لوگوں سے معلوم کرنا پڑا تھا۔

لیکن میں نے اس بدنصیب کا گھر تلاش کر ہی لیا تھا۔ وہ دو منزلہ خوبصورت سا مکان تھا۔ میں نے گیٹ کی گھنٹی بجا دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ پچیس اور تیس کے درمیان کی ایک عورت تھی۔ جو اپنے حلیے سے کام کرنے والی معلوم ہوتی تھی۔ ''جی بی بی۔'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''رعنا سے۔'' میں نے بے جھجک ہو کر بتایا۔

''وہ تو سو رہی ہیں جی۔'' ملازمہ نے بتایا۔ ''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

میں ناکام واپس جانے کے لئے نہیں آئی تھی۔ اسی لئے میں نے کہا۔ ''ان سے کہو کہ آپ کی کوئی دوست بہت دور سے ملنے کے لئے آئی ہے۔''

''نام کیا ہے جی آپ کا۔''

''صندل۔'' میں نے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اسے میرا نام یاد نہ رہا ہو کیونکہ میں بہت دنوں کے بعد اس سے ملوں گی۔''

''اچھا جی۔ میں ابھی پوچھ کر بتاتی ہوں۔''

وہ گیٹ بند کر کے اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی کچھ دیر میں ہوئی تھی۔ ''آئیں جی۔'' اس نے کہا۔

اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا جو بہت سلیقے اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ پورے ماحول سے ایک خاص قسم کی پاکیزگی اور شرافت کا احساس ہو رہا تھا۔ لعنت ہے ایسے معاشرے پر۔ ایسے گھر کی لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک۔ خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو۔ ان لوگوں نے جینا عذاب کر کے رکھ دیا ہے۔

رعنا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ وہی پُرکشش چہرہ۔ لیکن بے پناہ اداسی کے ساتھ۔ ''میرا نام صندل ہے۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں ہاتھ ملایا تھا پھر وہ سامنے ہی بیٹھ گئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پھر کہا۔ ''معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی ہماری ملاقات ہوئی ہو لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہا۔''

''رعنا۔ ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''لیکن وہ ملازمہ تو یہ کہہ رہی تھی۔''

''وہ میں نے اس لئے کہہ دیا تھا کہ اگر یہ نہیں کہتی تو وہ مجھے اندر نہیں آنے دیتی۔'' میں نے بتایا۔

''آپ لوگوں نے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔'' وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔ ''جاؤ۔ چلی جاؤ پلیز۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی بہانے آتا ہی رہتا ہے۔ کبھی فلاں چینل سے۔ کبھی فلاں اخبار سے۔ کبھی فلاں این جی او۔ میں تو پریشان ہو کر رہ گئی ہوں۔ اب کہاں تک ہر ایک کو اپنی بے عزتی کی داستان سناتی رہوں۔ جاؤ۔ میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا تھا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے بس یوں ہی جھوٹ بول دیا تھا۔ اپنی شہرت کے لئے۔'' پھر وہ رونے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''رعنا تم مجھے غلط مت سمجھو۔ میرا تعلق کسی چینل، کسی این جی او وغیرہ سے نہیں ہے اور نہ میں تمہارے زخموں پر نمک چھڑکنے آئی ہوں۔''

''تو پھر کون ہو تم؟''

''صرف ایک لڑکی۔'' میں نے بتایا۔ ''میں بھی تمہاری طرح ایک لڑکی ہوں اور تمہارے دکھوں کو شیئر کرنے آئی ہوں۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتی کہ انسان کی اس تذلیل پر تمہارے ساتھ بیٹھ کر دو آنسو بہا لوں۔ میرا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔''

وہ چپ ہو گئی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ اس کا یہ رویہ بالکل نیچرل تھا۔ اس کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ میں نے اس وقت اس سے اس حادثے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔

عام دلچسپی کی باتیں۔ اس کے مشاغل۔ پسند ناپسند وغیرہ۔ کچھ دیر بعد وہ بہل گئی تھی۔ یا عارضی طور پر وہ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ وہ خود سے اپنا البم اُٹھا کر لے آئی جس میں اس کی بے شمار تصویریں تھیں۔ میں جی کھول کر اس کی تصویروں کی تعریفیں کرتی رہی۔

کچھ دیر کے بعد وہ اندر سے چائے اور ناشتے کا سامان وغیرہ لے کر آ گئی۔ اس دوران اس کی والدہ بھی آ گئی تھیں۔ ایک معقول صورت مہذب عورت۔ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اندر سے کتنے صاف ستھرے اور نیک ہوں گے۔ جب رعنا کسی کام سے اُٹھ کر اندر گئی تو اس کی امی نے کہا۔ ''بیٹا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''کس بات کا شکریہ آنٹی؟''

''یہی کہ تم نے رعنا کو مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ورنہ اس نے تو لوگوں سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ تمہاری وجہ سے ایسا لگ رہا ہے جیسے شاید وہ اپنی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔''

''لوٹ آئے گی آنٹی۔ لوٹ آئے گی۔'' میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے تو رعنا بہت باحوصلہ لڑکی معلوم ہوئی ہے۔''

اسی دوران رعنا واپس آ گئی۔ اس کی ماں نے موضوع بدل کر میرے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ میں کون ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ میرا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

جب جانے کا وقت ہوا تو رعنا مجھ سے لپٹ پڑی۔ ''دیکھیں۔ اب ہم دوست بن گئے ہیں۔ آپ آتی رہئے گا۔ ورنہ میں اداس ہی رہا کروں گی۔''

''نہیں۔ بالکل نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اداسی کی اور جہاں تک دوستی کا تعلق ہے تو میں اسی لئے تو یہاں آئی تھی۔ لہٰذا ہم میں دوستی ہو چکی ہے۔''

میں گھر واپس آئی تو خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں ایک ٹوٹی ہوئی لڑکی کی دل جوئی کر کے آ رہی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا۔ اپنے بھائی امان سے میری دوستی بھی تھی۔ ہم دونوں بڑی حد تک ایک دوسرے کے راز دار بھی تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بھائی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں آج کون سا بڑا کام کر کے واپس آئی ہوں؟''

''اچھا۔ میری گڑیا بھی اب کارنامے دکھانے لگی ہے۔''

''جی جناب۔ بہت زبردست کارنامہ...'' میں نے بتایا۔ ''میں کسی کے آنسو پونچھ کر آئی ہوں۔''

''کس کے آنسو؟''

''اس لڑکی کے جس کے ساتھ..... زیادتی ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کسی طرح اس کا ایڈریس تلاش کر لیا تھا۔''

''خدا کی پناہ۔ تم اس کے گھر بھی پہنچ گئیں؟'' امان پریشان ہو گیا تھا۔

''تو اس میں کیا ہو گیا؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس سے تو میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے۔''

''گڑیا۔ تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔'' اس نے کہا۔ ''اول تو ایسی لڑکیاں اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتی ہیں۔ اغوا کرنے والے ایسی لڑکیوں کو اغوا کرتے ہیں۔ جن میں کوئی خرابی دکھائی دیتی ہے۔''

''خدا کا خوف کرو بھائی۔ وہ ایک شریف لڑکی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔''

''تم پہلی ملاقات میں کسی کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہو اور دوسری بات اور زیادہ خطرناک ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیا ہے؟''

''وہ یہ ہے کہ ایسی لڑکیوں کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اغوا کرنے والے یوں ہی نہیں چھوڑ دیتے بلکہ وہ دوسری بار بھی موقع سے فائدہ اُٹھانے کی پلاننگ کرتے رہتے ہیں اور اس سے ملنے جلنے والوں پر ان کی خاص نظر ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ پوائنٹ Valid ہے بھائی۔'' میں نے کہا۔

''اس لئے تو سمجھا رہا ہوں کہ تم اس سے ملنے میں احتیاط کرو۔'' امان میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''بلکہ اس سے ملو ہی نہیں۔''

''یہ کیسا ظلم ہے بھائی کہ ہم کسی مظلوم لڑکی کی ہمدردی سے بھی خوف محسوس کرنے لگیں کہ نہ جانے اس کی مصیبت کب ہمارے گلے پڑ جائے۔''

''یہی تو ہو رہا ہے یہاں۔ اس دور میں نیکی کرنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے۔ بہرحال میں نے تم کو سمجھا دیا ہے۔''

ارمان نے گرچہ مجھے اچھی بات بتا دی تھی۔ اس کے باوجود میں نے رعنا سے ملاقات جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چاہے کم ہی سہی لیکن اس سے ملتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔

اس کے علاوہ اس سے ابھی تک اس موضوع پر بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔

اسی لئے کچھ دنوں کے بعد میں پھر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس بار بہت گرم جوشی سے میرا استقبال ہوا تھا۔

''کہاں رہ گئی تھیں آپ؟ میں تو آپ کا انتظار ہی کرتی رہی تھی۔''

''بس بھائی۔ کچھ مصروفیات ہو گئی تھیں۔'' میں نے بتایا۔ پھر پوچھا۔ ''اچھا تم اگر مجھے دوست سمجھتی ہو تو ایک بات بتاؤ۔''

''جی پوچھیں۔''

''تم کب سے گھر میں بند بیٹھی ہو۔ باہر نہیں نکلیں۔''

میرے اس سوال پر وہ چپ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر دکھ محسوس کیا۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ''جب سے وہ حادثہ ہوا ہے۔ میں گھر سے باہر نہیں گئی۔''

''بے وقوف ہو تم۔ کیا زندگی اس طرح گھر بیٹھنے سے گزر جائے گی۔ نہیں۔ تم کو ہمت سے کام لے کر باہر نکلنا ہوگا۔ معاشرے کو فیس کرنا ہوگا۔ تم کوئی مجرم تو نہیں ہو کہ گھر

بیٹھ گئیں۔ سب سے چھپ گئیں۔ تم نے کیا جرم کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔''

''لیکن کہاں جایا کروں؟''

''تم نے کالج جانا کیوں چھوڑ دیا؟''

''اس لئے کہ اب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''بے کار کی بات ہے۔ اس طرح تم کہیں کی نہیں رہو گی۔ کالج جایا کرو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اپنے کسی بھائی کو ساتھ لے لو۔ یا آنے جانے کے لئے وین لگوا لو۔''

''لیکن دوسری لڑکیوں کا سامنا کرتے ہوئے شرم آئے گی۔''

کس بات کی شرم۔ دیکھو رعنا۔ یہ زمانہ بہت فاسٹ ہے۔ کسی کے پاس اتنی فرصت ہے کہ پرانے واقعات کو یاد کرتا پھرے۔ کوئی کسی پر دھیان نہیں دیتا۔ دو چار دنوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔''

''آپ ہمت دلا رہی ہیں تو پھر یہ سلسلہ شروع کر دوں گی۔'' اس نے کہا۔

''شاباش۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اب چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔''

رعنا کی اماں نے بھی اس وقت میرا ساتھ دیا۔ ''ہاں بیٹا لے جاؤ اس کو۔ نہ جانے کیوں تم پر بہت بھروسا ہو گیا ہے حالانکہ تم دوسری دفعہ اس گھر میں آئی ہو لیکن برسوں کی جان پہچان معلوم ہوتی ہے۔''

میں رعنا کو لے کر آ گئی۔

میں اس بار اپنی گاڑی لیتی آئی تھی۔ اس لئے ہم بہت دیر تک سیر کرتے رہے۔ پھر شام کے وقت واپس آ گئے۔ میں نے سوچا بھی کہ رعنا کو اپنے گھر لے جاؤں پھر امان کا خیال آ گیا۔ وہ تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ میں رعنا سے دور رہوں لیکن میں تو اس کو ساتھ لئے گھوم رہی تھی۔

میں نے گھر فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں گھر دیر سے آؤں گی۔ اپنی کسی دوست کے ساتھ ہوں لیکن میں نے دوست کا نام نہیں بتایا تھا۔

اور اس شام رعنا نے اپنے ساتھ گزرنے والے واقعے کی پوری تفصیل بتا دی تھی۔ میں اس کی یہ داستان اس کی زبانی تحریر کر رہی ہوں۔

☆☆☆

زندگی میرے لئے بہت خوبصورت تھی۔

محبت کرنے والے ماں باپ اور اسی طرح محبت کرنے والے دونوں بھائی۔ ہم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقے میں آزاد خیالی بھی ہوتی ہے اور قدامت پسندی بھی۔ ہم پڑھے لکھے روشن خیال قسم کے لوگ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی روایات بھی عزیز ہیں۔ میں نے اعلیٰ تعلیم کے خواب دیکھ رکھے تھے۔ سوچتی تھی۔ یہ کروں گی۔ وہ کروں گی۔ اسکالر بنوں گی وغیرہ وغیرہ۔

والدین نے ایک اچھے کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ آنے جانے کے لئے بس یا رکشا کا سہارا لیا کرتی۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے وین نہیں لگوائی تھی۔ ورنہ شاید وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو بدقسمتی سے ہو چکا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ ایک نوجوان میری راہ دیکھا کرتا ہے۔ میں نے اس کو کئی بار اپنے بس اسٹاپ پر کالج کے سامنے بھی دیکھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جم کر رہ جاتیں۔ اس کا اس طرح دیکھنا مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ نہ جانے کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ کوئی پسند کرے یا نہ کرے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تو وہ کم بخت بھی ایسا ہی تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ براہِ راست میرے پاس آ گیا۔ اس وقت میں اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ اسٹاپ پر بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ مجھ سے دور دور تھے۔

اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''کیوں اتنی زحمت کرتی ہیں۔ اگر حکم دیں تو میں آپ کو لایا لے جایا کروں۔''

مجھے خوف بھی محسوس ہوا اور میرے تن بدن میں آگ سی بھی لگ گئی۔ میں نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔ وہ مجھے غصے سے دیکھتا ہوا فوراً وہاں سے ہٹ گیا کیونکہ کچھ اور لوگ بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

اور اس کے دوسرے ہی دن وہ حادثہ ہو گیا جس نے

شمارہ جون 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆اول: کہانی محبت کی..... اشعر علی (کراچی)

☆دوم: دعائے بد..... ڈاکٹر فرحان احمد (پشاور)

☆سوم: آس کے جگنو..... فراز علی (نیویارک)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجئے ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری زندگی کو ناسور بنا کر رکھ دیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کم بخت اس حد تک چلا جائے گا۔

اس دن اس نے گھر سے اسٹاپ کے راستے میں مجھے اُٹھالیا تھا۔ اس کے پاس ایک گاڑی تھی۔ جس کو کوئی اور چلا رہا تھا۔ گاڑی میرے پاس رکی اور وہی کمینہ نیچے اُتر آیا۔ اس کے پاس ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور دکھا کر مجھے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کے تاثرات سے ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اسی وقت مجھے گولی مار دے گا۔ اس نے مجھے گاڑی میں بٹھالیا اور گاڑی ایک طرف روانہ ہوگئی۔

''کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ تمہیں کس راستے سے لے جارہا ہے؟''

''نہیں۔ کیونکہ اس شخص نے میری آنکھوں پر رومال باندھ دیا تھا۔'' رعنا نے بتایا۔ ''اسی لئے کچھ پتا نہیں چلا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ گاڑی بہت دیر تک چلتی رہی ہے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''وہ مجھے زبردستی گاڑی سے اُتار کر کمرے میں لے آیا۔ یہاں میری پٹی کھول دی گئی۔ یہ ایک بڑا کمرا تھا۔ جس میں پرانے زمانے کا فرنیچر تھا اور وہیں اس کمینے نے میرے ساتھ زیادتی کی.....'' رعنا رونے لگی تھی۔

''نہیں پلیز۔ رونا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس زیادتی میں اس کا ساتھی بھی شامل تھا۔''

''نہیں۔ صرف وہی تھا۔'' اس نے بتایا۔

''لیکن خبریں تو یہی تھیں۔''

''وہ غلط خبریں تھیں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ یہ لوگ بھی دو کی دس بنا دیتے ہیں۔''

''پولیس نے اب تک کیا کیا؟''

''کچھ بھی نہیں۔ وہ تو اس کا پتا بھی نہیں چلا سکی۔'' رعنا نے بتایا۔ ''صرف تسلی دیتے رہ گئے۔ بس اب پکڑا جائے گا۔ کل پکڑا جائے گا۔ پرابلم یہ ہے کہ میں وہ جگہ بھی نہیں بتا سکتی جہاں مجھے لے گئے تھے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا۔ کس طرح چھوڑا تمہیں؟''

''بس رات ہوئی تو اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر واپس لے آئے اور گھر کے سامنے والے اسٹاپ پر اُتار دیا۔ کہنے کو تو بس یہ ایک مختصر سی کہانی ہے لیکن اس مختصر کہانی میں میرا برسوں کا کرب چھپا ہوا ہے۔ میری پوری زندگی چھپی ہوئی ہے۔''

''بس جو ہوا اسے ذہن سے جھٹک دو۔'' میں نے کہا۔ ''تم اسے بھول نہیں سکتیں۔ یہ میں جانتی ہوں لیکن اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ تم آہستہ آہستہ اس غم کو بھلانے کی کوشش کرتی رہو۔''

کئی دنوں کے بعد میرے موبائل پر رعنا نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ ''آپ۔'' وہ مجھے آپ کہنے لگی تھی۔ ''آپ کئی دنوں سے آئی نہیں۔''

''ہاں رعنا۔ میں ذرا مصروف ہوگئی تھی۔'' میں نے بتایا۔

''آپ آجایا کریں۔ آپ آتی ہیں تو دل بہل جاتا ہے۔''

''اوکے۔ آج شام ضرور آؤں گی۔'' میں نے کہا۔

شام کو وقت نکال کر میں اس کے پاس چلی گئی۔ اب تو میں ایک طرح سے اس گھر کی ایک فرد بن گئی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ اس وقت ایک بڑا مسئلہ درپیش تھا۔

رعنا کے لئے ایک رشتہ آیا تھا۔ لڑکے کا پورا گھرانا باہر تھا اور ان لوگوں کو اس حادثے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان لوگوں کو بتایا جائے یا ان سے چھپالیا جائے۔

رعنا کا یہ حال تھا کہ وہ شادی ہی سے انکار کئے جارہی تھی۔ ''نہیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں اسی طرح رہوں گی۔''

''پاگل مت بنو۔ شادی تو کرنی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''کس طرح؟'' وہ غصے سے بولی۔ ''کیا اس لئے کہ کچھ دنوں کے بعد جب اسے پتا چلے تو وہ مجھے دھکے دے کر نکال دے۔''

''آنٹی۔'' میں نے رعنا کی امی سے کہا۔ ''یہ ایسا معاملہ ہے جس کو چھپایا نہیں جاسکتا آپ ان لوگوں کو صاف صاف بتادیں اگر ان میں ذرا بھی انسانیت ہوگی تو وہ رعنا کو قبول کرلیں گے۔ ورنہ ابھی سے ان کی ذہنیت کا اندازہ ہو جائے گا اور رعنا آئندہ کے عذاب سے بچ جائے گی۔''

رعنا کی امی نے یہی کیا۔ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ان لوگوں کو صاف صاف بتا دیا اور وہاں سے جواب بھی آگیا کہ سوری وہ لوگ ایسی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی نہیں کرسکتے۔''

''چلو اچھا ہوا۔'' اس کی امی نے کہا۔ ''اس طرح

ہمیں وقت سے پہلے پتا چل گیا ورنہ رعنا وہاں جا کر بری طرح پھنس جاتی۔''

اس دن رعنا بہت افسردہ تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''آپی میں جانتی ہوں کہ میری شادی کبھی نہیں ہو سکے گی وہ کم بخت مجھے ایک ایسا داغ لگا کر چلا گیا ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔''

اس کے اس طرح رونے سے خود میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس بے چاری کے ساتھ جو ظلم ہو چکا تھا اس کا کوئی ازالہ نہیں ہوسکتا تھا۔

میں جانتی تھی کہ یہ ایسا معاشرہ ہے جہاں کوئی اس قسم کی لڑکی کو قبول نہیں کرے گا چاہے وہ لاکھ وسیع النظر پڑھے لکھے اور سوشلڈ مہذب ہی کیوں نہ ہوں وہ کبھی اپنے گھر میں رعنا جیسی لڑکی کو گوارا نہیں کریں گے مرد کے پاس اتنا ظرف ہی کہاں ہوتا ہے۔

میں بہت ہی اداس سی گھر واپس آگئی۔

اور اسی رات خود مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرا بھائی ارمان لان میں اپنے موبائل پر کسی سے باتیں کررہا تھا۔ میں عموماً رات کے وقت لان کی طرف نہیں جایا کرتی تھی لیکن اس رات میرا دل گھبرا رہا تھا۔ اس لیے کمرے سے نکل کر لان میں آگئی۔ اور میں نے ارمان کی آواز سنی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''یار اس لڑکی نے، تو میری بہن سے دوستی کر لی ہے۔ ہاں یار اسی لڑکی نے میں تو ڈر رہا ہوں کہ کسی دن یہ راز ظاہر ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟ نہیں تم کچھ مت کرنا۔ میں خود ہی اس معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔''

میں جہاں تھی بس وہیں جم کر رہ گئی۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے یہ کیا سن لیا ہے۔ میرا بھائی۔ میرا پیارا بھائی اس نے یہ کام کیا تھا۔ اس نے رعنا کو اغوا کیا تھا۔

او خدا، کیا تھا یہ سب؟ ارمان ایسا ہوگیا تھا۔ اب یاد آیا کہ وہ مجھے رعنا سے ملنے سے کیوں منع کررہا تھا؟ کتنی تاویلات دی تھیں اس نے کہ ایسا ہو جائے گا، ویسا ہو جائے گا صرف اس لیے کہ کہیں رعنا میرے گھر نہ آجائے کہیں وہ اسے میرے ساتھ نہ دیکھ لے۔

ایسا کمینہ نکلا تھا وہ، اس نے ایک معصوم اور شریف لڑکی کو برباد کردیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پولیس کو خبر کردوں۔ رعنا کے گھر والوں کو بتا دوں کہ وہ لوگ جس کو پورے شہر میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ میرے گھر میں رہتا

اس وقت کائنات میں 103 عناصر دریافت ہو چکے ہیں۔ ان میں سے تین چوتھائی اپنے مخصوص خواص اور ایٹمی ساخت کی بنا پر دھاتیں کہلاتی ہیں، باقی غیر دھاتیں۔ یہ تمام دھاتیں کمرے کے درجۂ حرارت پر ٹھوس حالت میں ہوتی ہیں مگر پارے (Mercury) کی دھات اس درجۂ حرارت پر مائع حالت میں رہتی ہے اور بازار سے مائع حاصل میں ہی ملتی ہے۔ یہ 38.9 درجہ سینٹی گریڈ سے نیچے درجۂ حرارت پر ٹھوس حالت میں چلی جاتی ہے اور دوبارہ حرارت پہنچانے سے 38.9 یا 40 درجہ سینٹی گریڈ پر مائع حالت میں واپس آجاتی ہے۔ پارے کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اسے تھرمامیٹروں میں بھرا جاتا ہے۔ جب تھرمامیٹر گا پارے والا حصہ مریض کے منہ میں رکھا جاتا ہے تو یہ ایک منٹ کے وقفے کے بعد جسم کا درجۂ حرارت بتا دیتا ہے۔ انسانی جسم کا درجۂ حرارت 37 تا 38 درجہ سینٹی گریڈ ہوتا ہے لہٰذا اگر تھرمامیٹر کا پیمانہ اس درجۂ حرارت سے آگے بڑھ جائے تو کہا جاتا ہے کہ مریض کو بخار ہوگیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس
تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

ہے۔ بھائی ہے میرا۔ بے غیرت، بے ضمیر، بے حس، ظالم۔ اس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ بے پناہ نفرت۔ رعنا کے آنسو یاد آگئے تھے۔ اس کی امی کا مہذب اور نیک چہرہ سامنے آگیا تھا۔

وہ سب فریاد کررہے تھے۔ رو رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے کہ رعنا کی زندگی برباد کرکے اسے ملا، کیا ملا لیکن اس وقت خدا جانے میں کیوں خاموش رہی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

اب کہاں کی نیند، کہاں کا سکون؟

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ گھر والوں کو بتا دوں پھر کیا ہوگا کیا ابو اس صدمے کو برداشت کرپائیں گے۔ کیا امی جو پہلے ہی دل کی مریضہ ہیں بیمار نہیں پڑ جائیں گی؟ تو پھر کیا کروں میں؟ نہیں کسی کو بتانا ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن ارمان کو سزا دینی تھی۔ میں نے یہ فیصلہ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا کہ اسے یہ سزا خود میں دوں گی۔ اپنے ہاتھوں سے وہ معاشرے، گھر اور خاندان کا ناسور تھا اور ناسور کو تو کاٹ کر پھینک دینا چاہیے۔

وہ رات کسی نہ کسی طرح کٹ ہی گئی۔

دوسری صبح میں نے اس سے ملاقات نہیں کی۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکلی، ورنہ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا۔ روزانہ سویرے ہم ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی لڑائی کیا کرتے تھے۔ اس لڑائی کے بغیر نہ اس کو مزہ آتا تھا اور نہ مجھے۔

ہمارے والدین ہماری ان لڑائیوں سے عاجز تھے اور ہنستے بھی رہتے۔

لیکن میں اس کے سامنے ہی نہیں گئی۔

پورا دن کچھ ایسا ہی گزرا تھا میں خاموش خاموش تھی۔ امی نے کئی بار پوچھا بھی۔ لیکن میں نے سر درد کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا۔

شام کو بھی وہی کیفیت رہی۔ میں اس کے سامنے ہی نہیں آئی۔ میں جانتی تھی کہ میں اس کے سامنے گئی یا وہ میرے سامنے آیا تو شاید میں خود پر قابو نہیں رکھ سکوں اور اس کو اس کا اصل چہرہ دکھا دوں گی۔

رات نو بجے کے قریب دروازے پر دستک دے کر وہ خود ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ ''ارے کیا بات ہے گڑیا۔ کیا اپنے بھائی سے ناراض ہو؟'' اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت مجھے اس سے چڑ اور گھن محسوس ہو رہی تھی۔ کیسی بات تھی۔ جس بھائی پر میں جان دینے کے لئے تیار رہتی تھی۔ اس کے لئے میرے احساسات اب ایسے ہو رہے تھے۔

''بتاؤ نا۔ کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم جاؤ یہاں سے پلیز۔ Leave me alone''

''آخر بات کیا ہے گڑیا؟'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ میں اس وقت تنہا رہنا چاہتی ہوں۔''

''اوکے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں اس وقت جا رہا ہوں۔ رات بھر میں ٹھیک ہو جاؤ۔ ورنہ الٹا لٹکا دوں گا۔''

وہ مجھ سے اکثر کیا کرتا تھا۔ جب میں ذرا سی بھی بیمار پڑتی تو وہ یہی کہتا۔ ''دیکھو گڑیا۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ تم فوراً ٹھیک ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں الٹا لٹکا دوں گا۔''

اس وقت بھی اس نے اپنا وہی جملہ دُہرایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں روتی رہی تھی۔ یا خدا۔ ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا۔ میرے اس بھائی پر کس شیطان نے غلبہ پا لیا تھا۔

ارمان ایسا تو نہیں تھا۔ کبھی نہیں تھا۔ پھر ایسا کیوں ہو گیا تھا؟ کتنا بڑا اور کتنا گھناؤنا جرم کر بیٹھا تھا۔ دوسری صبح ارمان گھر میں نہیں تھا۔ امی نے بتایا کہ وہ سویرے ہی کہیں نکل گیا تھا۔

میں یہ سوچ رہی تھی کہ کیا کروں؟ پھر ایک خیال آیا۔ کیوں نہ رعنا کو اعتماد میں لے کر اسے سب کچھ بتا دوں۔ پھر جو اس کا فیصلہ ہو۔ ویسے ایسے شخص کو سزا تو ہر حال میں ملنی چاہیے تھی۔

میں اس وقت یہ نہیں سوچ رہی تھی کہ ارمان میرا بھائی ہے۔ بھائی ہو گا لیکن اب وہ ایک کرمنل تھا۔ ایک خطرناک مجرم۔ میں اپنے معاشرے کی اور لڑکیوں کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔

شاید ایک کی سزا سے دوسروں کی زندگی سنور جائے۔ شاید ارمان کو ملنے والی سزا کسی اور کو کوئی سبق دے سکے۔ یہی سب سوچتی ہوئی میں رعنا کے گھر پہنچ گئی۔

میں یہاں کل بھی آئی تھی۔ لیکن آج اور کل کے درمیان بہت فرق ہو چکا تھا۔ کل میں اس کی ہمدرد بن کر آئی تھی اور آج خود اپنی نگاہوں میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

رعنا گھر پر موجود تھی۔ آج وہ بہت دکھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے مجھے لپٹا لیا۔ ''آپی۔ ان لوگوں نے بھی تھوک دیا ہے مجھ پر۔''

''کن لوگوں نے؟''

اس نے آنسوؤں کے درمیان بتایا کہ کئی برس پہلے اس کی منگنی اس کے اپنے چچا کے بیٹے سے ہو چکی تھی۔ وہ لڑکا بھی اچھا تھا۔ لیکن آج وہ لوگ رشتہ ختم کر کے چلے گئے تھے۔ وہ کسی داغ دار لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

اب سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔

میں اس سے کچھ کہے بغیر اس کے گھر سے باہر آ گئی۔ میں نے فیصلہ کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کسی کو بھی بتائے بغیر۔

اب یہ معاملہ میرے اور ارمان کے درمیان تھا۔

میں گھر پہنچی تو پتا چلا ارمان واپس نہیں آیا تھا۔ پھر امی نے مجھے بتایا۔ ''صندل۔ ارمان تو دس بارہ دنوں کے بعد آئے گا۔ اس کا فون آیا تھا کہ وہ اسلام آباد جا رہا ہے۔''

''اسلام آباد۔ وہ کیوں؟''

''یہ تو اس نے نہیں بتایا۔ لیکن وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ گیا ہے۔ تمہارے لئے کہہ رہا تھا کہ صندل کے لئے بہت سے تحفے لیتا آؤں گا۔''

''کمینہ۔'' میں نے زیر لب کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھے بہت شدت سے اس کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس دوران میں رعنا کی طرف بھی نہیں گئی۔ ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے جا کر ملوں۔ اس دوران --- وہ بے چاری موبائل پر مجھ سے رابطہ بھی کرتی رہی لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا نمبر دیکھتے ہی فون کاٹ دیتی تھی۔

بالآخر دس دنوں کے بعد اس نے میسج کیا۔ ''آپی۔ خدا کے لئے آ جاؤ۔ تم کو ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔''

خدا جانے کیا بات ہو سکتی تھی۔ میں نے اب اسے فون کیا تو اس نے بتایا۔ ''آپی۔ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ تمہارا نمبر ہی نہیں مل رہا تھا۔ تم جلدی سے آ جاؤ۔ ایک بہت زبردست نیوز ہے تمہارے لئے۔''

''کیسی نیوز۔ کچھ بتاؤ تو سہی؟''

''اس آدمی کا پتا چل گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ تم آ جاؤ۔''

اب جانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور رعنا کے گھر کی طرف دوڑا دی اور پھر مجھے وہ دکھائی دے گیا۔ وہی ارمان۔ میرا بھائی۔ رعنا کا مجرم۔ وہ اسلام آباد نہیں گیا تھا۔ یہیں کراچی میں تھا اور رعنا کے گھر کے آس پاس بھٹک رہا تھا۔ نہ جانے اب کیسے ارادے اس کے ذہن میں تھے؟

وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ گاڑی کو پہچان کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اور تیز۔ اور تیز۔ پھر ایک زوردار دھماکہ، ایک بھیانک چیخ اور سب کچھ برباد ہو کر رہ گیا۔

میں نیم بے ہوش تھی۔ ارمان خون میں لت پت روڈ پر پڑا ہوا تھا۔ رعنا میرے پاس تھی اور نہ جانے کتنے لوگ تھے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے رعنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رعنا۔ یہ ہے تمہارا مجرم اور یہ میرا بھائی بھی ہے۔ سگا بھائی۔''

''ہاں۔ یہ میں جانتی ہوں۔'' رعنا رو رہی تھی۔ ''میں

ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور جیسے لکھنے والوں نے اپنا نام اور خاص مقام بنایا تھا، میری اس وقت دو کہانیاں چھپی تھیں جب ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ ''ہائے اللہ'' چھپ گیا تھا۔ قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے سینئر اور عصمت چغتائی سے جونیئر تھی۔ ہاجرہ اور خدیجہ کی تحریروں میں ترقی پسند سوچ اور فکری عکس ملتا ہے مگر عینی کے ہاں نہیں۔ وہ ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں کھڑی تھی۔ عینی کے اس رویے کی وجہ سے عصمت چغتائی نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں قرۃ العین حیدر کی بورژوائی سوچ اور اظہار کا ذکر کیا تھا مگر میں قرۃ العین حیدر کو بڑی رائٹر مانتا ہوں، میں اس کے اسلوب کا قائل ہوں اگرچہ وہ ترقی پسند نہیں تھی اور اس نے کبھی کوئی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔

⁂

فیض، ساحر اور ابن انشا کی شاعری ہمیشہ میری دھڑکنوں میں رہی ہے۔ فیض کو ہمیشہ یہ کمال حاصل رہا کہ وہ جو بھی کہتے دل میں اتر جاتا تھا۔ میں کئی ایسے لوگوں سے واقف ہوں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر انہیں فیض کا پورا کلام زبانی یاد تھا۔ ساحر میں بھی فیض والی بات تھی یعنی دل میں اتر جانے والی، کچھ تنگ نظر نقاد کہتے ہیں کہ اگر اردو شاعری میں فیض نہ ہوتے تو ساحر لدھیانوی بھی نہ ہوتے۔ دراصل یہ بات ابراہیم جلیس نے پھیلائی تھی مگر مذاق میں۔ جب ساحر اور جلیس کی آپس کی تکرار بڑھ جاتی تو وہ یہ بات کہتے تھے مگر چند لمحوں بعد وہی جلیس سب سے زیادہ ساحر کی تعریف کر رہے ہوتے تھے۔ ساحر نے جو نظم پرچھائیاں لکھی، یہ ادب میں سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اس کا پورا رنگ ہویدا ہے۔ حیدر آباد (دکن) کے ایک مشاعرے میں ساحر نے یہ نظم پڑھی تھی۔ یہ نظم اتنی طویل تھی کہ ساحر لگاتار ایک گھنٹے تک سناتا اور داد وصول کرتا رہا۔ بعد میں مجھے سجاد ظہیر نے اس نظم کے حوالے سے ایک ستائشی خط بھیجا کہ تمہارے دوست نے یہ نظم سنا کر مشاعر لوٹ لیا ہے۔

اقتباس: حمید اختر
مرسلہ: راحیل نواز، جھنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانتی ہوں کہ یہی میرا مجرم ہے۔ یہ تمہارا بھائی بھی ہے۔ لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ یہ میرا شوہر ہے۔''

☆☆☆

اسپتال کا کوریڈور۔

میں رعنا۔ میرے گھر والے۔ پولیس۔ مجھ پر کوئی کیس نہیں بن پایا۔ کیونکہ ارمان میرا سگا بھائی تھا۔ بس یہ سمجھا گیا کہ کسی وجہ سے گاڑی میرے قابو سے باہر ہوگئی ہوگی اور اس کی زد میں میرا بھائی آ گیا۔

رعنا نے جو کچھ مجھے بتایا۔ وہ بہت حیران کر دینے والا تھا۔ اس نے بتایا کہ ارمان ایک دن اچانک ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس نے آ کر اپنی گردن جھکا دی تھی اور یہ کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کا مجرم ہے اور سزا کے لئے آیا ہے۔ وہ اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔

کیونکہ یہ فعل کرنے کے بعد وہ چین سے سو نہیں سکا تھا۔ ضمیر کی خلش اسے بے چین رکھتی تھی۔ پھر اس نے یہ کہا کہ اگر رعنا چاہے یا اس کے گھر والے چاہیں تو وہ فوری طور پر رعنا سے شادی کے لئے تیار ہے۔

اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا تعلق ایک شریف اور مہذب خاندان سے ہے۔ نہ جانے کیوں اس پر شیطان سوار ہو گیا تھا اور وہ رعنا کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

پھر جب اس نے یہ بتایا کہ صندل اس کی چھوٹی بہن ہے تو سب کے سب حیران رہ گئے تھے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ صندل کا بھائی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

بہرحال، جب اس نے شادی کی بات کی تو سب سوچ میں پڑ گئے کیونکہ رعنا کے لئے فی الحال کوئی آپشن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر انہوں نے یہی سوچا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب ارمان کو پولیس کے حوالے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی لئے ہنگامی طور پر ان دونوں کی شادی کر دی گئی۔

شادی کے بعد ارمان نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی وقتی طور پر بہک گیا تھا۔ ورنہ اندر سے وہ ایک نیک اور شریف نوجوان ہے۔

پھر یہ ہوا کہ میں نے سزا دینے کے لئے ارمان کو ہٹ کر دیا۔

رعنا کی امی نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹی۔ قدرت کے بھی کھیل بہت عجیب ہوتے ہیں۔ کہاں سے بات چلی اور کہاں تک آ گئی۔ اس پورے تماشے میں سب سے زیادہ مضبوط کردار تمہارا سامنے آیا ہے کہ تم نے ایک مجرم کو سزا دیتے وقت یہ نہیں سوچا کہ وہ تمہارا بھائی ہے۔ تمہارا اپنا خون ہے۔ آفرین ہے بیٹی تم پر۔''

پھر رعنا نے کہا۔ ''آپی۔ میں نے ارمان کو معاف کر دیا ہے۔ اب تم بھی اسے معاف کر دو اور دعا کرو کہ اس کی زندگی بچ جائے۔''

اور ہم بہنوں کی دعائیں کام آئیں۔

ارمان بچ گیا۔ اس کی زندگی ایک معجزہ تھی۔ لیکن چونکہ وہ سزا پا چکا تھا۔ اسی لئے قدرت نے بھی اسے معاف کر دیا۔

اور اب رعنا میری بھابی ہے۔

وہ ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ میرے بھائی ارمان کو مجھ پر بہت فخر ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ جس گھر میں صندل جیسی بہن موجود ہو۔ اس گھر کے بیٹے بگڑ نہیں سکتے اور اگر بگڑ جائیں تو پھر انہیں سیدھا بھی کر دیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے ارمان سے پوچھا۔ ''بھائی چلو اب تو بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟''

''گڑیا۔ میں رعنا کو دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''تو پاگل ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوا کہ تم اسے بے عزت ہی کر دو۔''

''گڑیا۔ کیا تم یقین کرو گی کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ شخص جو میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے اس حرکت کے لئے اکسایا تھا اور اس شیطان کے کہنے پر میں نے یہ مجرمانہ حرکت کی تھی۔''

''تو ایسے شیطان کو اپنے ساتھ کیوں رکھتے ہو بھائی۔''

''انسان ہوں نا۔ لیکن تم جیسی لڑکی میری بہن ہے اور جب بہن اتنی مضبوط ہو تو پھر اس کا بھائی کہاں بہک سکتا ہے اور جب بھی ایسا کوئی خیال اس کے ذہن میں آئے گا۔ کسی طرف سے کوئی گاڑی تیزی سے آئے گی اور اسے ہٹ کرتی ہوئی آگے نکل جائے گی۔''

میں ہنس پڑی۔ لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کاش۔ میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ کاش۔ میں پہلے ساری صورت حال معلوم کر لیتی۔

کیونکہ میری اس حرکت کے بعد میرا بھائی ایک ٹانگ سے معذور ہو چکا ہے۔ وہ بیساکھی پر چلتا ہے۔

ڈیڈی پاپا اور میں

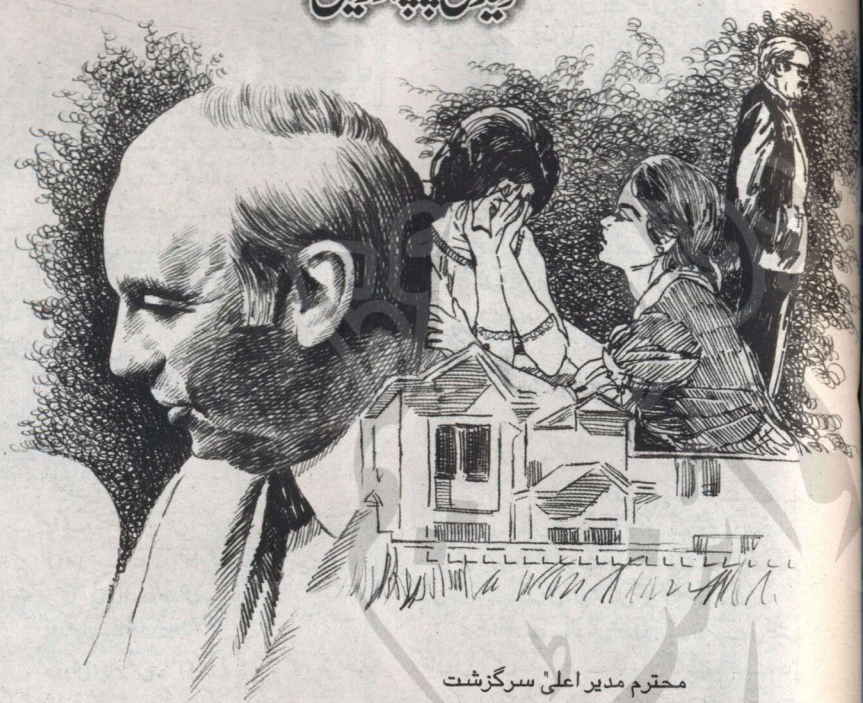

محترم مدیر اعلیٰ سرگزشت

السلام علیکم!

میں نے اپنی داستان حیات لکھی ہے۔ میں اردو پڑھ سکتی ہوں لیکن لکھ نہیں سکتی دراصل بچپن سے انگریزی اسکول سے واسطہ رہا ہے۔ ایک ماہ تک اسے مسلسل لکھا اور پھاڑا ہے۔ تب جاکر اپنی داستان مکمل کی ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگی۔ اپنا دکھ زیادہ جو لگتا ہے۔ اس لیے اس سرگزشت کی خامی خوبی کا اندازہ قارئین ہی لگاسکتے ہیں۔

عنبرین

(کوئٹہ)

یہ ایک عجیب کہانی ہے۔

میں شرمسار ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کیا سب غلط ہے۔ یا سب صحیح ہے۔

اس کہانی کی ابتدا اس دن سے ہوتی ہے جب شیروانی صاحب راستے میں مل گئے تھے۔ ایک دراز قامت، سرخ و سفید انسان جن کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ لیکن انتہائی باوقار۔

میں اس شام امی کے ساتھ شاپنگ کے لیے ایک جدید قسم کی مارکیٹ میں گئی ہوئی تھی کہ اچانک کسی کی آواز آئی۔ ''بانو یہ تم ہو۔''

بانو میری امی کا نام تھا اور اس آدمی نے میری امی ہی کو مخاطب کیا تھا۔ امی انہیں دیکھ کر جیسے سکتے میں رہ گئی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ امی کو شاید اس وقت یہ ہوش بھی نہیں رہا تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ کھڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی ہوں۔ بالآخر میں نے ہی امی کو مخاطب کیا۔ ''امی۔ کون صاحب ہیں یہ؟''

''بیٹا۔ یہ شیروانی صاحب ہیں۔'' ان کو جیسے ہوش آ گیا تھا۔ پھر انہوں نے شیروانی صاحب سے کہا۔ ''شیروانی۔ یہ میری بیٹی ہے۔ عنبرین۔''

شیروانی نے آگے بڑھ کر بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کا یہ عمل مجھے اچھا لگا۔

''شیروانی کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں۔'' امی نے کہا۔ ''کہاں رہے اتنے دنوں تک؟''

''میں ملک سے باہر چلا گیا تھا بانو۔'' شیروانی نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ''اگر بیٹی کو اعتراض نہ ہو تو آؤ کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''

''نہیں انکل۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''آپ تو بہت Decent آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔''

''تھینک یو بے بی۔''

ہم ایک ریسٹوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت امی نے شیروانی صاحب سے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ میری بڑی بیٹی ہے عنبرین۔ بی بی اے کر رہی ہے۔''

''اور تمہارے شوہر فیروز؟''

''وہ وہی اپنا بزنس۔'' امی نے بتایا۔ ''تمہیں تو معلوم ہے کہ فیروز نے شروع سے کاروبار کو ترجیح دی ہے۔''

''ہاں' جانتا ہوں میں۔'' شیروانی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ''بیٹی۔ میں اپنا تعارف خود کروا دوں۔ میرا نام نوید شیروانی ہے۔ میں اور تمہاری امی ایک ساتھ ہی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ پھر ان کی شادی ہو گئی اور میں ملک سے باہر چلا گیا۔ واپس آ کر میں نے بھی ایک چھوٹا سا بزنس کر لیا ہے۔ بس یہ ہے مکمل کہانی۔''

''اور تمہاری بیوی بچے۔'' امی نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

''کہیں بھی نہیں کیونکہ میں نے شادی نہیں کی۔'' شیروانی نے بتایا۔ ''میرا مطلب ہے کہ نگہت کے بعد۔''

''کیوں؟''

''اس کی وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' شیروانی نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ لیکن بہت جلد انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال بھی لیا تھا۔ وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اپنے بیتے دنوں کو دُہراتے رہے۔ یہ نارمل سی باتیں تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے باتیں کرتے ہوئے امی کی زبان کچھ لڑکھڑانے لگتی تھی۔

شیروانی نے امی کو اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔ پھر ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے اور ہم اپنی گاڑی کی طرف۔

گھر پہنچے تو پاپا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

''ارے بھئی۔ کہاں رہ گئے تھے تم لوگ؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''تمہارا موبائل بھی آف جا رہا تھا۔''

''میں بیٹری چارج کرنا بھول گئی تھی۔'' امی نے بتایا۔ ''لیکن پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ عنبرین تو میرے ساتھ تھی نا۔''

''بیگم تم نہیں جانتیں کہ میں تمہارے بغیر کتنا اُداس ہو جاتا ہوں۔'' پاپا منہ بنا کر بولے۔

امی مسکرا کر رہ گئیں۔

یہ بالکل درست تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بے انتہا محبت تھی۔ خاص طور پر پاپا تو امی کے شوہر بھی تھے اور عاشق بھی، اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی عار نہیں ..... کہ امی اس عمر میں بھی خوبصورت تھیں۔

بہت اسمارٹ۔ بلکہ میں اور امی ایک دوسرے کی بہنیں دکھائی دیتی تھیں۔ قدرت نے شاید ان کو اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ جبکہ پاپا بھی کم نہیں تھے۔ وہ بھی ایک ہینڈسم انسان تھے اور ان دونوں کی جوڑی بہت رشک سے دیکھی جاتی تھی۔

میں نے اس دن ایک بات یہ محسوس کی کہ نہ جانے کیوں امی نے شیروانی صاحب کا ذکر پاپا سے نہیں کیا تھا۔ یا تو بھول گئی ہوں۔ یا اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی ہو۔ لیکن وہ تو آتے ہی ہر بات بتا دیا کرتیں۔ جس طرح بچے بتا دیتے ہیں کہ آج یہ ہوا۔ راستے میں کون کون ملا..... وغیرہ وغیرہ۔ اور یہی عادت پاپا کی بھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ضرورت محسوس نہ کی ہو۔

بہر حال میں نے اس کے بعد یہ محسوس کیا کہ امی کچھ چپ چپ اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھیں۔ حالانکہ وہ بہت شگفتہ مزاج کی تھیں۔ ہنسی مذاق، لیکن اس دن کے بعد انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تبدیلی صرف میں محسوس کر رہی تھی کیونکہ پاپا کے آتے ہی وہ نارمل ہو جایا کرتیں۔ وہی قہقہے۔ وہی باتیں۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ وہ اچانک کہیں چلی جاتیں اور ان کی

واپسی دیر میں ہوتی۔ ایک بار موبائل پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں کہ میں اچانک داخل ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ گڑبڑا گئی تھیں۔ انہوں نے موبائل جلدی سے آف کر دیا تھا۔

یہ ساری باتیں کسی اور طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

خدا نہ کرے جو میں سوچ رہی تھی وہ درست ہو۔ ورنہ بہت بڑی قیامت آ جاتی۔ پاپا کے لیے تو وہ زندگی کی طرح تھیں اور جب زندگی رُخ موڑنے لگے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

ایک دن میں نے ہمت کر کے امی سے پوچھ ہی لیا۔

''امی۔ خیریت تو ہے نا۔ آج کل آپ کچھ چپ چپ رہنے لگی ہیں۔''

''ارے بیٹا یوں ہی۔'' امی نے کہا۔ ''کبھی کبھی انسان کے موڈ میں تبدیلی بھی تو آ جاتی ہے۔ ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔''

لیکن کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی طوفان ہمارے گھر کی طرف چلا آ رہا ہو۔ ایک شام میں اپنی ایک دوست سے مل کر گھر آئی تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ شیروانی صاحب گھر میں موجود تھے۔ پاپا بھی تھے۔ امی بھی تھیں۔ وہ تینوں ڈرائنگ روم میں تھے۔ کم از کم ایک بات تو سامنے آئی تھی کہ شیروانی صاحب پاپا کے لیے اجنبی نہیں تھے بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو پاپا نے کہا ''عنبرین۔ ان سے ملو۔ یہ میرے دوست ہیں۔ شیروانی۔''

''میں ان سے مل چکی ہوں پاپا۔'' میں نے بتایا۔

''ہاں۔ میں بتانا بھول گئی تھی۔'' امی جلدی سے بولیں۔ ''ایک دن راستے میں شیروانی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ عنبرین بھی میرے ساتھ تھی۔''

''اوہ۔ پھر تو یہ اچھی بات ہوئی۔'' انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''عنبرین۔ شیروانی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں شیروانی اور تمہاری امی سب ایک ہی کالج میں ہوا کرتے تھے۔''

میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ امی کی شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ شیروانی کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہو جاتی۔ ایسی چمک جو اپنا احساس دلایا کرتی ہے۔

دوسری طرف خود شیروانی کی نگاہیں بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں اور پاپا ان دونوں کی کیفیت سے بے خبر اپنی باتیں

ناخن بتاتے ہیں

انگلیوں کے ناخن بہت سے امراض کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کی روشنی میں ہم خود کو صحت مند رکھ سکتے ہیں۔ جلدی امراض کے ماہر جینئس کیمبل ناخنوں پر اُبھرنے والی علامات کے بارے میں انکشاف کر کے ان کے تدارک سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

لمبے نشانات: ان نشانات کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جسم میں جست کی کمی واقع ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ملٹی حیاتین کی گولیاں استعمال کیجیے۔

دھبے دار نشانات: یہ نشانات ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کے جسم کو مطلوبہ مقدار میں کیلشیم نہیں مل رہا ہے۔

دائرے دار نشانات: مذکورہ نشانات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آپ کے جسم میں فولاد کی کمی ہے، لہٰذا اپنے معالج سے مشورہ کیجیے۔ اپنا ٹیسٹ کرائیے۔

سبزی مائل پیلے نشانات: یہ پھپھوندی (Fungus) ہو سکتی ہے اس لیے اپنے ناخنوں کو پانی سے بچائیں اور معالج سے مشورہ کریں۔ چپٹے یا دونوکوں والے ناخن امکان ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کے گردے متاثر ہو چکے ہیں یا آپ کو کوئی جلدی مرض ہے۔''

مرسلہ: ڈاکٹر محمد علی، کراچی

کیے جا رہے تھے۔ پُرانے قصّے۔ اپنے ماضی کو اس طرح دُہرانا کتنا اچھا لگتا ہے۔

میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں بیٹھ سکی۔ مجھے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ بہت عجیب سا احساس ہو رہا تھا اور میرا خیال ہے کہ ایسا احساس ..... جو اپنے والدین میں سے کسی کے ساتھ خاص طور پر اپنی ماں کے ساتھ کوئی ایسی بات دیکھ لے۔

ایک بار میں نے ان دونوں کو ایک ہوٹل میں دیکھ لیا۔

میں اپنی دوست کے یہاں گئی تھی۔ اس کا گھر اس خوبصورت ہوٹل کے قریب ہی تھا۔ نہ جانے اسے کیا سوجھی۔ اس نے کہا ''چل عنبرین۔ آج ہوٹل میں چل کر لنچ کرتے ہیں۔''

''ارے رہنے دے۔ جو کچھ گھر میں ہے۔ وہی کھا لیں گے۔''

''آج کوئی خاص نہیں ہے۔ کک آج چھٹی پر ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ چل۔"

ہوٹل قریب ہی تھا۔ ہم دونوں ٹہلتے ہوئے آ گئے تھے اور ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی میں نے امی اور شیروانی صاحب کو دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں پورے ماحول سے بے خبر ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں ہمیں نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں نے اپنی دوست کا ہاتھ تھام لیا۔ "نہیں یار۔ یہاں نہیں۔ کہیں اور چلتے ہیں۔"

"کیوں۔ یہاں کیوں نہیں؟"

"بس یار۔ یہاں کچھ گھٹن ہو رہی ہے۔"

"تیری مرضی۔"

ہم دونوں اس ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ وہ دن میرے لیے قیامت کا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ میں تو ان پر فخر کرتی تھی۔ ان کے گن گاتی رہتی تھی۔ پاپا سے ان کی محبت تو مثال تھی۔ پھر یہ شیروانی درمیان میں کہاں سے آ گیا۔ کیوں آ گیا؟

امی میری آئیڈیل تھیں لیکن اب احترام کا وہ مینار گرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اس رات میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ میں پاپا کے لیے امی کی یہ بددیانتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے تنہائی میں امی سے پوچھا۔ "امی۔ یہ بتائیں کہ یہ شیروانی کون ہے؟"

"بیٹا۔" امی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "اس انداز سے بات نہیں کرتے۔"

"یہ چھوڑیں یہ بتائیں کہ وہ کون ہیں؟"

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کیا سوال کر رہی ہو؟"

"امی۔ اب میں کوئی بچی نہیں رہی جو ایسی باتیں سمجھ نہ سکوں۔ جب سے یہ شخص ہماری زندگی میں آیا ہے تب سے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ آپ بدل گئی ہیں۔ آپ کے انداز بدل گئے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ پاپا کو دھوکا دے رہی ہیں۔"

"نہیں۔" امی لرز اٹھیں۔ "ایسا مت کہو۔ میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں تمہارے پاپا سے بے انتہا محبت کرتی ہوں اور پھر تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں۔"

"بہت ہی مجبور ہو کر بات کر رہی ہوں امی کیونکہ میں نے آپ کو اس شخص سے کئی بار باہر ملتے ہوئے دیکھا ہے۔" میں نے کئی بار اپنی طرف سے کہہ دیا تھا۔

امی نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ بہت نروس دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "عنبرین۔ اگر تمہیں کچھ بتا دوں تو تمہارا کیا ردِعمل ہو گا۔"

"خدا کے لیے امی۔ کوئی ایسی بات مت بتایئے گا جسے میں سن نہ سکوں۔"

"ایسی ہی بات ہے بیٹا۔" وہ دھیرے سے بولیں۔ "اب یہ تمہاری مرضی کہ تم مجھے معاف کرتی ہو یا مجھے سزا دیتی ہو۔"

"ایسا تو نہ کہیں۔ آخر زیادہ سے زیادہ یہی ہوا ہو گا نا کہ آپ نے شیروانی انکل سے محبت کی ہو گی۔ پھر آپ کی شادی پاپا سے ہو گئی ہو گی۔ تو یہ تو بہت عام سی بات ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں شرمندہ ہونے والی کون سی بات ہے؟"

"نہیں بیٹا۔ بات اس سے بھی زیادہ ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ؟" میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ "اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"وقت آنے پر بتا دوں گی تمہیں۔" امی نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ بتا نہ سکوں۔" امی دوسری طرف دیکھنے لگی تھیں۔

میں نے اس وقت امی کو مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ شاید اندر سے ٹوٹنے لگی تھیں اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ جو کچھ بھی تھا وہ درگزر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے یہ کیسی بات کہہ دی تھی کہ معاملہ کچھ اور بھی تھا۔ وہ کچھ اور کیا ہو سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے میں پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔

دوسری طرف پاپا تھے۔ ان کی محبت تھی۔ ان کی شفقت تھی۔ وہ امی کی ذرا سی بات کو بھی اپنے لیے حکم سمجھا کرتے اور مجھے امی پر غصہ آنے لگتا تھا کہ آخر وہ کس طرح اتنے شریف انسان کو دھوکا دے رہی ہیں۔

ایک دن پاپا نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا تم ایک کام کرو۔ مجھے بہت ضروری کام سے دفتر جانا ہے۔ ورنہ میں خود چلا جاتا۔ شیروانی انکل سخت بیمار ہیں۔ تم امی کے ساتھ چلی جاؤ۔ دفتر سے فارغ ہو کر میں بھی آتا ہوں۔"

"نہیں پاپا۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں تنک کر بولی۔

"ارے ایسا نہیں کہتے۔" پاپا نے کہا۔ "وہ بہت پیارا انسان ہے۔ میرا بہت اچھا دوست ہے اور بالکل اکیلا ہے بے چارہ۔ اس لیے تم جاؤ اس کے پاس۔"

اب میں پاپا کو کیا بتاتی کہ میں اس کے پاس کیوں نہیں

جانا چاہتی؟

بے چارے پاپا کو کیا معلوم تھا کہ وہ جس کے پاس ہمیں بھیج رہے ہیں۔ وہ کسی زمانے میں امی سے محبت کر چکا ہے بلکہ یہ سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔ امی اس کے ساتھ آیا جایا کرتی ہیں۔

لیکن پاپا نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے اور امی کو جانا ہی پڑ گیا۔ اس وقت خود امی بھی جانے سے کترا رہی تھیں۔ لیکن پاپا نے مجبور کر کے بھیج دیا تھا۔

گاڑی امی ہی چلا رہی تھیں۔ لیکن راستے میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شیروانی ایک سنگل اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ اپارٹمنٹ کے پاس آ کر امی نے گاڑی روک لی۔ "عنبرین۔ تم دوسری منزل کے تین نمبر اپارٹمنٹ میں چلی جاؤ۔"

"اور آپ؟"

"نہیں۔ میں نہیں جا رہی۔" امی نے کہا۔ "جب تم واپس جانا چاہو تو چلی جانا۔ میں کہیں اور جا رہی ہوں۔"

میں ان کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ اس لیے میں نے اصرار نہیں کیا۔

میں صرف پاپا کے کہنے پر اس شخص کے پاس جا رہی تھی۔ ورنہ میری کوئی خواہش نہیں تھی کہ ایسے آدمی سے جا کر ملوں جو میرے پاپا کو دکھ دینے کا سبب بننے والا ہو۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دستک دے کر اندر گئی تو ایک ملازمہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "شیروانی صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"آئیں بی بی۔" وہ مجھے ان کی خواب گاہ میں لے آئی۔

شیروانی بستر پر دراز تھا۔ جاگ رہا تھا۔ اس نے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ چہرے سے نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن اس عالم میں بھی اس کی باوقار شخصیت کا فسوں اپنی جگہ پر تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "بیٹی تم۔"

"پاپا نے بتایا تھا کہ آپ بیمار ہیں تو میں دیکھنے چلی آئی۔" میں نے کہا۔ "بلکہ پاپا ہی نے بھیجا ہے۔"

"ہاں تمہارا باپ بہت اچھا آدمی ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"نہ جانے کیوں ممی نیچے سے مجھے پہنچا کر واپس چلی گئیں۔" میں نے یہ بات جان بوجھ کر کی تھی۔ "شاید وہ اوپر نہیں آنا چاہتی تھیں۔"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ صرف خلا میں دیکھتا رہا۔

خاموشی کے کئی لمحے گزر گئے۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔ "شاید۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

وہ شاید اپنے آپ سے کسی بات کا اعتراف کر رہا تھا۔

کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ جاتے تھے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا "بیٹی۔ میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں پیار کرنا چاہتا ہوں۔"

اور اس وقت میں پھٹ پڑی۔ "رہنے دیں یہ سب۔ اگر پاپا مجبور نہیں کرتے تو میں کبھی یہاں نہیں آتی۔ میں ایسے آدمی سے ملنا ہی نہیں چاہتی جو اپنے دوست کو دھوکا دے رہا ہو۔"

"کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔"

ہر اچھا کام عبادت ہوتا ہے

عبادت دراصل اس بات کا اقرار اور اظہار ہے کہ جس کی عبادت کی جا رہی ہے، وہ معبود ہے اور جو عبادت کر رہا ہے وہ عبد ہے۔ عبد کے معنی بندے کے ہیں۔ جو انسان عبادت کرتا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں بندہ ہوں اور جس کی عبادت کر رہا ہوں وہ میرا مالک ہے، خالق ہے، آقا ہے، اس کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ اس کی اطاعت میں ہی میری بھلائی ہے۔ معبود نے جو ہدایات دی ہیں، ان پر عمل کرنے ہی میں نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت کرے۔ عبادت کرنے والے ہی اچھے بندے ہوتے ہیں۔ وہ اچھے انسان بھی ہوتے ہیں۔ عبادت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ خود عبادت کرنے والے کو ہی فائدہ ہوتا ہے۔ عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اور اللہ کا تعلق پائیدار رہے۔ جب انسان کو یہ بات یاد رہے گی کہ وہ خود آقا نہیں ہے بلکہ آقا کا بندہ ہے تو وہ آقا کے احکام کی پابندی کرے گا اور اس پابندی کی وجہ سے ہر کام صحیح ہو گا۔ جھوٹ، دھوکا، ظلم، ناانصافی اور بے ایمانی نہیں ہو گی، بلکہ سچائی، سکون، ہمدردی، انصاف اور دیانت کا دور دورہ ہو گا۔ یہی عبادت کا مقصد ہے۔

فرمودات شہید حکیم محمد سعید

مرسلہ: ارم، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔'' میری آواز کچھ بلند ہوگئی تھی۔ ''آپ ایک مکار انسان ہیں۔ آپ نے ایک طرف پاپا سے دوستی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور دوسری طرف آپ امی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور اب تو اپنی امی سے بھی شرم آنے لگی ہے مجھے۔''

میں اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ میں نے یہ خیال نہیں کیا کہ وہ بیمار ہیں اور میری باتیں انہیں شاک پہنچا رہی ہیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر میں اس اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی تھی۔

گھر پہنچی تو امی موجود تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔ ''کیا ہوا عنبرین۔ تم واپس کیوں آ گئیں؟''

''اس لیے کہ جو ڈرامہ ہو رہا ہے میں اسے نہیں دیکھ سکتی۔'' میں نے کہا۔ ''بہت ہوگئی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں اس آدمی کو بھی بُرا بھلا کہہ کر آئی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟ کیا تم نے اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی ہے۔'' امی بے ساختہ بول پڑی تھیں۔

''باپ؟'' میں یہ سن کر سکتے میں رہ گئی تھی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں بیٹا۔'' امی نے ایک گہری سانس لی۔ ''شیروانی تمہارے اصل باپ ہیں۔''

پھر انہوں نے جو کچھ بتایا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔

تینوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ یعنی شیروانی، امی اور پاپا۔ شیروانی کی شخصیت ایسی تھی کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوسکتا تھا۔ امی بھی ہوگئیں اور شیروانی کو پسند کرنے لگیں۔ یہ پسند گہری محبت میں تبدیل ہوگئی۔

لیکن شیروانی کی ماں ایک اکھڑ مزاج عورت تھی۔ اس نے شیروانی کا رشتہ اپنی بہن کی بیٹی سے طے کر رکھا تھا۔ انہوں نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ شیروانی کو اس عورت سے شادی کرنی پڑ گئی۔ امی نے خاموشی سے یہ صدمہ برداشت کرلیا۔

پھر شیروانی دوسرے شہر چلے گئے۔

اس دوران پاپا نے امی کو پرپوز کیا اور امی کی شادی پاپا سے ہوگئی۔ پھر یہ ہوا کہ امی کو ایک حادثہ پیش آ گیا اور ڈاکٹروں نے یہ کہا کہ اندرونی چوٹ کی وجہ سے یہ اب شاید ماں بننے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ پاپا کو دیوانگی کی حد تک بچوں سے پیار تھا اور بچوں کی خواہش تھی۔

پھر ایک دن شیروانی مجھے لے کر آ گئے۔ اس وقت میری عمر صرف ایک سال کی تھی۔ انہیں بھی یہ افسوس ناک خبر معلوم ہوچکی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ میری بچی عنبرین ہے۔ لیکن آج سے یہ تم دونوں کی بیٹی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''نگہت کا انتقال ہوچکا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اس کی دیکھ بھال کے لیے میری ماں تھیں۔ وہ بھی اب نہیں رہیں۔ میں نے چھ مہینوں تک اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے اور اب اپنی زندگی اس بھروسے پر تمہارے حوالے کر رہا ہوں کہ تم ہی اب اس کے ماں باپ ہو۔''

اور اس طرح میں امی اور پاپا کے پاس آ گئی۔

''یہ ہے کل کہانی۔'' امی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ میں نے شیروانی سے محبت کی تھی اور تمہارے پاپا کو بھی یہ معلوم ہے۔ لیکن میں ان سے بے وفائی کا کبھی تصور نہیں کرسکتی اور دوسری طرف ہم نے تمہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ اس پیار کا اندازہ تم خود ہی کرسکتی ہو۔ شیروانی جب واپس آئے تو یہ خوف ہونے لگا کہ وہ کہیں تمہیں لینے تو نہیں آئے ہیں کیونکہ تم پر اصل حق تو ان ہی کا ہے۔ وہ تو اتنا شریف انسان ہے کہ اس نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ہم کبھی یہ بات اپنی زبان پر بھی نہ لائیں۔ لیکن اس وقت تم جو اتنا بُرا بھلا کہہ کر آئی ہو۔ اس لیے میں نے غصے میں آ کر تمہیں یہ بات بتا دی ہے۔ ورنہ۔''

اور اس وقت میری آنکھوں سے سیلاب امڈ پڑا۔ میں امی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ یہ سب کتنے عظیم لوگ تھے اور میری سوچ کتنی گھٹیا تھی۔ میں نے اپنے باپ کا دل دکھایا تھا۔

''امی۔ میں شیروانی انکل کے پاس جاؤں۔ ان سے معافی مانگنے کے لیے۔''

''جاؤ بیٹا ضرور جاؤ۔ لیکن بس ایک بار انہیں ڈیڈی ضرور کہہ دینا۔ وہ یہی خواہش لیے باہر سے آیا ہے۔''

اور اب میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ میرے پاس پاپا بھی ہیں اور ڈیڈی بھی۔ دونوں مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ میں ہفتے میں دو دن اپنے ڈیڈ یعنی شیروانی صاحب کے پاس جا کر رہتی ہوں۔ ان کی خدمت کرتی ہوں۔ ان کے ساتھ تفریح کرتی ہوں۔ پھر پانچ دن پاپا اور امی کے ساتھ رہتی ہوں۔

شاید ہی ایسی محبتیں کسی اور نے پائی ہوں گی جیسے مجھے مل رہی ہے۔ میں محبتوں کی بارش کے درمیان کھڑی ہوں۔

○

ابن الوقت

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

بدلتے حالات کی ایک لفظی تصویر ارسال خدمت ہے، یہ میری اپنی سرگزشت ہے لیکن اس کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ آپ اس میں بہت کچھ دیکھ اور سمجھ لیں گے۔ بس غور کرنے کی ضرورت ہے۔

عظیم الدین
(کراچی)

آج سے کوئی تیس سال پہلے کراچی وسعت پذیر شہر تھا لیکن اتنا نہیں پھیلا تھا۔ اس وقت فلیٹ بہت کم تھے اور کہیں کہیں پائے جاتے تھے۔ مرکزی شہر کو چھوڑ کر لوگ فلیٹوں میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ شہر سے دور جو نئی آبادیاں بن رہی تھیں ان میں مکان تھے اور فلیٹ بہت کم تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ نئی آبادیاں بھر گئیں اور مین سڑکوں کے ساتھ فلیٹ کھمبیوں کی طرح سر اُٹھانے لگے تھے۔ اضافی آبادی کا دباؤ یہ فلیٹ سمیٹنے لگے تھے۔ اگرچہ اس طرزِ زندگی نے کچھ نئی مشکلات بھی پیدا کی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ یہ ہمارے ملک، معاشرے اور لوگوں کا مسئلہ ہے کہ جب بھی کوئی اجتماعی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ حل ہونے کے بجائے بڑھتا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی فلیٹوں کے ساتھ بھی ہوا۔ آغاز میں ان سے جو اجتماعی مسائل پیدا ہوئے ان میں وقت کے ساتھ کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ اس دور میں انسان سادہ تھے۔ بہت زیادہ پیچیدگی کم ہی پائی جاتی تھی کیونکہ اس وقت لوگ خوبی کو خوبی اور خامی کو خامی ہی مانتے تھے۔ آج کے دور میں خامیاں خوبیاں بن گئی ہیں جو خوبیاں ہوتی تھیں اب انہیں خامیوں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ یہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس وقت بُرے لوگوں میں بھی کچھ نہ کچھ اچھائیاں پائی جاتی تھیں ورنہ لوگ انہیں قبول نہیں کرتے۔ کھلی بدمعاشی اور غنڈہ گردی یا تو کہانیوں میں پائی جاتی تھی یا فلموں میں، ڈراموں میں بھی اس کا رواج نہیں ہوا تھا۔ زیرِ نظر قصہ ایک ایسے ہی شخص کا ہے جسے میں آج کے دور کے حساب سے دیکھتا ہوں تو وہ نہایت شریف اور اچھا انسان نظر آتا ہے لیکن جب اپنے دور کے حساب سے دیکھتا ہوں تو وہ اچھا انسان ثابت نہیں ہوتا... میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔

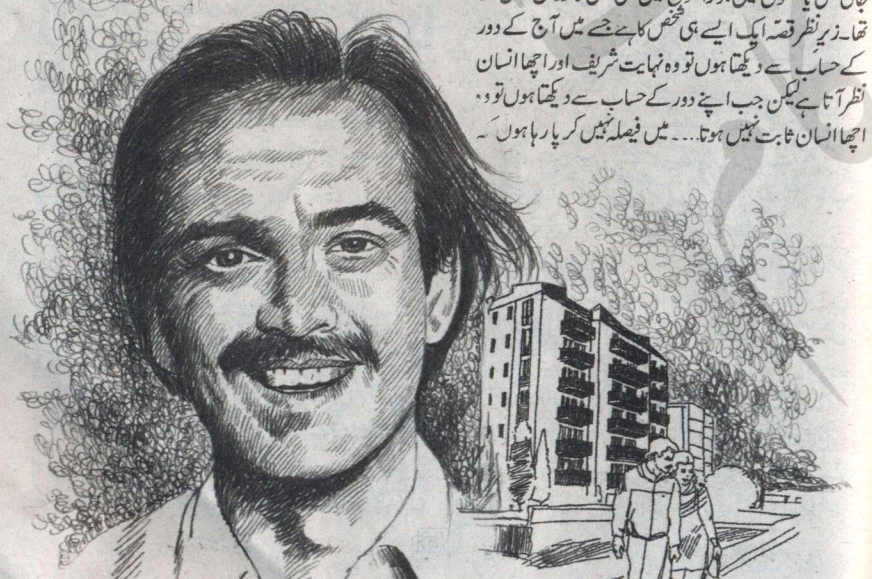

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے کس دور کے حساب سے دیکھوں۔

تیس سال پہلے میں ایک صوبائی وزارت میں سیکشن آفیسر کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ تنخواہ ٹھیک تھی لیکن بیوی بچوں کے ساتھ کرائے کے مکانوں میں گزارا مشکل ہو رہا تھا۔ اس وقت میرے دو بچے تھے۔ اتنی حیثیت نہیں تھی کہ کوئی مکان یا فلیٹ خرید لیتا۔ لیکن میری بیوی شائستہ کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح ہمارا اپنا گھر ہو جائے۔ خواہش تو میری بھی تھی لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ صرف خواہش کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے، اپنا گھر کرنے کے لیے خاصی رقم درکار ہوگی اور یہاں تو معاملہ ہینڈ ٹو ماؤتھ تھا۔ تنخواہ بس کسی طرح پوری پڑ جاتی تھی۔ شائستہ اپنے گھر کے لیے مختلف تجویزیں دیتی رہتی تھی۔ کیونکہ صرف تجویز دینے پر کچھ خرچ نہیں ہوتا ہے۔ خاص طور سے چھٹی کا دن اسی میں گزرتا تھا۔ بہت سا وقت شائستہ کو یہی سمجھانے میں گزر جاتا تھا کہ اس کی دی ہوئی تجویز کس وجہ سے ناقابل عمل ہے۔

ایک جمعے کو میں صبح دیر سے اُٹھا۔ اس وقت چھٹی جمعے کو ہوتی تھی۔ شائستہ بچوں کو ناشتا کرا کے گھر کے دوسرے کام نمٹا رہی تھی جب تک میں نہا کر آیا اس نے میرا ناشتا لگا دیا تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں دو کمرے تھے ایک میں ہمارا بیڈ روم تھا اور دوسرا نشست گاہ بھی تھا اور رات کو ہمارے بچوں کا بیڈ روم بن جاتا تھا۔ شائستہ کچھ پُرجوش ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے دماغ میں پھر کوئی خیال آیا ہے۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ میں ناشتے سے فارغ ہوں اور میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد ٹی وی پر شارجہ میں ہونے والا کرکٹ میچ دکھایا جانا تھا۔ اگر میں شائستہ کے چکر میں پڑتا تو میچ کا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ اس لیے میں نے جلدی سے ناشتا مکمل کر لیا تاکہ وہ اپنی بات کرے اور میں میچ شروع ہونے سے پہلے اس مسئلے کو ختم کر سکوں۔ ناشتے کی ٹرے سرکتے ہی شائستہ نے اخبار میرے سامنے کر دیا۔

"یہ دیکھیں۔"

میں نے اخبار لیا۔ "کیا ہے اس میں ....وہی باسی پُرانی خبریں ہیں۔"

"جی نہیں۔" اس نے اخبار کا نچلا حصہ دکھایا۔ "یہ اشتہار دیکھیں۔"

اشتہار ایک فلیٹ کمپلیکس کا تھا۔ ایک نامی گرامی بلڈر جو شہر میں پہلے ہی کئی کامیاب فلیٹس تیار کر کے لوگوں کے سپرد کر چکا تھا اس نے کم آمدنی والے لوگوں کے لیے ایک نیا پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ پروجیکٹ گلشن اقبال میں تھا۔ اس میں فلیٹ کی قیمت ستر ہزار سے شروع ہو رہی تھی۔ کمپلیکس میں دو اور تین کمروں کے فلیٹ تھے یعنی رقبے کے لحاظ سے بھی چھوٹے فلیٹس تھے۔ کم آمدنی والوں کے لیے تو ستر ہزار کی رقم بھی خاصی تھی۔ اس وقت میری تنخواہ تین ہزار روپے تھی۔ میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ "ہم اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے؟"

"اس میں سے بلڈر کو چالیس ہزار دینے ہیں۔" شائستہ نے دوبارہ اخبار میرے سامنے کر دیا۔ "تیس ہزار ہاؤس بلڈنگ کا لون ہے۔"

میں نے اخبار پھر پیچھے کر دیا۔ "یہ ایک اور ذلت ہوگی ہاؤس بلڈنگ پُرانے سود خوروں کا نیا روپ ہے۔ جو ایک بار ان کے چنگل میں پھنس جائے اسے مشکل سے ہی نجات ملتی ہے۔"

"آپ غور سے دیکھیں اگر کوئی چار سال میں یہ ساری رقم بلڈر کو دے دے تو فلیٹ کی قیمت ساٹھ ہزار ہو جائے گی۔" شائستہ نے پھر اخبار سامنے کیا۔

"ساٹھ ہزار تو پھر بھی دینا ہوں گے۔ اتنی رقم کہاں سے کریں گے؟ ہر سال پندرہ ہزار دینا ہوں گے اور یہ سب سے کم قیمت ہے فلیٹوں کی یعنی تین کمرے کا فلیٹ سب سے اوپری فلور پر اور ایسٹ اوپن ملے گا۔"

"ہم بات کر سکتے ہیں رعایت کروا سکتے ہیں۔" شائستہ نے اصرار جاری رکھا۔ "ہم تین کمروں کا بک کرا سکتے ہیں۔ ویسٹ اوپن کرا سکتے ہیں، ضروری نہیں ہے سب سے اوپری منزل کا فلیٹ بک کرائیں۔ یہ کل پانچ منزلہ فلیٹ ہیں ہم دوسرے یا تیسرے فلور کا بھی لے سکتے ہیں۔"

میں نے چڑ کر کہا۔ "چلو فرض کرو ہم لے لیتے ہیں لیکن ادائیگی کیسے کریں گے یہ بھی سوچا ہے تم....؟"

"اگر انسان ارادہ کر لے تو اللہ بھی مدد کرتا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔ "دیکھئے میرے پاس زیور ہے، ہم کمیٹی ڈال سکتے ہیں۔ آپ کوشش کریں تو کوئی پارٹ ٹائم جاب تلاش کر سکتے ہیں۔ میں گھر میں کام کر سکتی ہوں۔"

میں شام پانچ بجے دفتر سے اُٹھ جاتا تھا۔ اس کے بعد کوئی پارٹ ٹائم جاب کر سکتا تھا بلکہ میرا ایک دوست فرقان میڈیکل اسٹور چلا رہا تھا اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ میں شام کے وقت اس کے پاس آجاؤں اس کا میڈیکل اسٹور موقع کی جگہ تھا وہاں کئی کلینک تھے شام میں بہت رش ہوتا تھا اور وہ اکیلے کام نہیں سنبھال سکتا تھا کئی ملازم رکھے تھے لیکن وہ ڈنڈی مار جاتے تھے۔ رقم غائب کر دیتے یا دوائیاں لے جاتے تھے۔ وہ چاہتا تھا میں اس کے ساتھ آجاؤں۔ شائستہ

کی بات سے فرقان کا خیال آیا۔ شائستہ کے پاس کوئی دس تولے سونا تھا۔ یہ بھی پندرہ سولہ ہزار کا نکل جاتا۔ میں نے غور کیا ہمیں ماہانہ بارہ سو روپے کی ضرورت تھی۔ اگر یہ رقم میں پارٹ ٹائم کام کر کے کما لیتا تو چار سال بعد ہم اپنے ذاتی فلیٹ کے مالک بن سکتے تھے۔ میں نے شائستہ سے پوچھا۔ "تم کیا کرو گی؟"

"آپ جانتے ہیں مجھے کڑھائی کا کام آتا ہے وہ تو آپ نے منع کر رکھا ہے ورنہ مجھے بھی بہت کام مل سکتا ہے۔"

شائستہ کی تجویز نے پہلی بار مجھے متاثر کیا تھا۔ اشتہار میں لکھا تھا کہ سائٹ و بکنگ آفس چھٹی کے دن بھی کھلا رہے گا اور پہلے تین دن بکنگ کرانے والوں کو خاص رعایت دی جائے گی۔ میں ان دنوں شاہ فیصل کالونی میں رہتا تھا اور فلیٹ سائٹ یہاں سے کچھ دور راشد منہاس روڈ پر تھی۔ میرے پاس بائیک تھی میں نے شائستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے شام کو ہم چلتے ہیں اور دیکھ کر آتے ہیں۔"

"دیکھ کر نہیں آتے ہیں بکنگ کرا کے آتے ہیں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"لیکن بکنگ کے لیے بھی تو رقم درکار ہوگی۔"

"میرے پاس دو ہزار روپے پڑے ہیں میرا خیال ہے ان سے کام چل جائے گا آپ اللہ کا نام لے کر شروع کریں۔"

میں فکر میں پڑ گیا تھا میچ کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور میں نے پہلے فرقان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر اس نے ارادہ بدل لیا تھا یا کسی اور کو ملازم رکھ لیا تھا تو پھر مجھے مشکل پڑ جاتی۔ میں فلیٹ بک کرانے سے پہلے کم سے کم اس سے بات کر لینا چاہتا تھا۔ اتفاق سے فرقان بھی شاہ فیصل میں ہی رہتا تھا۔ جمعے کے دن مجھے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ جمعے کی نماز کی تیاری کر رہا تھا۔ "خیریت یہ آج کیسے چھاپہ مار دیا؟"

"یار کام تھا میں تجھ سے پوچھنے آیا ہوں کہ تیری شام کے وقت میڈیکل اسٹور پر پارٹ ٹائم جاب والی آفر برقرار ہے؟"

وہ ہنسا۔ "اتنا لمبا سوال تو مختصر بھی کہہ سکتا تھا کہ میری آفر برقرار ہے۔ ہاں بھائی برقرار ہے۔ کیا تیرا ارادہ بن گیا ہے؟"

میں نے اسے فلیٹ کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ دیکھ عرفان ابھی میٹرک کر رہا ہے۔ چار سال بعد وہ گریجویشن کر کے میڈیکل اسٹور پر بیٹھنے کے قابل ہوگا تب تک تو میرے ساتھ کام کر سکتا ہے۔"

"فرقان تو مجھے کیا دے گا؟" میں نے ہچکچا کر پوچھا۔

"جو آخری لڑکا میں نے رکھا تھا وہ شام چار سے رات

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

وزن: مفعول فاع لات، مفاعیل فاع لن
بحر: مضارع مثمن اخرب کمفوف محذوف

اس شعر میں دو ابہام ہیں۔ ایک تو یہ کہ کس کا رنگ شکستہ ہے؟ اور دوسرا یہ کہ صبح بہار نظارہ سے کیا مراد ہے؟ حسرت نے بہار نظارہ کو وصل کے معنی میں لے کر ایک نیا پہلو پیدا کیا ہے اور شعر کا مفہوم تقریباً وہی بیان کیا ہے جو فراق کے مشہور شعر کا ہے۔

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

زیادہ تر شارحین نے رنگ شکستہ سے عاشق کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ مراد لے کر شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ نظارہ کی بہار کا آغاز (صبح) عاشق کے پریدہ رنگ سے ہوتا ہے کیونکہ محبوب کے سامنے آ کر عاشق کا رنگ و نور شوق و اضطراب سے فق ہو جاتا ہے۔ جس طرح صبح کو چمن میں پھول کھلتے ہیں، اسی طرح اڑا ہوا رنگ (سفید) رنگ بہار نظارہ کی صبح (یعنی آغاز) ہے اور گل ہائے ناز کے کھلنے سے عبارت ہے۔ میرے خیال میں اس شعر کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ محبوب کا رنگ رخ شکستہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اب بہار نظارہ آغاز ہونے والی ہے اور محبوب گل ہائے ناز کھلانے پر آمادہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں، محبوب کا رنگ شکستہ ہے، اس وجہ سے کہ اسے خود عشق کا آزار لگ گیا ہے۔ خود عشق میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے اب وہ عاشق پر نظر کرم رکھے گا اور گل ہائے ناز کو شگفتہ کرے گا۔ معشوق کا خود عاشق بن جانا غالب کے لیے نیا خیال نہیں۔

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

اقتباس: تفہیم غالب از شمس الرحمن فاروقی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیارہ بجے تک میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں اسے پندرہ سو دے رہا تھا۔"

"میں چار بجے سے نہیں آسکتا چھ بجے سے آسکتا ہوں اور رات بارہ بجے تک بیٹھ سکتا ہوں۔ جمعے کے بعد تو جب کھولے گا میں تب آجاؤں گا۔"

فرقان نے سوچا اور پھر بولا۔ "ٹھیک ہے میں تجھے بھی پندرہ سو دوں گا۔ لیکن تجھے بارہ بجے تک بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے تو گیارہ بجے جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر رش نہ ہو تو اس سے پہلے بھی جاسکتا ہے۔"

میں خوش ہوگیا تھا۔ فرقان نے صحیح معنوں میں دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ میں اور شائستہ اسی شام فلیٹ کی سائٹ پر گئے۔ اس زمانے میں یہ سڑک ویران ہوتی تھی اور اس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ جس جگہ فلیٹ بننے تھے وہاں دور دور تک سوائے میدان کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن کھدائی کا کام شروع کر دیا گیا تھا اور ایک بڑا خوب صورت سا بکنگ آفس بھی بنا دیا تھا۔ یہ بڑا کمپلیکس تھا جس میں دس بلڈنگز تھیں اور ہر بلڈنگ میں پچاس فلیٹ تھے۔ بلڈنگز کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ دیا ہوا تھا۔ کمپلیکس کے وسط میں ایک پارک تھا اور عمارتوں کے درمیان میں پارکنگ کی جگہ بھی دی ہوئی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ بلڈر نے دس سال تک فلیٹوں کی مینٹیننس اپنے پاس رکھی تھی اور اس کی ماہانہ فیس اس وقت پچاس روپے تھی۔

شائستہ اور میں نے کوشش کر کے ایک چار کمروں کا ویسٹ اوپن فلیٹ جس میں دو اٹیچ باتھ تھے اور ایک کامن باتھ تھا نوے ہزار میں بک کرا لیا۔ یہ دوسری منزل پر تھا اور اس کا رقبہ گیارہ سو اسکوائر فٹ تھا۔ بڑا ڈرائنگ روم تھا اور لاؤنج بھی اچھا خاصا بڑا تھا۔ اس زمانے میں سادہ کچن ہوتے تھے لیکن بلڈر امریکن کچن بنا کر دے رہا تھا۔ پورا فلیٹ ماربل تھا اور باتھ روم ٹائلڈ تھے۔ شائستہ بہت خوش تھی۔ چار سال میں نوّے ہزار روپے ہمیں تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے ادا کرنے تھے۔ پندرہ سو مجھے فرقان دیتا اور باقی رقم کے لیے شائستہ نے کہا کہ وہ کڑھائی کر کے پورے کر لے گی۔ ہم نے بلڈر سے طے کیا تھا کہ ہم دو ہزار روپے ماہانہ دیں گے اس کے علاوہ کوئی اور رقم نہیں دیں گے۔ اس طرح کل رقم پینتالیس مہینوں میں پوری ہو جاتی اسے اور کیا چاہیے تھا اس لیے وہ مان گیا۔ قبضہ تین سال میں ملنا تھا۔

میں دفتر سے آتا اور بس منہ ہاتھ دھو کر ایک کپ چائے پیتا اور فرقان کے میڈیکل اسٹور پر چلا جاتا تھا۔ وہاں سے میری واپسی عام طور سے گیارہ بجے کے بعد ہوتی تھی۔ فرقان خوش تھا وہ ملازموں کی ہاتھ صفائیوں سے بچ گیا تھا اور مجھے یہ آسانی تھی کہ کبھی کسی دوا کی ضرورت ہوتی تو فرقان عام طور سے ایسے ہی دے دیتا تھا یا اگر مہنگی ہوتی تو صرف خرید کی ہوئی رقم لیتا تھا۔ گھر آتے آتے میں اتنا تھک جاتا تھا کہ کھانا کھا کر بستر پر لیٹتا تو اگلے دن ہی آنکھ کھلتی تھی۔ دوسری طرف شائستہ بے چاری صبح سے شام تک گھر دیکھتی، بچوں کو سنبھالتی، کھانا بناتی اور ساتھ میں کڑھائی بھی کرتی تھی۔ یہ ہاتھ کی کڑھائی تھی جو خاصی مشکل ہوتی ہے۔ میں تو بارہ بجے سو جاتا تھا وہ اس کے بعد بھی جاگ کر کڑھائی کرتی رہتی تھی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ پانچ سو روپے سے زیادہ کمانے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ جب ہمارا فلیٹ ملے تو اسے نئے فرنیچر اور سامان سے آراستہ کرے۔ اضافی رقم سے وہ کمیٹی ڈال لیتی تھی۔

ان دنوں زندگی ایک گھن چکر بن گئی تھی۔ صبح شام کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ عزیزوں رشتے داروں سے ملے ہوئے برسوں ہو گئے تھے۔ وہی ملنے آتے تھے تو ملاقات ہو جاتی تھی۔ سارے ہفتے میں بس جمعے کا آدھا دن ملتا تھا۔ شام کو میں میڈیکل اسٹور جاتا تھا۔ اشد ضرورت کے سوا چھٹی نہیں کرتا تھا۔ فرقان میری محنت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ایک سال بعد خود سے مجھے دو ہزار دینا شروع کر دیے۔ ان ہی دنوں ہمارے ہاں بیٹی ہوئی تھی۔ مجھے اور شائستہ دونوں کو بیٹی کی بہت خواہش تھی۔ ہمیں مشکل پیش آئی۔ شائستہ کو کام بھی چھوڑنا پڑا لیکن اللہ کے کرم سے یہ مشکل وقت بھی گزر گیا۔ سال کے سال تنخواہ بڑھتی تھی مگر مہنگائی اس سے زیادہ بڑھ جاتی تھی لیکن گزارا پھر بھی ہو رہا تھا۔

شروع میں ہم تقریباً ہر مہینے ہی زیرِ تعمیر فلیٹ دیکھنے جاتے تھے اور ابتدا میں اس کی تعمیر کا کام بھی بڑی تیزی سے ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے پہلی اور دوسری منزل کا اسٹرکچر بھی تیار ہو گیا تھا اور رفتار دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہوئی کہ تین سال سے پہلے نہیں تو تین سال میں یہ کام مکمل ہو جائے گا اور ہمیں اپنا گھر مل جائے گا۔ اس کے بعد ذرا سستی آگئی اور ہم کئی مہینے بعد چکر لگانے لگے۔ دو سال بعد ہم نے خاصے عرصے بعد ایک چکر لگایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابھی فلیٹ صرف تین منزل تک بنا ہے اور آخری دو منزلوں کی تعمیر کا کام رکا ہوا تھا۔ بکنگ مکمل ہوتے ہی وہاں سے سائٹ آفس ختم کر دیا گیا تھا۔ اس لیے بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ تعمیر کا کام کیوں سست روی کا شکار ہے۔

شائستہ پریشان ہوگئی۔ "عظیم ہم پیسے بھر رہے ہیں اور کچھ کر ہی نہیں رہے ہیں۔ اس طرح تو فلیٹ پانچ سال میں بھی مکمل نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "کسی دن ان کے ہیڈ آفس جا کر پوچھتے ہیں۔"

دو دن بعد میں نے دفتر سے چھٹی کی اور شائستہ کے ہمراہ بلڈر کے ہیڈ آفس پہنچا۔ وہاں جا کر ہمیں کچھ اس قسم کی کہانیاں سننے کو ملیں کہ بہت سارے لوگ جنہوں نے فلیٹ بک کرائے تھے وہ اب واجبات ادا نہیں کر رہے ہیں اور اس وجہ سے تعمیر کا کام رکا ہوا ہے۔ شائستہ نے کہا۔

"تو آپ ان کی بکنگ منسوخ کریں اور فلیٹ کسی دوسرے کو دے دیں۔"

"ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" بلڈر کے منیجر نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس صورت میں ہم مزید رقم اس وقت تک ادا نہیں کریں گے جب تک فلیٹ کی تعمیر دوبارہ شروع ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔"

"تب آپ کی بکنگ منسوخ کی جاسکتی ہے۔" منیجر نے دھمکی دی۔

"خوب جن لوگوں کی وجہ سے تعمیر کا کام رکا ہے ان کی بکنگ تو منسوخ کی نہیں جا رہی اور جو باقاعدگی سے قسط ادا کر رہے ہیں اپنا پیٹ کاٹ کر ان کو بکنگ منسوخ کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے۔"

شائستہ کو غصہ آتا تھا تو وہ کسی کو نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے دفتر میں خاصا ہنگامہ کیا تھا۔ میں اسے روکتا رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا اس ہنگامے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ البتہ میں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ اب اس وقت تک ان لوگوں کو مزید کوئی رقم نہیں دینی ہے جب تک تعمیر کا کام دوبارہ شروع نہیں ہو جاتا۔ میں نے کوشش کی اور کئی ایسے لوگوں کا پتا چلا لیا جن کے اس پروجیکٹ میں فلیٹ تھے اور وہ بھی پریشان تھے۔ ہم نے مل کر کے ڈی اے اور کے سی بی اے میں جا کر شکایت کی کہ ہم سے رقم لی جا رہی ہے اور جواب میں پروجیکٹ کی تعمیر رکی ہے۔ بہرحال یہ ایک طویل کہانی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ تین یا چار سال بعد نہیں بلکہ چھ سال بعد ہمیں فلیٹ جیسے تیسے تعمیر کر کے حوالے کر دیے گئے۔ تعمیراتی کام اتنا ناقص تھا کہ آغاز میں ہی خرابیاں سامنے آنے لگیں اور انہیں کوئی ٹھیک کرنے والا نہیں تھا۔

بلڈر اپنے وعدے سے بھی پھر گیا کہ دس سال تک مینٹیننس کا کام وہ کرے گا۔ دو سال بعد اس نے اس کام سے ہاتھ اُٹھا لیا اور مکینوں سے کہہ دیا کہ وہ خود یونین بنا کر انتظام چلائیں۔ اس وقت فلیٹوں میں یونین کا چکر اتنا خطرناک نہیں ہوتا تھا جیسا کہ آج کل ہے اور لوگ اس سے عاجز آئے ہوئے ہیں۔ ایک کمیٹی بنائی گئی اور جیسے تیسے انتظام چلنے لگا۔ ہماری نئے اور اپنے فلیٹ میں آنے کی خوشی ان مسائل نے غارت کر دی تھی۔ شائستہ نے بہت چاؤ سے نیا فرنیچر اور دوسرا سامان لیا تھا۔ مگر ہم پانی بجلی اور مرمت کے مسائل سے دوچار تھے۔ آئے دن فلیٹ میں کوئی نہ کوئی چیز خراب ہو جاتی تھی اور اس کی مرمت کرانی پڑتی تھی یا تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ خاص طور سے بجلی اور پانی کی ساری فٹنگ ہمارے آنے کے ایک سال کے اندر بدل گئی۔ اسی طرح باتھ روم کی سیوریج خراب تھی اسے ٹھیک کرانا پڑا اور ان سارے کاموں میں خاصا خرچ ہو گیا تھا۔

ایک سال بعد مسائل میں کچھ کمی آئی تھی یا ہم ان کے عادی ہو گئے تھے۔ اس دوران میں فلیٹس پوری طرح آباد ہو گئے تھے۔ باہر مارکیٹ بھی کھل گئی تھی اور ضروریات کی چیزیں وہیں سے ملنے لگی تھیں۔ کمیٹی بننے سے کچھ مسئلے بھی حل ہونے لگے تھے۔ اصل میں لوگ مینٹیننس کی رقم بھی ادا نہیں کرتے تھے اور اس کا خمیازہ دوسرے لوگوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔ پانی کم ملتا تھا کیونکہ موٹر خراب ہو جاتی تو کئی کئی دن اس کی مرمت نہیں ہو پاتی تھی۔ اکثر بیرونی بلب فیوز ہو جاتے تھے اور ان کا متبادل نہیں تھا۔ کمیٹی کے پاس اس کے لیے رقم ہی نہیں ہوتی تھی۔ سب شریف لوگ تھے جو ناد ہندہ سے رقم مانگ سکتے تھے اس سے لڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ تو بعد میں یونین یا کمیٹی کا معاملہ بدمعاشوں کے ہاتھ میں آیا اور سہولیات کی فراہمی جوں کی توں رہی یا پہلے سے بھی ابتر ہو گئی لیکن اب کسی کی مجال نہیں ہے کہ مینٹیننس کی رقم دینے سے انکار کرے۔

جب بلڈر نے مینٹیننس سے ہاتھ اُٹھا لیا اور ہم اپنے مسائل خود حل کرنے لگے تھے ان ہی دنوں ہماری والی بلڈنگ میں ایک فیملی آئی۔ دبلے سے صاحب خانہ تھے۔ میرے ہم نام ہی تھے یعنی عظیم الدین کہلاتے تھے لیکن عرف عام میں عزمی میاں پکارے جاتے تھے۔ ان کے چار لڑکے تھے جو اس وقت پانچ سے دس سال کے درمیان تھے۔ باپ کے برعکس لڑکے بچپن سے ہی خاصے صحت مند تھے۔ عزمی میاں ٹھیکیداری کرتے تھے۔ مگر یہ ان کا کہنا تھا کیونکہ اکثر وہ گھر میں یا فلیٹوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ایک مہینے کے اندر انہوں نے ان فلیٹوں میں آباد اکثر لوگوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی اور تقریباً سب ہی انہیں اچھا آدمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قرار دیتے تھے کیونکہ وہ کسی کی بُرائی میں نہیں پڑتے تھے اور اگر کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی تو ممکن حد تک اس کے کام آتے تھے لیکن یہ کام آنا اکثر زبانی یا جسمانی ہوتا تھا مالی لحاظ سے وہ خود بہت کمزور تھے۔ اکثر پُرانے کپڑوں میں نظر آتے تھے۔ یہی حال ان کے بچوں کا بھی تھا۔ اس لیے مالی مدد کی کوئی توقع بھی نہیں کرتا تھا۔

مگر دوسروں کے کام آنے کے باوجود وہ اپنے ایک الگ تیور رکھتے تھے اور کوئی انہیں ہلکا سمجھنے کی غلطی نہیں کرتا تھا۔ ایک دو لوگوں نے ایسا سمجھتے ہوئے ان سے ذرا کم تر درجے کا سلوک کیا تو انہوں نے موقع پاتے ہی ان کا ایسا دماغ درست کیا کہ پھر کسی نے ایسی جرأت نہیں کی۔ وہ رکھ رکھاؤ پورا کرتے تھے۔ دوسروں کی مدد کرتے تھے لیکن اپنے معاملے میں کسی سے مدد نہیں لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے مزاج کو سب سمجھنے لگے تھے۔ اپنی نیکی شخصیت سے قطع نظر وہ سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔ بزرگوں کی عزت کرتے تھے، بچوں سے پیار سے ملتے اور خواتین کا پورا احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی وہ خواتین میں بہت مقبول تھے۔

ہمارے فلور پر سیڑھیوں پر جلنے والا بلب کئی دن سے فیوز تھا اور کئی بار کمیٹی والوں سے کہنے کے باوجود تبدیل نہیں ہوا تھا۔ میں نے دفتر میں جا کر شکایت کی تو جواب ملا کہ پورے کمپلیکس میں گئی سو بلب فیوز ہیں جب فنڈز ہوں گے تو انہیں ایک ساتھ تبدیل کر دیا جائے گا۔ سب جانتے تھے کہ نہ فنڈز ہوں گے اور نہ بلب تبدیل ہوں گے۔ یعنی نو من تیل ہو گا اور نہ رادھا ناچے گی۔ رات کے وقت سیڑھیاں چڑھتے اُترتے کوئی نہ کوئی گرتا تھا۔ ہمارے برابر والے فلیٹ میں ایک بزرگ رہتے تھے وہ عشاء کی نماز پڑھ کر آ رہے تھے کہ سیڑھی سے پاؤں پھسلا اور وہ بے چارے گھٹنے کی ہڈی تڑوا بیٹھے۔ اس حادثے کے بعد سارے بلڈنگ والے غصے میں آ گئے تھے۔ سب مل کر کمیٹی کے دفتر گئے وہاں خاصا ہنگامہ ہوا لیکن پرنالا وہیں بہتا رہا کہ جب فنڈز ہوں گے تو سب فیوز بلب ایک ساتھ بدلے جائیں گے۔ جب ہم لڑ جھگڑ کر واپس آ رہے تھے تو دیکھا کہ عزمی میاں سیڑھیوں پر نیا بلب لگا رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔

"لو میاں اتنی سی بات تھی۔ سوا دو روپے کا بلب ہے اس کے لیے اتنا لمبا چوڑا جھگڑا کرنے یا اپنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عزمی بھائی۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر یہ کمیٹی کس مرض کی دوا ہے؟"

"میاں کمیٹی ہر مسئلے کو حل نہیں کر سکتی ہے، کبھی آدمی کو خود بھی کوشش کرنی چاہیے۔" وہ بولے اور چلے گئے میں نے محسوس کیا کہ باقی سب شرمندہ سے تھے۔ اس کے بعد اکثر ایسا ہونے لگا کہ ہماری بلڈنگ میں کوئی مسئلہ ہوتا تو عزمی میاں خود اسے حل کرتے دکھائی دیتے۔ کبھی کہیں سیمنٹ اور پلاسٹر کا کام کر رہے ہیں۔ کبھی بجلی کی تاروں یا بٹنوں کو ٹھیک کر رہے ہیں۔ ساری بلڈنگ کی باہری سیوریج کی لائنیں انہوں نے خود سے بغیر کسی کے کہے یا کوئی رقم مانگے اپنے خرچے سے ٹھیک کر دیں۔ اگر کوئی بلب فیوز ہو جاتا تو وہ چند دن انتظار کر کے خود لا کر لگا دیتے تھے اور پانی کی کوئی لائن لیک کرنے لگتی تو اسے بھی ٹھیک کر دیتے تھے۔ کسی سے شکایت بھی نہیں کرتے تھے۔ خواتین کے بہت سارے کام کر دیا کرتے تھے جو مرد گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کر پاتے تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہر طرف عزمی میاں کی واہ واہ ہونے لگی تھی۔ شائستہ بھی ان کی تعریف کرتی تھی۔ "اتنے اچھے ہیں کہ کسی کام سے منع نہیں کرتے اور اتنے کام آنے پر مجال ہے جو ذرا بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کریں۔ دروازے پر بھی آتے ہیں تو ایک طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ سامنے جاؤ تو نظریں نیچی کر کے بات کرتے ہیں۔"

شائستہ درست کہہ رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں شروع دن سے عزمی میاں میرے دل کو کھٹکتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ ان کی شخصیت میں کوئی چکر ہے، وہ ویسے نہیں جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر دل کی یہ کھٹک میں نے خود تک محدود رکھی تھی کیونکہ اگر میں کسی سے کہتا شائستہ سے بھی کہتا تو وہ کبھی نہ مانتی۔ پھر مجھے یا کسی کو ان سے نقصان نہیں ہوا تھا، ابھی تک فائدے ہی پہنچے تھے اس لیے کہنا بیکار ہی تھا۔ عزمی میاں کو یہاں آئے ایک سال ہونے کا آیا تھا اس دوران میں فلیٹوں کی حالت بد انتظامی کی وجہ سے خراب ہونے لگی تھی۔ دیکھ بھال ہو نہیں رہی تھی اور جو چیز خراب ہو جاتی اس کی بس کام چلاؤ مرمت ہوتی تھی اس لیے صرف تین سال میں فلیٹ ایسے لگنے لگے جیسے دس بارہ سال پُرانے ہوں۔

مگر ظاہری حالت سے زیادہ تکلیف دے دوسرے مسائل تھے جو روز بہ روز بڑھتے جا رہے تھے۔ صفائی کا انتظام ناقص تھا اور جا بہ جا کچرے کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ پانی کا مسئلہ الگ تھا۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن پانی اوپر ٹنکیوں میں چڑھایا جاتا تھا جس کے پاس فلیٹ میں ٹنکی تھی وہ اسے بھر لیتا اور اس کے بعد بے تحاشہ پانی بہاتا۔ جہاں ایک بالٹی سے کام چل سکتا تھا وہاں چار بالٹی بہاتا۔ پانی چڑھانے کے چند گھنٹوں

جب ہر طرف جل تھل نظر آتا تھا اور اس کے بعد جب پانی ختم ہو جاتا تو یہ قول عزمی میاں کے ہر طرف تھر تھر نظر آتا تھا۔ جو بے چارے ٹنکی سے محروم تھے وہ مشکل میں پڑ جاتے۔ سیوریج لائنیں اوور لوڈ ہونے سے لیک کرنے لگتیں اور اس کی سیم سے عمارتوں کی حالت بھی خراب ہونے لگی تھی۔ کمیٹی والے کچھ نہیں کرتے تھے یا کر نہیں سکتے تھے۔ ایک دن میں دفتر سے آیا تو شائستہ پریشان بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا۔ "آج پانی آنا تھا لیکن نہیں آیا ہماری بلڈنگ کی موٹر خراب ہو گئی ہے، اب پرسوں آئے گا اور تب تک کیسے گزارا ہو گا۔"

"مجھے کیا پتا؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "تمہیں ہی فلیٹ میں آ کر رہنے کا شوق ہوا تھا اب بھگتو۔"

"ہاں.... ہاں ہم عورتیں ہی بھگتیں گی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے اب ہماری بلڈنگ کی کمیٹی الگ ہو گی اور اس کے صدر عزمی بھائی ہوں گے۔"

میں حیران ہوا۔ "تم عورتوں نے فیصلہ بھی کر لیا اپنے مردوں سے پوچھے بغیر....؟"

"ہاں کیونکہ ہر گھر میں آپ جیسے مرد پائے جاتے ہیں جو گھر کے مسئلوں کو عورتوں کی ذمے داری سمجھتے ہیں اس لیے فیصلہ بھی ہمیں کرنا ہے۔ آج شام کو ہم نے جا کر کمیٹی کے دفتر میں بتا دیا ہے۔"

"عزمی بھائی مان گئے؟"

"بہت مشکل سے مانے۔ ہم پہلے ان کے پاس ہی گئے تھے۔"

"دیکھ لو بعد میں کوئی اور مشکل گلے نہ پڑ جائے۔"

"کچھ نہیں ہو گا اب دیکھیے گا نظام کتنا اچھا چلے گا۔" شائستہ نے کہا۔ "اور ہاں اس بار سے مینٹیننس کی رقم سو روپے ہو گی۔"

آج سے کوئی ستائیس سال پہلے سو روپے خاصی بڑی رقم ہوتی تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان فلیٹوں کا کرایہ پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ "یہ تو خاصی بڑی رقم ہے؟"

"ہاں تو کام بھی تو آئے گی۔" شائستہ نے اطمینان سے کہا۔ "عزمی بھائی کہہ رہے تھے کہ کم سے کم اتنی رقم سے کام چلے گا۔"

ہماری بلڈنگ میں کل پچاس فلیٹ تھے اور ان میں سے پانچ چھ خالی تھے گویا کل ساڑھے چار ہزار کی رقم جمع ہوتی۔ میرا خیال تھا کہ اتنی رقم سے عزمی میاں کیا کر سکیں گے۔ بہر حال یہ ساری بلڈنگ والوں کا فیصلہ تھا اس لیے مجھے بھی ماننا پڑا۔ اس وقت مجھے خوش گوار حیرت ہوئی جب پہلے ہی دن بلڈنگ کی پارکنگ میں لگے تمام بلب جل رہے تھے جبکہ باقی بلڈنگز کی پارکنگ میں اکا دکا بلب جل رہے تھے۔ پھر سیڑھیاں اور تمام راہداریاں بالکل صاف ستھری تھیں۔ اس روز پانی بھی آیا تھا۔ پتا چلا کہ عزمی میاں نے صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے ایک آدمی رکھ لیا ہے۔ قادر بخش اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ عمارت میں صفائی بھی کرے گا گھروں سے کچرا بھی اُٹھائے گا اور روز موٹر چلا کر پانی کھولنے کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ قادر بخش کہیں دور دراز علاقے سے آیا تھا اور اسے موٹر والی کوٹھری میں رہنے کی جگہ دے دی گئی تھی اس کے لیے تین وقت کا کھانا عزمی میاں کے گھر سے آ جاتا تھا۔ دیکھنے میں اور باتوں سے تھوڑا سا ایب نارمل لگتا تھا لیکن اپنے کام میں مستعد تھا۔ اس کی وجہ سے چند دن میں گندگی کا ڈھیر نظر آنے والی بلڈنگ جگمگانے لگی تھی۔ عزمی میاں نے اسے صفائی کا تمام سامان لا دیا تھا۔ مرمت کا کام وہ خود کر لیتے تھے۔

دوسری عمارتوں والے ہم پر رشک کرنے لگے تھے اور خود میرا خیال بدل گیا تھا۔ پہلے مجھے سو روپے ہر مہینے دینا بھاری لگ رہا تھا۔ لیکن جب اس کے فوائد دیکھے تو یہ سو روپے کم لگنے لگے۔ پانی روز ملنے لگا تھا اور جن کے پاس ٹنکیاں نہیں تھیں وہ بہت خوش تھے اس طرح ان کا گزارا چل جاتا تھا۔ پانی کی آمد کے وقت عزمی میاں پوری بلڈنگ کا خود گشت کرتے تھے اور اگر کوئی بے جا پانی بہا رہا ہوتا تھا تو اسے خبردار بھی کرتے تھے۔ ان کی سخت گرفت کی وجہ سے لوگ بھی محتاط ہو گئے تھے۔ پہلے بلا تکلف راہداریوں میں کچرا پھینک دیتے تھے اب اگر کوئی کچرا پھینکتا تو اسی سے صفائی کرائی جاتی تھی۔ عزمی میاں نے خبردار کر دیا تھا کہ اب کچرا پھینکنے والے پر جرمانہ ہو گا تو اسے مہینے کے مہینے ادا کرنا ہو گا۔ اسی طرح سیڑھیوں اور راہداریوں میں پان کی پیک یا سگریٹ کے ٹکڑے پھینکنا بھی ممنوع ہو گیا تھا۔ قادر بخش ہمہ وقت عمارت میں گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس لیے غلط حرکت کرنے والا فوراً نظر میں آ جاتا تھا۔

چند مہینے بعد عزمی میاں نے تمام فلیٹ والوں کو جمع کیا اور سیوریج لائن بدلنے کا منصوبہ مع اخراجات کے پیش کیا۔ انہوں نے کہا۔ "بلڈر کی ڈالی لائن کیسی ہے یہ آپ سب جانتے ہیں اور اس نے فلیٹوں کا کیا حشر کیا ہے اس سے بھی آپ بے خبر نہیں ہے۔ اب پانچ ہزار کے خرچ سے پوری عمارت کی سیوریج لائن بدل جائے گی اور یہ مسئلہ دس بارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال کے لیے حل ہو جائے گا۔ ایک بار سیم ختم ہو گی تو مرمت اور رنگ کا کام بھی ہو جائے گا لیکن ابھی یہ کام کرنا ہے۔"

پانچ ہزار کا مطلب تھا کہ سب کے حصے میں سو روپے سے زیادہ رقم آتی۔ بعض غریب یہ بھی افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے عزمی میاں نے یہ فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ کتنا دیتے ہیں فی فلیٹ کم سے کم بھی پچاس روپے دینا لازمی تھا۔ انہوں نے اس طرح بات کی اور اس کے فوائد سمجھائے کہ تقریباً سب ہی مان گئے تھے۔ جو ذرا صاحب حیثیت تھے انہوں نے زیادہ رقم دینے کی ہامی بھر لی۔ میں نے ڈیڑھ سو روپے دینے کو کہا۔ عزمی میاں نے اسی وقت رقم جمع کرنا شروع کر دی کہ سامان کی خریداری کا آغاز تو کیا جائے۔ اگلے دن پائپ اور دوسرا سامان آ گیا۔ اس کے بعد عزمی میاں نے باقی رہ جانے والوں سے بھی رقم وصول کر لی۔ یہ ان کا طریقہ کار تھا رقم وصول کرنے کا۔ کوئی ایک بھی دیتا تو مثال بن جاتی اور باقی سب کو رقم ادا ہی کرنی پڑتی تھی۔

چھٹی والے دن انہوں نے مزدور اور مستری بلوایا اور ایک سیوریج لائن بدل دی۔ اس دوران میں ان فلیٹوں کے مکینوں کو پانی بہانے سے منع کر دیا تھا ورنہ کام خراب ہو جاتا۔ ہر لائن پر فلور کے دو فلیٹ تھے اس طرح پانچ لائنیں بنتی تھیں جو پانچ ہفتوں میں بدل گئیں اور عزمی میاں کے مطابق تخمینے میں تبدیلی آئی تھی۔ دو ہزار مزید خرچ ہو گئے تھے جو فلیٹ والوں پر بانٹے گئے اور انہوں نے مہینے کے ساتھ ادا کیے۔ بہرحال اس سے یہ ہوا کہ فلیٹ میں جو ہمہ وقت سیلن اور بدبو رہتی تھی اس سے نجات مل گئی۔ دیواریں صاف ہو گئیں۔

چند مہینے بعد عزمی میاں نے دوسرا منصوبہ پیش کیا کہ جہاں جہاں سے عمارت کا پلاستر خراب ہوا تھا اسے ٹھیک کر کے پوری عمارت اور اندرونی راہداریوں میں نیا رنگ کرایا جائے۔ انہوں نے پلاسٹک پینٹ کی تجویز دی جو مہنگا تھا لیکن اس سے چار پانچ سال کے لیے رنگ کی چھٹی ہو جاتی اور اگر دیوار خراب ہوتی تو اسے صاف کرنا بھی آسان ہوتا۔ اس پر خرچ بیس ہزار آ رہا تھا گویا فی فلیٹ چار سو روپے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی اس لیے شروع میں تو سب ہی اس کے مخالف ہو گئے۔ لیکن عزمی میاں مستقل مزاجی سے پیچھے لگے رہے دلائل کی ان کے پاس کمی نہیں تھی۔

"یار چار سو کتنی رقم ہوتی ہے اس سے زیادہ تو آج کل ایک کمرا پینٹ کرنے میں خرچ آتا ہے۔"

"سب کا فائدہ ہو گا۔ جو فلیٹ آج لاکھ کا ہے پینٹ ہوتے ہی وہ سوا لاکھ کا ہو جائے گا۔ گویا چار سو خرچ کر کے پچیس ہزار کا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔"

"جس فلیٹ کا کرایہ ابھی پانچ چھ سو لے رہے ہو صاف ستھرے ہو کر یہی سات آٹھ سو کرائے میں جائیں گے۔ ساری کسر دو تین مہینے میں نکل جائے گی۔"

"ماحول صاف ستھرا ہو گا اور قیمت بڑھے گی تو اچھے لوگ یہاں رہنے آئیں گے اور نچلے طبقے کے خود نکل جائیں گے۔"

"بچوں کو اچھا اور صاف ماحول ملے گا۔"

ان کے دلائل ایسے نہیں تھے جو لوگوں پر اثر نہ کرتے۔ وہ انفرادی طور پر ایک ایک شخص پر کام کر رہے تھے۔ ہر ہفتے ہونے والی میٹنگ میں وہ اپنی تجویز دُہراتے اور ہمیشہ انہیں پہلے سے زیادہ حمایت مل جاتی۔ بالآخر چند ہفتوں بعد ان کی تجویز اکثریت رائے سے منظور کر لی گئی اور فوراً ہی اس کے لیے رقم اکٹھا کی جانے لگی۔ اس معاملے میں عزمی میاں نہایت پھرتیلے تھے جیسے ہی لوگوں کے منہ سے ہاں نکلتی وہ رقم وصول کرنے کے چکر میں لگ جاتے۔ اب تک انہوں نے رقم لی تھی تو کام بھی کیا تھا اس لیے کسی کو دیتے ہوئے کھٹک بھی نہیں ہوتی تھی۔ بس مجبوری مارتی تھی۔ اپنا پیٹ اور خواہشیں مار کر ہی رقم نکالنی پڑتی تھی۔ اس بار بھی عزمی میاں نے نہایت تیزی سے کام شروع کرایا۔ انہوں نے کاریگر بلوائے پہلے پوری عمارت کا پلاستر ٹھیک کرایا اور پھر رنگ کا کام شروع ہوا۔ انہوں نے رنگ براہِ راست فیکٹری سے حاصل کیا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ عمارت کے ایک ایسے حصے پر جو باہر سڑک سے اور خاصی دور سے نظر آتا تھا پینٹ بنانے والی کمپنی کا اشتہار پینٹ کیا گیا تھا اور اس وقت کیونکہ اس چیز کا رواج نہیں تھا اس لیے یہ بھی خوبصورت لگا تھا۔ پلاستر اور رنگ و روغن کے بعد سچ مچ ہماری بلڈنگ کی شکل ایسی ہو گئی جیسے ابھی ابھی بنی ہو۔ پینٹ بھی خوب صورت اور الگ سے نظر آتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ عزمی میاں نے اس کام میں خاصا کچھ بچا لیا تھا انہوں نے جو اشتہار پینٹ کرایا تھا اس کے بھی خاصے پیسے وصول کیے ہوں گے لیکن جب اگلی میٹنگ ہوئی تو انہوں نے انکشاف کیا کہ پانچ ہزار روپے اوپر سے خرچ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے صرف انکشاف ہی نہیں کیا بلکہ پورا بل بنا کر سب کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں سیمنٹ، بجری، رنگ اور دوسری چیزوں کی قیمت کے ساتھ مزدوری بھی شامل تھی۔ ٹھیکیداری انہوں نے خود کی تھی۔ "اس کے سمجھ لو پانچ ہزار بچا لیے ورنہ دس ہزار اوپر سے لگ جاتے۔"

"آپ نے تو کہا تھا کہ بیس ہزار میں کام ہو جائے گا۔" ایک صاحب نے احتجاج کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ صرف اندازہ لگایا تھا، میں نے بھی کبھی اس طرح کا کام نہیں کیا ہے اس لیے اندازہ غلط ہو گیا۔" انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اس کے باوجود آپ نقصان میں نہیں رہیں گے مجھے معلوم ہے آپ اپنا فلیٹ پہلے ایک لاکھ بیس ہزار میں بیچ رہے تھے اور رنگ ہوتے ہی آپ نے قیمت بڑھا کر ایک لاکھ تیس ہزار کر دی ہے۔"

یہ بات سچ تھی اس لیے وہ صاحب کھسیا کر رہ گئے۔ سب کو ملا کر مزید پانچ ہزار دینا ہی پڑے تھے۔ میں نے گھر آ کر شائستہ سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولی۔ "آپ لوگ بس یہی دیکھ رہے ہیں کہ اتنی رقم جا رہی ہے یہ نہیں دیکھ رہے کہ اس سے فائدے کتنے ہو رہے ہیں۔ پانی باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ عزمی بھائی ہر ہفتے اوپر اور نیچے کا پورا ٹینک صاف کراتے ہیں۔ پہلے بدبو والا پانی آتا تھا اب صاف ستھرا پانی آتا ہے۔ پھر ہر روز آتا ہے۔ راستے اور سیڑھیاں صاف ستھری ہو گئی ہیں۔ رات کو ہر جگہ روشنی ہوتی ہے چھت پر بھی لائٹس لگا دی ہیں، پہلے عورتیں لڑکیاں شام کے بعد باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھیں اب مزے سے چلی جاتی ہیں۔ شام کے وقت لڑکوں اور مردوں کا چھت پر جانا منع ہے صرف عورتیں جا سکتی ہیں۔ ہم تو مزے سے چائے اور کھانے پینے کا سامان بھی اوپر لے جاتے ہیں، ایک ڈیڑھ گھنٹا کھلی ہوا میں مزے کرتے ہیں۔"

عزمی میاں نے چالاکی سے عورتوں کے مفاد کا پورا خیال رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ ہر گھر میں مردوں کو عزمی میاں کے خلاف بات کرنے سے پہلے ہی بہت کچھ سننے کو مل جاتی تھیں۔ کبھی آپس میں ملاقات ہوتی تو دل کی بات کر لیتے تھے۔ بلکہ مردوں میں بھی اکثر عزمی میاں سے بہت خوش تھے کیونکہ انہیں گھر آتے ہی بیویوں سے مسئلے مسائل نہیں سننے پڑتے تھے۔ سب سے بڑھ کر کسی بھی کام کے لیے کمیٹی کے دفتر نہیں بھاگنا پڑتا تھا بلکہ اکثر تو عزمی میاں سے بھی نہیں کہنا پڑتا تھا اس سے پہلے ہی وہ مسئلہ حل ہوتا تھا۔

عزمی میاں کے یونین کے صدر بننے کے ایک سال کے اندر ہماری بلڈنگ کی کایا پلٹ گئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ دوسرے پچاس روپے فی فلیٹ دے رہے تھے تو ہمیں ڈیڑھ سو روپے فی فلیٹ دینا پڑ رہا تھا جو فلیٹ خالی تھے عزمی میاں اس کے مالک سے بھی پچاس روپے ماہانہ لیتے تھے۔ لوگوں کے کام چل رہے تھے اس لیے وہ زیادہ رقم بھی ہنسی خوشی دے رہے تھے۔ جو ذرا مجبور تھے عزمی میاں کو ان کے کام لیے تھے لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی کام کے لیے اضافی رقم لی جاتی تھی تو وہ ان غریبوں کا اس میں بھی خیال کرتے تھے یوں انہیں ان لوگوں کی غیر مشروط حمایت حاصل ہو گئی تھی۔

دوسرے سال ایک نیا چکر سامنے آیا۔ ہمیں پتا چلا کہ دوسری بلڈنگز والے کمیٹی سے جان چھڑا کر عزمی میاں کو صدر بنانا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہماری عمارت میں کوئی یونین یا کمیٹی نہیں تھی بلکہ عزمی میاں ہی اوّل آخر تھے۔ اب دوسری بلڈنگز والے ان کو یہی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کمیٹی والے اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ لوگوں کا دباؤ بڑھنے لگا وہ اپنے مسائل حل نہ ہونے سے مشتعل تھے۔ جب کمیٹی والوں نے بغاوت کا خطرہ محسوس کیا تو وہ خود عزمی میاں کے پاس تجویز لے کر آئے کہ وہ کمیٹی میں شامل ہو جائیں۔ عزمی میاں بھلا اس بے عزتی میں کیوں شریک ہوتے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ "مجھے تو معاف رکھو میں اس بُرائی میں شامل نہیں ہو سکتا۔"

"ہم بُرائی ہیں؟" ایک کمیٹی ممبر نے سیخ پا ہو کر کہا۔

"یہ میں نہیں لوگ کہہ رہے ہیں۔" عزمی میاں نے آرام سے کہا۔ "پھر میں تمہارے پاس نہیں آیا ہوں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے تم میرے پاس آئے ہو۔"

کمیٹی والوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح عزمی میاں ان کے جال میں آ جائیں، سنا ہے انہیں کمیٹی کا تاحیات صدر بنانے اور مالی لالچ بھی دیے گئے تھے۔ مگر وہ انکار پر قائم رہے۔ اصل میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر دوسری بلڈنگز کے مکین بغاوت پر اُتر آئیں گے اور وہ موقع ہو گا جب وہ سب اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے اور ایسا ہی ہوا۔ واٹر بورڈ کی طرف سے علاقے میں پانی کا مسئلہ ہوا لیکن عزمی میاں پہلے ہی ایک اضافی لائن کسی طریقے سے حاصل کر چکے تھے اس لیے جب دوسرے فلیٹ والے پانی کو ترس رہے تھے تو ہماری بلڈنگ میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ حد یہ کہ لوگ اپنی گاڑیاں تک دھو رہے تھے۔ ایک شام فلیٹ مکینوں کے ایک مشتعل ہجوم نے کمیٹی کے دفتر پر حملہ کیا اور وہاں موجود ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اس میں کمیٹی کے کچھ اراکین بھی تھے باقی جان بچا کر بھاگ نکلے اس کے بعد ان لوگوں نے تقریباً زبردستی عزمی میاں کو اپنا صدر نامزد کر دیا۔ زبردستی یوں کہ عزمی میاں آخر وقت تک انکار کرتے رہے تھے اور اس شرط پر مانے تھے کہ وہ اکیلے ہی یونین ہوں گے۔

یوں فلیٹوں کی تاریخ میں پہلی بار ایسا انوکھا واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص ہی کرتا دھرتا بن گیا۔ سب سے پہلے تو عزمی میاں نے مینٹیننس فیس بڑھا کر ڈیڑھ سو روپے فی فلیٹ کر دی۔ لوگ خوشی خوشی دینے کو تیار ہو گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اب ان کے مسائل حل ہوں گے۔ عزمی میاں نے پُرانے لوگ نکال باہر کیے اور اس کے بعد صفائی اور سیکیورٹی کرنے والے بھرتی کیے۔ الیکٹریشن اور پلمبر ہائر کیے جن کی خدمات دن رات چوبیس گھنٹے کے ہوتی تھیں کہیں کوئی مسئلہ ہوا انہیں فوراً حل کرنا ہوتا تھا، جہاں یونین کا دفتر تھا وہاں کام کرنے والوں کا دفتر بنا دیا۔ قادر بخش صفائی کرنے اور کچرہ اُٹھانے والوں کا انچارج بن گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ مستعدی سے اپنا کام کرنے لگا تھا۔

فلیٹوں کی پارکنگ کا فرش اُدھڑ گیا تھا اور پارک میں مٹی اُڑتی تھی۔ شروع شروع میں لگائے گئے پھول پودے سب غائب ہو چکے تھے۔ بچوں کے لیے لگائے جھولے وغیرہ سب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ان کا لوہا اور دوسرا سامان چوکیدار بیچ کر کھا چکے تھے۔ عزمی میاں نے پہلے بنیادی مسائل حل کیے یعنی پانی، سیوریج اور بجلی کے سسٹم کو درست کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے پہلے فی فلیٹ دو سو روپے وصول کیے۔ چند مہینوں میں پورے کمپلیکس کے یہ مسائل حل ہو گئے۔ پانی کھلا آنے لگا، بجلی کی کھلی تاریں کنسیل کر دی گئیں یا صفائی سے لگا دی گئیں۔ پورے کمپلیکس میں روشنی کا انتظام کیا گیا۔ پانی چڑھانے والی پُرانی موٹریں نکال کر ان کی جگہ کم لیکن طاقتور موٹریں لی گئیں۔ انڈر گراؤنڈ اور اوور ہیڈ ٹینکوں کی جب برسوں بعد صفائی ہوئی تو اس سے نکلنے والی چیزیں دیکھ کر لوگوں کو اُلٹیاں لگ گئی تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہر گند ان ٹینکوں میں تھی۔ ان کے کھلے خانوں پر تالے والے ڈھکن لگا کر بند کر دیے گئے۔ اب کوئی گند اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے مرحلے میں عزمی میاں نے عمارتوں کی خراب حالت کو درست کرنا شروع کیا اور اس بار فی فلیٹ آٹھ سو کی رقم لی۔ ان کا کہنا تھا کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے اور پہلے بھی تخمینہ اندازے سے بڑھ کر نکلا تھا ویسے ان کا تخمینہ ہمیشہ اندازے سے بڑھ کر ہی نکلتا تھا۔ مگر کیونکہ کام ہو رہا ہوتا تھا اور اچھا ہوتا تھا اس لیے لوگ اعتراض بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سیوریج ٹھیک کرنے کے بعد تمام عمارتوں کی مرمت کی گئی اور پھر ان پر روغن کیا گیا۔ اس بار عزمی میاں نے ایک دوسری کمپنی سے بات کی اور عمارتوں پر اس کے اشتہار پینٹ کرائے۔ سال بھر کے اندر پورا کمپلیکس ایک جیسی حالت میں آ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ فلیٹ اب بن کر تیار ہوئے تھے۔ اتنے اچھے اور صاف ستھرے تو بلڈر نے بھی نہیں بنائے تھے۔ اس زمانے میں نئے نئے بلدیاتی انتخابات ہوئے تھے۔ عزمی میاں نے چالاکی یہ کی کہ اپنے کام کا افتتاح میئر سے کروایا اور ساتھ ہی اسی کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک معروف سیاسی رہنما کے نام سے اس کمپلیکس کو منسوب کر دیا۔ اس کے لیے باقاعدہ کارروائی ہوئی اور پُرانے لیز منسوخ کر کے لوگوں کو نئے نام سے فلیٹوں کی لیز دی گئی۔

اگلے مرحلے میں عزمی میاں نے پھر چندہ وصولی کر کے پورے کمپلیکس میں پختہ راستے بنوائے۔ چار دیواری کے ساتھ سرو کے درخت لگوائے اور پارک میں خوبصورت پودے اور درخت لگا کر باقی زمین کو لال اینٹوں کا فرش دے دیا۔ بچوں کے لیے نئے سرے سے جھولے اور سلوپ بنوائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پارک کی حالت بدل گئی۔ اندر پارکنگ کے رول بنائے گئے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہ تھا کہ جس کو جہاں جگہ مل گئی اس نے گاڑی پارک کر دی۔ اب باقاعدہ زمین پر نشان بنے تھے اور گاڑی یا بائیک ان کے مطابق ہی پارک کرنی ہوتی تھی۔ آنے جانے والے راستوں پر پارکنگ کی سختی سے ممانعت تھی۔ اسی طرح جو مہمان آتے تھے وہ گاڑی باہر پارک کر کے آتے۔ انہیں اندر گاڑی لانے کی اجازت نہیں تھی عزمی میاں نے فی گاڑی بیس روپے اور فی بائیک دس روپے ماہانہ فیس لگا دی۔ اس کے بدلے انہیں ٹوکن دیا جاتا تھا جسے دیکھ کر ہی گارڈ انہیں اندر آنے دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر آدمی کو آرام سے پارکنگ ملنے لگی ... اگر ... میں نہیں رہتے تھے لیکن اپنی گاڑی یہاں پارک کرتے تھے اب انہیں موقع نہیں ملتا تھا۔

چند سالوں میں ان فلیٹوں کا نظام اور ماحول اتنا اچھا ہو گیا کہ ان کی قیمت دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اس دوران میں آس پاس مزید کئی فلیٹ بن گئے تھے لیکن ان کا حال شروع سے ابتر تھا اور جن کا کسی قدر بہتر تھا ان کا سسٹم بھی ہمارے فلیٹوں کی ٹکر کا نہیں تھا۔ اس کا کریڈٹ عزمی میاں کو جاتا تھا جو اکیلے ہی یہ سارا نظام چلا رہے تھے اور کسی کو شکایت کا موقع بہت مشکل سے ملتا تھا۔ آبادی بڑھنے سے سڑک پر ٹریفک بھی بڑھا تھا۔ عزمی میاں نے یہ کیا کہ فلیٹوں کے اوپر ہورڈنگز لگوا دیے اور ان پر ٹو لیٹ لکھوا دیا۔ شروع کی دو بلڈنگز اس طرح تھیں کہ سڑک سے ان کا اوپری حصہ صاف

دکھائی دیتا تھا۔ دونوں پر چار چار ہورڈنگز لگا دیے۔ اشتہار دینے والوں کی کمی نہیں تھی چند مہینے میں ان آٹھوں ہورڈنگز پر اشتہار لگ گئے تھے۔ لیکن ان کا حساب کتاب صرف عزمی میاں کو پتا تھا۔

سڑک کے ساتھ جو بلڈنگ تھی اس کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ پہلے ان کا حساب کتاب فلیٹوں سے ہٹ کر ہوتا تھا اور ان کی الگ یونین تھی۔ لیکن عزمی میاں نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ وہ بھی ان کے تحت آ گئیں۔ یہ کوئی سو کے قریب دکانیں تھیں۔ عزمی میاں ان سے بھی ماہانہ مینٹیننس لینے لگے اور اس کے بدلے انہیں صفائی، سکیورٹی اور دوسری سہولتیں مہیا کرنے لگے۔ مارکیٹ کے فٹ پاتھ نئے سرے سے بنوا کر دیے اور باہر کی دیواروں پر تازہ روغن کرا دیا۔ سروس روڈ اور مین روڈ کے درمیانی فٹ پاتھ پر اسٹال لگوا دیے اور ان سے بھی ماہانہ وصول کرنے لگے۔ مگر ساتھ ہی صفائی ستھرائی اور لوگوں کی سہولت کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے فلیٹس اور ان کے سامنے کا حصہ دوسرے فلیٹوں سے الگ ہی نظر آتا تھا تو غلط نہ ہوگا۔

جہاں تک عزمی میاں کا تعلق تھا تو فلیٹوں کے ساتھ ساتھ ان کی حالت بھی بدلنے لگی تھی۔ پہلے وہ پُرانے اور خستہ حال کپڑوں میں دکھائی دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے جسم پر بہتر اور پھر بہترین لباس نظر آنے لگا۔ ان کے بچوں کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ صحت مند تو وہ پہلے بھی تھے اب باقاعدہ پلے پلائے سانڈ نظر آنے لگے تھے۔ عزمی میاں کا بڑا لڑکا مشکل سے سولہ سترہ برس کا تھا لیکن ڈیل ڈول سے پورا جوان مرد نظر آتا تھا۔ اس سے چھوٹے بھی دو اسی کے سائز کے تھے۔ خود عزمی میاں کی صحت بہتر ہوئی تھی لیکن ... میں وہ اب بھی نحیف سے نظر آتے ... لیکن یعنی جسمانی لحاظ سے اپنے بھائیوں سے پیچھے ہی تھا جہاں تک جسمانی چستی کا تعلق تھا وہ تینوں سے بہتر ہی تھا۔ ایک دن اتفاق سے میں نے اسے چند لفنگوں کی مرمت لگاتے دیکھ لیا جو بس اسٹاپ پر آنے والے خواتین اور لڑکیوں کو تنگ کر رہے تھے۔ ان میں فلیٹوں کی بھی چند لڑکیاں تھیں انہوں نے پاس سے گزرتے عزمی میاں کے لڑکے سے شکایت کی اور پھر اس نے بلا تکلف ان لڑکوں کو اتنا مارا کہ وہ ہاتھ پاؤں جوڑ کر معافیاں مانگنے لگے تھے حالانکہ وہ چار تھے اور یہ اکیلا تھا۔

عزمی میاں کے باقی لڑکے بھی ایسے ہی تھے۔ صحت مندی تو قدرتی طور پر تھی باقی کسر عزمی میاں کی تربیت نے پوری کر دی تھی۔ ایک طرح سے وہ عزمی میاں کی گھر کی فوج تھی اور جب کوئی ایسا معاملہ درپیش آ جاتا جو گفت و شنید سے کسی طرح نہیں سلجھتا تھا تو عزمی میاں بیٹوں کو آگے کر دیتے تھے اور وہ دوسری زبان میں آگے والے کو سمجھا دیتے۔ جو عزمی میاں کی نرم گفتاری سے نہیں پسیجتے تھے وہ ان کے بیٹوں کی گرم گفتاری سے سمجھ جاتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ عزمی میاں کے بیٹوں نے بدمعاشی شروع کر دی تھی۔ بلکہ عام حالات میں وہ سب سے اتنی نرمی اور احترام سے پیش آتے تھے کہ جب وہ اپنی اصلیت پر آتے تو لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ عام حالات میں وہ دوسرے شریف لڑکوں کی طرح تھے جن سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اپنے باپ کی طرح وہ خواتین اور لڑکیوں کا بھی پورا احترام کرتے تھے۔ ان کی ذات سے عام لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں تھی بلکہ میں ایمان داری سے کہوں گا بہت سے فوائد تھے جس سے دوسرے فلیٹ والے محروم تھے اور وہ ہمیں صرف عزمی میاں کی وجہ سے حاصل تھے۔

جب پورا کمپلیکس عزمی میاں کے ہاتھ میں آیا تو اس کے کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے اپنا ذاتی فلیٹ خرید لیا جبکہ ... وہ کوئی کام بھی نہیں کرتے تھے اور نہ ہی یونین صدر کی حیثیت سے ان کی کوئی تنخواہ تھی۔ چار کمروں کے اس فلیٹ کی مالیت کم سے کم تین لاکھ روپے تھے۔ یہ رقم آج سے بیس سال پہلے خاصی بڑی شمار ہوتی تھی۔ اس کے ایک سال بعد انہوں نے گاڑی بھی لے لی تھی۔ ان کے تین لڑکوں کے پاس ذاتی موٹر سائیکلز تھیں اور چوتھا صرف عمر کی وجہ سے محروم تھا لیکن کچھ عرصے بعد اسے بھی بائیک مل گئی۔ عزمی ... سے ترقی کرتے ہوئے جب انہوں نے بیس ... سامان اور فرنیچر ... قیمت سامان اور فرنیچر تبدیل کیا تو میں چشم دید گواہ کی حیثیت سے سب دیکھ رہا تھا۔

عزمی میاں کی اس کایا پلٹ سے شاید دوسروں کو حیرت ہوئی ہو لیکن مجھے یہ سب متوقع لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں نے شروع سے ان کی فطرت کو بھانپ لیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بہ ظاہر یہ سب خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر کیا تھا جیسا کہ وہ اکثر بتاتے بھی تھے مگر ان کی ذاتی زندگی گواہی دے رہی تھی کہ انہوں نے خود بھی بھرپور فوائد حاصل کیے تھے۔ دس سال میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے۔ ان کی رہائش، لباس، سامانِ زندگی اور طعام سب امیرانہ ہو گیا

جولائی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ یہ بات سب جانتے تھے اس کا چھپا رہنا ممکن ہی نہیں تھا کہ عزمی میاں نے کس طرح یہ ترقی کی تھی لیکن کسی کو ان سے شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے لوگوں کو چونا لگایا تھا لیکن ساتھ ہی ان کے کام بھی آئے تھے یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے پیسے کے بدلے لوگوں کے وہ کام کیے تھے جو دوسرے پیسے لے کر بھی نہیں کرتے ہیں اس لیے سب ان سے خوش تھے اور ان کو گوارا کر رہے تھے۔

البتہ کچھ سر پھرے ایسے تھے جنہیں یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ جب عزمی میاں کچھ کرتے نہیں ہیں تو اتنے ٹھاٹ سے کیسے رہتے ہیں؟ ایک کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا اس نے ہفتہ وار میٹنگ میں سب کے سامنے کہہ دیا کہ عزمی میاں فنڈ میں خرد برد کرتے ہیں یہ سن کر عزمی میاں کے بیٹے اسی وقت کھڑے ہو گئے تھے لیکن عزمی میاں نے انہیں ڈانٹ کر بٹھا دیا اور اعتراض کرنے والے سے کہا۔ ''رشید صاحب آپ اکاؤنٹنٹ ہیں نا اگلی میٹنگ میں، میں سارا حساب کتاب حاضر کردوں گا تب بات ہوگی۔''

میں نے بعد میں رشید صاحب کو سمجھایا کہ وہ عزمی میاں کے منہ نہ لگیں اور معافی تلافی کر کے معاملہ ختم کر دیں لیکن وہ بھی ایک ضدی آدمی تھے۔ اگلے ہفتے عزمی میاں نے سب کے سامنے حساب کے رجسٹر رشید صاحب کے سامنے رکھ دیے اور ان سے کہا۔ ''اب اس میں گڑبڑ نکالیں۔''

رشید صاحب نے کوشش کی لیکن ان کی اکاؤنٹینسی معمولی پڑھے لکھے عزمی میاں کے سامنے فیل ہو گئی اور آخر میں انہوں نے کہا۔ ''تم نے فراڈ اس طرح کیا ہے کہ اسے پکڑا نہیں جا سکتا، آخر تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟''

اس سے زیادہ کہنے کا انہیں موقع نہیں ملا کیونکہ عزمی میاں کے لڑکوں نے انہیں گھیر لیا اور جب دوسروں نے درمیان میں پڑ کر انہیں چھڑایا وہ ان کا حلیہ بگاڑ چکے تھے۔ ایسے ہی دو تین بدگمانوں کے ساتھ جب یہی سلوک ہوا تو باقی سب تائب ہو گئے اور عزمی میاں کی ایمان داری پر ایمان لے آئے۔ رشید صاحب سے سلوک کسی کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن عزمی میاں نے بھی اتمام حجت کے بعد ان کی درگت بنوائی تھی اس لیے کوئی کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ عزمی میاں نے نہایت ہوشیاری سے ایک طرف اپنے لڑکوں کی دھاک بٹھا دی تھی لیکن دوسری طرف ان پر غنڈہ گردی کا لیبل بھی نہیں لگنے دیا تھا۔ یہی لڑکے فلیٹوں کے ماحول کو بھی صاف ستھرا رکھتے تھے۔ اگر کوئی لفنگا ٹائپ لڑکا کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کی کوشش کرتا یا کسی لڑکی کو چھیڑتا یا لڑکا اور لڑکی میں افیئر چلتا ہوا نظر آتا تو یہ مداخلت کرتے تھے اور لڑکے کو سیدھا کر دیتے تھے اس کے بعد لڑکی خود ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی تھی یا جس کے پیچھے کوئی لڑکا پڑا ہوتا تھا وہ خوش ہو جاتی۔

عزمی میاں کے بیٹوں کی وجہ سے فلیٹوں کا ماحول دوسرے فلیٹوں کی نسبت نہایت اچھا تھا اوّل تو کوئی چھچھوری فیملی وہاں رہ نہیں سکتی تھی۔ یہ لوگ نہایت حکمت عملی سے اسے وہاں سے رخصت کر دیتے تھے یا اگر رہنا چاہتی تو اسے بالکل شریف بن کر رہنا پڑتا تھا۔ جن کے لڑکے ان کے قابو سے باہر ہوتے تھے وہ اسی میں عافیت سمجھتے کہ یہاں سے چلے جائیں۔ یوں رفتہ رفتہ کمپلیکس میں صرف اچھی اور شریف فیملیز رہ گئی تھیں۔ اسی طرح شروع میں کچھ معنی خیز قسم کی خواتین بھی آ کر یہاں رہنے لگی تھیں۔ ان میں مرد اِکا دُکا ہوتا تھا اور زیادہ تر نوجوان اور حسین عورتیں ہوتی تھیں۔ سرِ شام ہی ان کے فلیٹ میں غیر مردوں کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے وہ دھندہ کرتی تھیں اور انہیں پولیس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ عزمی میاں نے ان کے معاملے میں حکمت عملی سے کام لیا اور انہیں براہِ راست کچھ کہنے کے بجائے ان کے لیے آنے والے گاہکوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً ان کی گاڑی سے چیزیں چوری ہو جاتی تھیں یا چوکیدار مشکوک سمجھ کر ان کی مرمت کر دیتے تھے، اس طرح ان عورتوں کا دھندہ خراب ہوا تو وہ یہاں سے جانے پر مجبور ہو گئیں اور جو اس طرح بھی نہیں گئیں۔ ان کے لیے فلیٹ کے مالک سے رجوع کیا گیا کیونکہ وہ عام طور سے کرائے کے فلیٹ میں آتی تھیں۔

عزمی میاں کے آنے کے بعد ہم نے کوئی تین سال ان فلیٹوں میں نہایت سکون سے گزارے۔ ہمارے بچے بڑے ہوئے یہاں آنے کے بعد ہماری ایک بیٹی اور ایک بیٹا اور ہوا تھا۔ میرا بڑا بیٹا ڈپلومہ کر کے دبئی چلا گیا تھا اس نے کچھ عرصے بعد بھائی کو بھی بلوا لیا۔ بڑی بیٹی کی ہم نے شادی کر دی تھی اس کے بعد بیٹوں کی بھی شادی ان ہی فلیٹوں میں کی۔ عزمی میاں نے ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ کمپلیکس میں رہنے والے شادی بیاہ کے لیے شادی ہالوں کے محتاج نہیں تھے۔ کسی تقریب کے لیے پارک مل جاتا تھا اور وہ بھی بالکل مفت میں صرف سامان کا خرچا ہوتا تھا۔ لوگ نہایت سکون سے اپنی شادیاں اور دوسری تقریب نمٹاتے تھے۔ نہ آنے جانے کی فکر ہوتی تھی اور نہ کوئی سرکار کا ڈر۔

پھر وقت بدلا اور فلیٹوں کے انتظام میں بدنظمی نظر آنے لگی۔ صفائی کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ قادر بخش انتقال کر گیا تھا ایک رات اپنی کوٹھری میں سویا تو صبح اُٹھا ہی نہیں۔ اس کی جگہ جو آیا اسے اپنے کام سے ویسی دلچسپی نہیں تھی جیسی قادر بخش کو تھی۔ پانی میں ناغہ ہونے لگا تھا اگرچہ ضرورت پوری ہو جاتی تھی لیکن پہلے کی طرح کھل کر نہیں ملتا تھا۔ رات کو روشنیاں کم ہونے لگی تھیں۔ جو چیز خراب ہو جاتی وہ کئی بار کی یاد دہانی کے بعد ٹھیک ہوتی تھی۔ ماحول بھی بدل گیا تھا۔ جہاں پہلے ایسا ماحول تھا کہ عورتیں اور بچیاں بے فکری سے پارک میں بیٹھی رہتی تھیں وہاں اب اوباش قسم کے لڑکوں کا ہجوم رہنے لگا عورتوں اور لڑکیوں کو آنے جانے میں بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ عزمی میاں سے پوچھتے تو وہ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے چند دن میں سب ٹھیک ہونے کا مژدہ سناتے۔ پھر سنا کہ ان کے لڑکوں کا کچھ نئے آنے والوں سے جھگڑا ہوا تھا اس کے بعد انہیں دھمکیاں ملنے لگی تھیں۔ ان کے دو بیٹے گھر چھوڑ کر کہیں اور جا کر رہنے لگے تھے۔ عقل مندوں کو آنے والے حالات پہلے ہی خراب نظر آنے لگے تھے۔ ایک دن میں گاڑی کی سروس کرا کے واپس آ رہا تھا کہ عزمی میاں راستے میں پیدل جاتے دکھائی دیئے۔ میں حیران ہوا اور گاڑی ان کے پاس روک دی۔ ''عزمی بھائی خیریت آج سواری پیدل جا رہی ہے؟''

''ہاں میاں اپنی گاڑی خراب ہے اور بائیک پر ہمیں اچھا نہیں لگتا اس لیے پیدل جا رہے ہیں۔''

''تو یہ بھی گاڑی ہے آجائیے۔'' میں نے دروازہ کھولا اور وہ اندر آ گئے میں نے گاڑی اور بات آگے بڑھائی۔ ''عزمی بھائی آج کل فلیٹوں کے حالات اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔''

''ہاں میاں حالات تو خراب ہوں گے جب سیاسی پارٹیاں فلیٹ یونین پر قبضے کا سوچیں۔''

''تو کیا ہمارے فلیٹ میں کوئی سیاسی پارٹی قابض ہونا چاہتی ہے؟''

''سامنے کی بات ہے میاں اور بس کچھ مہینے کی بات ہے ہم بھی یہاں سے رخصت ہوں گے اور اس کے بعد اللہ مالک ہے۔''

''آپ یہاں سے چلے جائیں گے۔'' میں فکر مند... ہو گیا۔ ''پھر فلیٹوں کا کیا ہوگا؟''

''بتایا تو ہے اللہ مالک ہے ویسے ایک مشورہ ہے مفت میں.... ایک سال کے اندر فلیٹ بیچ دو اور کہیں زمین لے لو۔''

''تو رہوں گا کہاں؟''

''میاں کہیں عارضی ٹھکانہ ڈال لو، دو تین سال کی بات ہے زمین اور جائداد کی قیمت کو پر لگنے والے ہیں۔''

''آپ کہاں جائیں گے؟''

انہوں نے یونیورسٹی روڈ کی ایک سوسائٹی کا بتایا۔ ''وہاں اپنا بنگلہ بنا لیا ہے دو سو گز پر۔''

میں دم بہ خود رہ گیا عزمی میاں نے اتنا کمایا تھا جب کہ انہوں نے لگایا بھی تھا تو جو نہیں لگاتے تھے وہ کتنا کماتے ہوں گے۔ یہ بات مجھے آنے والے چند سالوں میں پتا چل گئی کیونکہ میں نے عزمی میاں کا مشورہ نہیں مانا اور فلیٹ فروخت نہیں کیا۔ عزمی میاں کے جانے کے بعد نئے آنے والوں نے یونین سازی کا چکر چلایا اور دیکھتے ہی دیکھتے کمپلیکس پر قابض ہو گئے جگہ جگہ تصویریں اور بینر لگا دیے گئے۔ یونین فیس یوں وصول کی جانے لگی جیسے ان کا پیدائشی حق ہو اور سہولیات کی فراہمی یوں کرنے لگے جیسے ہمیں بھیک دے رہے ہوں۔ چند سالوں میں فلیٹوں کی حالت بُری ہو گئی اگرچہ قیمت بڑھی تھی لیکن چند سال پہلے جس قیمت میں جا رہا تھا میں اسے بیچ کر اچھی سوسائٹیز میں کئی پلاٹ لے سکتا تھا لیکن اب ان سوسائٹیز میں قیمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ فلیٹ بیچ کر بھی میں مشکل سے ایک پلاٹ ہی لے سکتا تھا مجھے عزمی میاں کا مشورہ نہ ماننے کا سخت افسوس ہوا تھا۔

بیٹوں نے ماحول بدلتے دیکھ کر اصرار کیا تو میں نے فلیٹ بیچ دیا۔ اتفاق سے اسی سوسائٹی میں پلاٹ لیا جہاں عزمی میاں موجود تھے اور اب اپنے بیٹوں کے ساتھ پراپرٹی کا کام کر رہے تھے۔ سب بیٹوں کے پاس گاڑیاں تھیں اور اب وہ دو سو گز کے بنگلے سے چھ سو گز کے بنگلے میں شفٹ ہو گئے تھے۔ پلاٹ انہوں نے دلوایا تھا۔ بیٹوں کی کمائی سے گھر بنا تھا۔ ورنہ میں تو صرف پلاٹ لے سکا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کبھی کسی کا محتاج نہیں کیا اور ہر بار اپنے فضل سے عطا کیا۔ بیٹوں اور بیٹیوں کی ذمے داری نبھا چکا ہوں۔ تیسرا بیٹا بھی دبئی جا چکا ہے۔ وہ ہمیں بھی بلاتے ہیں لیکن حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وطن چھوڑ کر جانے کو دل نہیں کرتا ہے۔

میری چھوٹی سالی کی ایک بیاہی بیٹی اب اسی کمپلیکس کے ایک فلیٹ میں کرائے پر رہ رہی ہے اور وہ وہاں کے جو حالات بتاتی ہے تو اس کے مقابلے میں عزمی میاں کا دور ہمیں جنت لگتا ہے۔ انہوں نے کمایا لیکن لوگوں کے کام بھی آئے اب جو لوگ وہاں یونین کے نام پر لوٹ مار کر رہے ہیں وہ لگانے کے قائل نہیں ہیں۔ بس کما رہے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیسرا عشق

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
میں نے دو عشق کیے اور دونوں میں ناکامی ملی مگر اصل عشق کون سا ہے؟ یہ آپ کو میری آپ بیتی پڑھ کر ہوگا۔

نسیم
(لاہور)

میں یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں میں کوئی رنگین اور سہانا خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں، لیکن یہ خواب نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی۔

میری شادی کی پہلی سہاگ رات تھی۔ زندگی کی سب سے حسین اور یادگار رات جس کے خواب ہر لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دیکھنے لگتی ہے۔

میں حجلۂ عروسی میں دلہن بنی خواب کی سی حالت میں تھی۔ سکڑی سمٹی کسی رنگین گٹھری کی طرح بیٹھی تھی۔ میرے مہندی لگے گورے ہاتھ پیر، ریشمی لباس کی سلوٹوں میں گم ہو گئے تھے۔ میری بڑی نند نے مجھے بٹھانے کے بعد میرا لمبا سا گھونگٹ نکال دیا تھا تاکہ کمرے میں داخل ہونے والے کو میرے پیر اور بدن کا کوئی حصہ دکھائی نہ دے۔ تھوڑی دیر بعد میں کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ میری ساس، نندیں اور دوسری عزیز رشتے دار عورتیں کمرے کا دروازہ بھیڑ کر جا چکی تھیں مگر ان کی باتوں کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کسی بات پر آپس میں اُلجھ رہی تھیں۔ تکرار اور بحث کر رہی تھیں۔ میں باوجود کوشش کے ان کی باتیں سن اور سمجھ نہ سکی تھی۔ چند لمحوں کے بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ کمرے کے اندر اور باہر ایک گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ شاید سونے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اس کمرے کے گہرے سناٹے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں شور مچاتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ میری نس نس میں ایک عجیب سی سرشاری سمائی ہوئی تھی۔ ایک ایسی عجیب سی کیفیت جو میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے کیا نام دوں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن ایک انجانا سا نشہ محسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا شوہر نذیر شاہ کمرے میں آنے والا تھا۔ زندگی کے ایک نئے اور انوکھے اور حسین سفر کا آغاز ہونے والا تھا۔

میں نے نذیر شاہ کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی تصویر دیکھی تھی۔ نہ ہی اس کے متعلق سنا تھا کہ وہ کیسا ہے؟ وہ شادی سے ایک روز پہلے کویت سے آیا تھا۔ جس طرح سے میری شادی ہوئی تھی، اب نہیں ہوتی ہے۔ برسوں پہلے جو روایتی انداز سے شادیاں ہوتی تھیں، اب وہ ایک دقیانوسی اور فرسودہ سی بن گئی ہیں اور انہیں معیوب بھی سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو دلہن کو شادی کے بعد آرسی مصحف کی رسم میں دکھایا جاتا تھا یا پھر وہ حجلۂ عروسی میں گھونگٹ اُلٹ کر چہرہ دیکھتا اور منہ دکھائی دیتا تھا..... اب نکاح کے فوراً بعد دلہا اور دلہن اسٹیج پر نہ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں بلکہ اس طرح سے فری ہو جاتے ہیں جیسے برسوں سے اُٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا رہا ہو۔ دلہا دلہن نہیں دوست ہیں۔ دلہن میں نہ تو شرم وحیا اور نہ ہی حجاب۔ کسی فلمی اداکارہ کی طرح چہک رہی ہے، مٹک رہی ہے۔ پوز دے دے کر تصویریں اُتروا رہی ہے اور ویڈیو بنوا رہی ہے۔

اتفاق سے طرفین بھی دقیانوسی خیالات کے تھے۔ اس سے میرا رشتہ میرے والدین نے طے کیا تھا۔ میں نے نذیر شاہ کے بارے میں سنا تھا کہ اس کی آمدنی بہت اچھی ہے۔ عرب ممالک میں جو یہاں سے جا کر ملازمت کر رہے تھے، ان کی آمدنی بہت اچھی ہوتی تھی۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ میرا شوہر صاحبِ حیثیت ہے۔ میں اس بات سے بہت خوش اور سرشار تھی کہ میں اب ایک خواب ناک اور پُرمسرت زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں نے ازدواجی زندگی کے جو خواب دیکھے ہیں وہ ایک ایک کر کے پورے ہوں گے۔ میں اس سے اتنا پیار کروں گی، اتنی محبت دوں گی کہ وہ اس سے مالا مال ہو جائے گا۔ شوہر کو صرف جسمانی قربت نہیں بلکہ پیار اور چاہت کی بھی ضرورت ہے۔ میں اسے دیوانگی کی حد تک چاہوں گی تاکہ وہ میری محبت کا اسیر ہو جائے، عشق میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔

مجھ سے دو بڑی بہنیں تھیں۔ ان کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان میں ایک تین اور دوسری دو بچوں کی مائیں بن چکی تھیں اور ان کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار تھی۔ دوسرے کے لیے قابلِ رشک تھی۔ میں اپنی دونوں بہنوں کے مقابلے میں سب سے حسین اور پرکشش تھی۔ میرے خاندان ہی میں نہیں بلکہ محلے میں بھی میرے حسن و شباب کا بڑا چرچا تھا۔ میری تربیت ایک خاص انداز میں بلکہ بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی جبکہ بڑی بہنوں کے حسین ہونے کے باوجود انہیں یہ سب کچھ حاصل نہ تھا۔

ایک تو میری تعلیم کے لیے میرے والد نے اخراجات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوئی پروا نہیں کی۔ شہر کے ایک بہترین اور معیاری اور مہنگے ترین اسکول میں داخل کرانے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ دوسرا یہ کہ مجھے باور کرایا گیا کہ میں بہت حسین ہوں، قصہ کہانیوں کی شہزادیوں کی طرح حسین اور مثالی ہوں، میرے لباس پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔ لباس سے لے کر جوتوں، چوڑیوں، ربن اور پرس تک کی میچنگ کا خیال رکھا جاتا تھا۔ میری کون سی ایسی ضد اور فرمائش نہیں تھی جو پوری نہیں کی جاتی ہو.....

ان تمام باتوں نے نہ صرف میرا دماغ خراب کردیا تھا بلکہ میں اپنے آپ کو کسی شہزادی کی طرح ہی سمجھنے لگی تھی اور میرا دماغ ہر وقت ساتویں آسمان پر رہتا تھا۔ میرے اندر ضد، غصہ، غرور اور تکبر فطری امر تھا۔

لیکن میری دونوں بہنوں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ انہیں مجھ سے کوئی حسد، جلن اور عداوت نہیں تھی۔ وہ میری سگی بہنیں تھیں، مجھے بے حد چاہتی تھیں لیکن وہ میرے والدین کو منع کرتی اور ٹوکتی رہتی تھیں کہ وہ مجھے بگاڑ رہے ہیں جو آگے چل کر نہ صرف ان کے لیے بلکہ میرے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوگا۔ امی ان دونوں کو بُری طرح جھڑک دیتی تھیں۔ ابو بھی انہیں ڈانٹنے سے باز نہیں رہتے کہ وہ ان معاملات میں نہ بولیں۔ اپنے کام سے کام رکھیں۔ میں اپنی چاندسی بیٹی کو بہت چاہتا ہوں۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد میں نے بھی عام لڑکیوں کی طرح سندر سپنے دیکھنے شروع کردیے۔ جوانی نے شباب کو راہ دی۔ جب میرا شباب اُبلنے لگا تو میرے لیے رشتوں کی بھرمار ہوگئی۔ جب کالج جانے لگی تو محلے اور کالج اور خاندان کے رشتے دار لڑکوں کے طویل ترین عشقیہ خطوط آنے لگے۔ میں ان خطوں کو پڑھتی ضرور تھی کیونکہ ان خطوط میں میرے حسن وشباب کی تعریف ہوتی تھی جس سے میں بڑا حظ اُٹھاتی تھی۔ میرا دماغ اور خراب ہوجاتا تھا، یہ سوچ کر کہ میں کس قدر حسین ہوں کہ لڑکے میرے لیے کیسے پاگل ہورہے ہیں۔ وہ ایسے اشعار بھی لکھتے تھے جو میرے حسن وشباب کی مدح سرائی میں ڈوبے ہوتے تھے۔

مجھ میں پندارِ حسن تھا۔ میں عشقیہ خطوط تو پڑھ لیتی تھی..... لیکن اس بات کو قطعی پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی لڑکا سرِراہ مجھ سے بات کرنے اور عشقیہ خط دینے کی کوشش کرے۔ مجھے جو عشقیہ خطوط موصول ہوتے تھے، وہ ڈاک سے۔ چونکہ لفافوں کی پشت پر ان کا نام نہیں ہوتا تھا اس لیے امی سے کہتی تھی کہ یہ میری سہیلیوں کے خط ہوتے ہیں۔ امی اس بات کا یقین کرلیتی تھیں اور خط کو پڑھتی نہیں تھیں، انہیں مجھ پر اعتماد تھا۔ دو ایک محلے کے لڑکوں نے مجھ سے سرِراہ بات کرنے کی جسارت کی تو میں نے ان کی ایسی خبر لی تھی کہ ان کے دماغ درست ہوگئے۔ دوسرے لڑکوں کی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے بات کریں۔

لیکن جب راتوں کی تنہائی میں ان عشقیہ خطوط کو پڑھتی تھی تو میرا دل بھی دھڑکتا تھا، آرزوئیں تھیں کہ پنپ رہی تھیں کہ کسی سے محبت تو کروں، کوئی مجھ سے محبت کرے، اظہارِ عشق کرے۔ میرے کمرے میں ٹی وی تھا۔ کیبل سے غیر ملکی چینلز پر جو فلمیں دکھائی جاتی تھیں، ان میں جو نامناسب مناظر کی فلمیں ہوتی تھیں وہ میرے دل اور جذبات میں ہلچل پیدا کردیتی تھیں..... میں کسی ایسے ویسے لڑکے سے محبت کی قائل نہ تھی۔ میں کسی اونچے گھرانے کے رئیس زادے سے محبت کرنا چاہتی تھی جس کے پاس نئے ماڈل کی گاڑی ہو، اعلیٰ درجے کے ائرکنڈیشنڈ ہوٹلوں میں لے جاکر ڈنر یا بار بی کیو کھلائے۔

توقیر پہلی ہی ملاقات میں میرے حسن وشباب کا اسیر ہوگیا۔ وہ ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ گو وہ ایسا خوبصورت، کڑیل اور اسمارٹ نہ تھا جیسا کہ میں چاہتی تھی، بس وہ قبول صورت تھا۔ اس کی مرسیڈیز گاڑی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں اپنی ایک سہیلی کے پاس ماڈل ٹاؤن گئی ہوئی تھی، وہیں اس نے لفٹ کی پیشکش کی جو میں نے بغیر کسی جھجک اور تکلف کے قبول کرلی۔ پھر اس نے مال روڈ پر لے جاکر ایک اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ میں پُرتکلف ناشتا کرایا۔ اس طرح ہماری دوستی کا آغاز ہوا۔ دوستی نے عشق کا رنگ دھارلیا۔ یہ عشق میرا خواب اور ارمان تھا جس نے خوابوں کی انجان دنیا میں پہنچادیا۔

ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا تھا، شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ ایک برس تک ہم دونوں کے درمیان محبت پروان چڑھتی رہی۔ یہ ایک عشق صادق تھا جس میں کوئی میل اور غلاظت نہیں تھی۔ صرف ایک جذبہ تھا، اس کی گہرائی کا اندازہ اس طرح ہوتا تھا کہ وہ ایک سیدھا سادا اور شریف النفس شخص تھا۔ اس نے مجھے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گرسنہ نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ تنہائی کے کتنے ہی سنہرے مواقع ملے، وہ چاہتا تو مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کرکے من مانی کرسکتا تھا اور میں اس کی پیش قدمی اور حد سے تجاوز پر کوئی تعرض نہ کرتی اس لیے کہ میں خود بھی یہ چاہتی تھی کہ اس کے بازوؤں میں جھولتی رہوں۔ یہ فلموں کے جذباتی مناظر کا اثر تھا جو میری خواہشات پر کمند ڈالنے نہیں دیتا تھا اور جوانی کے ارمان بے

لگام ہوجاتے تھے۔ معلوم نہیں اسے کیا خوف تھا جبکہ میں اس سے بے حد بے تکلف بھی تھی۔ میری دو ایک سہیلیوں نے بتایا تھا کہ لڑکے اس محبت سے کیسے فائدے اُٹھاتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے۔ ماڈرن عشق ایسا ہی بے باک ہوتا ہے۔ میرے لبوں نے جب بھی مٹھاس جذب کرنے کی کوشش کی وہ برف کا تودہ بنا رہا۔ ایسے وقت میں میرے دل میں شک آتا تھا کہ کہیں وہ سراب تو نہیں؟

توقیر نے دو ایک مرتبہ دور سے اپنی پُرشکوہ کوٹھی بھی دکھائی تھی جو گلبرگ میں واقع تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن دردانہ سے بھی ملوایا تھا۔ اس کی بہن مجھ سے مل کر اتنی خوش ہوئی کہ مجھے چوم لیا تھا۔ ایک روز دردانہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی اور اپنے والدین سے سہیلی کی حیثیت سے ملایا تھا۔ اس کے والدین اور گھر کے دوسرے افراد بھی میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔ میں ان سے زیادہ ان کے گھر کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ ایسا آراستہ وپیراستہ گھر میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں ایسے ہی گھر کی بہو بننا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ ایک برس کے لیے امریکا چلا گیا جہاں اس کے چچا مقیم تھے۔ اس نے امریکا جاکر تین مہینے تک باقاعدگی سے خط وکتابت جاری رکھی۔ وہ ہر خط میں یہ لکھتا تھا کہ میرا جذبۂ عشق صادق ہے۔ آتے ہی ہم دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ جائیں گے۔ ایک روز اس کا آخری اور تفصیلی خط آیا تھا۔ اس نے اپنے خط میں لکھا کہ اس کے چچا کے دفتر میں ایک لڑکی جو سیکریٹری کے فرائض انجام دیتی تھی، اس سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بتادیا تھا کہ پاکستان میں ایک لڑکی نسیم ہے، میری دوست ہے، اس کے اور میرے عشق ومحبت کا ایک اٹوٹ رشتہ ہے، ایک روز اس نے مجھے فریب سے شراب پلائی تو میرا پیر پھسل گیا اور اس نے ایسی نامناسب تصویریں بنالیں کہ میری اس سے شادی کردی گئی۔ اس نے ایک طرح سے مجھے بلیک میل کیا۔ سمجھنے کو تو وہ میری بیوی ہے، لیکن مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ مجھے تم سے جو محبت ہے، میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم مجھے یاد آتی رہوگی۔ تم بھی مجھے نہیں بھولنا.....!

میں توقیر کا وہ آخری خط پڑھ کر خوب روئی، مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ اس کا پیر کیسے پھسل گیا؟ اس نے شراب پی ہوئی تھی تو کیا ہوا..... اس لیے کہ وہ اتنا شریف، سیدھا سادا اور بزدل تھا کہ اتنی دور جانہیں سکتا تھا۔ کیا شراب کا نشہ.....

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شباب کے نشے سے بھی تیز اور گہرا ہوتا ہے؟ ایک مرتبہ میں نے اس کے گلے میں اپنی نرم و نازک اور مرمریں بانہیں حمائل کر دی تھیں کہ وہ کچھ اور قریب آ جائے مگر اس نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ میں نے اپنی توہین محسوس کی اور میں بے نیام تلوار بن گئی۔ میں اپنی اس غیر اختیاری حرکت پر حیران تھی اور دوسری طرف وہ میری اس جرأت پر پسینا پسینا ہو گیا تھا۔ اس نے میری بانہوں کے شکنجے سے اپنی گردن کو آزاد کیا اور مجھ پر چادر ڈال دی اور کہا تھا کہ نسیم! تم ایک شریف خاندان کی لڑکی ہو۔ تم خود کو قابو میں رکھو۔ اپنے اوپر آنچ نہ آنے دو۔ بہت جلد ہم دونوں شادی کر لیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس حرکت کا کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ تمہیں یہ بات زیب نہیں دیتی، پھر وہ مجھے اس تنہائی کے ماحول سے لے کر نکلا اور گاڑی میں بٹھا کر ساحل پر لے آیا تھا۔ ایک ایسا شخص کسی لڑکی کے جذبات اور شراب کا شکار ہو جائے۔ یقین آنے والی بات نہ تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اس نے شادی کے بارے میں جو واقعہ لکھا ہے وہ جھوٹ ہے۔ اس روز کے واقعے نے تو قیر کے دل میں میرے بارے میں غلط رائے قائم کر دی تھی۔ میں اس کے خیال میں ایک آوارہ اور بدچلن لڑکی تھی۔

میں کئی دنوں تک تو قیر کو بھلا نہ سکی۔ اسے متعدد خط لکھے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دو ایک بار فون کیا تو اس نے بڑے روکھے پن سے کہا تھا کہ..... اب تم مجھے بھول جاؤ۔ عشق کو بھول جاؤ۔ اب میں کسی اور کا ہوں اور بچے کا باپ بننے والا بھی ہوں۔ اس کے جواب اور لہجے سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ مجھے اس بات کا بڑا غم تھا کہ میں ایک اونچے گھرانے کی بہو نہ بن سکی۔ میرا بڑا ارمان تھا کہ اس گھر میں جا کر راج کروں۔

نذیر شاہ سے میرا رشتہ طے ہونے کے بعد اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا کہ اس بے وفا کو بھول جانے کی کوشش کروں۔ اس ناکام عشق کو دفن کر دوں۔ میں دل کے نہاں خانوں سے اس کی تصویر مٹانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔

نذیر شاہ کی تصویر اس لیے نہ مل سکی تھی کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی تھی کیونکہ وہ میرے والد کے دوست کا ہونہار لڑکا تھا۔ اسے میرے والد، والدہ، بہنوں اور دنوں بہنوئی دیکھ کر پسند کر چکے تھے۔ میں نے نذیر شاہ کی ماں اور بہنوں کو دیکھ کر ایک خیالی پیکر تراش لیا تھا۔ اس کی ماں کا قد درمیانہ تھا جب کہ اس کی دونوں بہنوں کا قد نکلتا ہوا تھا اور وہ گوری چٹی بھی تھیں۔ میرے تصور میں اس کی تصویر جو تھی، وہ یہ تھی کہ وہ دراز قامت، سرخ و سفید اور گبھرو جوان ہوگا۔ کسی ہیرو کی طرح خوبرو اور وجیہہ اور پھر کویت میں اس کی تنخواہ ہزاروں میں ہے۔

میں دھڑکتے دل سے نذیر شاہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت میں عجیب و غریب احساسات سے دوچار ہو رہی تھی۔ انجانے لمحات کے تصور سے نس نس میں خون کی گردش تیز ہو رہی تھی۔

جیسے صدیوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھلنے کی آہٹ سی سنائی دی، ایسا لگا جیسے کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔ اور دروازے کو بند کرنے اور چٹخنی لگانے کی آواز سن کر میں سمجھ گئی کہ یہ نذیر شاہ ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ میرے پلنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ پلنگ کے پاس آ کر رکا، میں روایتی دلہنوں کی طرح گردن جھکا کر اور لمبا سا گھونگٹ نکال کر بیٹھنے کی قائل نہ تھی اس لیے کہ میں نئے دور کی لڑکی تھی اور اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھی۔ آج کی دلہنوں نے شرمانا اور لجانا چھوڑ دیا تھا۔ بہنوں اور سہیلیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھیں۔ نکاح کے وقت بھی وہ گردن اُٹھا کر بیٹھتی تھیں۔ میں بھی ایسا ہی چاہتی تھی۔ مجھے شرمانے کا ڈھونگ قطعی پسند نہ تھا۔ یہ تو میری ماں، بہنوں اور خاندان کی بڑی بوڑھیوں کی تاکید تھی اور پھر میری بڑی نند مجھے اسی حالت میں بٹھا گئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کی بات رکھ لی تھی۔

نذیر شاہ نے بستر پر میرے پاس بیٹھ کر بڑی آہستگی اور سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

"یہ غلام، حسن کے دربار میں مؤدبانہ سلام پیش کرتا ہے۔"

مجھے اس کی یہ بات سن کر بڑے زور کی ہنسی آئی مگر میں نے ضبط کر لی۔ وہ بے حد سیدھا سادا لگا۔ بالکل تو قیر کی طرح۔ میری شادی شدہ سہیلیوں نے مجھے بہت ساری باتیں سمجھائی تھیں۔ یہ بھی بتایا تھا کہ شادی کی پہلی رات شوہر کسی الو کے پٹھے کی طرح ہوتا ہے۔ زر خرید غلام سا بن جاتا ہے۔ بڑی منتیں اور سماجتیں کرتا ہے، گڑگڑاتا ہے، بہت محبت بھری باتیں کرتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ شیشے میں اُتارنے کے لیے کرتا ہے۔ ایک پتھر کو موم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غیر محسوس انداز سے اپنے شوہر کو جتنا تر سا سکتی ہو تر سا لو، پھر کبھی ایسا موقع نہیں ملتا۔ اس میں بڑا مزہ اور لطف آتا ہے۔

اس نے چند لمحوں کے بعد کپڑوں کی سلوٹوں سے میرا ہاتھ نکالا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ پھر اس نے میرے ہاتھ کی ایک انگلی نکالی اور منہ دکھائی کی انگوٹھی پہنا دی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے گھونگٹ کے کونے اُلٹ دیے اور پھر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"سبحان اللہ!"

اس لمحے فطری شرم و حیا نے مجھے اپنی آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا۔ میرے لبوں پر ایک عجیب سی تھرتھراہٹ آ گئی۔ اس نے میرا چہرہ دیکھ کر سبحان اللہ اس لیے کہا تھا کہ میرے حسن نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ میں دلہن بن کر اور غضب ڈھا رہی تھی۔ چند لمحوں تک ہم دونوں کے درمیان ایک گہرا سکوت طاری رہا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ میں اسے دیکھوں مگر فطری حیا مانع تھی۔ میرا دل مجھے سمجھا رہا تھا کہ کچھ دیر اور صبر کر لو۔ وہ بھاگا تھوڑا ہی جا رہا ہے۔ وہ سدا کے لیے تمہارا ہو چکا ہے، اب تو تمہیں اسے زندگی بھر دیکھنا ہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے حسن و جمال کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دے گا۔ تو قیر تو بہت سیدھا سادا تھا مگر اس نے کبھی میرے حسن و جمال کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ میرے حسن و شباب کی تعریف شاعرانہ انداز میں کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کی یہ بات اتنی پسند تھی کہ میرا دل اس پر نچھاور ہونے کو چاہتا تھا۔ مگر اس نے کبھی ایسا کمزور لمحہ آنے ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن نذیر شاہ نے میرے حسن و جمال کی تعریف کے بجائے اپنے، اپنے گھر والوں کے بارے میں مختصر سا لیکچر دے ڈالا کہ مجھے کس طرح ان کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

جب اس نے مجھے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کہا تب میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

اسے دیکھتے ہی میرے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا چہرہ میرے آبگینۂ دل پر کسی پتھر کی طرح لگا تھا اور اس کی کرچیاں میرے وجود میں چبھ گئی تھیں۔

اسے دیکھتے ہی میرے دل کو جو صدمہ ہوا، بیان سے باہر ہے۔ میرا سینہ کٹ رہا تھا اور میں نے دل تھام لیا تھا۔ وہ خوبصورت تھا اور نہ ہی وجیہہ۔ اس کا رنگ بھی کالا تھا، وہ رات تھا تو میں دن۔ میں چودھویں کے چاند کی طرح تھی اور وہ ایسا گھپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ بلیک اینڈ وائٹ جوڑا۔ ایک عام سا مرد..... قدرے موٹا، پستہ قد، اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ غم سے میری ایسی حالت تھی کہ اس وقت مجھے زہر ملتا تو شاید میں کھا لیتی۔ کیونکہ ایسی اذیت ناک زندگی سے مرنا بہتر ہوتا ہے۔

میں نے اپنی شادی شدہ سہیلیوں سے سنا تھا کہ یہ ایک ایسی رات ہے جو ساری زندگی پر بھاری ہوتی ہے۔ میں نے اس رات کوئی کیف و سرور محسوس نہیں کیا اور اپنے آپ کو کسی سردلاش کی طرح اس کے حوالے کر دیا تھا۔

میں سوچتی رہی کہ اس میں میرے والدین نے ایسی کون سی خوبی دیکھی جو اسے ساری زندگی کے لیے مجھ پر تھوپ دیا؟ کیا اسے میرے لیے صرف اس لیے پسند کیا گیا کہ وہ کویت میں ملازمت کر رہا ہے اور ہر ماہ لاکھ سوا لاکھ کی تنخواہ ہے۔

اس شادی سے مجھے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے محبت کی ایک رمق تک نہ تھی۔ البتہ نفرت ضرور ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا تھا اس لیے کہ وہ میرا شوہر تھا۔ صرف میرا جسم اس کی ملکیت تھا۔ وہ مجھے اپنی ملکیت بنا کر بہت خوش تھا۔ اس کی سرشاری سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس نے ساری دنیا فتح کر لی ہو..... مگر میں باوجود کوشش کے اسے اپنا دل نہ دے سکی۔ نہ میں اسے اپنا دل دینا چاہتی تھی۔ یہ میری اپنی ملکیت تھا اس کے لیے میں مجبور نہ تھی۔ وہ میری روح کا کبھی مالک نہیں بن سکتا تھا۔ اس سے عشق کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے شادی سے قبل سوچا ہوا تھا کہ میں اپنے شوہر سے ایک بیوی نہیں بلکہ محبوبہ کی طرح عشق کروں گی۔ مگر اب میں نے اس سے نفرت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میرا جسم فتح کر چکا تھا لیکن میرا دل جیت نہیں سکا تھا۔

وہ مجھے پا کر کتنا خوش تھا اس کا اندازہ یوں ہوتا تھا کہ گھر کی اور اس کے خاندان کی لڑکیاں، عورتیں میرے حسن و جمال کی تعریف کرتیں تو وہ کسی بچے کی طرح خوش ہو جاتا تھا۔ لیکن اس نے بھولے سے بھی میرے حسن و جمال کی تعریف نہیں کی تھی اور نہ ہی میرے کانوں میں محبت بھرا رس گھولا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے حسن و شباب اور چہرے اور سراپا کی دل کھول کر تعریف کرے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ ذلت خیال کیا..... آخر وہ کیا تھا؟ یہ کالا کلوٹا، بھدا موٹا اور بے کشش اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتا تھا؟

مجھے اس کی اس بات پر ایک طرف بڑی حیرت تھی تو دوسری طرف صدمے کا بھی احساس تھا۔ معلوم نہیں کیوں میں اس کی زبان سے اپنی تعریف سننے کے لیے کسی بھکارن کی طرح تڑپنے لگی۔ کیف کے لمحات میں بھی اس نے میری تعریف نہیں کی تھی۔ میرے پندارِ حسن کو ٹھیس لگتی تھی، مجھے غصہ تو آنا ہی تھا۔

میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے کوئی محبت نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ میرے غرور، انا اور پندارِ حسن نے پہلے ہی دن جس نفرت کو جنم دیا تھا وہ میرے دل میں پرورش پانے لگی تھی۔ سہیلیاں جب مجھ سے میرے شوہر کی بُرائیاں کرتیں اور بے جوڑ شادی پر تبصرہ کرتیں تو تب میرے دل پر ان کی باتیں چابک بن کر لگتیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں خودکشی کرلوں یا پھر اپنے شوہر سے طلاق لے لوں۔ مجھے کسی کو یہ کہتے ہوئے شرم آتی تھی کہ یہ شخص میرا شوہر ہے۔

شادی کو دو مہینے کا عرصہ گزرا، وہ میرے لیے بڑا ہی کرب ناک تھا۔ وہ مجھ سے کہتا تھا۔

''میری جان نسیم! مجھے تم سے عشق ہوگیا ہے..... تم بیوی نہیں، میری محبوبہ ہو۔''

میں اس عرصے میں اس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دے سکی۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ جیسے مجھ سے عشق کرتا ہو، اس کی محبت میں بڑی گرم جوشی ہوتی تھی۔ وہ مجھے حد سے زیادہ چاہنے لگا تھا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ میں حور کی طرح تھی اور وہ کسی سیاہ فام غلام کی طرح لگتا تھا۔ میرے حسن وشباب اور جسم کی کرشمہ سازیوں نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔ میں اس سے سرد مہری سے پیش آنے لگی۔

گو اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا مگر مجھے اس کی ذرہ برابر پروانہ تھی۔ لیکن اس نے کبھی میری سرد مہری کی شکایت نہیں کی بلکہ وہ مجھے ہر وقت خوش رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتا تھا۔ شاید وہ اس لیے ایسا کرتا تھا کہ میں اس قدر والہانہ انداز، وارفتگی اور خود سپردگی سے پیش آؤں جیسے ایک بیوی کو پیش آنا چاہیے۔ جب وہ میری ضرورت محسوس کرتا تو میں ایک لاش بن کر آنکھیں بند کرلیتی۔

میرا خیال تھا کہ وہ شاید دو ماہ بعد چھٹیاں گزار کر چلا جائے گا لیکن تین ماہ گزر جانے کے باوجود وہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ اس کے جاتے ہی ایک برس کے لیے مجھے ایک گدھ کے پنجے سے نجات مل جائے گی۔ اس کا رات دن جونک کی طرح چپکے رہنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس کی چاہت میں ڈوبی شامیں اور راتیں بڑی اذیت ناک اور ناگوار ہوتی تھیں۔ میں ان عورتوں کو دیکھتی جو نہ تو بہت خوبصورت تھیں اور نہ ہی پُرکشش مگر ان کے شوہر بڑے وجیہہ تھے۔ مجھے ان کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ میں سوچتی کہ قدرت نے آخر مجھے کس بات کی سزا دی جو اس شخص کو میرے سر تھوپ دیا۔

ایک روز جب ہم دونوں سونے کے لیے لیٹے تو میں اس کے قرب سے بچنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''آپ کویت واپس کب جارہے ہیں؟ چھٹیاں شاید ختم ہونے والی ہوں گی نا؟''

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو اس کا چہرہ بہت ہی بدنما اور کراہت آمیز تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا مجھ سے تمہارا دل بھر گیا ہے؟'' اس نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں اس سے نظریں نہ ملا سکی۔

''جی نہیں..... یہ بات نہیں.....'' میں اس کی بات سن کر گڑبڑا سی گئی۔ میں دل میں حیران تھی کہ اس نے میرے دل کی یہ بات کیسے جان لی تھی؟ میں نے فوراً ہی بات بنائی تھی

''میں اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کہیں آپ کی چھٹیاں ختم تو نہیں ہورہی ہیں۔''

پہلے تو اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا، پھر چند لمحوں کے بعد میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں واپس چلا جاؤں؟''

''نہیں تو.....'' میں اس کے بازوؤں کی سخت گرفت میں کسمسانے لگی۔ اس کی پیاسی آنکھیں کہہ رہی تھیں، وہ مجھے جلدی سونے نہیں دے گا۔ ان میں اَن جانے جذبات کروٹیں لے رہے تھے۔ میں نے ان نگاہوں کی تاب نہ لاکر نفرت سے اپنی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرالی۔ وہ کسی خوں خوار درندے کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے دل پر جبر کرکے ریاکاری سے کہا ''میں چاہتی ہوں کہ آپ سدا نظروں کے سامنے رہیں۔''

''اچھا.....!'' اس نے ایک دم خوش ہوکر کہا ''ہاں..... اگر تم یہ چاہتی ہو تو پھر کبھی میں کویت نہیں جاؤں گا..... تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ مجھے تم سے دور ایک دن بھی رہا نہیں جائے گا۔''

''کیا.....!'' میں نے ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھی۔ سر پیٹ لیا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ کمان سے نکلا تیر واپس آنے سے رہا تھا۔ آخر بات بنانی تھی ''اگر آپ نہیں گئے تو پھر گزارہ کیسے ہوگا..... گھر کیسے چلے گا؟ آپ کے پاس جو رقم ہے وہ کچھ دن بعد ختم ہوجائے گی۔''

''میں نے مستقل طور پر اپنے وطن میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ کہنے لگا ''میں سوچتا ہوں کہ میں اپنا ہنر اور اپنی محنت اور صلاحیت کسی دوسرے ملک کو کیوں دوں؟ مجھ جیسے ہنرمندوں نے غیر ممالک میں جاکر اپنے ملک کو بہت پیچھے کردیا ہے اس لیے تو ہمارا ملک وہ ترقی نہیں کرسکا جو اسے

کرنا چاہیے تھی۔''

اس کے خیالات ونظریات اتنے عظیم اور بلند ہیں، مجھے تو اندازہ نہ تھا۔ اس کے جواب نے مجھے لاجواب کردیا تھا مگر پھر میں نے کہا۔

''وہاں آپ کو لاکھ سوا لاکھ تنخواہ ملتی ہے مگر یہاں تو پندرہ سولہ ہزار بھی نہیں ملیں گے۔ ایک معمولی سی تنخواہ سے کیا ہوگا؟ گھر کیسے چلے گا؟ روز بہ روز مہنگائی بڑھتی جارہی ہے، اس سے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ آپ کیا دیکھ نہیں رہے ہیں کہ قیمتوں کو کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔ ہر شخص رو رہا ہے۔ حکومت کو نہ تو غریبوں کی فکر ہے اور نہ ان کی غربت کی۔ وہ ان کے منہ کا نوالا چھین رہی ہے۔''

''میں اپنے وطن کی خاطر..... دو لاکھ روپے کی آمدنی کو بھی لات مارنے کو تیار ہوں۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا ''میرے اس ملک میں ہزاروں نہیں، لاکھوں ایسے خاندان ہیں جو چار پانچ ہزار میں گزارہ کررہے ہیں۔ کیا ہم دونوں کے لیے آٹھ دس ہزار روپے ماہانہ کافی نہیں ہوں گے، کیا اس میں بہ آسانی گزارہ نہیں ہوسکتا؟''

''ہم دونوں.....!'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ''آپ اپنی امی، ابو اور بھائی کو بھول گئے؟ انہیں پالنا آپ کی ذمے داری بھی تو ہے۔''

''مجھے ان لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' اس نے اپنے بازوؤں کا حلقہ میرے گرد اور تنگ کرلیا ''اس لیے کہ ابو کو زمینوں سے معقول آمدنی ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ میرا چھوٹا بھائی فہد بھی ملازمت کرتا ہے۔ اسے چار ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کو کوئی معاشی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے گھر والے چاہتے ہیں کہ میں اپنا مستقبل بناؤں اور اپنا گھر چلاؤں۔ کسی اور پر بوجھ نہ بنوں۔''

میں نے آخری کوشش کے طور پر اس خیال سے کہ یہ جادو اس پر چل جائے گا، اپنے دل پر جبر کرکے اپنی آنکھیں بند کرکے بڑی اذیت اور ناگواری سے مگر سرد مہری سے اس کے موٹے، بھدے اور بے کیف ہونٹوں کا جواب دیتے ہوئے کہا ''آپ وہاں چار پانچ برس رہ کر آجائیں تو ہمارا مستقبل اور تابناک ہوجائے گا۔ ہمارے پاس اپنا گھر ہوگا، گاڑی ہوگی، دولت ہوگی۔ ہماری زندگی خوابوں سے کہیں حسین ہوگی۔''

''میری جان..... میری معشوق، تمہارے عشق کا یہ انداز مجھے جانے نہیں دے رہا ہے۔ خدا کی قسم، اب تو میں تمہارے عشق میں ایسا گرفتار ہوگیا ہوں کہ تمہیں کسی قیمت پر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تمہاری یہ محبت اور قرب حاصل رہے گا، تم دیکھنا میں اتنا کماؤں گا کہ ہماری زندگی تمہارے تصورات سے بھی کہیں حسین ہوگی۔''

پھر وہ مجھ پر جذباتی انداز سے جھکتا چلا گیا۔ یہ ایک طوفان تھا جس نے میرے خوابوں کو تہس نہس اور تاخت وتاراج کردیا تھا۔

میں نے بڑی کوشش کی اسے کسی نہ کسی طرح دوبارہ کویت جاکر ملازمت کرنے پر آمادہ کروں۔ میں نے اپنی ساس اور سسر کو بھی مجبور کیا کہ اسے کویت جانے پر زور ڈالیں۔ پھر میں بدترین معاشی حالات اور خلفشار سے غیر محسوس انداز سے اس بات کا احساس دلاتی رہی تھی کہ یہاں اس کا ملازمت کرنا مناسب نہیں ہے اور اچھی ملازمت کا ملنا بھی آسان نہیں ہے لیکن اس نے میری کوئی بات نہیں مانی اور نہ ہی ماں باپ کے حکم کے آگے اپنا سر جھکایا۔ اس کی ضد نے میرے اندر نفرت کی آگ کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ پھر میں اس کے مرنے کی دعائیں مانگنے لگی۔ اسے موت بھی نہ آتی تھی۔ اِدھر میں یہ سوچ سوچ کر بھی حیران ہوتی تھی کہ دوسری حسین عورتیں اپنے بدصورت شوہر کو کیسے برداشت کرلیتی ہیں۔ ان کے ساتھ کس طرح زندگی گزارتی ہیں۔ شاید وہ بھی میری طرح کرب واذیت سے گزرتی ہوں گی۔ چونکہ وہ عورت ہیں، عورت کو احتجاج اور اُف کرنے تک کی اجازت نہیں دی جاتی اس لیے وہ بے زبان جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

کوئی ایک مہینے کے بعد ہم لاہور سے کراچی آگئے۔ میرے شوہر کو کراچی کی ایک بہت بڑی فیکٹری میں ملازمت مل گئی تھی۔ یہاں چالیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ تھی بلکہ فیکٹری کی طرف سے مفت رہائش کی سہولت بھی تھی۔ یہ گھر ہر طرح سے آراستہ وپیراستہ تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ہمیں ایک چمچہ اور گلاس تک خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ گھر بفرزون میں تھا اور ایک سو بیس گز پر بنا ہوا تھا۔ یہ گھر خوبصورت تھا۔ چھت پر ایک کمرا بھی بنا ہوا تھا۔ پیچھے گلی تھی اور عقبی دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ میں ایک طرف اس بات سے بے حد دکھی تھی کہ میرا شوہر میرے لیے زندگی بھر کا روگ تھا۔ اس سے نجات پانے کی یہی ایک صورت تھی کہ میں اسے قتل کردوں لیکن اسے قتل کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ جیسا بھی تھا، اب اس کے ساتھ ساری زندگی بڑی اذیت سے گزارنی تھی۔

دوسری طرف میں کراچی آکر بہت خوش ہوئی۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے کہ کراچی شہر اور اس کی حسین زندگی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، اس سے بڑھ کر پایا۔ یہ جو رونق، گہما گہمی، حسن، کشش اور رنگینی تھی وہ لاہور میں نہیں تھی۔ یہاں کی فضا پر بہاریں چھائی رہتی تھیں۔ ماحول بھی بڑا خوابناک تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ یہاں کے مرد اور عورتیں بڑی باذوق اور نفیس قسم کی ہیں۔ جامہ زیبی کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ شائستہ مزاج ہیں۔ ایک بات وہ یہ کہ یہاں کے باشندوں میں پیسے کی بڑی فراوانی ہے۔ اس لیے میں نے دکانوں اور فوڈ اسٹریٹ، مٹھائیوں کی دکانوں پر گاہکوں کا خوب رش دیکھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حرام آمدنی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اس گھر میں ایک بڑا چھبیس انچ کا رنگین ٹیلی وژن، کیبل، ڈی وی ڈی، سی ڈیز تھیں۔ یہاں فلمیں دیکھنے کی آزادی تھی۔ نذیر شاہ شام کے وقت کوئی نئی انگریزی اور ممنوعہ فلموں کی سی ڈی لاتا تھا تاکہ میرے جذبات میں تندی پیدا ہو۔ میں شام کے وقت اس کے انتظار میں بن سنور کر بیٹھی رہتی۔ اس کے منہ ہاتھ دھوتے ہی اسے چائے بنا کر دیتی۔ چائے پینے کے بعد وہ تیار ہو جاتا۔ پھر ہم دونوں گھومنے کے لیے باہر نکل جاتے۔ رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھا لیتے یا پھر کسی ہوٹل سے پارسل لا کر گھر میں کھا لیتے۔ ممنوعہ قسم کی فلمیں تو میں اس کی غیر موجودگی میں دن میں دیکھتی تھی۔ اسے صرف رومانی ڈراموں سے دلچسپی تھی۔ میں جو انگریزی فلموں کی سی ڈیز دیکھتی، وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ معلوم نہیں وہ کیوں ایسی فلموں کی سی ڈیز لاتا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرا وقت آسانی سے کٹ جائے یا پھر ان کا کردار بن کر اسے خوش کروں۔ اس نے کبھی بھی مجھے اس بات پر اصرار یا مجبور نہیں کیا کہ میں یہ فلمیں اس کے ساتھ دیکھوں۔ حالانکہ میں اس کی بیوی تھی اور ہمارے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا۔

میں چھ سات دن تک اس محلے میں بڑے خوف کے عالم میں رہی تھی۔ اس لیے کہ جس گلی میں مکان تھا، آس پاس بہت کم مکان تھے۔ اس مکان کے بائیں طرف چھ سات پلاٹ خالی تھے اور اس طرح دائیں طرف دس بارہ پلاٹ۔ کسی کسی پلاٹ کے گرد دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ اس مکان کے عقبی حصے میں دو تین مکان بنے ہوئے تھے لیکن ان کے درمیان میں دو تین پلاٹ خالی تھے۔ ایک مکان پر برائے فروخت کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اسی طرح سامنے والی قطار میں ذرا ہٹ کر دو تین مکان بنے ہوئے تھے۔ یہ گلی سارا دن ویران اور سنسان پڑی رہتی تھی۔ دن ڈوبنے کے بعد ایسا گہرا سناٹا چھا جاتا تھا کہ وحشت برسنے لگتی تھی۔ میں نہ تو کسی سے ملنے گئی تھی اور نہ ہی مجھ سے کوئی ملنے آئی تھی..... نذیر شاہ دفتر سے واپسی پر اخبار لاتا تھا۔ اس میں بعض ایسی ہولناک خبریں ہوتی تھیں، اس کے آنے تک ایک انجانا خوف رہتا تھا۔ چونکہ میں اکیلی ہوتی ہوں، ایسا نہ ہو کہ کسی دن ڈاکا پڑے اور میں بھی، جو کسی خزانے سے کم نہیں تھی، لوٹ نہ لی جاؤں۔ میں کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے رہتی تھی۔ فلموں کے باعث میرے ذہن سے خوف ڈر نکل جاتا تھا۔

جب نذیر شاہ دفتر سے آتا تھا، گھومنے پھرنے کے لیے لے کر نکل جاتا تھا۔ یہ نئی موٹر سائیکل بھی کمپنی کی دی ہوئی تھی۔ چھٹی والے دن دیر تک سوتے رہتے اس لیے کہ ساری رات جاگتے رہتے تھے۔ وہ میری تعریف یہ کہہ کر کرتا تھا کہ تم میری معشوق ہو۔

کیبل میں ایک چینل تھا جس میں جغرافیہ کے پروگرام دکھائے جاتے تھے۔ مجھے فلموں کے مقابلے میں یہ زیادہ پسند تھا۔ اس کی وجہ سے میں روز روز اس کے تنگ کرنے کے عذاب سے بچ گئی تھی۔ اس پر اس کے سونے تک یہ پروگرام دیکھتی رہتی تھی۔ وہ میرے انتظار میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ پھر مایوس ہو کر سو جاتا تھا۔ وہ مجھے بیڈ روم سے آوازیں بھی دیتا کہ بند کرو، آجاؤ..... میں کہتی کہ یہ فلم ختم ہونے دو۔ بس تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ کہتا کہ یہ سارا دن دکھائی جاتی ہے۔ صبح دیکھ لینا۔ چونکہ مجھے اس سے اور اس کی خواہش پوری کرنے میں ایک خاص قسم کا تنفر تھا اس لیے میں اس کی بات نہیں مانتی تھی..... کبھی کبھی اس سے برداشت نہ ہوتا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں آ کر ٹی وی بند کر دیتا۔ پھر مجھے جبر و زبردستی لے جاتا۔ ایسی حرکت پر مجھے بہت غصہ آجاتا مگر مجھے اپنے غصے کو دبانا اور خون کے گھونٹ پینے پڑتے۔ اس طرح میں ایک سرد لاش کی طرح ہوتی، لیکن اسے میری ذرہ برابر بھی پروا نہ ہوتی تھی۔ اسے اپنی غرض سے سروکار تھا۔

چھٹی والے دن ہم ایک جاننے والے کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ نذیر شاہ کے ایک دوست نے جو اس کے ساتھ فیکٹری میں کام کرتا تھا، ہماری دعوت کی پھر ایک دن ہم نے بھی اسے اور اس کے گھر والوں کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ اب میں کراچی کے ماحول کی عادی ہونے لگی تھی۔ نذیر شاہ کے دفتر جانے کے بعد فلم دیکھنے بیٹھ جاتی۔ دوپہر دہی اور پراٹھا کھا کر سو جاتی۔ پھر سہ پہر بیدار ہو کر دیر تک بڑی آزادی سے نہاتی رہتی۔ میں ہمیشہ سے نہانے میں وقت بڑا صرف کرتی تھی۔ کیونکہ نہانے میں لذت

سی ہوتی ہے۔ نذیر شاہ کو لباس میں ساڑی بہت پسند تھی۔ اس نے مجھے بہت ساری ساڑیاں ایسے رنگوں کی خرید کر دی تھیں کہ ان میں میرا حسن و شباب اور نکھر جاتا تھا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ میں ماضی کی مدھو بالا ہوں۔ اسے مدھو بالا کی فلمیں بہت پسند تھیں۔ میں ہلکا سا میک اپ بھی کرتی تھی جو بڑا نفیس ہوتا تھا اور اپنے لانبے سیاہ ریشمی بال کھلے رکھتی تھی۔ اسے یہ بھی بے حد پسند تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ حسین نظر آؤں۔ اس لیے کہ وہ دفتر سے آ کر مجھے اس حالت میں دیکھتا تو بہکنے اور چہکنے لگتا تھا۔ مجھے پھر سے تیار ہونا پڑتا تھا۔

ایک شام میں نے نہا کر گہرے بھورے رنگ کی ساڑی پہنی اور اسی رنگ کا بغیر آستینوں اور نیچی تراش کا بلاؤز پہنا۔ سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے، سراپا کا ناقدانہ انداز سے جائزہ لیا تبھی اس کی موٹر سائیکل کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جما رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ اندر داخل ہوا مگر خواب گاہ میں نہیں گھسا۔ اس نے نشست گاہ میں کھڑے ہو کر مجھے پکارا۔

"نسیم..... اِدھر آؤ۔"

آج مجھے اس کے آواز دینے اور اس طرح سے بلانے پر تعجب ہوا۔ اس لیے کہ جب کبھی میں داخلی دروازہ کھلا رکھتی تو وہ تیر کی مانند اندر گھس آتا اور مجھے میری مدھو بالا کہہ کر خراجِ تحسین پیش کرنے لگتا تھا۔ پھر اسے میرے لباس، بال اور میک اپ کا ذرا بھی خیال اور احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ دہلیز پار کرتے ہی ٹھٹک کے رک گئی۔ میری نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا۔ نذیر شاہ ایک اجنبی شخص کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ شخص مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے جو اسے دیکھا تو اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایک خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ وہ شخص میرا خواب تھا۔ میرے خوابوں کا شہزادہ اور آئیڈیل تھا۔ ایسے ہی شہزادے کو تو میں خوابوں میں دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

میں اسے دیکھ کر بے خود ہو گئی۔ اپنے آپ کو بھول گئی۔ اس کی شخصیت میرے وجود پر چھا گئی۔ وہ ایک خوبصورت، وجیہہ، اسمارٹ اور خوش پوش شخص تھا۔ وہ بڑے مضبوط اور توانا بدن کا تھا۔ اس کا سینہ چوڑا چکلا اور ٹھوس تھا۔ دراز قامتی کے باعث اس کی مردانہ وجاہت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ میرا شوہر اس کے سامنے بدصورت اور بونا لگ رہا تھا۔

وہ بھی مجھے اسی طرح دیکھ رہا تھا جیسے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ عورت کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی مقناطیسی بڑی بڑی آنکھوں میں میرے حسن و شباب کے لیے خراج تھا۔ پورے کمرے میں اور اس کے ماحول پر ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت سا چھا گیا۔ وقت کی نبض جیسے رک گئی۔ میرا دل دھک دھک کرتا ہوا کہہ رہا تھا "تمہی تو ہو محبوب میرے....."

"نسیم.....!" نذیر شاہ کی آواز نے نہ صرف گہرے سکوت کو توڑا بلکہ اس نے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"یہ ہے میرا عزیز دوست اور عزیز از جان فرید احمد! کویت میں میرے ساتھ رہتا تھا، ہم ایک ہی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ ہم دونوں لاہور ہی سے بچپن کے دوست ہیں۔ اس کمینے نے مجھے بتایا نہیں کہ کویت میں ملازمت چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ آج اتفاق سے اس سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی تو میں اسے ساتھ لیتا آیا۔" اس نے توقف کر کے اپنے دوست کی طرف دیکھا "اور یہ ہیں میری مسز نسیم اور تمہاری بھابی..... تمہیں پسند آئیں اپنی بھابی؟"

"کیوں نہیں..... ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہیں۔" اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح سحر انگیز تھی۔ "خدا نظرِ بد سے بچائے۔"

"میرے دوست کو کیا چائے نہیں پلاؤ گی؟" میرے شوہر نے کہا "جاؤ..... جا کر جلدی سے چائے بنا کر لاؤ، بہت ہی اچھی سی۔"

جب میں باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی تو میرے دل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنا دل ہی نہیں، اپنا وجود بھی اس کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ میں نے اپنے دل میں بڑی حیرت سے سوچا کہ کاش.....! فرید احمد، نذیر شاہ کی جگہ میرا شوہر ہوتا تو آج میں دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوتی۔ اس نے میرے شوہر کے سامنے میری تعریف کی تھی، اس نے میرا دل جیت لیا تھا۔

میں چائے بنا کر لے آئی۔ وہ دونوں آپس میں بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ پھر وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔

"آپ نے کیا شاندار چائے بنائی ہے..... مجھے تو اس میں لاہور کی خوشبو آ رہی ہے۔ میرا دل کر رہا ہے کہ آج، ابھی اور اسی وقت لاہور واپس چلا جاؤں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم سے مل کر مجھے بھی لاہور اور بچپن کی یاد آ گئی ہے اور بچپن نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔" نذیر شاہ نے کہا "مجھے یہاں آئے دو تین مہینے ہی ہوئے ہیں مگر ایسا لگ رہا ہے کہ میں یہاں برسوں سے ہوں۔ میرا شہر مجھے بہت یاد آتا ہے میرے دوست احباب، سڑکیں، گلیاں، تانگے اور فضا کی خوشبو میرے دل کو تڑپاتی رہتی ہے۔"

"کویت میں بھی تم لاہور کو اسی طرح سے یاد کرتے تھے جیسے کوئی بچھڑا ہوا بچہ اپنے ماں باپ کو یاد کرتا ہے۔" فرید نے کہا "تم بہت جذباتی ہو میرے دوست.....!"

"اپنی زمین اور اپنی جگہ سے کسے جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ اپنی دھرتی اپنی ماں ہوتی ہے۔ ہم اس کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ کیا کوئی اپنی ماں کو بھی بھول سکتا ہے؟" نذیر شاہ نے کہا۔

"تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" فرید احمد کہنے لگا "آج میری طرف سے تم دونوں کو رات کے کھانے کی دعوت ہے۔ چونکہ میں اپنے فلیٹ میں اکیلا رہتا ہوں۔ نہ میری بیوی اور نہ میرے ماں باپ ہیں..... اس لیے میں کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھلاؤں گا۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے میری جان!" نذیر شاہ نے کہا "چونکہ آج تم پہلی بار میرے گھر آئے ہو لہٰذا تم میرے ہاں کھانا کھاؤ گے۔ نسیم ابھی رات کا کھانا تیار کیے دیتی ہے۔"

نذیر شاہ کی تجویز سن کر دل میں بہت غصہ آیا۔ میرا دل اس کے ساتھ باہر جانے اور ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے مچل رہا تھا۔ اس بہانے اسے زیادہ سے زیادہ دیر تک دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملتا۔ اب مجھے باورچی خانے میں بھاڑ جھونکنا تھا۔ یوں میرے احمق شوہر نے آج کی حسین شام غارت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھی۔

"اب تو میں ہر روز تمہارے ہاں کھانا کھایا کروں گا۔" وہ بولا "لیکن آج رات کھانا میری طرف سے ہوگا۔ تم دونوں کو چلنا ہی ہوگا۔"

نذیر شاہ نہانے اور تیار ہونے کے لیے چلا گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ چند لمحوں تک ہم دونوں کے درمیان خلوت حائل رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ مجھے اپنی نگاہوں میں جذب کر رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری سانسوں میں خراماں خراماں اُتر رہا ہو۔ میرے حسن کے نہاں خانے میں اپنی تصویر نقش کر رہا ہو۔ میں اس کے سامنے بت بنی بیٹھی تھی۔ میری پلکوں کی چلمن اُٹھتی اور گر رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تھیں کہ شور مچا رہی تھیں۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی بھابی!" اس نے اپنی سحر زدہ آواز میں مجھے مخاطب کیا تو سکوت کا فسوں ٹوٹ گیا "میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہماری بھابی نہ صرف اتنی خوبصورت اور پُرکشش ہوں گی..... بلکہ بے حد نفیس، عمدہ، جامہ زیب اور شائستہ مزاج کی بھی ہوں گی۔ آپ کے لب و لہجے سے ایسا لگتا ہے کہ آپ گریجویٹ ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں اس کے انداز سے پُرشش رہ گئی۔ دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فرید احمد جتنا خوبصورت تھا اس کی باتیں بھی اتنی ہی خوب صورت اور دل میں اُتر جانے والی تھیں۔ وہ ایک جوہری معلوم ہو رہا تھا جسے ہیرے کی قدر و قیمت معلوم تھی میرے شوہر نے کبھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔

میرے شوہر کے تیار ہو کر آنے تک وہ مجھ سے کراچی شہر اور تفریحی مقامات کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں نے اب تک کون کون سی چیزیں کھائی..... پھر اس نے چائنیز کھانوں کے بارے میں بھی پوچھ لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اب تک چائنیز کھانے نہیں کھائے ہیں۔ ان کی بڑی تعریف سنی ہے۔"

میرے شوہر نے اپنی بائیک مکان کے صحن میں لا کر کھڑی کر دی۔ ہم تینوں ایک ٹیکسی میں طارق روڈ پہنچے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہاں کی رونق اپنے شباب کی آخری منزل پر تھی۔ اس نے ایک جیولری شاپ پر لے جا کر سونے کے ٹاپس خرید کر دیے جو بارہ ہزار کی مالیت کے تھے۔ اس نے اپنی طرف سے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ میرے شوہر اور میں نے اسے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانا۔ اس نے کہا کہ بچپن کے دوست کی حیثیت سے میرا حق بنتا ہے۔ پھر وہ ہمیں وہاں سے ایک شاندار قسم کے چائنیز ریسٹورنٹ پر لے گیا۔

اس نے چکن کارن سوپ، فرائی جھینگے، فرائیڈ چکن رائس اور نہ جانے کیا کچھ منگوایا۔ اس نے سوپ اور دوسری ڈشوں کے بارے میں بتایا کہ انہیں کس طرح کھایا جاتا ہے۔ مجھے کھانے تو بہت پسند آئے۔ اس میں ایک عجیب سی لذت اور ذائقہ بھی تھا لیکن ان سے اچھا تو وہ مجھے لگا تھا۔ اس کی قربت سے میں بہت خوش تھی۔ وہ میرے شوہر کی نظریں بچا کر کسی نہ کسی حیلے بہانے سے ایسی نظروں سے دیکھتا کہ میرے دل کی کلی کھل کھل اُٹھتی۔

میں سوچتی..... کاش! یہ لمحات جاوداں ہو جائیں۔ وہ میری نگاہوں سے دل میں اُترتا جا رہا تھا۔

کھانے کی میز پر باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ فرید احمد کویت کی کمپنی میں جہاں میرا شوہر ملازمت کرتا تھا، اس کے دفتر میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔ جبکہ اس کمپنی میں میرا شوہر فورمین تھا۔ اس نے کراچی آ کر ایک اشتہاری کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ اسے یہاں اچھی تنخواہ مل رہی تھی۔ اس کے پاس گاڑی بھی تھی جو اس نے مرمت کے لیے گیراج میں دی ہوئی تھی۔

ان دونوں دوستوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا۔ ہمارے محلے میں ایک چار منزلہ عمارت میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا جائے۔ اس کے یہاں آنے سے نہ صرف کمپنی مل جائے گی بلکہ وہ رات کا کھانا بھی ہمارے ہاں کھا لیا کرے گا۔ چھٹی کا دن بھی گزارے گا۔ اس تجویز کو سن کر میں اندر ہی اندر خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ یہ سب کچھ مجھے کسی سہانے سپنے کی طرح لگا۔

وہ ہمیں ٹیکسی میں رات گھر پر چھوڑ گیا تو گیارہ بج چکے تھے۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے خوشی بھرا اور یادگار تھا۔ میں تو قیر سے بھی مل کر اتنی خوش نہیں ہوئی تھی جس قدر اس پہلی ملاقات سے ہوئی تھی۔ میرا شوہر اس کی تعریفوں کے پُل باندھنے لگا تھا۔ میرا دل اس سے کہیں زیادہ اس کی تعریف کیے جا رہا تھا۔

آج کی رات میرا دل ٹی وی دیکھنے کو بالکل بھی نہیں چاہا۔ یہ جان کر بھی نذیر شاہ مجھے سونے نہیں دے گا اس لیے کہ میں فرید احمد کے بارے میں سوچنا اور چشم تصور میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے تو اس کے خیالوں میں بے دھیانی میں شب خوابی کا وہ لباس پہن لیا جو وہ گزشتہ دنوں کسی بوتیک سے خرید کر لایا تھا اور انتہائی نامناسب سا تھا۔ میں ایسا لباس پہننے سے اس لیے احتراز کرتی تھی کہ مجھے ایک حجاب سا محسوس ہوتا تھا۔ گو ہم میاں بیوی تھے، کوئی حجاب نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی اس لیے پسند نہیں کرتی تھی کہ نذیر شاہ مجھے زہر لگتا تھا۔ وہ نہ صرف بہت خوش ہو جاتا تھا بلکہ چین سے سونے نہیں دیتا تھا۔ اس کا پہننا یا نہ پہننا برابر ہی تھا۔ جب میں وہ لباس پہن کر بستر پر دراز ہوئی تو اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس سے کہا کہ..... پلیز! آج میں بے حد تھک گئی ہوں۔ سارا جسم درد کر رہا ہے۔

مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے میرے انکار کا ذرہ برابر بُرا نہیں منایا۔ دوسری طرف کروٹ لے کر سو گیا۔ میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی لیکن اس کی حرکتوں سے نجات پانے سے ایک طرح خوشی ہوئی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی میرے انکار اور حیلے بہانوں کو قبول کیا ہو۔

میں نے نائٹ بلب بھی بجھا دیا۔ پھر میں فرید کے تصور اور خیالوں میں کھو گئی۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حصار میں قید پایا تو..... کبھی اس کے ساتھ ساتھ آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کرتے پایا، اُن جانی وادیوں میں بھٹکتی رہی اور پراگندہ خیالات نے میرے جسم میں خون کی گردش تیز کر دی اور وہ نس نس میں رقص کرتا رہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرا ہے اور میں اس کی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میں اس کی ذات کا جزو ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ذات کا جزو بن چکے ہیں۔ کیا میں اسے پا سکتی ہوں؟ اگر اس نے اپنی جھولی پھیلائی تو میں کسی پکے پھل کی طرح گر تو نہیں جاؤں گی؟

میرے دل کے کسی کونے میں ایک نادیدہ آواز نے میرے وجود کو جیسے جھنجھنا دیا۔ نسیم! یہ تم کیوں بھول رہی ہو کہ تم نذیر شاہ کی بیوی ہو، وہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ تم صرف اور صرف اسی کی ہو۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے، بہت ہی زیادہ۔ جنون کی حد تک۔ تمہارا ہر طرح خیال رکھتا ہے۔ اس نے کبھی کسی چیز کی کمی ہونے نہیں دی۔ کسی غیر مرد سے عشق کے بارے میں تمہارا سوچنا بھی گناہ ہے۔ غیر مرد سے اس لیے بھی عشق نہیں کیا جاتا کہ وہ خوبصورت اور وجیہ ہے..... مرد کی صورت نہیں، اس کا دل دیکھا جاتا ہے۔ تم فرید کے پیچھے مت بھاگو۔ اپنا جسم آلودہ نہ کرو، روح میلی نہ کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سراب ثابت ہو، اسے تم سے نہیں تمہارے حسن و شباب سے محبت ہو۔

نہیں، نہیں..... میرے دل نے پوری قوت سے چیخ کر کہا تو میرے وجود میں اس کی آواز گونجنے لگی۔ مجھے اپنے شوہر سے عشق ہو ہی نہیں سکتا۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں، فرید کو مجھ سے عشق ہے۔ اس کی محبت میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ میں اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا، یہ میں نے کیسے باور کر لیا کہ اسے مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔ مجھ سے عشق کرنے لگا ہے۔ پہلی ہی نظر میں میرا اسیر بن گیا ہوگا، وہ کسی شہزادے کی طرح ہے۔ کیا معلوم کسی سے محبت کرتا ہے، کسی حسین اور نوجوان لڑکی نے اسے دل دیا ہوگا۔ میں نے اس کی خوش اخلاقی کو عشق کا نام دے دیا ہے جو میری خود فریبی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صبح بیدار ہوئی تو دل و دماغ پر فرید کا خیال چھایا ہوا تھا۔ میرے چشم تصور میں اس کا خوبصورت چہرہ مسکرا رہا تھا۔ یہ وقت نہیں تھا کہ میں اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔ مجھے شوہر کو ناشتا بنا کر دینا تھا۔ وہ غسل خانے میں تھا، نہا رہا تھا۔ پانی گرنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی شب خوابی کا لباس تبدیل کیا اور شلوار قمیص پہن لیا پھر جلدی سے ناشتا تیار کر کے دیا۔ وہ نصف گھنٹے کے بعد ناشتا کر کے چلا گیا تو میں نے منہ دھویا۔ اپنے لیے چائے بنائی اور خواب گاہ میں آ گئی۔ چائے پی کر بستر پر لیٹی۔ پھر تصورات میں ڈوبی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

آنکھ کھلی تو گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں بستر سے نکل کر سنگھار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے چہرے اور سراپا کا بڑی آزادی اور سکون سے جائزہ لینے لگی۔ میں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔ میرے سوا کوئی نہیں تھا اور نہ کسی کے آنے کا ڈر اور امکان تھا۔ میں ناقدانہ انداز سے اپنے آپ کو دیکھتی ہوئی سوچنے لگی کہ کیا وہ میری ذات اور شباب سے متاثر ہوا ہوگا؟ کیا واقعی اس نے میری نگاہوں اور چہرے سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں اسے دل دے بیٹھی ہوں؟ اس نے مجھے جو قیمتی تحفہ دیا، ایک اعلیٰ قسم کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلایا۔ جتنی دیر تک ساتھ رہا اتنی دیر تک میری آنکھوں سے دل میں اُترتا رہا۔ مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا رہا، وہ مجھے جیسے انجانی نظروں سے دیکھتا دور تک چلا گیا۔ اگر میں اسے پسند نہ آئی ہوتی تو وہ اتنا کچھ نہ کرتا۔

دوسری طرف مجھے سمجھا رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے تم پر فریفتہ ہو کر نہیں کیا۔ اس نے ایک عزیز دوست کی بیوی سمجھ کر اس حیثیت سے کیا ہے۔ اس وقت جذبات کی افراتفری میں مجھ پر ایسی دوغلی کیفیت طاری تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دماغ کدھر جا رہا ہے، دل کدھر جا رہا ہے۔

میں نے اپنے آپ کو کشمکش کے بھنور سے نکال کر سنگار میز کے بڑے آئینے میں دیکھا۔ میرے ریشمی لانبے سیاہ بال میرے مخملیں سڈول شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ میرے چہرے پر ایک عجیب سی دمک بھی نمایاں تھی جس نے میرے رخساروں کی شادابی و تازگی اور سرخی کو نکھار کر مجھے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ پھر میں نے گرمی محسوس کر کے سفید لباس کو دیکھا جو لان کا تھا۔ میں نے سوچا کہ ناشتا کرنے سے پہلے لباس تبدیل کر لینا چاہیے جو شب خوابی کے لباس کی طرح تھا۔ اتفاق سے کوئی آ گیا تو شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ آئے گا کون؟ نہ میں نے کوئی ماسی رکھی تھی اور نہ ہی محلے اور پڑوس کی کوئی عورت ملنے آتی تھی۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک پڑی۔ مجھے اس لیے حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آیا ہوگا؟ اس وقت میرے شوہر کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھر سے سو قدم دور ہوتا تو اس کی موٹر سائیکل کی آواز سے آمد کا پتا چل جاتا تھا۔ محلے کی کوئی عورت مجھ سے ملنے اور راہ و رسم بڑھانے نہیں آئی تھی۔ میں نے دو ایک عورتوں کو اپنے گھروں کے دروازے پر کھڑے ہو کر مسکراتے دیکھا۔ شاید اس لیے میرا اور نذیر شاہ کا جوڑ کیسا ہے جوڑ تھا۔ جب کبھی میں نذیر شاہ کے ساتھ موٹر سائیکل پر جاتی تھی تو ان کی مسکراہٹ معنی خیز اور استہزائیہ سی ہوتی تھی۔ ان کے مکان اسی گلی میں تھے۔

میں نے جا کر دروازہ کھولا تو میری حیرت کی اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لمحے بھر کے لیے میں اپنا آپ بھول گئی۔ اپنی خبر ہی نہ رہی۔ دروازے پر میرے خوابوں کا شہزادہ فرید کھڑا تھا۔ وہ میری طرف مسکراتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دل میں اُتر جانے والی چمک سی تھی۔ اس نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

میں ایک دم سے چونکی۔ مجھے اپنی بداخلاقی کا احساس ہوا۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر بڑی ندامت سے کہا۔

"اوہ..... میں معافی چاہتی ہوں..... پلیز! اندر تشریف لائیں۔"

وہ اندر داخل ہوا تو میں نے دروازہ بند کیا اور اسے ساتھ لے کر نشست گاہ میں آئی۔ پھر ایک دم سے مجھے اپنے لباس کا خیال آیا۔ اس لباس میں..... میں ایک غیر مرد کے سامنے بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ اس میں..... بڑی بے حجابی تھی۔ میں اس سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آئی۔ جلدی سے لباس تبدیل کرتے ہوئے سوچا کہ اس نے مجھے اس عالم میں دیکھ کر کیا سوچا ہوگا؟ میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ جب میں کمرے میں پہنچی تو وہ ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

میں اس کے سامنے والے بڑے صوفے پر بیٹھی تو اس نے رسالے کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"بس اسٹاپ پر شبانہ اپارٹمنٹس ہیں نا، اس میں ایک اپارٹمنٹ دیکھنے آیا تھا۔ میں نے وہ لے لیا ہے۔ اور چھ ماہ کا کرایہ بھی ایڈوانس ..... دے دیا ہے۔ دو تین دن کے بعد شفٹ ہو جاؤں گا۔ مالک مکان روغن کرا کر دے رہا ہے۔ کچھ مرمت بھی ہے۔ وہ آج ہی شروع کر رہا ہے۔ میں اتوار کے دن اس میں شفٹ ہو جاؤں گا لہٰذا میں نے

سوچا کہ بتاتا چلوں۔"

"سچ.....!" میں خوش ہو گئی "یہ تو آپ نے بڑی اچھی خوشخبری سنائی۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ کو اتنی جلدی فلیٹ بھی مل گیا۔"

"نہیں آپ لوگ میرے نزدیک آنے سے پریشان نہ ہو جائیں کہ یہ کیا بلا ہے جو روز روز آ جاتی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

آپ نہیں جانتے کہ آپ کے یہاں آنے کی وجہ سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔" میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔ دوسرے لمحے فوراً ہی احساس ہوا کہ ایک غیر عورت ہونے کے ناتے یہ بات مجھے کہنا نہیں چاہیے تھی چونکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا اس لیے میں نے فوراً ہی بات بنائی۔ "آپ جلدی سے شادی کر کے گھر بسا لیں..... تاکہ اس گھر میں رونق آ جائے۔ عورت کے بغیر گھر سنسان ہوتا ہے۔"

"شادی.....!" وہ دلکش انداز سے مسکرایا "میں شادی صرف ایک ہی شرط پر کر سکتا ہوں..... یہ شرط آپ ہی پوری کر سکتی ہیں۔"

"کیسی شرط.....؟" میں نے حیران ہو کر اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

"آپ میرے لیے جولٹر کی یا عورت پسند کریں گی وہ نہ صرف آپ کی طرح حسین بلکہ نفیس اور شائستہ مزاج بھی ہو..... آپ ہی کی طرح عمدہ جامہ زیبی کا ذوق بھی رکھتی ہو۔ ایسے ہی لانبے ریشمی سیاہ بال ہوں۔ قد بھی آپ کے اتنا ہی ہو، غرض یہ کہ وہ ہر لحاظ سے آپ جیسی ہو۔"

میں اس کی بات سن کر مسکرانے لگی "ایسی لڑکی میں کہاں سے لاؤں ڈھونڈ کر۔ کراچی میں کسی کو نہیں جانتی اور نہ ہی میں کہیں جاتی ہوں؟ ہاں، لاہور ہوتا تو ایک نہیں ایسی بیسیوں لڑکیاں آپ کے روبرو کھڑی کر دیتی۔"

"میں لاہور جانے سے تو رہا..... میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا بلکہ بے فکری کی زندگی گزاروں گا..... لیکن کل جب آپ کو دیکھا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ پھر دل سے گھر بسانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"آپ مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں، جب میں لاہور جاؤں گی تو آپ کے لیے خود سے کہیں حسین لڑکی تلاش کر کے آپ کی شادی کرا دوں گی۔ میں اتنی حسین تو ہوں نہیں جو آپ میری اتنی تعریف کر رہے ہیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"آپ سے زیادہ حسین، دلکش اور پُرکشش لڑکی شاید ہی کوئی ہو۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "میں نے اپنی زندگی میں کیا، خوابوں میں بھی آپ کے جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ آپ اس قدر حسین ہیں کہ آپ کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔"

اس کی زبان سے میں اپنی تعریف سن کر پھولے نہ سمائی۔ اگر میرا شوہر میری تعریف کرتا رہتا تو شاید میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے محبت کی رمق پیدا ہو جاتی..... وہ نہ صرف بدصورت تھا بلکہ اس کا دل بھی کالا تھا اور وہ بدذوق بھی تھا۔ میرے حسن و جمال کا اصل قدردان اور باذوق فرید تھا۔ اس کی تعریف نے مجھے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟ چائے یا کافی..... شربت یا کولڈ ڈرنک۔"

اس نے فوری طور پر میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بس وہ مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور مرد اس طرح دیکھتا تو میرے دل میں نفرت کی لہر دوڑ جاتی۔ جب بھی میں اپنے شوہر کے ہمراہ نکلتی تو جوان لڑکے اور مرد مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور میرا بدن ٹٹولتے۔ مجھے ان کی گرسنہ نگاہوں سے وحشت ہوتی تھی، خوف آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ فرید بھی اس وقت مجھے ایک مرد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے اس پر اس لمحے ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے میرے سارے بدن میں ایک میٹھی سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ حسن کو ہر آنکھ دیکھتی ہے۔ قدرتی نظاروں کو حسین مناظر اور خوبصورت چیزوں کو۔ حسین لڑکیوں اور عورتوں کو..... او باش مرد بھی..... نیک اور پیارے لوگ بھی..... آنکھ کو بینائی اور نظارے کو پذیرائی قدرت نے عطا کی ہے۔ مجھے اس کی اس حرکت سے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی نظریں میرے حسن و جمال کو سراہ رہی تھیں۔

"آج گرمی اور حبس بھی بہت زیادہ ہے۔" وہ بولا "آپ شربت ہی بنا لائیں۔"

میں باورچی خانے کی طرف بڑھی تو میری چال میں ایک ارتعاش سا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں ایک خیال سانپ کی طرح پھنکارنے لگا..... نسیم..... اپنے آپ کو قابو میں رکھو..... اس مرد کو یہاں سے جلد از جلد رخصت کر دو۔ اس لیے کہ مرد اور ناگ کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ تنہائی کا زہر بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ گھر میں تم دونوں کے سوا کوئی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ یہ یک جائی تمہاری عزت کے لیے خطرہ ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تیل اور آگ کے ملن پر کوئی جلنے سے بچ گیا ہو۔ اس کا ایسے وقت آنا جبکہ تمہارا شوہر گھر پر نہیں ہے، اس کی بُری نیت کو ظاہر کرتا ہے، اسے چاہیے تھا کہ تمہارے شوہر کی موجودگی میں آتا۔

میں نے اپنے منہ زور جذبات کو دباتے ہوئے شربت کے دو گلاس تیار کیے۔ کمرے میں پہنچی تو وہ رسالہ دیکھ رہا تھا۔ شربت کا دور چلا۔ وہ مجھے اپنی نظروں میں جذب کرتا رہا تھا اور اس کی نظریں میرے نشیب و فراز کا طواف کر رہی تھیں۔ دل موہ لینے والی باتیں کیے جا رہا تھا..... کہہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں شادی کے بعد عورت سال دو سال میں فربہ اور بے کشش سی ہو جاتی ہے لیکن آپ کسی کنواری دوشیزہ کی طرح لگ رہی ہیں، جس کی شادی ہی نہیں ہوئی ہو۔ اس کا موضوع صرف میں اور میرا حسن و شباب اور دلکشی تھی۔ اس کے منہ سے تعریف کے الفاظ سن کر میری نگاہیں اس کی نظروں میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ جذبات بہنے لگے تھے۔ اِدھر میں اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ فطری تقاضوں سے انکار کر رہی تھی۔ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں چاہتی تھی کہ بہک جاؤں۔ وہ یہاں بیٹھا رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تو میں باوجود کوشش کے اسے روک نہ سکی۔ اگر میں اسے کھانے پر روکتی تو شاید وہ اس بہانے رک جاتا۔ اس نے جانے کے لیے بڑے رسمی انداز سے اجازت چاہی تھی۔ میں نے دل پر جبر کر کے اسے اجازت دے دی تھی۔ وہ گھر سے نکلا، میں کھڑکی پر لہراتے ہوئے پردے کی اوٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل تو ہو گیا تھا لیکن دل سے نہیں..... اس نے دو ایک مرتبہ دروازے کی طرف دیکھا بھی تھا۔ عورت..... مرد شناس ہوتی ہے۔ میں اس ابن آدم کو سمجھ چکی تھی۔ سمجھ رہی تھی۔ پھر میں بے چینی سے اس راستے کو دیکھنے لگی جس پر سے وہ گزرا تھا، جس پر اس کے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ میرے دل کے کسی کونے میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ وہ چلا کیوں گیا؟ میں نے اسے روکا کیوں نہیں؟ اسے جانے کیوں دیا؟ اسے آواز کیوں نہیں دی؟ اے میرے عشق کے دیوتا رک جاؤ۔ میرے دل میں جو عشق کی پیاس ہے اسے تو بجھا دو..... نہ جاؤ..... نہ جاؤ..... میرے اندر بے چینی کی ایک لہر اُٹھی۔ میں اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ میرے بے قرار دل کو ترس آنے لگا۔ میرے اندر کی بے چینی بھی دم توڑنے لگی۔ پھر میرے دل کے اندر کی نادیدہ آواز نے کہا کہ اچھا ہوا وہ چلا گیا۔ ورنہ میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔

پھر وہ تیسرے دن صبح آیا تو گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے کل بھی اس کا انتظار کیا تھا، آج بھی انتظار کر رہی تھی۔ انتظار کی یہ کیفیت بڑی جان لیوا و اذیت ناک تھی۔ میں نے کس طرح پل پل کاٹا، کھڑکی پر کتنی بار جا کر جھانکا، یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں نے بھی اپنے شوہر سے اس کی آمد کا ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ آیا تھا۔ اس نے بھی نذیر شاہ سے ملاقات پر اس بات کو چھپا لیا تھا۔ آج اسے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ بہت ہی پریشان دکھائی دیا۔ اس کا گرمی سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کل وہ فلیٹ میں منتقل ہو گیا اور سارا دن مزدوروں کے ساتھ اس کی سیٹنگ میں لگا رہا۔ رات کو ایک بج گیا۔ اس لیے وہ اس کام کو ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

چائے پینے کے بعد وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر مجھ سے افسردہ سے لہجے میں بولا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ فلیٹ ہی نہیں شہر اور ملازمت چھوڑ کر کسی اور شہر کو چلا جاؤں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے صدمے کا احساس ہوا۔ میں نے حیرت سے پوچھا تو میری آواز میں ارتعاش سا تھا۔

"وہ کس لیے؟ دو ایک دن میں کیا ہو گیا جو آپ اس قدر دل برداشتہ ہو رہے ہیں؟ اس روز تو آپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی؟"

"اس لیے کہ کسی کی صورت اور حسن و شباب نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ میری نیندیں چھین لی ہیں۔ دن میں ایک پل بھی میرے دل کو قرار نہیں رہتا۔"

اس خیال سے کہ وہ کسی عورت کے لیے پاگل ہو رہا ہے، میرا دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔ میں نے مردہ لہجے میں دریافت کیا "کون ہے وہ؟"

"وہ..... وہ تم ہو۔" اس نے میری نظروں کے روبرو آ کر میرے کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر انہیں تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "جس روز سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں، تمہارے بغیر زندگی سے کیا فائدہ؟"

"میری وجہ سے.....؟" میں اُچھل پڑی، مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میرے کانوں میں شیریں نغمہ گونجنے لگا۔

"ہاں..... تمہاری وجہ سے۔" وہ جذباتی ہونے لگا "مجھے یہ بات کہنا نہیں چاہیے تھی..... اس لیے کہ تم میرے عزیز دوست کی بیوی ہو..... مگر میں کیا کروں، دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ تمہارے اس حسین چہرے اور سراپا نے مجھے پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔ میرا دوست کتنا خوش نصیب ہے کہ اسے تم ملیں..... میں تم دونوں کی محبت اور زندگی کی راہ میں پتھر بننا نہیں چاہتا..... تم بھی شاید اس سے بے انتہا محبت کرتی ہو..... اور وہ بھی تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہے۔ کاش! میں تم دونوں جیسا خوش نصیب ہوتا۔"

"کون..... میں..... میں اس سے محبت نہیں کرتی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا "مجھے اس سے نفرت ہے..... نفرت!"

"کیا....." اس کے چہرے کی حیرت اور خوشی اس کی آنکھوں سے بھی نمایاں ہونے لگی۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ "تم اپنے شوہر سے خوش نہیں ہو؟ نذیر شاہ سے محبت نہیں کرتیں، کس لیے نسیم.....! کیا اس نے تمہیں خوش نہیں رکھا؟" وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔

"مجھے اس سے اس لیے بے پناہ نفرت ہے کہ وہ بدصورت ہے۔" میں بولے بغیر نہ رہ سکی "میں ایک حسین عورت ہونے کے ناتے اس سے کیسے محبت کر سکتی ہوں..... میرا اس سے کیا جوڑ..... وہ ایک لنگور کی مانند ہے۔"

"اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے لیے کسی بھی لحاظ سے بالکل بھی قابل نہیں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ تم اس کے ساتھ زندگی کیسے گزار رہی ہو؟"

"مجبوری کی بنا..... میرے والدین نے اس کی دولت و آمدنی کو دیکھ کر اس کے پلے باندھ دیا اس لیے..... میں اس سے آج تک ایک لمحے کے لیے بھی محبت نہیں کر سکی، دولت ہی سب کچھ تو نہیں ہوتی۔" میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"نسیم!" وہ میرے اور قریب آ گیا "میں وہ ایک بات کہہ دوں جو میں کہنے کے لیے دو دن پہلے آیا تھا لیکن کسی وجہ سے نہ کہہ سکا۔"

"کہہ دو..... بلکہ وہ سب جو تمہارے دل میں ہے، کہہ دو، رکو نہیں....." میں نے اس کی اُلفت زدہ آنکھوں میں جھانکا "جو بھی بات ہے وہ میں ضرور سنوں گی، میں تمہاری کسی بھی بات کا کوئی بُرا نہیں مناؤں گی۔"

اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے بازوؤں کے حصار میں قید کر لیا تو میں کسمسانے لگی، پھر اس نے مجھے بازوؤں کے حصار سے آزاد کر دیا۔

"تم پرائی عورت ہو..... میرے دوست کی بیوی ہو، بات کیسی بھی کیوں نہ ہو، بُرا تو نہیں مناؤ گی؟"

"کہو..... بغیر کسی خوف اور جھجک کے..... میں تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مناؤں گی۔" میں بال اور لباس درست کرتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں ہر قیمت پر پانا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے، تمہارے عشق نے مجھے پاگل کر دیا ہے نسیم! میں کہاں جاؤں..... کیا کروں؟ عشق کی آگ جلا رہی ہے..... اب تو میں تمہارے بغیر....."

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں اپنا چہرہ اوپر اُٹھا کر کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کہو..... رکو مت..... جو تمہارے دل میں ہے وہ زبان پر لے آؤ۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہاری ہی تلاش تھی..... تم جیسے شہزادے کی تلاش میں تھی..... جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھی تمہیں پانے کے لیے..... تمہیں پہلی بار دیکھا تو میرے دل نے چیخ کر کہا تھا، یہ تمہارا ہی محبوب ہے..... آج تمہیں سامنے دیکھ کر مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں، میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں، مانگنے کے لیے میرے پاس کوئی جھولی نہیں ہے..... اس لیے کہ میں ایک بدصورت شخص کی بیوی ہوں، اس کے باوجود میں اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے اپنا لو گے؟ کیا تم میرے بن سکتے ہو؟"

وہ مجھ پر جھک گیا۔ ہم وقت کے چکر سے نکل کر انسانیت کے ابتدائی دور میں پہنچ گئے جب اخلاق نے تہذیب کو چھوا نہیں تھا۔ میں اپنا مقام اور فرض بھول گئی تھی۔ شوہر سے میرا جو رشتہ تھا، وہ میں نے توڑ دیا تھا، عشق کی خاطر..... میں اس کی ہو چکی تھی۔

"فرید.....!" طوفان گزر جانے کے بعد میں نے کہا۔ "کیا میں نے غلط نہیں کیا، دنیا کیا کہے گی؟"

"نہیں، نہیں۔" وہ میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا "تم نے عشق کے سفر پر قدم رکھا ہے..... عشق اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ تم نے عشق کو عظیم کر دیا، لازوال کر دیا۔ دنیا بہت آگے جا چکی ہے اور مزید جا رہی ہے۔ عشق کا اختیار ہر کسی کو حاصل ہے۔ مبارک ہو، ہم نے عشق کی منزل پا لی۔"

اس کی باتوں میں جادو تھا، میرے دل کو بڑی تقویت سی ہوئی تھی۔ میں سہ پہر تک مدہوش سی پڑی رہی تھی۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ میری کس کس میں عجیب سی فرحت بھر گئی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی قربت میں ایسی سرشاری محسوس نہیں کی تھی۔ دل بستر چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ مجبوری تھی، کیونکہ میرے شوہر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ مجھے بے ترتیب بستر اور چادر درست کرنے کی جلدی تھی، شکنیں سب کچھ کہے دے رہی تھیں۔ بہ وقت تمام انہیں درست کیا۔ جلدی سے گرم پانی سے نہائی جس سے ساری تھکن اور مسل مندی دور ہوگئی۔ سارے جسم میں چستی سی آ گئی۔ نہانے کے فوراً بعد الماری سے جوڑا نکال کر پہنا۔ فرش پر جو لباس بکھرا ہوا تھا اسے واشنگ مشین میں ڈال دیا۔ جلدی جلدی گہرا میک اپ کیا تاکہ چہرے اور گردن کے سرخ سرخ نشانات چھپ جائیں۔ جب کہ میں ہلکا میک اپ کرتی تھی۔ جب میں اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ نذیر شاہ آ گیا، دیکھتے ہی بولا۔

''آج تو بڑا غضب ڈھا رہی ہو..... آج تمہارا میک اپ بھی بڑا گہرا ہے؟''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں ڈر رہی تھی کہ وہ سرخ نشانات نہ دیکھ لے، اس کی توجہ وہاں سے ہٹانے کے لیے سرد مہری سے بولی۔

''یہ بات تم روز ہی کہتے ہو۔ میں پارلر تھوڑی گئی، میں نے گھر پر ہی بنا سنگار کیا ہے۔''

پھر مجھے غیر محسوس انداز سے اس کو من مانی کی اجازت دینا پڑی۔ میں ایسا نہ کرتی تو وہ نشانات دیکھ لیتا، پھر اس نے کہا۔

''آج یہ تمہارے چہرے پر جو دمک اور آنکھوں میں چمک دیکھ رہا ہوں، وہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، کیا بات ہے؟''

''میں کیا جانوں.....؟'' میں نے بے پروائی سے اپنے شانے جھٹکے۔ میں اسے کیسے بتاتی کہ آج مجھے میرا خواب، میری منزل مل گئی ہے ''ایک منٹ..... میں چائے بنا کر لے آؤں۔''

''آج ہم جائے فرید کے ہاں چل کر پئیں گے۔ وہ اپنے فلیٹ میں منتقل ہوگیا۔'' اس نے مجھے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا ''اور وہ یہاں آیا تھا؟''

''نہیں.....'' جھوٹ بولتے ہوئے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا ''وہ یہاں کیوں آنے لگا؟''

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم دونوں اس کے ہاں جانے کے لیے نکلے۔ اس کا فلیٹ نصف فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنے فلیٹ خصوصاً اپنی خواب گاہ کو ایسے شاندار طریقے اور سلیقے سے آراستہ و پیراستہ کیا تھا کہ اس کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ بستر کے عین سامنے ایک بہت ہی بڑا سنگار میز بھی تھا۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ لمبا چوڑا پلنگ اور اس پر ایسا نرم و گداز بستر تھا جو مجھے آج تک نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ کمرا ائر کنڈیشنڈ بھی تھا۔ یہ خواب گاہ کسی شاہی محل سے کم نہیں تھی۔

وہ رات کا کھانا ہمارے ہاں آ کر کھانے لگا۔ دو دن میں ایک مرتبہ وہ دفتر سے کسی کام کے بہانے سے نکل کر میرے ہاں آ جاتا تھا۔ دو ایک گھڑی میں عشق کی آگ فروزاں کر کے چلا جاتا تھا۔ میں ایک روز اس کے فلیٹ پر گئی۔ اس روز اس نے میری خاطر دفتر سے چھٹی لی۔ میں سہ پہر تک وہاں رہی پھر اپنے گھر آ گئی۔ اس نے مجھے اپنے فلیٹ کی ایک ڈپلی کیٹ چابی بھی دے دی تھی کہ میں اس کی غیر موجودگی میں آ کر وقت گزار سکتی ہوں۔

یہ عشق کی آگ تھی جس میں جذبے سلگ رہے تھے۔ جیسے جیسے میں اس آگ کی بھٹی میں جل رہی تھی، ویسے ویسے اپنے شوہر سے میری نفرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ فرید میں ایک سلیقہ تھا، وہ محبت کے آداب سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس نے اپنی محبت کے جادو سے ایسا اسیر بنایا تھا کہ میں تخلیے میں اس کی باتیں سن کر پاگل ہو جاتی تھی اور اس کی قربت سے اور مدہوش ہو جاتی تھی۔

اِدھر میرے شوہر نے میری محبت میں شدت پیدا کرنے کی غرض سے دس تولے سونے کے زیورات کا ایک سیٹ خرید کر مجھے دیا تھا۔ اس وقت گھر میں سونے کے زیورات کی کوئی کمی نہ تھی۔ میرے گھر والوں نے جہیز میں تیس تولے کے زیورات کے تین سیٹ دیے تھے۔ ان دنوں سونا بے حد سستا تھا۔ جب ابو نے میری شادی کے لیے برسوں قبل خرید کر رکھا تھا۔ تب فصل بہت اچھی ہوئی تھی، لیکن اب سونے کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ لاکھوں کا ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی کویت سے جو ہیرے جواہرات کے سیٹ شادی کے لیے لایا تھا، اس نے کویت اور عراق کی جنگ میں کوڑیوں کے مول خریدے تھے۔ ان کی مالیت تیس لاکھ سے کم نہیں تھی۔ ایک روز میں نے فرید کو تمام زیورات دکھائے تو اس نے بتایا تھا کہ چالیس لاکھ سے کم کی مالیت کے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ گھر میں دو لاکھ کے انعامی بانڈز تھے اور بینک میں قومی بچت کے دس لاکھ کے بانڈز نذیر شاہ نے خرید رکھے تھے۔ یہ سب کچھ بارہ برسوں کی کمائی تھی جو اس نے کویت میں حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے تین لاکھ کی بیمہ پالیسی بھی لی ہوئی تھی تاکہ کسی وقت میرے کام آئے۔

معلوم نہیں کیوں میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ بن سکی اور نہ اس کا عشق مجھے اپنی طرف مائل کر سکا..... وہ

بے وقوف نہیں جانتا تھا کہ عورت کا عشق دولت، کپڑے اور زیورات سے خریدا نہیں جاتا۔ ہر عورت کے اپنے خواب ہوتے ہیں۔ فرید جو میرا خواب اور آئیڈیل تھا، اس دولت سے کہیں زیادہ تھا اس لیے میں اس کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح جا گری تھی۔

ایک روز میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آخر ہم دونوں چوری چھپے ملتے رہیں گے۔ میں کبھی اس کے فلیٹ میں چلی جاتی تھی لیکن وہ اکثر میرے ہاں ہی آتا تھا۔ مجھے اس کی نہایت آراستہ و پیراستہ خواب گاہ حد سے زیادہ پسند تھی۔ اس کی جدائی شاق گزرتی تھی۔ میں اپنے شوہر سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ اس طرح چوری چھپے ملنے، محبت کرنے اور جدائی سے تنگ آ چکی تھی۔ یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ میرا شوہر اور بدصورت دکھائی دینے لگا تھا۔ معلوم نہیں کیا بات تھی، جب سے فرید آنے لگا تھا اس کی محبت میں بڑی گرم جوشی اور وحشیانہ پن آ گیا تھا۔ وہ میرے لیے نت نئے اور بھڑکیلے لباس خرید کر لانے لگا تھا جس میں میرا حسن و جمال دو آتشہ بن جاتا تھا۔ میرے لیے اپنے شوہر کو خوش کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے اب تک خود سپردگی سے کبھی اس کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی اور نہ اس نے کبھی شکایت کی۔ میں بیک وقت دو مردوں کے منہ زور جذبات کی تسکین کیسے کر سکتی تھی اس لیے میں اس سے مزید سرد مہری سے پیش آنے لگی تو اس کا اُلٹا اثر ہونے لگا تھا۔

نشاط انگیز لمحات گزر جانے کے بعد فرید نے خود ہی اس موضوع کو چھیڑا۔ گفتگو کرنے کے لیے میں نے سوچا تھا۔ اس نے کہا ''آخر ہم کب تک اس طرح ملتے اور ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ مجھ سے تمہاری یہ جدائی برداشت نہیں ہوتی، تم نہیں جانتیں کہ میں ساری رات کس طرح انگاروں پر لوٹتا رہتا ہوں۔ اگر کچھ دنوں تک یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گا۔ میں خودکشی کر لوں گا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

میں اس کی بات سن کر اس طرح سے تڑپ اُٹھی جیسے کسی نے میرے وجود پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ میں نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس نے بڑے جذباتی انداز سے اسے تھام لیا۔ ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا لیا پھر اسے اپنے سینے پر دل کی جگہ رکھ کر جذباتی لہجے میں بولا۔

''تمہاری اس چاہت نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے تدبیر بتائی جسے سن کر پہلے تو میں اُچھل پڑی، جب اس نے سمجھایا تو میری سمجھ میں آیا کہ اس کے سوا کوئی راستہ اور چارہ نہیں ہے۔ اپنی منزل، خواب اور آئیڈیل کو میں حاصل کر سکتی ہوں کہ اس کی بات آنکھیں بند کر کے مان لوں۔ اتنی دور جانا میرے لیے کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے شوہر کے قتل ہونے کی صورت میں نہ صرف بیمہ کی رقم دگنی ملے گی بلکہ میں اس کی تمام دولت کی قانونی مالک بھی ہو جاؤں گی۔ پھر ہم شادی کر کے ایک ہو جائیں گے۔ یہ ساری دولت لے کر دبئی چلے جائیں گے۔ جانے سے پہلے شادی کر لیں گے تاکہ ایک ہو جائیں۔ اس نے قتل کا جو منصوبہ بتایا، وہ یہ تھا کہ وہ رات کے وقت عقبی دروازے سے اندر داخل ہوگا۔ وہ میرے شوہر کو سائلنسر لگے پستول سے بلا تامل گولی مار کر ہلاک کر دے گا۔ اس سے پہلے میری مشکیں کس دے گا۔ الماری میں سے سارے زیورات اور نقدی لے کر چلا جائے گا۔ میں پولیس کو بیان دوں گی کہ چار مسلح نقاب پوش گھر میں گھس آئے تھے۔ میرے شوہر کو مزاحمت پر گولی مار دی۔ آج کل شہر میں ڈکیتی کی وارداتیں آئے دن ہو رہی ہیں، اس لیے پولیس کو قتل کے منصوبے پر کوئی شک نہیں ہوگا۔

صبح ہوتے ہی میرے شوہر کے دفتر جاتے ہی فرید آ گیا اور اس نے کہا کہ اس منصوبے پر آج رات ہی عمل کیا جائے گا۔ وہ اس وقت دفتر ایک ضروری کام سے جا رہا ہے۔ دو بجے تک اس کی واپسی ہوگی تاکہ اس منصوبے کا مزید جائزہ لیا جائے۔ اس کے جانے کے ایک گھنٹے بعد میرا دل گھبرانے لگا اور وحشت ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ فرید کے فلیٹ میں اس کا انتظار کروں اور وہیں وقت بھی گزار لوں۔

میں نے کپڑے بدلے، برقع پہنا اور فلیٹ کی طرف چل پڑی۔ جب فلیٹ کے دروازے پر پہنچی تو اندر سے فرید کی آواز سنائی دی جیسے وہ فون پر کسی سے بات کر رہا ہو۔ میں نے چابی تالے کے سوراخ میں ڈال کر دروازہ بے آواز کھولا اور بند کیا۔ ٹی وی لاؤنج میں پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ سامنے خواب گاہ تھی۔ اس کی دہلیز پر پردہ پڑا تھا۔ خواب گاہ میں سے ایک عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی۔

''تم کتنے دنوں سے کہہ رہے تھے کہ دبئی کی سیر کرانے لے جاؤں گا۔''

''صرف ایک دن کی بات ہے.....'' فرید نے جواب دیا ''آج رات مجھے ساٹھ لاکھ کے زیورات اور بیس لاکھ کی رقم ملنے والی ہے۔ اس کے علاوہ دو لاکھ روپے کے انعامی بانڈز بھی ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے فریب دے رہے ہو؟" وہ تنک کر بولی "تم اپنے دوست کی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے چلے جاتے ہو۔"

"وہ تو میرے دوست کی بیوی ہے، محبوبہ نہیں اور نہ ہی میں اس سے کوئی عشق لڑا رہا ہوں۔ ایک کھلونا ہے، وقت گزاری کا، تمہیں خواہ مخواہ شک ہو رہا ہے۔ صرف ایک بار میں بہک گیا تھا..... تم زیادہ جذباتی نہ ہو اور غصے میں نہ آؤ۔"

"شک کیوں نہیں ہوگا..... میں نے اس کمینی کو ایک بار دیکھا ہے، وہ بہت حسین اور سولہ برس کی لگتی ہے۔"

"وہ تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ دنیا تمہاری اشتہاری فلمیں دیکھ کر کیا پاگل نہیں ہو رہی ہے۔ آج یہ کریڈٹ کے جا رہا ہے؟ کالی راتوں کی آمدنی..... نجی محفلوں میں تمہارے ہر قسم کے ہوش ربا رقص، جن پر ہزاروں کے نوٹ نچھاور کیے جاتے ہیں۔ اگر میں تمہیں متعارف نہ کراتا..... کمرشل کو رنہ دیتا تو تمہیں کون پوچھتا۔" فرید احمد نے کہا "نیلم! کیا میں نے کبھی اس میں اپنا حصہ طلب کیا؟"

"یہ سچ ہے کہ جب میں تیرہ برس کی تھی تو تم نے شوبز نس میں متعارف کرایا..... تم میرے پہلے مرد رہے..... سنو، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری تصویریں اور نگیٹو مجھے دے دو..... تاکہ میں آزاد ہو جاؤں..... تم نے اپنا حصہ طلب تو نہیں کیا..... لیکن مجھے جہاں بھیجتے ہو ان سے جو کمیشن لیتے ہو۔ اب درمیان میں وہ کمینی بھی آ گئی، میرا دل کرتا ہے کہ اس کمینی کے چہرے پر تیزاب پھینک دوں۔"

"ہاں..... تمہیں یہ کام کرنا ہے، تم جیسے ہی یہ کام کرو گی، میں تمہاری تصویریں دے دوں گا۔ تمہارا یہ احسان ہوگا..... وہ جونک بن گئی ہے۔ کہتی ہے کہ تم سے عشق ہو گیا ہے، وہ اپنے شوہر کو موت کی نیند سلانے پر بھی تیار ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اس کے چہرے پر تیزاب کب پھینکوں؟" اس نے پوچھا۔ میرے جسم پر دہشت کی لہر دوڑ گئی۔

"آج کی رات رک جاؤ۔" وہ بولا "اس لیے کہ اس کے گھر پر ڈاکا مارنا ہے..... اس کے پاس جو زیورات ہیں وہ ساٹھ لاکھ کی مالیت کے ہیں۔ گھر میں بیس لاکھ کی نقدی اور دو لاکھ کے انعامی بانڈز بھی ہیں۔"

"پھر کیوں نہ ہم دبئی جا کر جشن اور ہنی مون ساتھ منائیں۔ یہ باسی ہنی مون بھی قیامت ہوگا۔"

"ہاں..... اس بریف کیس میں کیا ہے؟" فرید نے پوچھا "یہ کیا لائی ہو؟"

"دو کلو ہیروئن ہے۔" اس نے جواب دیا "شیرازی خان نے اس کام کا معاوضہ دیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے دبئی لے جاؤ..... دبئی میں اس کے تین کروڑ پاکستانی مل جائیں گے۔"

"ہیروئن لے جانا اتنا آسان نہیں ہے۔" فرید بولا۔

"وہ ہر تین مہینے میں دو کلو ہیروئن دبئی لے جاتا ہے۔ سنو..... کس طرح....." نیلم اسے بتانے لگی۔

"ویری گڈ!" فرید خوش ہو کر بولا "واقعی، یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ چلو آؤ، ہم جشن منائیں۔"

میری نظروں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ اگر میں کرسی کا سہارا نہ لیتی اور مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو شاید بے ہوش ہو جاتی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بھونچال آ گیا ہو۔ کمرے میں وہ دونوں جانور بن گئے تھے شاید..... ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا۔ میں نے سوچا میں سامنے چلی جاؤں پھر ہوش آیا، تو قیر سے پہلا عشق کیا، وہ ناکام رہا۔ یہ دوسرا عشق تھا، یہ بھی ناکام رہا۔ میں نے ایک لحظہ میں بہت کچھ سوچ لیا۔ ان دونوں سے انتقام لینا تھا۔ میں ان کے چہروں پر تیزاب پھینک کر قانون کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں باہر نکلی، دروازہ بند نہیں کیا، بھیڑ دیا اور گھر آ گئی۔ فون سے بفرزون پولیس اسٹیشن کا نمبر لے کر رابطہ کیا۔ نذیر شاہ کبھی کبھی مجھ سے فون پر رابطہ کیا کرتا تھا۔ میں نے پہلی بار کسی کو فون کیا تھا۔

شام نذیر شاہ جلد گھر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ آج پولیس نے فرید کے فلیٹ پر چھاپہ مارا تو دونوں یعنی فرید اور مشہور ماڈل گرل نیلم رنگ رلیاں مناتے پکڑے گئے۔ دو کلو ہیروئن بھی..... میں نے نذیر شاہ کو بتایا نہیں کہ یہ فون میں نے کیا تھا۔ میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر عورتوں کے ہجوم میں سے ان کی گرفتاری کا منظر دیکھا تھا۔ پولیس انہیں وین میں بٹھا کر لے گئی تھی۔

"کمینی مجھ پر تیزاب پھینکنے والی تھی..... اور فرید نے بھی مجھے دھوکا دیا تھا۔"

رات جب نذیر شاہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ مجھے بے حد خوبصورت اور پیارا سا لگا۔ میرے دو عشق ناکام ہو چکے تھے۔ یہ تیسرا عشق کبھی ناکام نہیں ہو سکتا تھا، میں نے سوچا۔ میں پہلی بار وارفتگی، والہانہ انداز اور پوری خود سپردگی سے اس پر نچھاور ہو گئی۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر مجھے خواب کی سی حالت میں دیکھ رہا تھا۔

گرگٹ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں ایک کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتا ہوں اس لیے نوجوانوں کی نفسیات پر عبور ہونے کا دعویٰ کیا کرتا تھا مگر اس نوجوان نے میرے دعوے کو، میرے تجربے کو مات دے دی۔ کس طرح، یہی کچھ میں نے اپنی اس روداد میں بتانے کی کوشش کی ہے۔
نفیس خیال
(کراچی)

گولیوں کی کرخت، ہیبت ناک اور خون منجمد کرنے والی آوازوں سے پورا علاقہ گونج رہا تھا۔

اس وقت رات کے صرف آٹھ بجے تھے۔ لیکن وہ پورا علاقہ اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ فلیٹس کے مکینوں نے کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ دکان کے شٹر گرے ہوئے تھے۔

ہر طرف تاریکی اور خوف۔ ایسے عالم میں راستے کا ہوش کسے رہتا ہے۔ مجھے ہوش نہیں تھا اور ویسے بھی میں اس علاقے کی گلیوں اور سڑکوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔

میں بس کسی بھڑکے ہوئے گھوڑے کی طرح اپنی جان بچانے کے لئے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے کس طرف۔ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ میں گرا اور میری دنیا اندھیری ہو گئی۔

میری عینک میرے چہرے سے نکل کر آس پاس ہی کہیں گر چکی تھی۔ میرے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں۔ وہ بھی ایک طرف جا گری تھیں۔ میں زمین پر دونوں ہاتھوں کی مدد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اپنی گری ہوئی عینک ٹٹولتا پھر رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

اچانک کسی نے میری عینک مجھے پکڑا دی۔ ''یہ لیں اپنی عینک۔ ٹوٹی نہیں ہے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے عینک لگالی۔ اندھیرے کے باوجود کسی حد تک کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔ میرے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ شلوار قمیص میں۔ اس کے ہاتھ میں کوئی اسلحہ دبا ہوا تھا۔ اب مجھے اتنی پہچان تو ہے نہیں کہ میں یہ بتا سکتا کہ یہ ٹی ٹی ہے، ریوالور ہے یا کچھ اور ہے لیکن تھا وہ آتشیں اسلحہ۔

اس نوجوان نے میری کتابیں بھی سمیٹ کر میرے حوالے کردیں۔ ''کون ہو تم؟ اس علاقے میں کیسے آگئے؟''

''بس بھائی۔ قسمت لے آئی۔''

اسی وقت تھوڑے ہی فاصلے پر گولیاں چلنے لگیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹنے لگا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ جلدی۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔''

سامنے ہی فلیٹ کی ایک اونچی بلڈنگ تھی۔ جس کا گیٹ بند کردیا گیا تھا۔ وہ مجھے لے کر اس گیٹ میں داخل ہوگیا اور گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی ایک جوان العمر قبول صورت عورت تھی۔ ''تارہ۔'' اس نوجوان نے اس عورت کو مخاطب کیا۔ ''ان کا خیال رکھنا۔ یہ بے چارے بلوے میں پھنس گئے تھے۔''

''اور تم کہاں جارہے ہو؟'' عورت نے پوچھا۔

''میں ابھی آرہا ہوں۔''

''نہیں۔ تم نہیں جاؤ گے۔'' اس عورت نے اس نوجوان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ۔ اندر آؤ۔ اب بہت ہوگئی۔''

'ارے بابا۔ میرے دوست میرا انتظار کررہے ہوں گے۔''

''لعنت بھیجو اپنے دوستوں پر۔'' اس عورت نے اس نوجوان کو اندر کھینچ کر دروازہ بند کرلیا تھا۔

''تارہ۔ کبھی کبھی تم بہت ناسمجھ ہوجاتی ہو۔'' وہ نوجوان بے بسی سے بولا۔

اندر آکر میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ دراز قامت۔ تندرست بدن، گورا رنگ۔ اس نے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے اپنا ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ باہر سے گولیوں کی آوازیں ختم ہوگئی تھیں لیکن پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دے رہے تھے۔

ہم تینوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔

''بھائی صاحب۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟'' اس نوجوان نے پوچھا۔

''نارتھ ناظم آباد میں۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ۔ اور کرتے کیا ہیں؟''

''ایک کالج میں پڑھاتا ہوں۔''

''اوہ۔ پھر تو آپ پروفیسر ہوئے۔ اسی لئے آپ کے ہاتھ میں کتابیں ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''نام کیا ہے آپ کا؟''

''نفیس خیال۔''

''نام بھی بہت عالمانہ اور شاعرانہ قسم کا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''بالکل آپ کی طرح اور میرا نام تیمور ہے۔''

''جس طرح تم کھردرے اور وحشی ہو۔ اسی طرح تمہارا نام بھی ہے۔'' وہ عورت بول پڑی۔

اب میں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ عورت نہیں بلکہ لڑکی تھی۔ میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کی۔ اس کے صبیح چہرے پر اس کی آنکھیں بہت کمال کی تھیں۔

''تیمور۔ تم کرتے کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مت پوچھیں۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''ورنہ ناراض ہوکر چلے جائیں گے۔''

تارہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں خاموشی تو رہی تھی لیکن میں اُلجھ رہا تھا۔ یہ نوجوان کون تھا؟ اس کے پاس اسلحہ کیوں تھا اور اس لڑکی سے اس کا کیا تعلق تھا؟ اس قسم کی کئی سوالات میرے ذہن میں تھے۔

کچھ دیر بعد تیمور نے موبائل پر کسی سے بات کی پھر موبائل آف کر کے میری طرف دیکھا۔ ''پروفیسر صاحب! راستہ کلیئر ہوگیا ہے۔ آپ اب آرام سے جاسکتے ہیں۔''

''تمہارا اور ان خاتون کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم مدد نہیں کرتے تو نہ جانے کیا ہوجاتا؟''

''چلیں۔ میں آپ کو اسٹاپ تک پہنچا دیتا ہوں بلکہ ایک منٹ ٹھہریں۔ میں ذرا واش روم تک ہوآؤں۔''

اس کے جاتے ہی اس لڑکی تارہ نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑا دیا۔ ''اسے رکھ لیں۔ اس پر میرا موبائل نمبر ہے۔ آپ مجھ سے ضرور رابطہ کریں گے۔ رکھ لیں اس کو۔''

میں نے وہ نمبر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد تیمور بھی آگیا۔ اس نے مجھے اسٹاپ تک پہنچا دیا تھا۔

باہر اب سب کچھ نارمل تھا۔

لوگوں کا آنا جانا۔ گاڑیاں، دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ خریداریاں بھی ہورہی تھیں۔ شاید ہمارے شہر کے لوگوں کے لئے یہ سب کچھ عام زندگی کی بات ہوکر رہ گئی ہے۔

ایک معمول ہے۔ گولیاں چلتی ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ فلاں کی ٹارگٹ کلنگ ہوگئی۔ وزیروں امیروں کے ایک جیسے بیانات آتے ہیں۔ پھر سب کچھ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔

سکون کی یہ کیفیت بس دو چار دنوں تک رہتی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک بار کسی محلے میں گولیاں چلتی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی زد میں آجاتے ہیں۔ کہرام برپا ہوتا ہے۔ پھر نہ سمجھ میں آنے والے بیانات اور خاموشی۔

خدا جانے بقول منیر اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے۔ کیوں ایسا ہوتا ہے۔ اس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں مل سکا ہے۔ ٹی وی کے مختلف چینلز پر کچھ لوگ آکر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر الزام تراشیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

میں اپنے فلیٹ میں آکر بہت دیر تک اس نوجوان کے کردار کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ بہ ظاہر وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ صورت شکل بھی بہت مناسب تھی۔

لیکن کچھ اشارے یہ کہہ رہے تھے کہ معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا دکھائی دے رہا ہے۔ پھر اس لڑکی کا رویہ۔ اس نے اپنا موبائل نمبر مجھے کیوں دیا تھا۔ کیا چاہتی تھی مجھ سے؟

بہرحال کئی دنوں کے بعد وہ لڑکی بھی ذہن سے نکل گئی۔ اسے فون کرنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

ایک دن کالج سے واپسی پر میں نے لانڈری میں کپڑے دینے کے لئے جب مختلف جیبوں کی تلاشی لی تو ایک جیب سے اس کا نمبر بھی نکل آیا۔ میں نے کچھ سوچ کر اس کا نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے اس نے ریسیو کیا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ ''ہیلو میں پروفیسر نفیس خیال بول رہا ہوں۔''

''اوہ پروفیسر صاحب۔ کہاں تھے آپ۔ میں تو کئی دنوں سے آپ کے فون کا انتظار کررہی تھی۔''

''مصروفیت ایسی ہوگئی تھی کہ دھیان نہیں رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تیمور کیسے ہیں۔''

''ان ہی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنی تھی۔ کیا آپ میرے پاس آسکتے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔ پھر اضافہ کیا۔ ''یا آپ جہاں بلائیں۔ میں آجاتی ہوں۔''

''چلیں۔ میں آرہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تو سکون ہوگیا ہوگا۔''

''ہاں سکون ہی ہے۔'' وہ ایک عجیب انداز سے بولی۔ ''آپ کب تک آرہے ہیں۔''

''شام تک۔''

شام کو جب وہاں پہنچا تو ہر طرف زندگی اپنے معمول پر تھی۔ کوئی شور نہیں۔ کوئی ہنگامہ نہیں۔ سب کچھ معمول کے مطابق۔ میں نے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ تارہ ہی نے کھولا تھا۔ وہ آج مجھے پہلے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

''آجائیں اندر۔'' اس نے کہا اور خود ایک طرف بیٹھ گئی۔

اس کے فلیٹ میں بھی سکون تھا لیکن اس کے چہرے

Monthly Digest
USPENSE
سسپنس
RGUZASHT
سرگزشت
AKEEZA
پاکیزہ
ASOOSI
جاسوسی
WELCOME BOOK SHOP
مکتبہ اعلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر بے سکونی تھی۔ ''تشریف رکھیں۔'' اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''پروفیسر صاحب۔ آپ کو میں نے اس لئے زحمت دی ہے کہ آپ تیمور کو سمجھ سکیں۔'' اس نے کہا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

''پہلے یہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں میرے اور تیمور کے درمیان کیا رشتہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ آپ اس کی سسٹر یا اور کوئی رشتے دار تو نہیں ہوسکتیں۔'' میں نے کہا۔ ''یا تو بیوی ہوسکتی ہیں یا اس کی دوست۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں اس کی دوست ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ آرام سے بیٹھ کر میری کہانی سنیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ تیمور چار پانچ دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ اسی طرح ہر واردات کے بعد چلا جاتا ہے۔''

''واردات کے بعد!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ اس سے یہ اندازہ نہ لگالیں کہ وہ خود کسی واردات میں ملوث ہوتا ہوگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟''

''ضد کی وجہ سے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس طرح میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ پہلے تو آپ سمجھ لیں۔ میں کیا ہوں۔ والدین کی موت کے بعد تقریباً تنہا ہوگئی تھی۔ بی اے کرچکی ہوں۔ تقریباً تنہا اس لئے کہا ہے کہ میرے ایک بڑے بھائی بھی ہیں جو کہ شادی کے بعد صرف اپنی بیوی کے ہوکر رہ گئے۔ میں گرچہ ان کے ساتھ ہی رہتی تھی لیکن نہ رہنے کے برابر۔ میں اپنی جاب تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ خیال تھا کہ ملازمت کے بعد علیحدہ ہوجاؤں گی۔''

ایک دن ایک اخبار میں ایک ریسپشنسٹ کی جاب دیکھی۔ ملازمت کی ضرورت وہاں تک لے گئی۔ وہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ پہلی منزل پر جہاں دو مکروہ صورت لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں ان کے سامنے پہنچی تو وہ اس طرح مجھے دیکھنے لگے جیسے میرے حسن اور میرے جسم کا اندازہ لگا رہے ہوں۔

ان کی بھوکی نگاہیں مجھے اپنے بدن پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ ''تم کو شام پانچ بجے کے بعد بھی رکنا ہوگا۔''

''وہ کیوں؟ کام تو پانچ بجے تک ختم ہوجاتا ہے۔''

''ہاں دفتر کا کام تو ختم ہوجاتا ہے لیکن کچھ اپنے کام بھی تو ہوتے ہیں۔'' دوسرے نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اس کی بکواس سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں انہیں برا بھلا کہتی ہوئی دفتر سے باہر آگئی۔

اس وقت میں رو رہی تھی۔ جی ہاں۔ باقاعدہ رو رہی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے یہی تیمور ملا گیا۔ وہ بھی شاید پہلی منزل کے کسی دفتر میں جا رہا تھا۔

اس نے جب مجھے روتے ہوئے سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھا تو میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ''بی بی۔ بات سنو۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔ خیریت تو ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں سیڑھیاں اترنے لگی لیکن اس نے پھر میرا راستہ روک لیا۔ ''بتاؤ مجھے۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ کیا مسئلہ ہوا ہے؟''

اب مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں پھٹ پڑی۔ ''یہ کمینے لوگ نوکری دینے کے بہانے مجبور لڑکیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''بتاؤ۔ کس نے ایسا کیا ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

میں چونکہ اس وقت غصے میں بھری ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے اس دفتر کے دروازے کی طرف اشارہ کردیا۔ ''اس میں دو جینٹس بیٹھے ہیں۔ جو مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کررہے تھے۔''

''تم آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''میں جارہی ہوں۔''

''نہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''تمہارے بغیر کام نہیں چلے گا۔ آؤ۔''

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوتا اور میں اس کے ساتھ اس دفتر میں جا کر پھنس جاتی لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی سچائی تھی کہ میں اس کے ساتھ ہولی۔

وہ مجھے لے کر بے دھڑک اس دفتر میں گھس گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تیمور نے اپنی

جیب سے ٹی ٹی نکال کر ایک کے سینے پر رکھ دی۔ ''حرامزادے۔ کس بات کا دفتر کھول رکھا ہے۔'' پھر اس نے ٹی ٹی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کو کور کئے رہو۔ میں ان کی ساری بدمعاشی نکالتا ہوں۔''

ان دونوں سے تو کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

تیمور نے پھر ان دونوں کی ٹھکائی شروع کردی۔ لہولہان کردیا اور ساتھ میں یہ بھی بولتا جا رہا تھا کہ ''اگر آواز نکلی تو گولیاں حلق میں اُتار دوں گا۔''

جان کے خوف سے دونوں چپ چاپ مار کھاتے رہے۔ پھر تیمور نے ان دونوں سے کہا۔ ''اگر آئندہ ایسی حرکت ہوئی نا تو زندہ گاڑ دوں گا۔ تیمور ہے میرا نام۔ اپنے باپ سے پوچھ لینا۔''

اس دن پتا چلا کہ عیاش اور بے غیرت قسم کے لوگ کتنے بزدل ہوتے ہیں، یہ صرف کمزور لڑکیوں پر ستم کرنا جانتے ہیں۔ تیمور نے ذرا سی دیر میں ان کی ساری بدمعاشی نکال دی تھی۔

بس یہ تیمور سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم اکثر ملتے رہے اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ پھر اس نے مجھے سہارا دیا اور یہ فلیٹ میرے لئے خرید کر میرے حوالے کردیا۔ اب میں اسی فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میرے اخراجات وہی برداشت کرتا ہے۔ لوگ ہم دونوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں لیکن اصل کہانی یہ ہے۔

''اور تمہارے گھر والے۔''

''گھر میں ہے ہی کون سوائے بھائی کے اور بھائی کو میری پروا کب رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور خود تیمور کیا کرتا ہے۔''

''سب کچھ۔'' وہ مسکرادی۔ ''وہ عجیب کریکٹر کا انسان ہے۔ ایک طرف تو بدمعاش اور دہشت گرد ہے۔ دوسری طرف انتہائی نرم دل اور ہمدرد بھی ہے۔ پیار کرنا جانتا ہے۔ دوسروں کی بے جھجک مدد کردیتا ہے۔''

''اس کا بیک گراؤنڈ۔ میرا مطلب ہے اس کی فیملی۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے گردن ہلائی۔ ''آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس کا تعلق ایک بہت بڑی فیملی سے ہے۔ بہت دولت مند اور مشہور لوگ ہیں۔ آپ نے نیورو سرجن ڈاکٹر جواد کا نام سنا ہے؟''

''ہاں۔ ہاں۔ وہ تو پاکستان کے بہت مشہور ڈاکٹر ہیں۔''

''وہی تیمور کے والد ہیں۔'' تارہ نے بتایا۔

''کیا۔'' میں یہ سن کر واقعی حیران رہ گیا تھا۔ ''ڈاکٹر جواد تیمور کے فادر ہیں؟''

''جی ہاں۔ اور یہ بات بھی مجھے اتفاقاً معلوم ہوگئی تھی۔ ورنہ تیمور نے خود سے کبھی نہیں بتایا۔''

''مجھے واقعی حیرت ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تو بہت دولت مند آدمی ہیں۔ اپنا اسپتال ہے۔ سب کچھ ہے ان کے پاس۔ پھر ان کی اولاد ایسی کیوں ہوگئی؟''

''پروفیسر صاحب، یہی تو میں چاہتی ہوں کہ تیمور جو کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ وہ چھوڑ دے۔ سلیقے کی زندگی گزارے۔ اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلا جائے۔''

''تم واقعی اس کی ہمدرد معلوم ہوتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''فرض کرو وہ گھر واپس چلا گیا تو پھر تمہارا کیا ہوگا؟''

''پروفیسر زندگی یہ جو زندگی ہے نا۔ اس کا سفر ہر حال میں جاری رہتا ہے۔''

''یہ ٹھیک کہتی ہو۔''

''تو پھر وعدہ کریں آپ اس کے والدین سے ملیں گے اور معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ پھر آپ تیمور سے مل کر اسے سمجھائیں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ میری بات مان لے گا۔''

''کوشش کرکے دیکھیں۔ ویسے وہ آپ کو پسند کرنے لگا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ بھی آپ کو یہاں لے کر نہیں آتا۔ وہ اسی قسم کا آدمی ہے۔''

میں نے تارہ سے وعدہ کرلیا کہ میں تیمور کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ ویسے مجھے تیمور کے لئے تارہ کی پریشانی اور اس کی فکر دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ یہ لڑکی اس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی ضروریات پسند.... ناپسند سے بھی واقف ہے۔ میں وہاں بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا اور اس دوران... وہ لڑکی صرف تیمور ہی کی بات کرتی رہی تھی۔

میں.... بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

اس لئے نہیں کہ تیمور کے لئے تارہ کی محبت دیکھ کر میں حسد میں مبتلا ہوگیا تھا بلکہ اس لئے کہ اس لڑکی کے حوالے سے مجھے کوئی اور یاد آگیا تھا۔

بہت پہلے کوئی میرے لئے بھی اسی طرح بے قرار رہتا تھا، اسے میری فکر پریشان رکھتی تھی۔ خیر۔ وہ وقت تو نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے کب کا گزر چکا تھا۔ اب میں تھا اور میرے ساتھ یادیں تھیں۔

میں نے کسی سے ڈاکٹر جواد کا نمبر حاصل کیا۔ ویسے بھی وہ بہت مشہور آدمی تھے۔ ان کا نمبر ملنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے براہِ راست ڈاکٹر جواد ہی سے بات کی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ میں پروفیسر نفیس خیال ہوں۔''

''جی' پروفیسر صاحب فرمائیں۔'' دوسری طرف بہت مہذب اور نرم لہجے میں پوچھا گیا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ مجھے آپ سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ سے یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

''دیکھیں اگر کوئی پرابلم ہے تو آپ میرے سیکریٹری کو بتادیں۔ وہ آپ کو وقت دے دے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ کچھ اور مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اسے ذاتی مسئلہ سمجھ لیں۔ لیکن اس کا تعلق میری نہیں بلکہ آپ کی ذات سے ہے اور یہ ملاقات آپ کے کلینک یا اسپتال میں نہیں بلکہ گھر میں ہونی چاہئے۔''

''اوکے۔ میں اپنا شیڈول دیکھ لوں۔ آپ مجھے دس منٹ بعد فون کرلیں۔''

میں نے جب دس منٹ کے بعد فون کیا تو ڈاکٹر نے بتایا۔ ''ٹھیک ہے پروفیسر صاحب۔ آپ کل مغرب کی نماز کے بعد میرے گھر آسکتے ہیں۔ میں آپ کو ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب نے اپنا ایڈریس سمجھا دیا تھا۔

دوسری شام کو سات بجے میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ بہت ہی شاندار گھر تھا۔ جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بہت پیسے والے شخص ہیں۔ ملازم نے مجھے ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ تیمور کی فریم کی ہوئی خوبصورت تصویر تھی۔ جو دیوار پر لگی ہوئی تھی۔

اس تصویر میں تیمور کے ساتھ ڈاکٹر جواد اور شاید ان کی بیگم یعنی تیمور کی ماں بھی موجود تھیں۔ یہ ایک گھریلو سی تصویر تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ادھیڑ عمر۔ ایک باوقار سے آدمی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''جی' پروفیسر صاحب۔ اب فرمائیں۔''

''پہلے یہ بتائیں کہ یہ تصویر کس کی ہے؟'' میں نے تیمور کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ۔ یہ میرے بڑے بیٹے تیمور کی تصویر ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔ ''کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟ خیریت سے تو ہے نا؟''

ڈاکٹر صاحب کے انداز سے تیمور کے لئے ان کی بے قراری کا پتا چل رہا تھا۔

''جی ہاں خیریت سے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پچھلے دنوں اس سے میری ملاقات ہوئی تھی اور کئی طرح کے سوالات میرے ذہن میں آئے تھے۔ میں ان ہی سوالوں کے جواب کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''چلیں۔ پہلے تو یہ سن کر اطمینان ہوا کہ تیمور خیریت سے ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''اب آپ کے سوالات کیا ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب۔ میں نے جن حالات میں اس کو پایا ہے۔ وہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا۔ آخر اس کی زندگی میں کیا کمی رہ گئی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''پروفیسر۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ہم دونوں میاں بیوی نے تیمور سے اتنی محبت کی ہے کہ جس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ پھولوں کی طرح پرورش کی ہے اس کی۔ اس کی ایسی کون سی ضد ہے کون سی فرمائش ہے جو ہم نے پوری نہیں کی۔''

''تعجب ہے۔ کیا آپ کی اور اولادیں بھی ہیں۔''

''ہاں۔ دو بیٹے اور ہیں۔ اس سے چھوٹے۔ یہ دونوں بہت ڈانٹ ڈپٹ سنتے آئے ہیں۔ ان کی پٹائی بھی ہوتی رہی ہے' لیکن تیمور کے ساتھ ایسا کبھی کچھ نہیں ہوا۔ بڑے سے بڑے نقصان پر بھی ہم نے اسے سینے سے لگالیا' .... پھر بھی وہ نہ جانے کیوں ہمیں چھوڑ کر چلا گیا؟''

ڈاکٹر صاحب کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ کوئی باپ ہی ایسے کرب کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس دوران .... ڈاکٹر صاحب کی بیگم بھی کمرے میں داخل ہوگئیں۔ ایک مہربان صورت باوقار سی عورت۔

''فریدہ۔'' ڈاکٹر صاحب نے اسے مخاطب کیا۔ ''یہ پروفیسر صاحب ہیں۔ ہمارے تیمور کی نیوز لے کر آئے ہیں۔''

''وہ خیریت سے تو ہے نا؟'' فریدہ بلک اٹھی۔

''ہاں ہاں' بالکل خیریت سے ہے۔'' میں نے تسلی دی۔

''تو پھر وہ اپنی ماں کے پاس کیوں نہیں آتا؟ آپ مجھے اس کے پاس لے چلیں۔ میں اس سے کہوں گی کہ اگر ماں سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اسے معاف کردے۔''

اس عورت کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور تیمور پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر وہ کس مزاج کا تھا کہ اتنے پیار کرنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

کیا کمی تھی اس کی زندگی میں۔ شاندار گھر۔ پیار کرنے والے ماں باپ اور ایک شاندار مستقبل اور اب اس کا کیا مستقبل تھا۔ کچھ بھی نہیں وہ ایک بدمعاش اور دہشت گرد بن چکا تھا۔

کمرے کی فضا سوگوار ہوگئی تھی۔

میں نے ان دونوں کو تیمور کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔ بے چارے اور پریشان اور اُداس ہوجاتے۔ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں رہتا ہے لیکن ان سے یہ وعدہ ضرور کرلیا کہ میں اسے لے کر آؤں گا۔

جب میں ان کی کوٹھی سے نکلا تو میرا ذہن اور اُلجھ گیا تھا۔ وہی سوال تھا کہ آخر کیوں۔ تیمور ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اس کے پاس تو کسی قسم کی محرومی بھی نہیں تھی۔

یہ ایک منفرد قسم کا کیس تھا۔

میں نے ایسے کئی لوگ دیکھے ہیں۔ جو والدین کی بے جا سختی کی وجہ سے انتقاماً برباد ہوجاتے ہیں لیکن یہاں تو کسی قسم کی سختی بھی نہیں تھی۔ پیار ہی پیار تھا۔

بہرحال' دوسرے دن میں نے تارہ کے موبائل پر فون کیا۔ اسے میری کال کا انتظار تھا۔ اس نے فوراً کہا ''پروفیسر صاحب۔ اس طرح نہیں۔ میں فون پر کچھ نہیں سنوں گی۔ آپ فلیٹ پر آجائیں۔''

''تمہارے تیمور صاحب۔ وہ کہاں ہیں؟''

''اس کا میسج آیا تھا۔ وہ چار پانچ دنوں کے بعد آئے گا۔''

میں نے تارہ کے پاس پہنچ کر اسے پوری حقیقت بتادی تھی۔ وہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ''میں تو کچھ اور سمجھ رہی تھی۔ پروفیسر صاحب' پھر یہ کیا سلسلہ ہے؟''

''یہ سلسلہ..... تیمور سے ملاقات کے بعد ہی پتا چلے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں ملاقات کس طرح کرسکتا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''یعنی میں یہاں کیا بہانہ لے کر آؤں۔ کیا جواز ہے میرے پاس۔''

''اوہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''آپ اس کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ میں نے اسے آپ کے بارے میں بتادیا ہے کہ آپ یہاں آیا کرتے ہیں۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت زبردست آدمی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ جب وہ آجائے تو مجھے بتادینا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ یعنی آپ اسی وقت آئیں گے جب وہ آئے گا۔''

''تارہ' میرا یہاں تیمور کی غیر موجودگی میں آنا مناسب نہیں ہے۔''

''پلیز۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ اتنے دنوں کے بعد تو آپ جیسا ہمدرد اور سمجھ دار شخص ملا ہے۔ میں آپ کو کیسے جانے دوں گی۔ آپ یہاں روز آیا کریں گے۔ ہر شام۔ یہ میری درخواست ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آجایا کروں گا۔''

میں نے اس سے وعدہ تو کرلیا تھا لیکن دل میں خوفزدہ بھی تھا۔ تیمور جیسے آدمی کا کیا بھروسا۔ نہ جانے کس وقت سر پھر جائے اور گولیاں چلانی شروع کردے۔

تارہ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ مرد کا شک کتنا خطرناک اور تباہ کن ہوتا ہے' وہ پھر نہیں دیکھتا۔

اس لئے میں جان بوجھ کر دو دنوں تک نہیں گیا۔ اس کا فون بھی آتا رہا لیکن میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ پھر ایک دن جب اس نے بتایا کہ تیمور واپس آگیا ہے اور مجھے اپنا کام شروع کردینا ہے تو پھر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

تیمور نے بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ ''پروفیسر صاحب۔ مجھے تو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے تارہ کا دھیان رکھا تھا۔''

''لیکن تم کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ تیمور کوئی جواب دیتا۔ تارہ پھٹ پڑی۔ ''جانا کہاں ہے۔ تیمور جیسے لوگ سوائے ٹھوکریں کھانے کے اور کیا کرسکتے ہیں۔''

''تارہ۔ ایسا تو نہیں بولو۔'' تیمور نے کہا۔

''تو اور کیا کہوں۔ تم جیسے لوگوں کی زندگی کیا ہے۔ دو کوڑی کے ہو کر رہ گئے ہو۔''

میرا خیال تھا کہ تیمور جیسا سخت مزاج شخص تارہ کی اس بات پر بھڑک اُٹھے گا۔ اس کے بجائے اس نے مسکراتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔ ''ارے بابا۔ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ میں تو خود کو بدلنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔''

''کیا خاک کوشش کرتے ہو۔'' تارہ کا وہی لہجہ تھا۔

''اچھا اچھا۔ مہمان کے سامنے تو ایسی باتیں نہ کرو۔''

تارہ اسے بُرا بھلا کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔ شاید وہ چائے بنانے کے لئے گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔ ''پروفیسر صاحب۔ آج کل اس کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آنے لگا ہے۔''

''تیمور۔ اگر تم ناراض نہ ہو تو میں تم سے ایک بات پوچھوں؟''

''پروفیسر صاحب۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ آپ کو تو دوست سمجھ لیا ہے اور تیمور جس کو دوست سمجھ لے اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ بتائیں کیا بات ہے۔''

''ڈاکٹر جواد سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔''

''اوہ۔'' اس نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ''لگتا ہے تارہ نے آپ کو...''

''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔''

''وہ میرے ابو ہیں۔'' اس نے بتایا۔

اب بات بالکل کنفرم ہوگئی تھی۔ ورنہ یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

''لیکن آپ نے کیوں پوچھا۔ آپ کو کیسے معلوم۔ کس نے بتایا آپ کو؟''

''کسی نے نہیں بتایا۔ پچھلے دنوں میں کسی مریض کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تھا۔ یہ ملاقات تمہارے ہی مکان میں ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں تمہاری تصویر دیکھ کر میں چونک اُٹھا تھا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ تم ان کے بیٹے ہو۔ وہ تمہاری طرف سے بہت پریشان تھے۔''

''یا خدا۔ آپ نے انہیں یہ تو نہیں بتایا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟''

''نہیں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔''

''یہ آپ نے اچھا کیا۔''

''تیمور۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری امی اور ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پلیز پروفیسر صاحب۔ میرے سامنے ان دونوں کی بات نہ کریں۔ وہ دونوں دشمن ہیں میرے۔ آپ نے ان کی جو محبت دیکھی ہے نا۔ وہ ان کی مکاری ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو نہیں ہو سکے گا۔''

''نہیں تیمور۔ میں بھی انسان کو پرکھنا جانتا ہوں۔ ماں باپ اولاد کے دشمن کس طرح ہو سکتے ہیں۔''

کیا آپ جانتے ہیں کہ میری بربادی میں کس کا ہاتھ ہے؟ ان ہی دونوں کا۔ مجھ کو اس حال تک پہنچانے والا کون ہے؟ وہی دونوں ہیں۔''

''یہ تم ان پر الزام لگا رہے ہو۔''

''ہاں۔ میں اپنے والدین پر الزام لگا رہا ہوں کیونکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ سچائی ہے۔''

اب میں کیا کہہ سکتا تھا؟ ایک بیٹا ہی اگر ماں باپ کے بارے میں ایسی بات کر رہا ہو تو پھر اس سے بہتر اور کون جان سکتا ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

ڈاکٹر جواد اور ان کی بیگم مجھے کسی پہلو سے جھوٹے اور مکار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ایک باپ اپنی اولاد کے سلسلے میں مکاری کیسے کر سکتا ہے۔

بہرحال یہ کیس نہ صرف پہلے سے زیادہ اُلجھ گیا تھا بلکہ میرے لئے ایک چیلنج بھی بن گیا تھا۔

اس دوران.... تارہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ چائے کے ساتھ اس نے جلدی جلدی دو چار چیزیں بھی تیار کر لی تھیں۔ جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک باسلیقہ لڑکی ہے۔

''پروفیسر صاحب۔'' تارہ نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ نے تیمور سے یہ پوچھا کہ یہ ایسی زندگی کیوں گزار رہا ہے؟''

''اوہو۔ دس دفعہ تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''پروفیسر صاحب کو بھی بتاؤ۔'' تارہ نے کہا۔

''پروفیسر صاحب۔ بات اتنی ہے کہ گھر والوں کے سلوک نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں گھر چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ اس دوران.... کچھ بُرے لوگوں سے دوستی ہوگئی اور آج میں خود ایک خطرناک آدمی بن گیا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ پولیس کے پاس میرا ریکارڈ نہیں ہے اور نہ ہی کہیں میرا نام آتا ہے۔ اس کے باوجود جاننے والے جانتے ہیں کہ اس واردات میں کس کا ہاتھ ہے۔ لیکن کسی کی مجال نہیں کہ تیمور کے خلاف بول سکے۔''

''چلو مان لیا کہ گھر والوں کے سلوک نے تمہیں اس حال کو پہنچا دیا ہے لیکن کیا تم خود کو بدل نہیں سکتے؟''

''اب تو بہت مشکل ہے۔''

''ارے یہ کیوں نہیں کہتے ذلیل انسان کہ بُرائی کی عادت پڑ چکی ہے۔'' تارہ نے پھر کہا۔

اس نے ایک اور سخت بات کہہ دی تھی۔ لیکن مجال ہے جو تیمور کے ماتھے پر شکن بھی آئی ہو۔ وہ مسکراتا ہی رہا تھا۔ یہ تارہ سے اس کی محبت کی انتہا تھی۔

میں نے کسی شیر کو اس طرح رام ہوتے ہوئے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

''تیمور۔ کیا تم جس جال میں پھنسے ہوئے ہو۔ اس سے نکل نہیں سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں روشنی دیکھی تھی۔ ''اب بہت مشکل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھ پر براہِ راست کوئی الزام نہیں ہے۔ لیکن ہم جیسوں کی زندگی کا کیا بھروسا۔''

تارہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کمرے کی فضا اچانک سوگوار ہوگئی تھی۔

''پروفیسر۔'' تیمور نے اچانک مجھے مخاطب کیا۔ ''تم سے ایک درخواست ہے۔ امید ہے کہ تم بُرا نہیں مانو گے۔ اور میری خواہش کا احترام کرو گے۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تارہ کا خیال رکھنا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بہت اچھی ہے۔ میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے۔''

تارہ سے شاید برداشت نہیں ہوا۔ اس لئے وہ اُٹھ کر چلی گئی تھی۔

میں کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گیا تھا۔ میں نے اس وقت یہ سوچ لیا تھا کہ کسی طرح بھی ہو۔ اس کہانی کو بہ خیر ہونا چاہئے۔ تیمور کی بہتری کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہی ہے۔

اگر وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے والدین اس سے دکھاوے کی محبت کرتے ہیں تو شاید ایسا ہی ہو۔ ورنہ وہ اتنا بڑا الزام کبھی نہیں لگا سکتا۔

کہتے ہیں کہ جب کسی معمے کو سلجھانا ہوتا ہے تو اس کے اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی شام اتفاق سے میرے ایک دوست مجھ سے ملنے آ گئے۔ وہ نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر نظامی۔ کمال کے ذہین۔ اور ایک لمحے میں انسان کی روح کے اندر تک اُتر کر اسے کھنگال لیتے ہیں۔

ہم دونوں کے درمیان بے پناہ بے تکلفی ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''یار۔ تم بہت قابل بنتے ہو۔ ذرا ایک کیس تو حل کرو۔''

''کیسا کیس؟''

میں نے نظامی کو تیمور کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئے تھے۔ ''واقعی یہ تو بہت عجیب صورتِ حال ہے۔ کیا تم اس نوجوان سے مجھے ملوا سکتے ہو۔''

''کیوں نہیں۔ وہ میرا بہت احترام کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک فون پر چلا آئے گا۔''

''اسے بلوا لو۔ اس کا سائیکو انالیسس کروں گا۔''

''بے وقوف مت بنو۔ وہ بدک جائے گا۔ خطرناک آدمی ہے۔''

تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے بتا کر تجزیہ کروں گا۔'' نظامی نے کہا۔ ''اس کو تو بتانا بھی نہیں کہ میں کون ہوں؟''

''تو پھر کب بلایا جائے؟''

''کل شام کو۔''

میں نے تیمور کو فون کیا تو اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ میں اسے کیوں بلوا رہا ہوں؟ وہ میرے پاس چلا آیا تھا۔ نظامی پہلے سے موجود تھا۔

تیمور اس بات پر حیران تھا کہ میں نے اسے کیوں بلوایا ہے؟ میں نے اس کی حیرت دور کرنے کے لیے کہا۔ ''تیمور یہ میرے دوست ہیں نظامی صاحب دبئی میں ان کی ایک فرم ہے۔ انہیں یہاں سے کچھ لوگوں کو لے جانا تھا تو میں نے سوچا کہ تمہاری ان سے ملاقات کروا دوں۔''

''ارے نہیں پروفیسر صاحب۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔'' اس نے کہا۔ ''اچھی بھلی زندگی گزر رہی ہے۔ بہرحال آپ کا شکریہ کہ آپ نے یاد رکھا۔''

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔

نظامی کے اشارے پر میں کسی کام کا بہانہ کر کے تقریباً پون گھنٹے کے لیے باہر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے پھر تیمور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا تھا۔

''ہاں بھئی۔ کیا رہا۔'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تمہارے دیو کو تو قابو میں کر لیا ہے۔'' نظامی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''بس ایک ٹوٹکا استعمال کرنا ہوگا۔''

''اور وہ ٹوٹکا کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہیں نہیں تمہارے ڈاکٹر جواد کو بتاؤں گا۔'' نظامی نے کہا۔ ''تم ان سے میری ملاقات کرا دو۔''

''کل ہی لو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس وقت ڈاکٹر صاحب سے فون پر بات کر لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اسپتال میں تھے۔ ان کی بے قراری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فوری طور پر ہم سے اسپتال آنے کے لیے کہا تھا۔

ہم دونوں اسی وقت اسپتال پہنچ گئے تھے۔

ڈاکٹر جواد سے ملنے کے لیے قطار لگی ہوئی تھی لیکن ہمارے نام سیکریٹری کے پاس تھے۔ اس لیے ہمیں اندر جانے کے لیے کہا گیا۔ اس وقت نظامی نے مجھ سے کہا۔ ''پروفیسر تم یہیں ٹھہرو میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔''

میں باہر ہی کھڑا رہا۔ نظامی پانچ منٹ میں ہی واپس آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''پروفیسر ڈاکٹر صاحب نے اپنی ساری اپائنٹمنٹ کینسل کر دی ہیں اور وہ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔''

''کہاں؟''

''تمہارے تیمور کے پاس۔'' نظامی نے بتایا۔ ''مجھے امید ہے کہ میرا ٹوٹکا کامیاب رہے گا۔''

آدھے گھنٹے کے بعد ہم تینوں تیمور کے فلیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تارہ کو فون کر کے کنفرم کر دیا تھا تیمور فلیٹ ہی میں موجود تھا۔

میں آگے تھا۔ میرے پیچھے نظامی اور خود ڈاکٹر صاحب ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے تارہ کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میں اپنے ساتھ کس کو لے کر آ رہا ہوں؟

میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ تیمور ہی نے دروازہ کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ ''اوہ آئیں پروفیسر صاحب۔''

تیمور آج میں اپنے ساتھ ایک خاص مہمان کو لے کر آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ پھر نظامی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تو ہیں نظامی صاحب اور وہ خاص مہمان کوئی اور ہیں۔''

''تو اس میں کون سا تکلف ہے۔ بلا لیں خاص مہمان کو بھی۔''

''آ جائیں جناب۔'' میں نے آواز دی۔

اور ڈاکٹر صاحب آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ تیمور انہیں دیکھ کر سکتے میں رہ گیا تھا۔

''ذلیل۔'' ڈاکٹر صاحب نے اچانک اس کا گریبان پکڑ کر تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ ''کیا سمجھا ہے تو نے کیا ہم مر جائیں گے تیرے بغیر۔ ذرا سا بھی احساس نہیں ہے کہ ماں پر کیا گزر رہی ہو گی ہے'' اس کے ساتھ ایک اور

تھپڑ۔

اِدھر میرا یہ حال تھا جیسے کسی نے بدن سے خون نچوڑ لیا ہو۔ تیمور جیسے سرپھرے سے کیا بعید تھا وہ تو کچھ بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کیا گردن جھکائے روتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب اس کی ٹھکائی کرتے رہے پھر تیمور روتا ہوا ڈاکٹر صاحب سے لپٹ گیا۔

''معاف کر دیں ابو معاف کر دیں مجھے آپ جتنا جی چاہے مار لیں اور ماریں ابو۔ اور ماریں۔''

پھر ڈاکٹر صاحب بھی رونے لگے۔ عجب جذباتی منظر ہو گیا تھا۔ ہم لوگ فلیٹ کے اندر آ گئے۔ نظامی کے ٹوٹکے نے ایسا کام کر دکھایا تھا جو تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنی جلدی صورتِ حال کا بدل جانا کمال ہی تھا پھر نظامی کا یقین کہ تم دیکھ لینا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ذرا سی دیر میں سب کچھ ٹھیک بھی ہو گیا تھا۔

''ابو' یہ تارہ ہے۔'' تیمور نے ڈاکٹر سے تارہ کا تعارف کروایا۔ ''یہ ایسی لڑکی ہے جس کے بارے میں پروفیسر صاحب سے پوچھ لیں۔''

''ڈاکٹر صاحب اس کی گواہی میں دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اس دور میں ایسی لڑکی ملنا ناممکن ہے۔''

''تیمور تو ابھی میرے ساتھ چلے گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''اور جہاں تک تارہ بیٹی کا سوال ہے۔ یہ ہمارے یہاں باقاعدہ رخصت ہو کر آئے گی اور تو نے اگر بات نہیں مانی تو کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔''

''ابو' میں حاضر ہوں۔'' تیمور جلدی سے بولا۔ ''میری کھال کے جوتے بنوا لیجیے گا۔''

''نالائق۔'' ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر ایک پیار بھری مسکراہٹ تھی۔

''پروفیسر صاحب اور نظامی صاحب آپ دونوں کل ہماری یہاں تشریف لائیے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ لوگوں سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

اس وقت سب سے عجیب صورتِ حال تارہ کی ہو رہی تھی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ تیمور بالآخر اپنے باپ کے گھر جا رہا تھا اور اندر سے اس کا دل تیمور کی جدائی پر رو بھی رہا تھا۔

تیمور اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم لوگ کچھ دیر تارہ کے ساتھ بیٹھے پھر اسے دلاسہ دے کر واپس آئے۔ میں نے راستے میں نظامی سے پوچھا۔ ''بھائی یہ تو بتا دو یہ سب کیا سلسلہ تھا؟''

''آج نہیں یہ بھید کل کھلے گا۔ نظامی نے کہا جب ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس جائیں گے۔''

''دوسری شام جب ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے تو اس وقت تیمور اپنی امی اور بہن بھائیوں کو لے کر کہیں گیا ہوا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں آ کر تیمور نارمل لائف گزارنے لگا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں' اور اب میں یہ بتا دوں کہ مجھے آپ دونوں سے کیا خاص بات کرنی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ تیمور کو بھی پتا نہ چلے ورنہ وہ بے موت مر جائے گا۔''

''جی' ڈاکٹر صاحب فرمائیں۔''

''تیمور ہماری اولاد نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا۔

''کیا۔'' میں یہ سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ ''آپ کی اولاد نہیں ہے تو پھر۔''

''وہ میرے سب سے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔ ''میرا دوست اور اس کی بیوی ایک حادثے میں انتقال کر گئے اس وقت تیمور شاید تین یا چار سال کا تھا پھر ہم نے اس کی پرورش کی اور اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی اور کی اولاد ہے بلکہ وہ جانتا بھی نہیں ہے۔''

''وہ جانتا ہے ڈاکٹر صاحب۔'' اب نظامی نے کہا۔

''کیا.....!'' اب ڈاکٹر کے حیران ہونے کی باری تھی۔ ''کیا تیمور یہ بات جانتا ہے۔''

''جی ہاں۔ والدین کی موت کا نقش اس کے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے لیکن اس نے بھی کبھی آپ پر ظاہر نہیں ہونے دیا ہو گا۔''

''ہاں' کبھی نہیں میرے خدا یہ کتنا بڑا انکشاف ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''خیر تو ہم نے اسے سینے سے لگا کر رکھا۔ پھولوں کی طرح پرورش کی ہے اس کی۔''

''اور اس کی زندگی میں بھی یہی ایک کمی رہ گئی تھی۔'' نظامی نے کہا۔ ''آپ نے اسے حد سے زیادہ پیار دیا۔ آپ اپنے بچوں کو تو ڈانٹتے اور مارتے بھی تھے لیکن اسے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا اور یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی کہ آپ دونوں اسے اپنی اولاد نہیں سمجھتے غیر سمجھتے ہیں، مہمان سمجھتے ہیں' ورنہ کبھی تو ڈانٹتے، کبھی تو مارتے لیکن آپ نے ایسا کبھی نہیں کیا اسی لیے وہ آپ کو ضد اور غصہ دلانے کے لیے بے تکی حرکتیں کرتا، نقصان کرتا لیکن آپ اسے اور زیادہ پیار کرنے لگتے۔ محرومی کے اس احساس نے اسے ضدی اور خودسر بنا دیا۔''

''میرے خدا اب بات سمجھ میں آ رہی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اسی لیے وہ گھر چھوڑ کر اپنی انتہا پر چلا گیا تھا۔''

''جی ہاں اور اس وقت بھی اس کی یہی خواہش ہوتی کہ کاش آپ اسے ڈانٹیں، اسے ماریں۔''

''اور اب میری بھی ایک اُلجھن دور ہو گئی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اُلجھن یہ تھی کہ اس لڑکی تارہ کے سامنے تیمور بالکل سیدھا رہتا تھا مجھے تو حیرت ہوتی تھی۔''

''اس کی وجہ یہی تھی۔ تارہ اس پر سختی کرتی ہو گی اور اس کی جبلت کو سکون ملتا ہو گا۔ اسی لیے تو میں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ ٹوٹکا بتایا تھا کہ وہ جاتے ہی تیمور پر برس پڑیں اس کی ٹھکائی شروع کر دیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اسی چیز کا ترسا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اسے کتنا سکون ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ وہ خوشی کے آنسو تھے آج ایک باپ نے اپنے بیٹے کو اپنا سمجھا تھا۔''

''کمال کی سمجھ ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ انسان کی فطرت ہے پروفیسر صاحب۔ اس پر سختی کی جائے تو وہ نرمی کو ترستا ہے اور نرمی کی جائے تو سختی کی خواہش کرتا ہے۔''

معمّا تو حل ہو گیا تھا۔

لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کچھ دنوں کے بعد میں نے تارہ کو فون کیا تو اس نے بتایا۔ ''پروفیسر صاحب اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ تیمور اب ایک کروڑ پتی کا بیٹا ہے اب وہ میری طرف کیوں دھیان دینے لگا؟''

''کیا مطلب کیا اس نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

''رابطہ تو کیا ہے۔'' تارہ نے بتایا۔ ''لیکن اس میں اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔''

''نہیں تارہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تیمور ایک مختلف انسان ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔ ویسے آپ اس سے جا کر مل لیں۔''

میں نے اسے فون کیا تو اس کے انداز میں وہی والہانہ پن تھا۔ ''ارے پروفیسر صاحب۔ میں تو خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔ اچھا ہوا جو آپ کا فون آ گیا۔ آپ سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''تو پھر میرے پاس آ جاؤ۔ میں اس وقت فارغ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

تیمور آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ گیا تھا۔ اب وہ ایک مختلف نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ سلیقے سے ترشے ہوئے بال، قیمتی کپڑے، بہت ہی شاندار موبائل سب کچھ بدل چکا تھا۔ "پروفیسر صاحب آپ نے جس انداز سے میری مدد کی ہے وہ میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ سوچا بھی نہیں تھا کہ میں نے اندھیری رات اور فائرنگ کے دوران جس آدمی کو سہارا دیا تھا وہ خود میرا سہارا بن جائے گا۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔ "خیر۔ یہ تو بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا ضروری بات کرنی تھی۔"

"تارہ کے بارے میں۔" اس نے بتایا۔

"تارہ بھی بہت خوش ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ اب تم محفوظ ہو گئے ہو تمہارا فیوچر محفوظ ہو گیا ہے۔"

"پروفیسر صاحب ابھی بھی بہت دشواریاں ہیں۔"

"اب کیا دشواری ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ اس کی زندگی بہت اچھی گزرے گی۔"

"یہ بہت مشکل ہے پروفیسر صاحب۔ اس کی زندگی میرے ساتھ نہیں گزر سکتی۔" اس نے کہا۔

"کیا۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تیمور یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"اس وقت میں صرف تیمور تھا اور اب تیمور جواد ہوں۔ اب میرا اسٹیٹس کچھ اور ہو چکا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں ماں باپ کا پیار حاصل کیا ہے۔ اسی لیے میں ان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تیمور۔ بہتر یہی ہے کہ تم کھل کر بات کرو۔ کیا تم اس لڑکی کو چھوڑ دینا چاہتے ہو؟"

"مجبوری ہے پروفیسر صاحب۔" اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ "ابو نے اس وقت مصلحتاً اسے اپنانے کی بات کر لی تھی لیکن اب وہ کسی اور جگہ میرا رشتہ لگا رہے ہیں۔"

"انسان واقعی بہت کمینہ ہے تیمور بہت کمینہ جس لڑکی نے تمہیں سہارا دیا۔ تمہاری بدمعاشیوں کے باوجود تم سے پیار کرتی رہی تم اسی کو دھوکا دے رہے ہو۔"

"پروفیسر صاحب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ میں نے تارہ سے ویسی محبت نہیں کی جیسی کہانیوں اور فلموں میں ہوتی ہے اس نے میری ایک نہ پوری کر دی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ کیا کمی ہے۔ وہ مجھ کو بُرا بھلا کہتی رہتی تھی اور میں اسی بات کو زندگی بھر ترستا رہا تھا۔ لیکن اب والدین مجھے سیدھا کر کے رکھتے ہیں اسی لیے تارہ کی میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔"

"ذلیل انسان اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اس بے چاری کو فلر کے طور پر استعمال کیا تھا۔" میں غصے سے بھڑک اُٹھا تھا۔ "صرف اپنی وقتی ضرورت کے لیے۔ صرف اس کی باتیں سننے کے لیے۔ اس کے علاوہ تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لعنت ہو تم پر۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تم ایسے نکلو گے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن میں کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔ میں نے بُرا بھلا کہہ کر اسے گھر سے نکال دیا۔ میرا تو یہ دل چاہ رہا تھا کہ اسے گولی مار دوں۔ اس نے ذلالت کی انتہا کر دی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ تارہ سے ملتے رہنے کے بعد تارہ کے لیے میرے جذبات کچھ اور ہو گئے تھے۔ میں اسے پسند کرنے لگا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ہر وقت یہ دھیان رہتا تھا کہ وہ کسی اور کی امانت ہے۔ یہ تیمور کی محبت ہے اور تیمور نے مجھ پر بھروسا کیا تھا۔ اسی لیے میں تارہ کو پسند کرنے کے باوجود یہ چاہتا تھا کہ وہ تیمور کی ہو جائے اور اس کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارے۔

لیکن اب تو سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔

میں نے کسی طرح تارہ کو یہ سب جا کر بتاتا۔ وہ تو بالکل ہی بے سہارا ہو چکی تھی۔ میں کئی دنوں تک سوچ بچار ہی میں مبتلا رہا پھر ایک دن ہمت کر کے تارہ کے پاس پہنچ گیا۔

تارہ نے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ یہ سب سنا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ رونے لگی اور روتی چلی گئی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اور اب تارہ میری بیوی ہے۔ اس کہانی کو کئی برس ہو چکے ہیں۔ ہم دونوں ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ تارہ نے میری خدمت کی انتہا کر دی ہے۔ میں اس کے لیے اس حادثے کا شکر گزار ہوں جو حادثہ مجھے تارہ سے ملوانے کا سبب بنا تھا۔

تیمور شاید اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ خوشیوں سے بھرپور ماں باپ کے سائے تلے۔